فنِ حدیث پر ایک نہایت محققانہ، وقیع اور نادر علمی دستاویز

جرح و تعدیل

تالیف

ڈاکٹر اقبال احمد محمد اسحٰق

مکتبہ قاسم العلوم

فنِ حدیث پر ایک نہایت محققانہ، وقیع اور نادر علمی دستاویز

جرح و تعدیل

تالیف

ڈاکٹر اقبال احمد محمد اسحٰق

صدر شعبہ حدیث

مکتبہ قاسم العلوم

نام کتاب ——— جرح وتعدیل

مصنف ——— ڈاکٹر اقبال احمد محمد اسحٰق

اہتمام ——— ملک اسد علی قاسمی

مطبع ——— گنج شکر پریس

ناشر ——— مکتبہ قاسم العلوم

تاریخ اشاعت ——— اکتوبر 2011ء

تعداد ——— 500

قیمت ———

ڈسٹری بیوٹرز

ملک اینڈ کمپنی

رحمان مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور، پاکستان
042-37231119 , 0321-4021415

فہرست مضامین

☆☆☆

مقدمہ

إن الحمد لله، نحمده و نستعينه و نستغفره، و نعوذبا لله من شرور أنفسنا، ومن سيئآت أعمالنا، من يهده الله فلا مضل له، و من يضلل فلا هادى له، وأشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له، وأشهد أن محمدا عبده و رسوله.

﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اتَّقُوْا اللهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ وَلَاتَمُوْتُنَّ إِلَّا وَ أَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ﴾ [آل عمران:۱۰۲] ﴿ يَاأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا، وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْراً وَ نِسَاءً وَاتَّقُوْا اللهَ الَّذِىْ تَسَآءَ لُوْنَ بِهٖ وَالْأَرْحَامَ إِنَّ اللهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا﴾ [النساء:۱] ﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اتَّقُوْا اللهَ وَقُوْلُوْا قَوْلاً سَدِيْدًا، يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْلَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَمَنْ يُطِعِ اللهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا﴾ [الأحزاب: ۷۰] أما بعد

اللہ تعالیٰ نے اپنے پسندیدہ اور آخری دین کو جس قوم میں نازل فرمایا وہ عرب کی غیر متمدن قوم تھی، لیکن اس کے پاس بعض انسانی قدریں: رواداری، ضیافت، صدق گوئی، وفاداری اور امانت داری جیسے اعلیٰ اخلاق و کردار کی روشن مثالیں بھی موجود تھیں، اس کے ساتھ ساتھ بعض خداداد صلاحیتیں، قوت حافظہ، سرعت فہم و فراست، خودداری و بے باکی، حوصلہ اور جرأت مندی، ہمت و سجاعت بھی ان میں بھرپور طور سے موجود تھی، انتہائی سخت گیر، سخت مزاج اور سخت جان بھی تھے۔

قبائلی عصبیت انتہائی عروج پر تھی، قبیلہ کی عزت و آبرو، اس کی عظمت و بڑائی، زندگی کا سب سے بڑا مقصد تھا، سردار کے حکم کی بجاآوری پر مر مٹتے تھے، جس چیز کو مان لیتے تھے اُس پر اڑ بیٹھتے تھے، اس کے خلاف سننے کی قوت برداشت نہیں رکھتے تھے۔

اللہ رب العزت نے تمام قوموں کو چھوڑ کر ان صفات سے متصف قوم عرب کو اپنی دائمی شریعت کے نزول کے لئے منتخب فرمایا اور عرض کیا ﴿اللهُ أَعْلَمُ

حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ﴾ [انعام: ۱۲۴] اللہ تعالیٰ اپنے پیغام کو جس جگہ بھیجتا ہے وہ اسکو سب سے زیادہ جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں قوم عرب کی تعریف کی جھلک واضح طور سے نمایاں ہے۔

اور واقعہ بھی یہی ہے کہ اس قوم کے جس فرد نے بھی دین مبین کو برحق سمجھ لیا مجال کیا ہے کہ اس سے ٹس سے مس ہو سکے، ظلم و زیادتی کا آسمان ٹوٹ پڑا لیکن استقامت کا پہاڑ بن کر ثابت قدم رہے، اور وہ قدیم غیرت و حمیت، عزم اور حوصلہ، جرأت و بیباکی، جو کبھی بے مقصد ہوا کرتی تھی بامقصد ہو گئی اور وہ ساری اخلاقی قدریں اور فطری صلاحیتیں دین کی حفاظت، اس کی نشر و اشاعت میں لگ گئیں۔ جی ہاں! ﴿اللّٰهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ﴾ [انعام: ۱۲۴]

یہی وجہ ہے کہ یہ روشنی آپ کے دور مبارک میں بڑی آب و تاب کے ساتھ پھیلتی رہی، پھر آپ کی بعد آپ کے خلفاء اور جاں نثاروں کا دور آیا، اس روشنی میں کوئی کمی نہیں آئی، بلکہ اس نے رفتہ رفتہ پوری دنیا کو منور کرنا شروع کر دیا۔

یہودی لابی جو بزعم خویش قیادت و سیادت کو صرف اپنا حق، رہنمائی اور پیشوائی کو اپنی وراثت سمجھتی تھی، حق کی یہ روشنی اس کو راس نہ آئی، اس کے بدیہی ہونے کے باوجود اس میں رخنہ ڈالنے کی کوشش کی، خلیفہ ثالث حضرت عثمان بن عفانؓ کے دور خلافت میں مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف ورغلایا، حضرت عثمان پر اقربا پروری کا الزام لگایا، حجاج بیت اللہ کے بھیس میں حرمُ اللہ کی بے حرمتی کی، ظلم و بربریت کا مظاہرہ کرتے ہوئے خلیفہ وقت کا ناحق خون بہایا، اور طرح طرح کی ریشہ دوانیاں کیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اختلاف و انتشار اور جدید سیاست نے جنم لیا، خوارج اور شیعان علی کے دو سیاسی فرقے نمودار ہوئے، جس میں سے ایک تکفیر علیؓ اور دوسرا عصمت علی کا قائل تھا، جمہور امت جو ابھی تک حق پرستی کی خوگر تھی اور کتاب و سنت کو اپنی زندگی کا معیار سمجھتی تھی کو امت کا یہ بٹوارہ پسند نہ تھا، خیر امت کی وسطیت کو چھوڑ کر جنہوں نے افراط و تفریط کو اختیار کیا راہ حق سے بھٹک گئے، جمہور نے اس افتراق کو فتنہ سے تعبیر کیا اور اس کو مذموم قرار دیا۔

جب ان سیاسی فرقوں نے یہ دیکھا کہ ان کی مقبولیت دن بدن گھٹ رہی ہے تب انہوں نے پیترا بدلا اور افتراقی سیاست پر دینی رنگ چڑھانے کی کوشش کی، اپنے باطل نقطہ نگاہ اور مفرط مزاج کے لئے کتاب و سنت کا سہارا لینا چاہا، سہارانہ ملنے کی صورت میں اس میں نفوذ کا راستہ تلاش کیا، قرآن کریم میں داخلہ کی گنجائش ان کو نظر نہ آئی، اس میں کسی قسم کا رد و بدل گرفت کرانے کیلئے کافی تھا، البتہ سنت رسول میں بزعم خویش ان کو راستہ دکھائی دیا، اس میں گھٹانے بڑھانے کا امکان نظر آیا، لہٰذا حدیث رسول کے گھڑنے کی مجرمانہ اور ناکام کوشش کی، اور سب کے سب پکڑے گئے توہین و تذلیل ہوئی، ناکام و نامراد ہوئے۔

سب سے پہلے یہ مجرمانہ عمل طاغوت اعظم عبداللہ بن سبا نے کیا جیسا کہ امام شعبی (متوفی ۱۰۳ھ) کا وضاحتی بیان ہے کہ: "أول من كذب عبدالله بن سبا" [۱]

اور اس طرح اپنے لئے جہنم کو رجسٹرڈ کرا کے "من كذب علي متعمدا فليتبوأ مقعده من النار"[۲] کا مصداق بنا، اور دنیا والوں نے اپنی نگاہوں سے اس کو آگ میں جھلستے دیکھا جو نار جہنم کا پیش خیمہ تھا۔[۳]

پھر اس کام کا بیڑا اس کے متبعین نے اٹھایا جنہوں نے اپنے لئے "شیعان علی" کا خطاب پسند کیا تھا، جو حد افراط سے بھی آگے نکل گئے حضرت علی کو کبھی معصومیت، تو کبھی الوہیت کا درجہ دیا، آل بیت کی محبت کا اظہار کر کے امت کو دام فریب میں لانے کی کوشش کی، حضرت علی اور آل بیت کی فضیلت میں صحیح احادیث موجود ہونے کے باوجود خود پسند حدیثیں گھڑنا شروع کیا۔

ساتھ ساتھ حضرت امیر معاویہؓ، خاندان بنی امیہ حتی کی حضرت ابو بکر و عمرؓ کی فضیحت میں بھی حدیثیں گھڑیں، اور اس طرح سے وضع حدیث میں پہلا نمبر حاصل کیا، جس کا اعتراف ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغۃ میں کیا ہے۔

---

(۱) لسان المیزان (۳/۲۸۹) ترجمہ ابن سبا۔ (۲) متواتر روایت ہے۔

(۳) وضع حدیث کے جرم میں حضرت علی نے عبداللہ بن سبا اور اس کی پارٹی کے بعض افراد کو زندہ جلادیا۔ (لسان المیزان ۲/۲۹۰)

اور اپنے اس کام میں شہرت یافتہ ہو گئے حتی کہ حضرت علیؓ کو بھی اپنی کار کردگی سے تنگ کر رکھا تھا، یہاں تک کہ آپ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے "مالي و لهذا الخبيث الأسود"[۱] اس کمینے کلوٹے [عبداللہ بن سبا] سے ہمارا کیا واسطہ اور پھر ایک بڑی جماعت کے ساتھ اس کو ہلاک کرادیا۔

یہ لوگ مبینہ طور پر بہت سی باتیں حضرت علیؓ کی جانب منسوب کر دیا کرتے تھے جس کا افسوس حضرت علی اور اصحاب علی کو بھی تھا آپ نے انہی کے بارے میں یہ بددعائیہ کلمہ کہا تھا "قاتلهم الله أى حديث أفسدوا" [۲] اللہ ان کو غارت کرے کس حدیث کو انہوں نے برباد کیا۔"

جب نوبت یہاں تک پہنچ گئی تو پاسبان سنت نبوی نے اس کی حفاظت کا معقول انتظام کیا، احتیاط و تحقیق کیساتھ ساتھ طلب اسناد کا اہتمام کیا، راویان حدیث کے حالات دریافت کئے جانے لگے، انکے سفر و حضر، تلامذہ واساتذہ، رہن سہن، وضع قطع، سیرت وسلوک پر نظر رکھی جانے لگی، ان کی عدالت و ثقاہت کو دیکھا جانے لگا۔

جرح و تعدیل کے قواعد و ضوابط تیار کئے گئے، وقت اور حالات کے تقاضہ کے ساتھ ساتھ یہ علم پروان چڑھتا رہا، اہل علم کی مجلسوں میں اس کا تذکرہ ہوتا رہا، اساتذہ اپنے طلبہ کے سوالات کے جواب میں اس کی وضاحت کرتے رہے، کتب حدیث اور کتب علل میں اس کا ذکر، کتب جرح و تعدیل میں ان کا استعمال ہوتا رہا، یہاں تک کہ یہ علم ہر طالبِ علمِ حدیث کیلئے معلوم اور معمول بہ ہو گیا۔

اس فن کے بڑے بڑے ائمہ اور نقاد پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی زندگی کو حفاظت حدیث اور راویان کی معرفت کیلئے وقف کر دیا، حقیقی راویان کے صفوں میں گھس پیٹ کرنے والے جعل سازوں کا پتہ لگایا، ہر ایک کی کارکردگی کی مفصل رپورٹ اس کی پوری زندگی کا نقشہ پیش کر کے ہر ایک کو اس کے اصلی مقام تک پہنچا دیا، اور قیامت تک کیلئے ان کا مسئلہ صاف کر دیا۔

پھر جب تدوین فنون کا دور آیا تو یہ علم جو سینہ بہ سینہ (بذریعہ اسناد) چلا آرہا

---

(۱) لسان المیزان ۳/۲۹۰ (۲) صحیح مسلم ۱/۸۳ مع شرح النووی نسخہ بیروت

تھا اس میں ترقی ہوئی، ان کے اصول و ضوابط اور معرفتِ رجال، دونوں کو الگ الگ فن کی حیثیت دے دی گئی، احوال رجال کی معرفت "علم اسماء رجال" اور اُصولِ عدالت و ضبط کی معرفت کو "علم جرح و تعدیل" کا نام دیا گیا۔

اسماء رجال اور راویان حدیث کے حالات کو تدوین کرنے والے یہی ائمہ فن تھے، جن قدوسی نفوس نے راویان حدیث پر جرح و تعدیل کا کام کیا ہے، اس کی تفصیل امام سخاوی (متوفی ۹۰۲ھ) نے اپنی کتاب "الإعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ" اور حاجی خلیفہ (متوفی ۱۰۶۷ھ) نے "کشف الظنون عن أسامي الکتب والفنون" اور علامہ کتانی (متوفی ۱۳۴۵ھ) نے "الرسالة المستطرفة" میں بیان کیا ہے اور ان کتابوں کا نام اور مختصر تعارف بھی پیش کیا ہے جو اس فن میں تالیف کی گئی ہیں۔

اسی طرح سے استاذ گرامی ڈاکٹر اکرم ضیاء عمری حفظہ اللہ نے ان کا تذکرہ بڑی تفصیل کے ساتھ "بحوث في تاریخ السنة المشرفة" میں کیا ہے، ان تالیفات میں موجود اور مفقود، مخطوط اور مطبوع کی جانب اشارہ بھی کر دیا ہے۔

جن ائمہ فن نے اسماء رجال پر کتابیں تصنیف کی ہیں ان میں کچھ مشہور ہستیاں یہ ہیں:

یحییٰ بن سعید قطان	(متوفی ۱۹۸ھ)	أحمد بن صالح عجلی	(متوفی ۲۶۱ھ)
محمد بن سعد کاتب واقدی	(متوفی ۲۳۰ھ)	ابو زرعہ عبدالکریم رازی	(متوفی ۲۶۴ھ)
یحییٰ بن معین	(متوفی ۲۳۳ھ)	ابن ابو حاتم رازی	(متوفی ۳۲۷ھ)
علی بن مدینی	(متوفی ۲۳۴ھ)	ابو حاتم محمد بن حبان بستی	(متوفی ۳۵۴ھ)
خلیفہ بن خیاط	(متوفی ۲۴۰ھ)	ابو احمد بن عدی	(متوفی ۳۶۵ھ)
احمد بن حنبل	(متوفی ۲۴۱ھ)	ابو حجاج مزی	(متوفی ۷۴۲ھ)
محمد بن اسماعیل بخاری	(متوفی ۲۵۶ھ)	ابو عبداللہ ذہبی	(متوفی ۷۴۸ھ)
مسلم بن حجاج قشیری	(متوفی ۲۶۱ھ)	حافظ ابن حجر عسقلانی	(متوفی ۸۵۲ھ)

أئمہ جرح و تعدیل کا تعارف، ان کی سیرت و سوانح عام طور سے کتب جرح و تعدیل میں پائی جاتی ہے، کچھ اہل علم نے خصوصیت کے ساتھ ان ائمہ کا ذکر کیا ہے، مثلاً ابن ابی حاتم رازی (متوفی ۳۲۷ھ) نے مقدمہ "جرح و تعدیل" میں، علامہ ابن حبان

(متوفی ۳۵۴ھ) نے مقدمہ ''المجروحین'' میں، علامہ ابن عدی (متوفی ۳۶۵ھ) نے ''الکامل فی الضعفاء'' کے مقدمہ میں، امام ذہبی (متوفی ۷۴۸ھ) نے ''ذکرمن یعتمدقوله فی الجرح والتعدیل'' میں، علامہ عبدالرحمٰن سخاوی (متوفی ۹۰۲ھ) نے ''المتکلمون فی الرجال'' میں، استاذ گرامی ڈاکٹر محمد ضیاءالرحمٰن اعظمی حفظہ اللہ نے چوتھی صدی ہجری تک کے مشہور ائمہ فن کا مفصل ترجمہ اپنی کتاب ''دراسات فی الجرح و التعدیل'' کے ایک خاص باب میں کیا ہے، جن ائمہ کرام کی کتابوں کا تعارف، جرح وتعدیل کے ضمن میں کیا گیا ہے، ان کی زندگی کی ایک جھلک، اور سوانحی خاکہ زیر نظر کتاب میں دکھادی گئی ہے، جو عام طور سے ائمہ اعلام ہیں، فن جرح وتعدیل سے ان کا کیا تعلق اور اس فن میں ان کا کیا مقام ہے خصوصیت کے ساتھ اس کو واضح کیا گیا ہے، تیسرا باب انہیں کے لئے مختص ہے۔

اسی طرح سے ان اصول و ضوابط کو جو اہل علم کے یہاں معروف و متداول تھے، تدوین فنون کے دور میں اصول حدیث کی کتابوں میں نمایاں مقام دے کر تحریر کیا گیا، اس کے درس و تدریس کا اہتمام ہوا، آگے چل کر ان کو مخصوص کتابوں میں تنظیم وترتیب کے ساتھ جمع کردیا گیا۔

جن حضرات نے یہ کام کیا ان میں علامہ تاج الدین سبکی (متوفی ۷۷۱ھ) ہیں جنھوں نے طبقات الشافعیہ میں احمد بن صالح مصری کے ترجمہ میں جرح وتعدیل کے کچھ قاعدوں پر روشنی ڈالی ہے جو ''قاعدة فی الجرح والتعدیل'' کے نام سے مطبوع ہے۔ علامہ ابو الحسنات عبدالحیٔ لکھنوی (متوفی ۱۳۰۴ھ) نے ''الرفع والتکمیل فی الجرح و التعدیل ''میں، ڈاکٹر محمد ضیاءالرحمٰن اعظمی نے دراسات فی الجرح والتعدیل میں، شیخ ابو لبابہ حسین نے ''الجرح و التعدیل'' میں، شیخ خلدون احدب نے ''أسباب اختلاف المحدثین دراسة نقدیة......''میں، ڈاکٹر عبدالموجود عبداللطیف نے ''علم الجرح و التعدیل دراسة وتطبیق'' میں کیا ہے، آخر میں ڈاکٹر عبدالعزیز محمد بن ابراہیم نے ایک مفید اور جامع کتاب ''ضوابط فی الجرح والتعدیل '' کے نام سے تحریر کیا ہے، راقم حروف نے بھی اس سلسلہ میں

ایک تالیف "ارشاد النبیل إلی الجرح والتعدیل" کے نام سے جمع کیا ہے، جو ملک کے بعض جامعات میں داخل نصاب ہے۔

ان ساری کوششوں اور کدوکاوش کا مقصد حدیث رسول کی حفاظت کرنا، صحیح اور ضعیف میں تمیز کر کے حق پر عمل پیرا ہونے، امت مسلمۃ کو بیرونی مداخلت -جو موجودہ زمانے میں دور استعمار سے دوبارہ زوروں پر ہے- سے محفوظ رکھنا ہے۔

یہ ساری کتابیں عربی زبان میں تھیں، اس لئے اردوداں طبقہ اپنے اس اہم تاریخی دستاویز سے نابلد، محدثین اور سلف صالحین کی بے مثال قربانیوں اور عظیم علمی خدمات سے ناواقف تھا جو امت مسلمہ کی تاریخ کا ایک عظیم سرمایہ ہے اور جس پر دین کی معرفت کا دارومدار ہے۔

لہٰذا مناسب معلوم ہوا کہ اس فن کے اہم گوشوں کو اردو زبان میں تبدیل کیا جائے، تاکہ اردوداں طبقہ سلف صالحین کے ان علمی خدمات سے مستفید ہو سکے اور اپنی تاریخ کے نقوش جاوداں کو زندہ و جاوید رکھ سکے، نیز طالبان علوم نبوت اس علم کی باریکیوں سے اچھی طرح واقف ہو سکیں۔

اس کتاب کا نام "جرح وتعدیل" رکھا گیا ہے جس میں ایک مقدمہ چار ابواب اور ایک خاتمہ ہے۔

پہلا باب : اسناد اور طبقات رجال کے بارے میں

دوسرا باب : قواعد جرح و تعدیل کے بارے میں

تیسرا باب : ائمہ جرح و تعدیل کے بارے میں

چوتھا باب : کتب جرح و تعدیل کے بارے میں

ان معلومات کو فن اصول حدیث، جرح وتعدیل، اسماء رجال، دفاع عن السنہ، کے اہم اور بنیادی جدید وقدیم مصادر و مراجع سے جمع کیا گیا ہے، جن کا حوالہ حاشیہ میں دے دیا گیا ہے حوالہ میں عام طور سے کتابوں کے نام میں اختصار سے کام لیا گیا ہے، جو انشاء اللہ مخل نہیں ہوگا اس لئے کہ یہ کتابیں اپنے مختصر نام سے بھی معروف ہیں مثلاً:

نزهة النظر شرح نخبة الفكر کے لئے صرف نزهة ،یانزهة النظر کااستعمال، المجروحين من المحدثين والضعفاء والمتروكين کے لئے المجروحين کا استعمال،تدريب الراوی فی شرح تقريب النووی کے لئے تدريب، یاتدريب الراوی کااستعمال،وعلى هذا القياس،ویسے اس بات کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ جہاں کتاب کانام پہلی مرتبہ وارد ہووہاں اس کانام مکمل تحریر ہو۔

عربی زبان سے اصطلاحات کا منتقل کرنا، ان کو مناسب الفاظ میں پرونا، سلیس اور عام فہم بنانا آسان عمل نہیں ہے، خاص طور سے مجھ جیسے بے بضاعت کے لئے بڑا مشکل کام تھا، کام میں تسلسل نہ ہونے کی وجہ سے بھی اسلوب میں یکسانیت بر قرار نہیں رہ پاتی لیکن "نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے" کے مقولہ سے ہمت ملتی رہی اور حسب امکان جو ہو سکا جمع کر دیا ہے، اہل علم سے التماس ہے کہ غلطیوں کی نشاندہی فرماتے ہوئے گراں قدر مشوروں سے نوازیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ رب ذوالجلال میری اس حقیر کی کوشش کو قبول فرمائے،امت مسلمہاور طالبان علوم کیلئے مفید اور ہمارے لئے باعث نجات بنائے۔ آمین۔

ربنا تقبل منا إنك أنت السميع العليم، وتب علينا إنك أنت التواب الرحيم ، و صلى الله على نبينا محمد و آله و صحبه أجمعين و من تبعهم بإحسان إلى يوم الدين.

ڈاکٹر:اقبال احمد محمد اسحٰق بسکوہری
(صدر شعبہ حدیث)
جامعہ محمدیہ منصورہ،مالیگاؤں
۶/ شوال ۱۴۲۳ھ

پہلا باب

اسناد اور طبقات رجال کے بارے میں

اسناد کا لغوی معنی :-

کلمہ ''اسناد'' سند سے ماخوذ ہے جو لغوی اعتبار سے مختلف معنوں میں مستعمل ہے۔ پہاڑ کے دامن کی بلندی کو سند کہا جاتا ہے، اسی طرح سے وادی کے سامنے کی بلند زمین کو بھی سند کہا جاتا ہے، آدمی جس چیز پر ٹیک لگاتا ہے یا جس پر اعتماد کرتا ہے اس کو بھی سند کہا جاتا ہے۔ (۱)

علامہ ابن جماعۃ (متوفی ۷۶۷ھ) فرماتے ہیں کہ اسناد یا تو سند سے ماخوذ ہے جو ''ما ارتفع و علا من سفح الجبل'' پہاڑ کے دامن کا وہ حصہ جو بلند و بالا ہو، کے معنی میں ہے، اسلئے کہ اسناد کرنے والا قول کی نسبت کو قائل تک پہنچاتا (بلند کرتا) ہے، یا تو ''فلان سند'' سے ماخوذ ہے جو ''فلان معتمد'' کے معنی میں ہے اس لئے کہ محدث حدیث کی صحت وضعف کے سلسلہ میں سند پر اعتماد کرتا ہے۔ (۲)

اصطلاحی معنی:-

اصطلاح میں اسناد (یا سند) اس واسطہ کو کہتے ہیں جو متن تک پہنچاتا ہے۔ جمہور محدثین کے یہاں سند اور اسناد میں کوئی فرق نہیں ہے لیکن کچھ محدثین نے مفہوم کے اعتبار سے فرق کیا ہے۔ ان کے یہاں:

سند: -اس واسطہ کو کہتے ہیں جو متن تک پہنچاتا ہے۔

اسناد:- قائل کی جانب قول کی نسبت کرنے کو کہتے ہیں۔ (۳)

علم اسناد:- اس علم کو کہتے ہیں جس سے راویان حدیث (صحابہ تابعین

---

(۱) لسان العرب ۳/ ۲۲۰ مادہ ''سند'' (۲) تدریب الراوی فی شرح تقریب النووی ۱/ ۴۱

(۳) لسان العرب ۳/ ۲۲۱، تدریب الراوی ۱/ ۴۲، نزهة النظر شرح نخبة الفكر ص ۹۲

وغیرہ) کی معرفت حاصل ہو۔[1]

وجود اسناد:-

صحابہ کرام اپنے دور میں رسول ﷺ کے اقوال، افعال اور سیرت کی نسبت آپ کی جانب کیا کرتے تھے، یہ طریقہ انہوں نے اللہ کے رسول ﷺ سے سیکھا تھا جو بسا اوقات اپنی باتوں کو حضرت جبرئیل علیہ السلام کی جانب منسوب کرتے تھے، جسکی بیشمار مثالیں کتب حدیث میں موجود ہیں۔ اور کبھی اللہ رب العزت کی جانب منسوب کیا کرتے تھے جیسا کہ احادیث قدسیہ سے واضح ہوتا ہے۔ "رفع القول إلى قائله" کی یہی وہ بنیاد ہے جہاں سے اسناد کا وجود ہوا، پھر آہستہ آہستہ یہ سلسلہ بڑھتا گیا۔

معلوم یہ ہوا کہ اسناد کا وجود دورِ رسول سے موجود ہے جس کی ابتدا خود ذات گرامی سے ہوتی ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ ایک دوسرے پر اعتماد کی وجہ سے اس کو ہر ایک سے طلب نہیں کیا جاتا تھا، لیکن جب حالات میں تبدیلی آنے لگی تب باقاعدہ اس کی طلب بھی شروع ہو گئی۔

یہیں سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اسناد اور حدیث رسول دونوں لازم ملزوم ہیں، دونوں کا وجود بیک وقت ہوا ہے، اسناد کوئی ایسی چیز نہیں جو بعد کی پیداوار ہے، جب صحابہ کرام نے آپ ﷺ سے کچھ سنا، آپ کے اسوہ حسنہ کو دیکھا تو دوسروں تک آپ کی جانب نسبت کر کے پہنچایا۔

اھمیت اسناد:-

رسول پاک ﷺ کے اقوال، آپ کے افعال، آپ کی تقریرات اور سیرت مقدسہ کی معرفت کا دار و مدار اسناد اور اس کی صحت پر ہے، اس لئے کہ سلسلہ اسناد میں پائے جانے والے افراد ہی وہ برگزیدہ شخصیتیں ہیں جنہوں نے احادیث رسول، تفسیر قرآن، دین و شریعت کو ہم تک پہنچایا ہے، اس بنیاد پر اہل علم نے اسناد کو بڑی اہمیت دی ہے۔ کسی نے اس کو "نصف علم" قرار دیا ہے تو کسی نے "جزء دین" کہا ہے۔

چنانچہ علامہ ابن سیرین (متوفی ۱۱۰ھ) فرماتے ہیں کہ: "هذه الأحاديث

---

(۱) الحطة في ذكر الصحاح الستة ص ۹۳

دین فانظروا عمن تاخذونها"[1] یہ حدیثیں دین ہیں لہٰذا یہ دیکھو کہ کس سے لے رہے ہو۔

علامہ ابن مبارک (متوفی ۱۸۱ھ) فرماتے ہیں کہ: "الاسناد من الدین لولا الاسناد لقال من شاء ماشاء "[2] اسناد دین کا جز ہے اگر اسناد کا وجود نہ ہوتا تو ہر شخص جو چاہتا سو کہتا۔

یحییٰ بن سعید قطان (متوفی ۱۹۸ھ) فرماتے ہیں کہ: حدیث کی طرف دیکھنے سے پہلے سند کی طرف دیکھو اگر سند صحیح ہے تب تو ٹھیک ورنہ اگر سند صحیح نہ ہو تو حدیث سے دھوکہ نہ کھانا۔[3]

علی بن مدینی (متوفی ۲۳۴ھ) فرماتے ہیں کہ: "معرفة الرجال نصف العلم لأن الحدیث سند ومتن، والسند عبارة عن الرواة فمعرفتهم نصف العلم"[4]
راویان کی معرفت نصف علم ہے اس لئے کہ حدیث سند اور متن کے مجموعہ کا نام ہے اور سند کا مطلب راویان حدیث ہوتا ہے لہٰذا ان کی معرفت نصف علم ہے۔

آغاز فتنہ اور طلب اسناد:-

صحابہ کرام کا سنہرا دور ابھی مکمل بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ طرح طرح کے فتنوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا، انھیں فتنوں کے نتیجہ میں خلیفہ مظلوم حضرت عثمان بن عفانؓ (۳۶ھ) میں شہید کر دیئے گئے، آپ کی شہادت کے بعد مسلمانوں میں اختلاف کی بنیاد پڑ گئی جس کا خمیازہ امت کو آج تک بھگتنا پڑ رہا ہے، اسی وقت سے امت کا شیرازہ منتشر ہونا شروع ہوا، جنگ جمل وصفین کا افسوسناک واقعہ پیش آیا، مختلف سیاسی فرقے نمودار ہوئے جنھوں نے اپنے اوپر دینی رنگ چڑھانے کی کوشش کی، سمع وطاعت کو بالائے طاق رکھ کر اپنی آوارہ مزاجی کیلئے کتاب وسنت سے دلیل تلاش کرنے لگے، جب دلیلیں ہاتھ نہ لگیں تو جھوٹ کا سہارا لیا جو عام طور سے سیاست دانوں

---

(۱) الجرح والتعدیل لابن أبی حاتم ۱۵/۷
(۲) مقدمة صحیح مسلم ۸۷/۱، الجرح والتعدیل ۱۶/۲
(۳) تهذیب الكمال فی أسماء الرجال للمزی ۶۵/۱
(٤) المحدث الفاصل بین الراوی والواعی ص ۳۲۰، تهذیب الكمال ۱۶۵/۱.

کی شرست میں داخل ہے، جسکا نتیجہ یہ نکلا کہ حدیث رسول میں دروغ گوئی شروع ہو گئی، اپنی اپنی پارٹی کو مضبوط بنانے کیلئے اپنی فضیلت اور دوسروں کی فضیحت بیان کی جانے لگی۔ پھر اس کو رسول کی جانب منسوب کیا جانے لگا، جب نوبت یہاں تک آ پہنچی تو پاسبان حرمت نبوی کے غیرت مندوں کی جماعت بنیان مرصوص بن کر نمودار ہوئی، صحابہ و تابعین اور خدام سنت نبوی کے ان دستوں نے اس بیرونی مداخلت کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اور طلب اسناد کا سلسلہ شروع کر دیا جس میں ابھی تک حالات وظروف کے اعتبار سے رعایت دی گئی تھی اور یہ ایک مسلمہ اصول بن گیا کہ جب تک اپنے واسطہ کا ذکر نہ کیا جائے کوئی بات رسول کی جانب منسوب نہیں کی جاسکتی اور نہ ہی اس پر کان دھرا جاسکتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس (متوفی ۶۸ھ) فرماتے ہیں کہ: ایک دور تھا جب ہم کسی کی زبان سے قال رسول اللہ سنتے تھے تو ہماری نگاہیں اس کی طرف دوڑ پڑتی تھیں اور ہم ہمہ تن گوش ہو جاتے تھے لیکن جب (صورت حال بدل گئی) لوگ اچھے اور برے پر سوار ہونے لگے (رطب ویابس بیان کرنے لگے) تو اب ہم ان سے انھیں باتوں کو قبول کرتے ہیں جن کو ہم پہلے سے جانتے ہیں۔[1]

امام محمد بن سیرین (متوفی ۱۱۰ھ) فرماتے ہیں کہ: اہل علم اسناد کے بارے میں (سابقہ دور میں) سوال نہیں کرتے تھے لیکن جب فتنہ (شہادت عثمان) واقع ہوا تو روایت کرنے والے سے راوی کا نام طلب کیا جانے لگا، اگر راوی کا تعلق اہل سنت سے ہوتا تو اس کی روایت قبول کر لی جاتی، اور اگر بدعتی ہوتا تھا تو اس کی روایت چھوڑ دی جاتی۔[2]

معلوم یہ ہوا کہ اسناد کی ابتداء فتنہ (شہادت عثمانؓ) کے بعد ہوئی ورنہ سند تو پہلے ہی سے موجود تھی، ایک دوسرے پر کامل اعتماد کی وجہ سے اس کی طلب نہیں کی جاتی تھی، اسی وجہ سے بہت سے تابعین نے مرسل روایتوں کو روایت کیا جن کو بعد میں

---

(۱) صحیح مسلم ۸۱/۱ طبع بیروت مع شرح نووی

(۲) مقدمۃ صحیح مسلم ۸۴/۱

بطور احتیاط مجروح قرار دیا گیا۔

امام ابراہیم نخعی (متوفی ۹۵ھ) فرماتے ہیں کہ " إنما سئل الاسناد فی أیام المختار" یعنی اسناد کی طلب اور اس کے بارے میں سوال مختار کذاب کے زمانے میں کی گئی (جس کا قتل ۶۷ھ میں ہوا تھا) اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت علیؓ کے تعلق سے جھوٹ کی کثرت ہو گئی تھی۔(۱)

امام شعبی (متوفی ۱۰۴ھ) فرماتے ہیں کہ: سب سے پہلے کذب بیانی عبداللہ بن سبا نے شروع کی تھی، یہ حضرت علیؓ کی جانب جھوٹی باتیں منسوب کرتا تھا یہاں تک کہ ان کو بھی عاجز کرر کھا تھا حتی کہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ: "مالی و لھذا الخبیث الأسود"(۲) اس کمینے کلوٹے سے ہمارا کیا واسطہ۔ اس کی ریشہ دوانیوں اور دروغ گوئی پر اصحاب علی بھی بے حد افسوس کرتے تھے جس کا اظہار انہوں نے اس طرح کیا ہے: "قاتلھم اللہ أی حدیث أفسدوا"(۳) اللہ ان کو برباد کر دے، کن باتوں کو انھوں نے برباد کر دیا۔

معلوم ہوا کہ طلب اسناد کی ابتدا حضرت علیؓ کے زمانے میں ہو چکی تھی جو زمانہ فتنہ اوّل یعنی شہادت عثمانؓ کے فوراً بعد کا تھا۔ یعنی صحابہ کرام کا دور اول جب خلفاء راشدین کا دور ختم ہو رہا تھا اور دوسرا دور شروع ہو رہا تھا۔

بلکہ بقول ابن حبان اس کی بنیاد حضرت عمر فاروقؓ سے پڑ چکی تھی۔

جسکی دلیل حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کا وہ واقعہ ہے جس میں وہ حضرت عمرؓ سے ملنے گئے تین مرتبہ آواز دیا جواب نہ ملنے پر واپس ہونے لگے اتنے میں حضرت عمر باہر آئے اور کہا واپس کیوں جا رہے ہو، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے "حدیث استئذان" آپ کو سنا دیا، حدیث سننے کے بعد حضرت عمر نے ان سے شہادت طلب کی، کہ کیا کسی اور نے سنا ہے کہ نہیں؟ چنانچہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اس کی طلب کیلئے نکلے اور اس کے سننے والوں میں سے حضرت ابو سعید خدریؓ کو بطور شاہد پیش کیا،

---

(۱) بحوث فی تاریخ السنة المشرفة ص ۴۸-۴۹

(۲) لسان المیزان ۲۸۹/۳، ۲۹۰ (۳) صحیح مسلم ۸۴/۱

حضرت ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ:

كنت في مجلس من الأنصار إذ جاء أبو موسى كأنه مذعور فقال: استاذنت على عمر ثلاثا فلم يوذن لي فرجعت، فقال: ما منعك؟ قلت: استاذنت ثلاثا فلم يؤذن لي فرجعت، وقال رسول ﷺ: "إذا استأذن أحدكم ثلاثا فلم يؤذن له فليرجع" فقال: والله لتقومن عليه بينة أمنكم أحد سمعه من النبي ﷺ؟ فقال أبي بن كعب: والله لا يقوم معك إلا أصغر القوم، فكنت أصغر القوم، فقمت معه فاخبرت عمر أن النبي ﷺ قال ذلك.(١)

علامہ ابن حبان اس واقعہ کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ:

فأول من فتش عن الرجال وبحث عن النقل في الأخبار عمر بن الخطاب وأبو موسىٰ الأشعري (٢)

جب کہ اس طرح سے طلب شہادت کا نمونہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے زمانے میں بھی پیش ہو چکا ہے جب جدہ (دادی) کی وراثت کا معاملہ پیش آیا تو مغیرہ بن شعبہؓ نے رسول ﷺ کے حوالہ سے اس کو چھٹا حصہ دینے کی بات کہی، حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا کہ: "هل معك أحد" کیا کوئی اور تمہارے ساتھ شہادت دینے والا ہے؟ چنانچہ محمد بن مسلمہؓ جنھوں نے یہ بات آپ سے سنی تھی نے شہادت دی تب اسکو نافذ کیا گیا۔(٣)

ان دونوں بزرگوں کے زمانہ میں طلب شہادت کی یہ کارروائی مجرد احتیاط، مزید اطمینان اور راویان حدیث کو محتاط رہنے کیلئے درس کے طور پر کی گئی تھی جب کہ حضرت علیؓ کے زمانہ میں طلب اسناد ضرورت کے پیش نظر کی گئی، پھر صحابہ کرام کا دوسرا دور شروع ہوا، اس میں یہ سلسلہ جاری رہا، جس میں بڑے بڑے تابعین بھی پائے جاتے تھے، اسی دور میں امام شعبی عامر بن شرحبیل (١٧-١٠٣ھ) رحمہ اللہ امام بن کر ابھر رہے تھے، جنھوں نے اس کام کو مزید ترقی دی، چنانچہ ربیع بن خثیم (متوفی

(١) صحيح بخاری كتاب الاستئذان ١١/٢٦-٢٧، حدیث نمبر (٦٢٤٥)
(٢) مقدمة المجروحين ٣٨/١ (٣) تذكرة الحفاظ ٢/١

۶۱ھ) فرماتے ہیں کہ: میں نے امام شعبی سے یہ حدیث بیان کیا کہ: "من قال لا إله إلا الله وحده لاشريك له، له الملك وله الحمد، يحيي ويميت وهو على كل شئي قدير، عشر مرات كان له كعتق رقبة أو رقاب" توامام شعبی نے ان سے پوچھاکہ یہ حدیث آپ نے کس سے سنی؟ انھوں نے کہاکہ عمرو بن میمون سے۔ امام شعبی نے عمرو بن میمون سے ملاقات کیااور پوچھاکہ یہ حدیث آپ سے کس نے بیان کیاہے؟ انھوں نے کہاکہ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ نے۔ پھر امام شعبی نے ابن ابی لیلیٰ سے ملاقات کی اور سوال کیاکہ یہ حدیث آپ سے کس نے بیان کیاہے؟ انھوں نے فرمایا کہ صحابی رسول ابوایوب انصاریؓ نے (۱)

یحییٰ بن سعید (متوفی ۱۹۸ھ) فرماتے ہیں کہ: "فهذا أول من فتش عن الاسناد" (۲) یہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے (اس وقت کیساتھ) اسناد کی تفتیش کی۔

حافظ ابن عبدالبر اس واقعہ کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ: اسی طرح سے محدثین اسناد کی تفتیش کرتے تھے۔ (۳)

اس طرح سے مملکت اسلامیہ کے ہر ہر علاقہ میں حدیث رسول کیلئے سند طلب کرنے والے اور اس کی تفتیش کرنے والے محافظین سنت موجود تھے۔ اور جب صحابہ کرام کا دوسرا دور شروع ہوا تو اس میں یہ سلسلہ جاری رہا جس میں بڑے بڑے تابعین بھی پائے جاتے تھے۔

طلب اسناد امر ضروری:

جوں جوں وقت گذرتا گیا طلب اسناد میں شدت، پھر اسکا التزام کیا جانے لگا یہاں تک کہ یہ ایک ضرورت اور عادت بن گئی۔

امام زہری (متوفی ۱۲۴ھ) فرماتے ہیں کہ: "لايصلح أن يرقى السطح بدون درجة" (۴) چھت پر بغیر سیڑھی کے جانا ممکن نہیں۔ یعنی بغیر اسناد کے حدیث

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الاستئذان ۲۰۱/۱۱، حدیث نمبر (٦٤٠٤)، التمهيد لما فی الموطاء من المعانی والأسانيد لابن عبدالبر ۵۵/۱

(۲) المحدث الفاصل بين الراوی والواعی ص ۲۰۸

(۳) التمهيد لابن عبدالبر ۵۵/۱ . (٤) الجرح والتعديل ۱۱٦/۲

تک پہنچنا ممکن نہیں۔

اور خود آپ کی یہ عادت تھی کہ بغیر اسناد کے کوئی حدیث نہیں بیان کرتے تھے، اور اہل علم میں یہ منتشر ہو چکا تھا کہ:

والعلم إن فاته إسناد مسنده　　كالبيت ليس له سقف ولا طنب

اگر سند بیان کرنے والے سے اسکا بیان فوت ہو گیا تو وہ علم اس گھر کی طرح ہے جس میں نہ چھت ہے اور نہ میخیں ہیں۔

ھشام بن عروہ (متوفی ۱۴۶ھ) فرماتے ہیں کہ: "إذا حدثك رجل بحديث فقل عمن هذا؟"[1] کہ جب کوئی شخص تم سے حدیث بیان کرے تو اس سے پوچھو کہ کس سے سنا ہے؟

نتیجہ یہ ہوا کہ طلب اسناد ایک ضروری امر قرار پایا اور ہر خاص و عام کیلئے ایک مسلمہ اصول بن گیا، دیہاتی ہو یا شہری، جاہل ہو یا عالم، ہر ایک کے لئے اس کا استعمال ضروری ہو گیا، بڑے سے بڑا محدث بھی اگر بغیر سند کے کوئی بات کہتا خواہ وہ اختصار ہی کیلئے کیوں نہ ہو تو بھی قابل قبول نہیں ہوتی تھی جب تک کہ سند کا پتہ نہ چل جاتا۔

اصمعی کا بیان ہے کہ سفیان بن عیینہ (متوفی ۱۹۸ھ) کی خدمت میں ایک دیہاتی حاضر ہوا اور یہ سوال کیا کہ اگر حج کرنے والی عورت طواف بیت اللہ سے پہلے حائضہ ہو جائے تو کیا کرے؟ انھوں نے کہا کہ: طواف بیت اللہ کے علاوہ بقیہ سارے اعمال حج کرے۔ دیہاتی نے پوچھا کوئی قدوہ نمونہ موجود ہے؟ آپ نے کہا جی ہاں! حضرت عائشہؓ کے ساتھ یہ معاملے پیش آیا تھا تو اللہ کے رسول نے ان کو یہی حکم دیا تھا، دیہاتی نے پھر سوال کیا "هل من بلاغ؟" کہ کیا اسکی کوئی سند بھی ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ جی ہاں، حدثني عبدالرحمٰن بن القاسم، عن أبيه، عن عائشة.[2]

غور کیجئے کہ سفیان بن عیینہ جیسے جلیل القدر امام و عظیم محدث سے ایک دیہاتی سند طلب کر رہا ہے جب کہ یہاں معاملہ درس حدیث کا نہیں بلکہ فتوی کا تھا۔

علامہ مدائنی فرماتے ہیں کہ: ایک دیہاتی نے ایک صاحب کو بغیر سند کے

---

(۱) السنة قبل التدوين ص ۲۲٦　　(۲) الكفاية في علم الرواية ص ٤٤

حدیث بیان کرتے ہوئے سنا تو اس نے انھیں فوراً ٹوک دیا اور کہا کہ :"لِمَ تر سلها بغير أزمة ولاخطب؟ "(۱) بغیر نکیل ولگام کے تم اس کو کیوں چھوڑ رہے ہو؟

امام ابو عبداللہ حاکم (متوفی ۴۰۵ھ) نے ابن ابی فروہ کا یہ واقعہ ذکر کیا جب وہ آیا اور امام زھری کے سامنے قال رسول ﷺ کہہ کر حدیث بیان کرنے لگا، تو امام زھری نے فرمایا: ابن ابی فروہ اللہ پر کس چیز نے تجھ کو جری بنادیا ہے کہ تو اپنی حدیثوں کی سند نہیں ذکر کرتا، ایسی حدیث بیان کرتا ہے جو بے لگام بے نکیل ہیں!! (۲)

حدیث رسول میں اسناد کے التزام کا نتیجہ یہ ہوا کہ ذکر اسناد ایک عام مزاج بن گیا، حتی کہ حدیث رسول کے علاوہ دیگر اسلامی فنون تفسیر، تاریخ، اقوال رجال وغیرہ کیلئے بھی اسکا استعمال ضروری ہو گیا۔

مستشرقین اور اسناد:-

لیکن جن لوگوں کا ذہن بیمار ہے وہ نام نہاد تحقیق کے نام پر شبہات کا سہارا لے کر بدیہیات کا انکار کرنے پر مصر رہتے ہیں اور اپنے اس قاعدہ پر عمل کرنے میں کوئی دریغ محسوس نہیں کرتے کہ "جھوٹ کو اتنا اچھالو اور عام کرو کہ وہ سچ نظر آنے لگے" حقیقت میں یہ وہ لوگ ہیں جو علم و تحقیق، صداقت وامانت سے بغاوت کے عادی مجرم ہو چکے ہیں، انہیں میں سے مستشرقین اور ان کے برخورداروں کی جماعت ہے جن کا یہ خیال ہے کہ اسناد بہت بعد کی پیداوار ہے بلکہ خود ساختہ ہے اس لئے کہ اس کا استعمال رسول کے زمانے کے بعد ہوا۔ پھر اس بعد کی تعیین میں وہ آپس میں ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔

چنانچہ کایتانی اور شبر بخر کا یہ دعویٰ ہے کہ سندوں کا استعمال رسول ﷺ کی وفات سے تقریباً اسی سال بعد ہوا اسلئے کہ سب سے پہلے احادیث عروہ بن زبیر (متوفی ۹۴ھ) نے جمع کیا ہے اس میں انہوں سند کا استعمال نہیں کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سند کے استعمال کی ابتداء رسول کی وفات کے اسی سال بعد شروع ہوئی۔

اسکی دلیل یہ ہے کہ امام طبری نے اپنی تاریخ میں ان حدیثوں کا ذکر کیا ہے جن کو

---

(۱) السنة قبل التدوين ص ٢٢٤ (۲) معرفة علوم الحديث ص ٦

عروہ نے جمع کیا تھا اور عبد الملک کے پاس تحریر کر کے بھیجا تھا جنکا زمانہ (۷۰-۸۰ھ) کا ہے، اسمیں سند مذکور نہیں اور عروہ نے اس میں بلاواسطہ قال رسول اللہ کہا ہے۔

غرض یہ ہے کہ کسی چیز کے عدم ذکر سے عدم شی لازم نہیں آتا، اگر بالفرض یہ تسلیم کر لیا جائے کہ عروہ نے اپنی سند نہیں ذکر کی، جب کہ یہ مشہور تھا کہ ان کی روایتیں عام طور سے حضرت عائشہؓ کے واسطہ سے ہوتی ہیں درمیان میں صرف ایک ہی واسطہ تھا، تو یہ کیسے پتہ چلا کہ سند کا وجود ہی نہیں تھا؟ سند نہ ذکر کرنے کے بہت سارے اسباب ہو سکتے ہیں جس میں اختصار، شہرتِ اسناد، معرفت سند سب کچھ ممکن ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ مستند باتوں کیلئے مستند دلیلوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ امام طبری کی کتاب کوئی حدیث کی مستند کتاب تو ہے نہیں کہ اس کے نقول کو بنیاد بنا کر سند کی ابتداء وانتہاء کا اصول مرتب کیا جائے۔ وہ تو ایک تاریخی کتاب ہے جہاں بنیادی طور سے حالات وواقعات ذکر کرنا مقصد ہوتا ہے، سند کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ یہاں پر ان کو ایک واقعہ جو عبد الملک کے زمانہ میں پیش آیا تھا اس کا ذکر کرنا مقصد تھا، اس کو ذکر کر دیا۔ اس لئے کہ ایک مورخ کے مقصد کی چیز بس اتنے میں ہوتی ہے۔

ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی حفظہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ہر زمانہ میں بحث نگار متقدمین کی کتابوں سے اپنے مقصد کی چیز نقل کرتا ہے۔ پوری بات نہیں نقل کرتا، اور یہاں تو عروہ کی سند میں صرف ایک ہی واسطہ تھا اور وہ کسی صحابی کا ہوتا تھا، اس کو حذف کرنا آسان بات تھی۔ (۱)

نیز امام طبری کی کتاب کے علاوہ دیگر کتابوں میں بھی ان حدیثوں کا ذکر ہے جو امام طبری سے کہیں زیادہ متقدم ہیں، ان میں سندیں موجود ہیں۔ چنانچہ امام زہری (متوفی ۱۲۴ھ) نے عروہ کی حدیثوں کو جو عبد الملک کے بھیجا تھا مستند ذکر کیا ہے۔ اور خود امام طبری نے کبھی کبھی عروہ کی سند کا تذکرہ حضرت عائشہؓ کے ذکر کے ساتھ کیا ہے۔ "مسند امام احمد بن حنبل" میں بھی یہ روایت سند کے ساتھ موجود ہے۔ لہٰذا یہ دعویٰ بے بنیاد اور باطل ہے۔ (۲)

(۱) دراسات فی الحدیث النبوی ۲/۳۹۳

(۲) دراسات فی الحدیث النبوی ۲/۳۹۲. نیز دیکھئے مسند احمد ۲۱۲/٤

مزید یہ کہ اگر عروہ نے سند نہیں ذکر کیا تو اس سے یہ تعیین کیسے ہوئی ہے کہ اسناد کی ابتدا رسول کی وفات کے اسی سال بعد ہوئی؟ اگر ذکر نہ ہونا نفی کی دلیل ہے تو پھر وجود کی دلیل اس میں کہاں ہے؟

اس متزلزل بنیاد کو ان کے خاندان والوں میں سے ہارفنس نے خود ڈھادیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سند کی ابتدا پہلی صدی کے تیسری تہائی سے شروع ہوتی ہے۔ (تیسری تہائی تقریباً ۶۷ھ سے شروع ہوتی ہے۔)

روبسن کا یہ دعویٰ ہے کہ پہلی صدی کے نصف میں ایسی چیزوں کے وجود کی اُمید کی جاتی ہے جو اسناد کے مشابہ ہیں، البتہ اس کا دقیق نظام تو یہ دھیرے دھیرے ہوا ہے۔

جب کہ شاخت کا یہ دعویٰ ہے کہ فقہی کتابوں میں حدیثیں عموماً بغیر سند کے مذکور ہیں، مثلاً موطاء امام مالک (متوفی ۱۷۹ھ) "الأم" امام شافعی (متوفی ۲۰۵ھ) "کتاب الخراج" امام ابو یوسف (متوفی ۱۸۲ھ) وغیرہ کی، جب کہ اس کے بعد والی کتابوں میں اسانید موجود ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ اسانید بعد کی ایجاد ہیں۔[1]

شاخت کا یہ دعویٰ مبنی بر فریب ہونے کے ساتھ ساتھ پر مغالطہ بھی ہے، امام مالک کی موطاء میں عام طور سے حدیثیں سند سے مروی ہیں البتہ کچھ مراسیل و بلاغات وغیرہ اس میں ضرور ہیں جو کہ امام مالک کے یہاں قابل حجت ہیں، یہی معاملہ کتاب "الأم" اور "کتاب الخراج" کا بھی ہے جس میں بیشتر حدیثیں بذریعہ اسناد مروی ہیں، امام شافعی کی کتاب "الأم" سے مسند شافعی ترتیب دی گئی ہے جو مکمل مسند ہے، ان کتابوں میں جو روایتیں مسند نہیں تو اس کا مطلب تو یہ نہیں ہوتا ہے کہ اسناد کا وجود ہی نہیں تھا، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان اہل علم نے اختصار کے طور پر ایسا کیا تھا، اسلئے کہ ان حضرات کی سندیں معروف تھیں، اگر مطلب ایسے ہی اخذ کیا جاتا ہے تو جو مسند روایتیں ہیں کیا وہ اسناد کے وجود پر دلالت نہیں کرتیں؟ ایک پہلو کو واضح اور دوسرے کو نظر انداز کر کے گھما پھرا کر خود ساختہ نتیجہ نکالنا یہ فریب کاری ہے۔

مغالطہ اس میں یہ ہے کہ بات یہ کہی جارہی ہے کہ "فقہ کی کتابوں میں اسناد

---

(۱) بحوث في تاريخ السنة المشرفة ص ٥٧

نہیں تھی"،جس کی بنیاد پر اسناد کو متأخر سمجھا جارہا ہے۔اور آگے یہ کہا جارہا ہے کہ "بعد والی کتابوں میں اسانید موجود ہیں" اور یہ نتیجہ اُخذ کیا گیا ہے کہ اسناد کا وجود متأخر ہے۔یہ تو بہت برا مغالطہ ہے اسلئے کہ بعد والی کتابوں سے جن میں سندیں موجود ہیں اس سے کتب حدیث مراد لیا ہے۔ کیونکہ کتب فقہ تو اپنے منہج پر بغیر اسناد ہی کے تحریر ہوئی ہیں اور بعد والی کتابوں میں تو اسناد بالکل نہیں ہے کہیں کتب حدیث تو کہیں کتب فقہ ملا کر معاملہ خلط مبحث کیا جارہا ہے تا کہ ذہنوں کو خواہ مخواہ الجھایا جائے۔

خود روبسن کا یہ کہنا ہے کہ صغار صحابہ سے جو روایتیں مروی ہیں وہ کبار صحابہ کے مقابلہ میں زیادہ ہیں اگر یہ سندیں محدثین کی گھڑی ہوئی ہوتیں تو وہ صغار صحابہ کی جانب نسبت نہیں کرتے بلکہ کبار صحابہ کی جانب کرتے،ایسا نہ کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سندیں خود ساختہ نہیں ہیں۔(۱)

نیز جن کتابوں کو بطور مثال پیش کیا گیا ہے ان سے پہلے بعض ایسی کتابیں تحریر کی گئی ہیں جن کو مسانید کہا جاتا ہے۔ مثلاً مسند معمر بن راشد (۱۵۲ھ)اور مسانید میں سندیں بڑی التزام کے ساتھ مذکور ہوتی ہیں، لہٰذا اگر کسی کتاب میں اتفاق سے سند کو نہیں ذکر کیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اس کا وجود ہی نہیں تھا۔(۲)

نیز فقہی کتابوں اور حدیثوں کی کتابوں کے منہج اور طریقہ تالیف اور مقصد تالیف میں بڑا فرق ہوتا ہے، فقہی کتابیں مسائل کی وضاحت کیلئے تحریر کی جاتی ہیں اس میں اسناد کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی اولاً تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ جن حدیثوں سے استدلال کیا جاتا ہے اس کی سندیں دوسری جگہ موجود ہوتی ہیں۔ دوم یہ کہ یہاں مجرد لفظ حدیث سے استدلال مقصد ہوتا ہے اس لئے سندوں پر توجہ نہیں ہوتی ہے۔

جس طرح حدیث کی کتابوں میں مسائل گنائے نہیں جاتے ان کی وضاحت نہیں کی جاتی بلکہ اسناد اور لفظ حدیث کا ثبوت مقصد ہوتا ہے اس لئے سند و متن اور الفاظ پر مکمل توجہ دی جاتی ہے۔ لہٰذا دونوں کو خلط ملط کر کے نتیجہ نکالنا علمی شان کے خلاف ہے۔یہ نتیجہ وہی نکال سکتا ہے جو دونوں کے اسلوب تصنیف سے ناواقف ہو،

---

(۱) بحوث فی تاریخ السنة المشرفة ص ۵۸ (۲) بحوث فی تاریخ السنة المشرفة ص ۵۸

حالانکہ یہ لوگ اچھی طرح جانتے ہیں لیکن نیت میں خلل ہے۔

اس تفصیل سے یہ واضح ہو گیا کہ اسناد کے تعلق سے مستشرقین کی باتیں بے سروپا کی ہیں جس کی کوئی حقیقت نہیں، حقیقت یہ ہے کہ اسنادِ حدیث اور متنِ حدیث دونوں ایک وقت کی پیداوار ہیں، اسناد کا وجود نہ تو خود ساختہ ہے اور نہ متأخر ہے، البتہ اسناد کا طلب کرنا اور اس کی دریافت قدرے متأخر ہے۔

تعیین فتنہ:۔

علامہ ابن سیرین (متوفی ۱۱۰ھ) کے قول میں "فلما وقعت الفتنة قالوا سموا لنا رجالكم" میں جو فتنہ کا لفظ ہے وہ طلب اسناد کیلئے حد فاصل ہے، اس فتنہ سے مراد جملہ اہل علم نے شہادت عثمان بن عفان لیا ہے جیسا کہ حضرت سعید بن مسیّب (متوفی ۹۳ھ) کا فرمان ہے کہ: "فلما وقعت الفتنة الأولى يعني مقتل عثمان فلم يبق من أصحاب بدر أحدا "[1] جب فتنہ اولیٰ یعنی شہادت عثمان کا وقوع ہوا اس وقت اصحاب بدر میں کوئی باقی نہیں بچا تھا۔

عبید اللہ بن عدی محاصرہ کے وقت حضرت عثمان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ آپ عوام کے امام ہیں لیکن بڑی پریشانی میں مبتلا ہیں اسوقت ہماری امامت "امام فتنہ" کر رہا ہے جسکے پیچھے نماز پڑھنے میں ہم حرج محسوس کرتے ہیں۔[2]

اس واقعہ سے بھی معلوم ہوا کہ یہ فتنہ بالکل معروف ہو چکا تھا اور مطلق فتنہ سے یہی فتنہ مراد ہوتا تھا، جس کا تعلق حضرت عثمان کے خلاف بغاوت اور ان کی شہادت سے ہے۔

ابن عباس کے قول "فلما ركب الناس الصعب والذلول" کے پس منظر کو اگر دیکھا جائے تو اس فتنہ کی تعیین کا معاملہ بالکل واضح نظر آتا ہے، ابن عباس نے جن حالات کی جانب اشارہ کیا ہے وہ وہی حالات ہیں جن کو ابن سیرین نے "فلما وقعت الفتنة" سے تعبیر کیا ہے، اس لئے کہ ابن سیرین نے جو تعبیر استعمال کیا ہے وہ

---

(۱) صحيح بخارى كتاب المغازى ۳۲۳/۷ نمبر (٤٠٢٤) کے بعد

(۲) صحيح بخارى كتاب الأذان ۱۸۸/۲ حديث نمبر (٦٩٥)

فعل ماضی کا معنی دیتا ہے جس سے انہوں نے سابق دور کی جانب اشارہ کیا ہے۔

مزید بر آں یہ کہ ابن سیرین کے قول میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ اسناد کا وجود ہی نہیں تھا، بلکہ اس میں ہے کہ "لم یکونوا یسئلون عن الاسناد" لوگ اسناد کی طلب نہیں کرتے تھے اور نہ اس کے بارے میں پوچھ تاچھ کرتے تھے، وجہ یہ تھی کہ زمانہ رسول سے بالکل قریب تھا، صحابہ اور کبار تابعین بکثرت موجود تھے، صداقت و امانت غالب تھی ایک دوسرے پر مکمل اعتماد تھا۔

مستشرقین کا فتنہ:۔

لیکن مستشرقین جن کو دوسروں کا سوراخ نظر آتا ہے انہیں اپنا مادر زاد ننگا ہونا نظر نہیں آتا وہ اس فتنہ کے تعیین کے سلسلہ میں فتنہ میں مبتلا ہو گئے اور بہت سے احساس کمتری رکھنے والے مدعیان اسلام شاگردوں کو بھی فتنہ میں مبتلا کر دیا۔

ان کا مقصد یہ ہے کہ اس فتنے کو کھینچ تان کر جتنا زیادہ دور لے جا سکیں گے اتنا ہی یہ کہنے کا موقع ملے گا کہ سلسلہ اسناد جو احادیثِ رسول کے ساتھ پایا جاتا ہے یہ رسول کے انتقال کے ایک زمانہ بعد وجود میں آیا جبکہ اصحابِ رسول کا دور بھی ختم ہو چکا تھا، لہٰذا یہ سب غیر معتمد ہے، پھر جو حدیثیں رسول کی جانب منسوب کی جاتی ہیں وہ بھی غیر معتمد ٹھہریں۔

خود ساختہ انجیل کے ان متبعین کا دماغ اس فتنہ کے تعیین کے تعلق سے تو خوب چلا لیکن ان کا دماغ مقام "نیقیہ" میں پہنچ کر ماؤف ہو جاتا ہے جہاں حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام کے رفع کے سوا تین سو سال بعد (۳۲۵ء) میں بیس سو اڑتالیس (۲۰۴۸) پوپ اور پادریوں میں سے سترہ سو تیس (۱۷۳۰) کی مخالفت کے باوجود قوت کے بل بوتے دین نصاریٰ میں تحریف کیا گیا اور آج وہی محرف دین، حقیقی دین بن گیا ہے۔ اس محرف دین کی تصحیح کیلئے ان کا عقل کام نہیں کرتا، البتہ مذہب اسلام میں تحقیق کے نام پر کیڑے نکالنے کیلئے بڑے فراخ دل ہوتے ہیں جو کجی کی علامت اور (ویبغونہا عوجا) کی زندہ مثال ہے۔

ان کے خیال میں فتنہ سے مراد شہادت عثمان اور اس کے مابعد ہونے والے

واقعات نہیں بلکہ کوئی اور فتنہ مراد ہے پھر اس کی تعیین میں اختلاف کیا ہے۔

شاخت کا یہ کہنا ہے کہ فتنہ سے مراد ولید بن یزید کا قتل ہے۔ جو ۱۲۶ھ کا واقعہ ہے۔ اس لئے کہ تاریخ طبری میں ۱۲۶ کے واقعات میں لفظ "فتنہ" کا استعمال یوں ہوا ہے :

"اضطرب أمر بني مروان و هاجت الفتنة"[1] بنی مروان کے معاملات پریشان کن ہوگئے اور فتنے بھڑک اٹھے۔

ظاہر ہے کہ ابن سیرین کے قول میں یہ فتنہ قطعی طور سے مراد نہیں اس لئے کہ ابن سیرین کا انتقال ۱۱۰ھ میں ہو گیا ہے پھر ۱۲۶ھ کے واقعات کا ذکر کیسے کر سکتے ؟

ع : لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا

لہٰذا اب یہ مفروضہ قائم کیا گیا کہ ابن سیرین کا قول موضوع ہے۔ حالانکہ ابن سیرین کا قول معتمد بہ مصادر میں موجود ہے انہیں میں سے صحیح مسلم کا مقدمہ بھی ہے جو تاریخ طبری کے مقابلے میں کہیں زیادہ بہتر اور معتمد ہے پھر ایسا کیوں نہیں ہے کہ " اضطرب أمر بني مروان و هاجت الفتنة" ہی موضوع ہو، ابن سیرین ہی کا قول موضوع کیوں ہوا؟ یہ تو زبردستی کا فیصلہ، دعویٰ بلا دلیل اور علمی منہج سے راہ فرار ہے۔

اگر بالفرض ابن سیرین کا قول موضوع ہے اور فتنہ سے مراد ۱۲۶ھ کا واقعہ صحیح ہے تو پھر طلب اسناد سے اس کا کیا تعلق ہے ؟

اور اگر یہ قول موضوع ہے تو پھر کس فتنہ کی تعیین کیلئے سرگرداں نظر آتے ہیں، اور یہ فتنہ ایسے لوگوں کے لئے کہاں سے فتنہ بن گیا؟ اب تو فتنہ کی تعیین کا سارا کھیل ہی ہوائی ہے۔

حوادثات و فتن تو ہر زمانہ میں ہوتے رہتے ہیں، حضرت عثمان کی شہادت اور ولید بن یزید کے قتل کو اگر ماحول اور حالات کے تناظر میں دیکھا جائے تو فتنہ کس کو قرار دیا جا سکتا ہے یہ ہر دل و دماغ والا بآسانی سمجھ سکتا ہے۔

عجیب تو ہے کہ ایک طرف طلب اسناد کو ابن سیرین کے قول سے اخذ کیا جا رہا ہے اور پھر اس کو موضوع قرار دے کر فتنہ سے مراد مقتل ولید کو لیا جا رہا ہے اور پھر

(۱) بحوث في تاريخ السنة المشرفة ص ٤٨

دونوں کو جوڑ کر نتیجہ نکالا جارہا ہے، یہ تو عجیب تضاد ہے کہ جس قول کو موضوع سمجھیں اس کے ایک جز کو معتمد یہ مان کر استدلال بھی کریں اور جو اپنے مخالف ہے اسے موضوع مان لیں؟؟ اس بدیہی تضاد کو دیکھ کر دیگر مستشرقین نے اس قول سے تنازل اختیار کر لیا اور فتنہ کو قدرے مقدم کر دیا۔

چنانچہ روبسن، ہوروفتس اور کایتانی کا خیال ہے کہ فتنہ سے مراد مقتل ابن زبیر ہے جو ۷۲ھ کے حدود میں واقع ہوا ہے۔ دلیل یہ ہے کہ امام مالک نے اس تحریک پر لفظ فتنہ کا اطلاق کیا ہے۔ (۱)

عرض یہ ہے کہ ابن سیرین کے قول سے اس کی بھی تردید ہو جاتی ہے اس لئے کہ انہوں نے **"لم یکونوا یسئلون عن الاسناد"** غائب کا صیغہ استعمال کیا ہے جس سے ابتدائی دور کی جانب اشارہ ہے جیسا کہ خود ان کا دوسرا قول ہے:

"هاجت الفتنة و أصحاب رسول الله ﷺ عشرة آلاف فما خفت لها منهم مأة." (۲) فتنہ بھڑک پڑا اور اصحاب رسول کی تعداد اس وقت دس ہزار سے زیادہ رہی ہو گی لیکن اس میں سے سو افراد بھی اس فتنہ میں شریک نہ ہوئے۔

قول سابق میں ابن سیرین نے جس فتنہ کی جانب اشارہ کیا ہے یہ وہی فتنہ ہے جس کا ذکر اس قول میں موجود ہے، اور اس سے مراد شہادت عثمان ہی ہے کیونکہ صحابہ کی جو تعداد علامہ ابن سیرین نے یہاں بتائی ہے وہ بعد کے کسی بھی فتنہ پر صادق نہیں آتا۔

اس لئے کہ صحابہ کی اتنی بڑی تعداد ۷۲ھ کے حدود میں موجود ہی نہیں تھی اس وقت تو خال خال صحابہ باحیات تھے جن کو انگلیوں پر شمار کیا جا سکتا ہے، صحابہ کی اتنی بڑی تعداد اسی دور میں تھی جس کو ابن سیرین نے فتنہ کہا ہے اور وہ شہادت عثمان اور اس کے فوراً بعد کے فتنے ہیں۔

واقعہ ابن زبیر کی طرح بے شمار واقعات تاریخ کے اوراق میں مذکور ہیں جس کی کوئی اہمیت نہیں اور نہ ہی اس کو تاریخ میں فتنہ کا نام دیا گیا ہے۔

---

(۱) موطاء مالك، كتاب الحج ۱/ ۳۶۰ حديث نمبر (۹۹)

(۲) بحوث في تاريخ السنة المشرفة ص ٤٨

اگرچہ امام مالک نے اپنے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے اسے فتنہ سے تعبیر کیا ہے، بلکہ یہ ایک طرح سے امام پر خروج اور بغاوت ہے۔

نیز اس واقعہ سے فتنہ بھڑکا نہیں تھا بلکہ اگر اس کو فتنہ کہتے ہیں تو فتنہ ختم ہوا تھا اور مملکت اسلامیہ کے جزوی انقسام کا سلسلہ اتحاد میں جڑ گیا تھا۔

حضرت ابن عباس کا قول بھی اس حادثہ کو فتنہ ماننے کی نفی کرتا ہے اس لئے کہ ابن عباس کا انتقال (۶۷ھ) میں ہو گیا ہے جب کہ یہ واقعہ (۷۲ھ) کا ہے۔ بایں عقل و دانش بباید گریست۔

طلب اسناد امتیاز امت:-

طلب اسناد اس امت کی خصوصیت ہے جنہوں نے حدیث رسول کی حفاظت اور دین کو محفوظ کرنے کیلئے اس کا اہتمام کیا اور اسی کے ساتھ ایک جدید علم کا ایجاد ہو گیا، دنیا میں کوئی ایسی قوم نہیں ہے جنہوں نے اپنے نبی ورسول کی ہدایتوں کو یا دین کی حفاظت کے لئے اتنا اہتمام کیا ہو جتنا کہ اس امت نے کیا ہے۔

خود سماوی ادیان یہودیت، ونصرانیت کا ان کے انبیاء ورسل وحوارییں سے کوئی رابطہ ہی برقرار نہ رہا چہ جائیکہ یہ رابطہ مستند ہو۔ یہی وجہ ہے کہ سارے ادیان احبار و رہبان کے ہاتھ کا کھلونہ بن گئے اور تحریف و تبدیل ان کا مقدر بن گیا، دوسرے ادیان اپنی قدامت میں اس طرح گم ہیں کہ وہاں دین کے نام پر خود ساختہ رسم و رواج کے علاوہ کچھ بھی نہیں، جو حالات کے اعتبار سے بدلتے رہتے ہیں، اور وہ لوگ جو سیاست کو دین سے جدا رکھنے کی راگ الاپتے ہیں ان کے دین کا سارا دارو مدار سیاست پر ہے اور جیسا دیس ویسا بھیس کے مصداق ہے۔ لیکن اس کے برخلاف امت مسلمہ نے اپنے رسول اور آپ کے اصحاب سے اپنا مستند رابطہ برقرار رکھا، اگر سلف صالحین کا یہ کارنامہ نہ ہوتا تو شاید یہ امت بھی تاریخ کے اوراق میں دفن ہو چکی ہوتی۔

علامہ ابن حزم فرماتے ہیں کہ: مسلمانون کے یہاں شریعت کے نقل کے مختلف طریقے ہیں:

۱- **نقل متواتر**:- جو ہر خاص و عام کو معلوم ہوتا ہے جیسے قرآن کریم اور دین کے

ضروری مسائل۔

۲- **نقل مشہور**:- جو متواتر سے کم درجہ رکھتا ہے اور عام لوگوں پر مخفی ہوتا ہے البتہ سارے اہل علم اس کو جانتے ہیں جیسے معجزات نبوی، مناسک حج، زکوٰۃ کی مقدار وغیرہ۔

۳- **نقل آحاد**:- یعنی نقل ثقہ از ثقہ کا واسطہ یہاں تک کہ یہ سلسلہ رسول تک پہنچتا ہے، اس میں ایسے افراد ہوتے ہیں جن کا نام و نسب عدالت و ثقاہت، صفات ذاتیہ، زمان و مکان سب معلوم ہوتا ہے، حقیقت میں نقل کا یہ طریقہ بھی جماعت در جماعت منقول ہوتی ہے۔ چاہے وہ رسول تک ہو یا کسی صحابی تک یا تابعی تک ہو۔

یہ نقلِ شریعت کے ایسے طریقے ہیں جو صرف امت مسلمہ کے لئے خاص ہیں، ساری امتوں میں سے کسی کی یہ خصوصیت نہیں یہی وجہ ہے کہ ایک زمانہ گذر جانے کے باوجود آج بھی یہ شریعت بالکل تر و تازہ نظر آتی ہے۔

البتہ معضل، منقطع اور مرسل کا طریقہ نقل ایسا ہے جس کا قبول کرنا مختلف فیہ ہے جمہور اہل علم کے یہاں یہ طریقہ مقبول نہیں، جب کہ یہود و نصاریٰ کے یہاں یہ طریقہ سب سے معیاری طریقہ ہے، بلکہ بعض طریقے اس معیار کو بھی نہیں پہنچتے۔ (۱)

اقسام اسناد :-

حدیث رسول کی جو بنیادی قسم خبر متواتر اور خبر آحاد کی ہے، اس کا دار و مدار کثرت طرق اور قلت طرق پر ہے، اس سے معلوم ہوا کہ بنیادی طور سے سند کی بھی دو قسمیں ہیں: سند متواتر اور سند آحاد۔

سند متواتر:- اس سند کو کہیں گے جو غیر محصور طرق سے بلا حصر کے وارد ہو۔

سند آحاد:- اس سند کو کہیں گے جو محصور طرق سے وارِد ہو۔ اگر متعدد طرق ہو تو تین، دو یا ایک میں محصور ہو۔)

پھر ان سندوں کا اگر فرداً فرداً تقابلی جائزہ لیا جائے تو ہر ہر سند میں راویوں کی تعداد کی قلت و کثرت کے اعتبار سے اس کی دو قسمیں ہیں: عالی اور نازل۔

سند عالی:- اس سند کو کہتے ہیں جس میں راویوں کی تعداد دوسری سند کے مقابلہ

---

(۱) الباعث الحثیث شرح اختصار علوم الحدیث ص ۱۵۹-۱۶۰، بحوالہ "الملل والنحل ۲/۸۱-۸۴

میں (جس سے وہی روایت مروی ہو) کم ہو۔

سند نازل:- اس سند کو کہتے ہیں جس میں راویوں کی تعداد دوسری سند کے مقابلہ میں (جس سے وہی روایت مروی ہو) زیادہ ہو۔

اس میں سے ہر ایک کی دو دو قسمیں ہیں۔

علو مطلق، علو نسبی، نزول مطلق، نزول نسبی

علو مطلق:- کسی حدیث کی سند کے راویوں کا سلسلہ دوسری سند کے مقابلہ میں کم تعداد سے رسول تک پہنچے۔

علو نسبی:- کسی حدیث کی سند کے راویوں کا سلسلہ دوسری سند کے مقابلہ میں کم تعداد سے کسی امام تک پہنچے۔

نزول مطلق:- کسی حدیث کے راویوں کا سلسلہ دوسری سند کے مقابلہ میں زیادہ تعداد سے رسول تک پہنچے۔

نزول نسبی:- کسی حدیث کے راویوں کا سلسلہ دوسری سند کے مقابلہ میں زیادہ تعداد سے کسی امام تک پہنچے۔

(یعنی مطلق کا تعلق رسول سے ہوتا ہے اور نسبی کا تعلق مابعد رسول سے ہوتا ہے) نسبی کی چار قسمیں ہیں۔

موافقت:- کوئی راوی کسی مولف کتاب کے شیخ تک صاحب کتاب کی سند کے علاوہ کسی دوسری سند عالی سے پہنچ جائے۔

بدل:- کوئی راوی کسی مؤلف کتاب کے شیخ الشیخ تک (صاحب کتاب کی سند کے علاوہ دوسری سند عالی کے ذریعہ) پہنچے۔

مساوات:- کسی راوی کی سند مولفِ کتاب کے برابر ہو۔

مصافحہ:- کسی راوی کی سند کسی صاحب کتاب کے شاگرد کے سند کے برابر ہو۔[1]

سند عالی کا حکم:-

چونکہ سند عالی میں راویوں کی تعداد سند نازل کے مقابلہ میں کم ہوتی ہے اس

---

(۱) نزهة النظر شرح نخبة الفكر ص ۱۰۶-۱۰۹

لئے سند عالی میں غلطی کا امکان بھی کم رہتا ہے بنا بریں سند عالی نازل کے مقابلہ میں اعلیٰ اور بہتر ہوتی ہے بشرطیکہ دونوں شرطیں قوت میں برابر ہوں۔ لیکن اگر دونوں کی قوت میں فرق ہو تو جو سند صحیح یا زیادہ صحیح ہوتی ہے وہی بہتر ہوتی ہے، اگر سند ضعیف ہے تو علو سے کوئی فائدہ نہیں۔

علامہ ابن مبارک (متوفی ۱۸۱ھ) فرماتے ہیں کہ: "حدیث بعید الاسناد صحیح خیر من قریب الاسناد سقیم" (۱)

اسناد عالی کی طلب:-

سند عالی کو جو مقام حاصل ہے اس کی بنا پر محدثین اس کے حصول کیلئے انتہائی مشقت برداشت کر کے دور و دراز مقامات کا سفر کرتے تھے اور طلب علو کا بڑا اہتمام کرتے تھے بلکہ یہ سنت صحابہ کرام سے چلی آرہی ہے چنانچہ حضرت ابوایوب انصاری اور جابر بن عبداللہ کا واقعہ سفر، مجرد ایک حدیث کی معلومات کیلئے کافی مشہور ہے۔ (۲)

حضرت علقمہ اور اُسود کو حضرت عمرؓ کی طرف سے جب حدیث پہنچتی تھی تو وہ خود آ کر ان سے بلاواسطہ معلوم کرتے تھے۔ (۳)

امام اُحمد بن حنبل (متوفی ۲۴۱ھ) فرماتے ہیں کہ: اسناد عالی کی طلب سلف کی سنت ہے، اسلئے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود کے تلامذہ آپ سے حدیثیں سننے کے باوجود مدینہ منورہ کا سفر کرتے تھے، اور وہاں جا کر حضرت عمرؓ سے حدیثیں دوبارہ سنتے تھے۔ (۴)

نیز آپ نے فرمایا کہ: "طلب علو الاسناد من الدین" (۵)

ابوالعالیہ الریاحی (متوفی ۹۳ھ) فرماتے ہیں کہ: "کنا نسمع الروایة عن صحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و نحن بالبصرة فما نرضی حتی

---

(۱) الجرح والتعدیل ۲/۲۵

(۲) دیکھئے مسند الحمیدی رقم (۳۸٤) ۱/۱۸۹، وصحیح بخاری مع فتح الباری ۱/۱۷۳، الرحلة فی طلب الحدیث ص ۱۱۱-۱۲۱. خطیب بغدادی (متوفی ۴۶۳ھ) نے اس سلسلہ میں ایک کتاب "الرحلة فی طلب الحدیث" کے نام سے تحریر کی ہے، شیخ نورالدین عتر محقق کتاب نے مزید واقعات کا استدراک مصادر کے ساتھ کیا ہے، دیکھئے ۱۸۷-۱۹۵

(۳) علوم الحدیث لابن الصلاح (مقدمة ابن الصلاح) ص ۲۳۳

(۴) مناقب الامام احمد لابن الجوزی ۲۰۳ (۵) الرحلة فی طلب الحدیث ۸۹،

نرکب إلى المدينة فنسمعها من أفواههم"[1]

ہم اصحاب رسول سے بصرہ میں روایت سنتے تھے لیکن اس پر بس نہیں کرتے بلکہ مدینہ کا سفر کرنے خود ان کی زبان سے جا کر سنتے تھے۔

امام یحیٰ بن معین (متوفی ۲۳۳ھ) سے کسی نے مرض الموت میں یہ سوال کیا کہ اس وقت آپ کی کیا خواہش ہے؟ انہوں نے کہا کہ "بیت خال وإسناد عال"[2]

ان اقوال و واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اہل علم اسناد عالی کا بہت اہتمام کرتے تھے، لیکن چونکہ اسناد کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے لہٰذا اب اس کی اہمیت بھی نہیں رہ گئی اس کی ساری قسمیں مجرد علم کیلئے پڑھی جاتی ہیں۔

أصح الأسانيد:-

راویان حدیث میں قوت ثقاہت و عدالت کے اعتبار سے فرق ہوتا ہے بنا بریں بعض سندیں بعض کے مقابلہ میں قوی ہوتی ہیں۔ لہٰذا کچھ سندوں کو "أصح الأسانيد" کہا جاتا ہے چنانچہ:

امام بخاری کے نزدیک صحیح ترین سند: مالك، عن نافع، عن ابن عمر ہے۔

علی بن مدینی اور فلاس کے نزدیک: محمد بن سيرين، عن عبيدة، عن علي ہے۔

امام احمد اور اسحٰق راہویہ کے نزدیک: زهري، عن سالم، عن أبيه ہے۔

یحیٰ بن معین کے نزدیک: أعمش، عن إبراهيم، عن علقمة، عن ابن مسعود ہے

ابن ابی شیبہ کے نزدیک: زهري، عن علي بن حسين، عن أبيه، عن علي ہے۔

سلیمان بن داؤد کے نزدیک: يحيىٰ بن أبي كثير، عن أبي سلمة، عن أبي هريرة ہے۔

لیکن متأخرین نے کسی ایک سند پر اس طرح کا حکم لگانے کو غلط قرار دیا ہے۔ البتہ خاص خاص صحابہ کے اعتبار سے یہ حکم لگایا جا سکتا ہے۔[3]

علامہ احمد شاکرؒ فرماتے ہیں کہ تحقیق یہ ہے کہ کسی خاص سند پر مطلق "أصح

---

(۱) الكفاية في آداب الرواية ۴۰۳، الرحلة في طلب الحديث ص ۹۳، علوم الحديث ص ۲۳۳

(۲) علوم الحديث ص ۲۳۱

(۳) معرفة علوم الحديث ص ۵۳-۵۴ اختصار علوم الحديث لابن كثير ص ۲۲ نزهة النظر ص ۳۵

الأسانيد" کا حکم لگانا بہتر نہیں بلکہ یہ حکم نسبتاً لگائی جاسکتی ہے یعنی کسی صحابی یا شہر کے قید کے ساتھ مثلاً:

مکی سندوں میں : سفیان بن عیینة، عن عمرو بن دینار، عن جابر

یمنی سندوں میں : معمر، عن همام بن منبه، عن أبی هریرة

مصری سندوں میں: لیث بن سعد، عن یزید بن أبی حبیب، عن أبی الخیر، عن عقبة بن عامر

شامی سندوں میں: أوزاعی، عن جابر بن عطیة، عن علی

خاص خاص صحابہ کے اعتبار سے" أصح الاسانید" اس طرح سے ہے۔

أبو هریرةؓ:-

زهری، عن سعید بن المسیب، عن أبی هریرة

یحییٰ بن أبی کثیر، عن أبی سلمة، عن أبی هریرة

مالك، عن أبی الزناد، عن الأعرج، عن أبی هریرة

حماد بن زید، عن أیوب، عن محمد بن سیرین، عن أبی هریرة

إسماعیل بن أبی حکم، عن عبیدة بن سفیان حضرمی، عن أبی هریرة

ابن عمرؓ :-

مالك، عن نافع ،عن ابن عمر

زهری، عن سالم، عن أبیه ابن عمر

أیوب، عن نافع، عن ابن عمر

یحییٰ بن سعید القطان، عن عبیدالله بن عمر، عن نافع، عن ابن عمر

أنس بن مالک :-

مالك، عن الزهری، عن أنس

سفیان بن عیینة، عن الزهری، عن أنس

معمر، عن زهری، عن أنس

شعبة، عن قتادة، عن أنس

حماد بن زید، عن ثابت، عن أنس

هشام الدستوائی ، عن قتادة، عن أنس

عائشةؓ:-

هشام بن عروة، عن أبيه (عروۃ بن الزبیر) عن عائشة

زهری، عن عروة، عن عائشةؓ

عبدالرحمن بن القاسم، عن أبيه، عن عائشةؓ

یحییٰ بن سعید، عن عبید اللہ بن عمر، عن عائشةؓ

أفلح بن حميد، عن القاسم، عن عائشةؓ

سفيان الثوری، عن إبراهيم، عن الأسود، عن عائشةؓ

ابن عباسؓ:-

زهری، عن عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبة، عن ابن عباس

جابر بن عبداللہ:-

سفيان بن عيينة، عن عمرو بن دینار، عن جابر

ابن مسعودؓ:-

أعمش، عن إبراهيم، عن علقمة، عن ابن مسعود

سفيان ثوری، عن منصور، عن إبراهيم، عن علقمة، عن ابن مسعود.

علی بن أبی طالب:-

محمد بن سيرين، عن عبيدة السلمانی، عن علی

زهری، عن علی بن حسين، عن أبيه، عن علی [1]

أوهی الأسانيد:-

صحیح ترین سندوں کے مقابلہ میں کچھ سندیں ایسی ہیں جن کو "أوهی الأسانید" (بدترین سندیں) کہا جاتا ہے جو ضعیف ترین سندیں ہوتی ہیں۔

مکی سند:- عبید اللہ بن میمون القداح، عن شهاب بن خراش، عن إبراهيم بن يزيد الخوزی، عن عکرمة، عن ابن عباس.

یمنی سند:- حفص بن عمر العلنی، عن الحکم بن أبان، عن عکرمة، عن ابن عباس.

مصری سند:- احمد بن محمد بن حجاج بن رشدين بن سعد، عن أبيه، عن جده، عن قرة بن عبدالرحمن بن حَيوِل، عن کل من روی عنه.

---

(۱) الباعث الحثيث ص ۲۳-۲٤

شامی سند:- محمد بن قيس المصلوب، عن عبيد الله بن زجر، عن علي بن يزيد، عن القاسم، عن أبي أمامة.

أبوهريرة:- السري بن إسماعيل، عن داؤد بن يزيد الأودي، عن أبيه، عن أبي هريرة

عائشة:- حارث بن شبل، عن أم النعمان الكندية، عن عائشة

ابن مسعود:- شريك، عن أبي فزارة، عن أبي زيد، عن عبدالله

أنس بن مالک:-داؤد بن محبر بن قحذم، عن أبيه، عن أبان بن أبي عياش، عن أنس

ابن عمر:-محمد بن القاسم بن عبدالله بن عمر بن حفص، عن أبيه، عن جده

علی بن أبی طالب:-عمرو بن شمر، عن جابر الجعفي، عن الحارث الأعور، عن علي [۱]

لطائف اسناد:-

بعض سندوں میں کچھ ایسی صفات پائی جاتی ہیں جو پر لطف ہوتی ہیں، ایسی سندوں کو لطائف اسناد میں شمار کیا جاتا ہے۔ مثلاً:

مسلسل:-کسی روایت یا راویوں کی خاص صفت بیان کرنے پر ہر طبقہ کے راویوں میں اتفاق ہو۔ مثلاً کوئی راوی اس طرح سے کہے کہ: حدثني فلان و أخذ بلحيته، اور وہ عملاً اپنی داڑھی پکڑ لے۔ پھر اس کا شاگرد اسی طرح سے کرے......الخ

السابق واللاحق:-دو ساتھی کسی استاذ سے روایت کرنے میں مشترک ہوں اگر ان کی وفات میں کافی فاصلہ ہو تو پہلے وفات پانے والے کو سابق اور بعد میں وفات پانے والے کو لاحق کہا جاتا ہے۔ اور ایسی سند کو "السابق واللاحق" کہا جاتا ہے۔

أقران:-دو ساتھیوں میں سے کوئی ایک اپنے ساتھی سے روایت کرے، جبکہ دوسرا اس سے روایت نہ کرے۔

مدبج:-دو ساتھیوں میں سے ہر ایک اپنے دوسرے ساتھی سے روایت کرے۔

رواية الأكابر عن الأصاغر:- کسی راوی کا ایسے شخص سے روایت کرنا جو اس سے کم تر ہو۔ مثلاً باپ کا بیٹے سے، استاذ کا شاگرد سے روایت کرنا۔ [۲]

(۱) معرفة علوم الحديث ص ۵۶-۵۷ (۲) نزهة النظر ص ۱۱۰-۱۱۲

طبقہ

طبقہ کا لغوی معنی:-

طبقہ لفظ ''طبق'' سے ماخوذ ہے جس کا استعمال قرآن کریم میں (لتر کبن طبقا عن طبق) [انشقاق: ۱۹] میں کیا گیا ہے، اصحاب لغت نے طبقہ کو اسی مادہ میں ذکر کیا ہے اور اس کے معنی و مفہوم کی وضاحت کی ہے۔

چنانچہ علامہ جوہری عرض کرتے ہیں کہ: طبق من الناس: أی جماعة، والمطابقة: الموافقة، و طبقات الناس: مراتبهم. (۱)

یعنی طبقہ کا لغوی معنی ہے جماعت، اسی سے لفظ مطابقت ماخوذ ہے جس کا معنی ہے موافقت اور طبقات الناس کا مطلب ہے: لوگوں کے مراتب۔

علامہ ابن منظور فرماتے ہیں کہ: طبقہ اس جماعت کو کہتے ہیں جو ہم مثل ہو۔ (۲)

علامہ سیوطی فرماتے ہیں کہ: طبقہ مشابہ قوم کو کہا جاتا ہے۔ (۳)

طبقہ کا اطلاق مجازاً صدی پر بھی ہوتا ہے۔

طبقہ کی اصطلاحی تعریف:-

ہم عصر راوی عمر میں یا مشائخ میں ایک دوسرے سے مشترک ہونے میں برابر، یا تقریباً برابر ہوں۔ (۴) طبقہ کی یہ سب سے بہترین تعریف ہے۔

امام سیوطی نے طبقہ کی تعریف اس طرح کی ہے:

وہ حضرات جو عمر اور اسناد میں یا صرف اسناد میں تقریباً برابر ہوں۔ (۵)

تحدید زمنی:-

طبقہ کا استعمال محدثین کے یہاں مختلف اعتبار سے کیا گیا ہے اس کیلئے کوئی زمنی تحدید متعین نہیں اور نہ ہی کوئی ضابطہ ہے، مورخین و محدثین نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق اس کی تحدید کرلی ہے۔

علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ کچھ لوگوں نے ہر چالیس سال کی مدت کو ایک

---

(۱) الصحاح ۱۵۱۱/٤-۱۵۱۲
(۲) لسان العرب ۷۹/۱۲
(۳) تدریب الراوی ۳۸۱/۲
(٤) فتح المغیث ۳۹٤/٤
(۵) تدریب الراوی ۳۸۱/۲

طبقہ قرار دیا ہے، اور ایک ضعیف حدیث سے اس پر استدلال کیا ہے، جس کا لفظ یہ ہے۔

"طبقات أمتي خمس طبقات و كل طبقة منها أربعون سنة" (۱)

ابن عباس کی جانب یہ قول منسوب کیا جاتا ہے کہ: "الطبقة عشرون سنة" (۲)

اسلم بن سہل (متوفی ۲۹۲ھ) نے تاریخ واسط میں طبقہ کو صدی کے معنی میں استعمال کیا ہے، اور جملہ رواۃ کو اپنے دور تک چار قرن میں تقسیم کیا ہے، جبکہ طبقہ کا استعمال ان کے زمانے میں معروف تھا۔ (۳)

بعض حضرات مثلاً ابن حبان، نے اس لفظ کو قوم کے معنی میں استعمال کیا ہے، اس طرح سے انہوں نے راویوں کو چار طبقوں صحابہ، تابعین، تبع تابعین، تابع اتباع التابعین میں تقسیم کیا ہے۔ اسی طرح امام حاکم نیساپوری نے بھی تاریخ نیساپور میں کیا ہے۔ جبکہ امام ذہبی نے تاریخ اسلام میں دس سال کی مدت کو ایک طبقہ قرار دیا ہے۔ (۴)

حافظ ابن حبان، اور امام حاکم کے قول پر اللہ کے رسول ﷺ کی اس حدیث سے استدلال کیا جا سکتا ہے: "خير القرون قرني، ثم الذين يلونهم، ثم الذين يلونهم ثم يا تي قوم يشهدون ولا يستشهدون" (۵)

قرن ایسے زمانہ والوں پر استعمال ہوتا ہے جو کسی خاص مسئلہ میں مشترک ہوں، البتہ اس کے زمنی تحدید میں اختلاف ہے جو ۱۰ سے ۱۲۰ سال تک کا ہے۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ: عبداللہ بن بسر کی روایت میں ہے کہ قرن صدی کو کہتے ہیں اور یہی مشہور بھی ہے۔

ابن سیدہ کہتے ہیں کہ: چونکہ عام طور سے لوگوں کی عمر ستر سال تک کی ہوتی ہے۔ اس لئے قرن کی متوسط مقدار ستر سال تک کی ہے اور یہی معتدل قول ہے۔

ابن حجر فرماتے ہیں کہ: اس روایت میں قرن نبی سے مراد صحابہ کا قرن ہے، اگر اس کا شمار رسول کی وفات سے کیا جائے تو آخری صحابی کی وفات تک سو سال یا

---

(۱) الموضوعات الكبرىٰ ۱۹۶/۳، نیز دیکھئے سنن ابن ماجه كتاب الفتن ۱۳۴۹/۲ حدیث نمبر ۴۰۵۸-۴۰۵۹، (۲) لسان العرب ۷۹/۱۲

(۳) طبقات خليفة بن خياط مقدمه محقق ص ۴۲

(۴) طبقات خليفه ص ۴۲، بحوث فی تاريخ السنة ص ۱۸۲

(۵) صحيح بخاری فضائل اصحاب النبی ۱/۷ نمبر (۳۶۵۰-۳۶۵۱)

ستانوے سال یانوے سال ہوتا ہے۔

اور تابعین کا قرن اگر سو سے شمار کیا جائے تو ۱۷۰-۱۸۰ھ تک جاتا ہے۔ اور جو ان کے بعد ہیں ان کا دور تقریباً پچاس سال کا ہوتا ہے (یعنی جو ۲۲۰-۲۳۰ھ تک کا دور ہوتا ہے۔)

اس سے معلوم ہوا کہ قرن کی مقدار ہر زمانہ میں اہل زمانہ کی عمر کے اعتبار سے مختلف ہوتا رہتا ہے جب کہ اس بات پر اتفاق ہے کہ اتباع تابعین کا آخری دور ۲۲۰ھ تک کا ہے۔ (۱)

بعض روایتوں میں "ثم الذین یلونہم" (۲) تین بار مذکور ہے جس کی سند حسن ہے۔ اس سے تابع اتباع التابعین کا دور مراد ہوگا جو تقریباً تیسری صدی کے آخری چوتھائی تک پہنچتا ہے۔

راویوں کے طبقات:-

محدثین نے راویان حدیث کو مختلف طبقات میں تقسیم کیا ہے، لیکن اس تقسیم میں بھی کوئی اتفاق نہیں، کسی نے جملہ صحابہ کو ایک طبقہ، اسی طرح سے تابعین اور تبع تابعین اور تابع اُتباع التابعین میں سے ہر ایک کو ایک ایک طبقہ مان لیا ہے جو سب سے آسان تقسیم معلوم ہوتی ہے۔

کچھ حضرات نے صحابہ کو مختلف طبقات میں، اسی طرح سے تابعین و دیگر راویوں کو مختلف طبقات میں تقسیم کیا ہے۔

حافظ ابن حجرؒ نے جملہ صحابہ کرام کو باختلاف مراتب ایک طبقہ شمار کیا ہے۔ جبکہ تابعین کو پانچ اور تبع تابعین کو تین اور تبع تابعین کے شاگردوں کو تین طبقوں میں اس طرح تقسیم کیا ہے:

پہلا طبقہ:- صحابہ کرام باختلاف مراتب۔

دوسرا طبقہ:- کبار تابعین، جن میں مخضرین بھی شامل ہیں، مثلاً قیس بن ابی

---

(۱) فتح الباری شرح صحیح البخاری ۶/۷

(۲) اس روایت پر کلام چوتھے طبقہ میں آئے گا، دیکھئے ص ۱۲۸

حازم، سعید بن مسیب۔

تیسرا طبقہ:- تابعین کا متوسط طبقہ جیسے حسن بصری، ابن سیرین۔

چوتھا طبقہ:- تابعین کے متوسط طبقہ سے قریب تر طبقہ، جن کی زیادہ تر روایتیں کبار تابعین سے ہیں، جیسے زہری، قتادہ[یعنی تابعین کے متوسط اور طبقہ صغری کے درمیان کا طبقہ]

پانچواں طبقہ:- تابعین کا طبقہ صغریٰ جنہوں نے ایک دو صحابہ کو دیکھا، لیکن صحابہ سے سماع ثابت نہیں، جیسے اُعمش۔

چھٹا طبقہ:- تابعین کا وہ طبقہ جو طبقہ خامسہ کا ہمعصر تھا لیکن کسی صحابی کو نہیں دیکھا تھا: جیسے ابن جریج (یہ طبقہ حکما کبار اتباع تابعین کا طبقہ ہے جیسے مخضرین حکما کبار تابعین ہیں۔)

ساتواں طبقہ:- کبار اتباع تابعین جیسے امام مالک، سفیان ثوری وغیرہ۔

آٹھواں طبقہ:- اتباع تابعین کا طبقہ وسطی، جیسے سفیان بن عیینہ، ابن علیۃ۔

نواں طبقہ:- اتباع تابعین کا طبقہ صغری، جیسے یزید بن ہارون، امام شافعی، ابو داؤد الطیالسی۔

دسواں طبقہ:- وہ بڑے بڑے اہل علم جنہوں نے تبع تابعین سے روایت کیا ہے لیکن تابعین سے ملاقات نہیں ہوئی ہے، جیسے امام احمد بن حنبل[یعنی تابع اتباع التابعین کا پہلا طبقہ]

گیارھواں طبقہ:- تبع تابعین سے روایت کرنے والا طبقہ وسطی جیسے امام بخاری، امام ذہلی[تابع اتباع التابعین کا دوسرا طبقہ]

بارھواں طبقہ:- تبع تابعین سے روایت کرنے والا طبقہ صغری جیسے امام ترمذی، ان میں اصحاب کتب ستہ کے وہ مشایخ بھی شامل ہیں جن کی وفات متأخر ہے۔(۱)

کبھی کبھی ایک ہی راوی بعض مشابہت کی بنیاد پر مختلف طبقہ میں شامل ہو جاتا ہے۔(۲)

معرفت طبقات کے فائدے:-

طبقات کی معرفت سے چند اہم فائدے ہوتے ہیں مثلاً:

۱- مشتبہ ناموں میں غلط فہمی کا خطرہ کم ہو جاتا ہے مثلاً اگر دو راوی ایک ہی نام و کنیت کے ہیں لیکن طبقات الگ الگ ہیں، تو طبقات کی معرفت سے ان میں بآسانی تمیز کی جا سکتی ہے۔

---

(۱) تقریب التهذیب ص ۸۰ نسخه هندیه. (۲) فتح المغیث ٤/٣٩٤

۲- مدلس راوی نے اگر عنعنہ سے روایت کیا ہے تو اس کی گرفت طبقات کی معرفت سے بآسانی ہو سکتی ہے۔

۳- معنعن روایتوں میں عنعنہ کی حقیقت معلوم ہو جاتی ہے، اس لئے کہ اگر راوی ہم طبقہ ہے تو ایسی صورت میں عنعنہ اتصال کے معنی میں ہو سکتا ہے اور اگر ہم طبقہ نہیں تو اتصال کے معنی میں نہیں ہو سکتا۔ (۱)

۴- صحابہ، تابعین، تبع تابعین و دیگر راویوں میں تمیز کی جا سکتی ہے اور اس طرح سے ان کی فضیلت معلوم کی جا سکتی ہے۔

۵- حدیثِ مسند، مرسل اور منقطع میں اس کی معرفت سے فرق کیا جا سکتا ہے۔ (۲)

کتب طبقات:-

کتب طبقات ان کتابوں کو کہتے ہیں جن میں راویان حدیث کے نام و نسب اور حالات زندگی طبقہ در طبقہ ذکر کیا جاتا ہے، کچھ اہم کتب طبقات یہ ہیں: "الطبقات الکبری لابن سعد، الطبقات خلیفة بن خیاط" جن کا ذکر کتب جرح و تعدیل کے باب میں آئے گا۔ (۳)

پہلا طبقہ

صحابۂ کرامؓ (۱۲ ق ھ تا ۱۱۰ ھ)

صحابہ کرامؓ رسول پاک ﷺ کے وہ جاں نثار ساتھی اور وہ قدوسی نفوس ہیں جنہوں نے آپ کے پیغام کو سب سے پہلے قبول کیا، اس کیلئے ہر طرح کی ظلم و زیادتی، تکلیف و مشقت کو برداشت کیا، گھر بار، اہل و عیال، دوست و احباب، اعزاء و اقرباء سب کو اس کیلئے قربان کر دیا، اپنی زندگی کو اس دین کے حصول اور اس کی تبلیغ کیلئے وقف کر دیا، جوش توحید اور غیرت ایمانی رکھنے والی آپ کے اصحاب کی یہی وہ پہلی جماعت ہے جن کو راویان حدیث ہونے کا شرف اُول ملا، جو آپ کی سنت و سیرت کے چشم دید گواہ ہیں، کتاب و سنت پر عمل جن کی زندگی کا مقصد، امانت و صداقت اور راست گفتاری جن کا شیوہ تھا، اخوت و مساوات، ایثار و قربانی جن کا جذبہ تھا، ان کی صداقت و عدالت

---

(۱) مصدر سابق (۲) بحوث فی تاریخ السنة المشرفة ص ۷۴

(۳) دیکھئے صفحہ ۳۹۳

کی شہادت قرآن کریم نے دی ہے، یہی خیر امت کے اولین مخاطب ہیں، خیر القرون ہونے کا شرف بھی انہیں کو حاصل ہے، راویان حدیث کا پہلا دستہ ہونے کے ناطے ان کے بارے میں کچھ معلومات واصطلاحات کا جاننا ضروری ہے۔

صحابی کا لغوی معنی:-

صحابی: "صحبۃ" سے ماخوذ ہے جس کا مادہ (ص ح ب) ہے، جو سَمِعَ کے وزن پر ہے اس کا مصدر صحبة و صحابة ہے، جس کا معنی ہے ساتھ میں رہنا۔

اصحاب: "صحب" کی جمع ہے جس کا معنی ہے ساتھیوں کی جماعت اور "صحب" "صاحب" کی جمع ہے، اس طرح سے "صحابہ" بھی "صاحب" کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں ساتھی[1]

علامہ جوہری کہتے ہیں کہ صحابہ: اصحاب کی جمع ہے جو حقیقت میں مصدر ہے، اور اُصحاب کی جمع اصاحیب ہے۔[2]

اس طرح سے صحابی اور اصحابی دونوں ہم معنی ہیں۔

ابو بکر باقلانی فرماتے ہیں کہ صحابی، صحبت سے مشتق ہے، یہ اطلاق کسی مخصوص مقدار پر نہیں بلکہ ہر اس شخص پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جو کسی غیر کے ساتھ رہا ہے، چاہے یہ مدت کم ہو یا زیادہ، اسلئے صحابی کی صحبت کی مدت کم ہو یا زیادہ باعتبار لغت اس پر صحابی کا اطلاق ہوگا۔[3]

صحابی کا اصطلاحی معنی:-

صحابی کے اصطلاحی معنی میں اہل علم کے مختلف اقوال ہیں۔ امام بخاریؒ کہتے ہیں کہ: من صحب النبی صلی اللہ علیہ وسلم أو رآہ من المسلمین فھو من أصحابه۔[4]

مسلمانوں میں سے جو حضرات اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ رہے، یا آپ کو دیکھا، تو وہ آپ کے اصحاب ہیں۔

امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ ہر وہ شخص جو آپ کے ساتھ ایک سال،

---

(۱) لسان العرب لابن منظور ۱/ ۵۱۹ (۲) الصحاح للجوھری ۱/ ۱۶۱
(۳) الکفایة فی علم الروایة ص ۵۱
(۴) صحیح بخاری کتاب فضائل الصحابة ۷/ ۳ مع فتح الباری

ایک ماہ، ایک دن یا ایک گھنٹہ رہا ہو، یا آپ کو دیکھا ہو تو وہ صحابی ہے، اس کو صحبت کی فضیلت ساتھ رہنے کی مقدار کے حساب سے حاصل ہے۔(۱)

عام محدثین کے یہاں ہر وہ مسلمان جس نے اللہ کے رسول ﷺ کو دیکھا وہ صحابی ہے۔(۲)

ابو مظفر سمعانی فرماتے ہیں کہ اصحاب حدیث ہر اس شخص کو صحابی کہتے ہیں جو آپ سے کوئی حدیث روایت کرے، پھر اس میں وسعت دے کر ہر شخص کو جس نے رسولؐ کو دیکھا اس کو صحابی کہا ہے، حالانکہ بظاہر صحابی اسی شخص کو کہیں گے جس کی صحبت طویل اور مجلسیں کثیر ہوں۔(۳)

بعض حضرات نے صحبت کیلئے رویت کے ساتھ ساتھ ایک دو حدیثوں کی روایت کرنا شرط قرار دیا ہے۔(۴)

حضرت سعید بن میبؒ کی طرف ایک تعریف منسوب کی جاتی ہے جس کی نسبت ان کی طرف صحیح نہیں۔ اس میں یہ کہا گیا ہے کہ صحابی اس کو کہیں گے جس نے آپ کے ساتھ ایک یا دو سال قیام کیا ہو، یا ایک دو غزوہ کیا ہو۔(۵)

ان سب تعریفات میں حافظ ابن حجر کی تعریف سب سے زیادہ جامع اور مشہور ہے وہ یہ ہے:

ہر وہ شخص جس نے اللہ کے رسول ﷺ سے حالت ایمان میں ملاقات کی اور اسی پر اس کا انتقال ہوا ہو۔ (اگرچہ درمیان میں ردت ہی کیوں نہ ہو)(۶)

اس تعریف میں وہ سارے لوگ شامل ہو جاتے ہیں جنہوں نے آپ کو دیکھا، جنہوں نے آپ سے ملاقات کی، لیکن نابینا ہونے کی وجہ سے آپ کو دیکھا نہیں، آپ سے کوئی روایت کیا ہو یا نہ کیا ہو، آپ کے ساتھ غزوہ کیا ہو یا نہ کیا ہو، مجلس ملاقات مختصر ہو یا طویل۔(۷)

---

(۱) الکفایۃ فی علم الروایۃ ص ۵۱ — (۲) علوم الحدیث ص ۲۶۳

(۳) مصدر سابق — (٤) الباعث الحثیث ص ۲۰۳

(۵) علوم الحدیث ص ۲۶۳، التقیید والایضاح ص ۲۹۷

(٦) الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ ۷/۱، نزہۃ النظر ص ۹۹–۱۰۰

(۷) الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ ۷/۱

اس طرح اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو اسلام لانے کے بعد مرتد ہو گئے تھے لیکن پھر آپ کی حیات میں دوبارہ اسلام لے آئے جیسے عبداللہ بن ابی السرح۔

ایسے ہی وہ لوگ جو مرتد ہو گئے تھے پھر آپ کی وفات کے بعد دوبارہ اسلام میں داخل ہوئے تو صحیح قول کے مطابق صحابہ میں شامل ہوں گے، جیسے اشعث بن قیس، البتہ اس تعریف سے وہ لوگ خارج ہو جاتے ہیں جو اسلام لانے کے بعد مرتد ہو گئے اور حالت ارتداد میں ان کا انتقال ہوا، جیسے عبداللہ بن خطل، اور عبداللہ بن جحش، نیز وہ لوگ بھی خارج ہو جاتے ہیں جو آپ کے زمانہ میں اسلام لائے آپ کو دیکھا بھی لیکن وفات کے بعد دیکھا۔ (اس لئے کہ اس کو ملاقات نہیں کہا جا سکتا) جیسے ابوذویب الہذلی۔

ایسے ہی وہ لوگ جو آپ کے زمانہ میں تھے ایمان بھی لائے لیکن آپ کو دیکھ نہ سکے جیسے قیس بن ابی حازم اور دیگر مخضرمین۔

ایسے ہی وہ حضرات نکل جائیں گے جو اتنے کم سن تھے کہ سن تمیز کو نہیں پہنچ سکے اس لئے ان کی دیدار و ملاقات کا کوئی اعتبار نہیں۔

جنوں فرشتوں اور انبیاء کا حکم:-

جنوں میں سے جن حضرات نے آپ کو حالت ایمان میں دیکھا یا ملاقات کی ان کو بھی صحابی کہا جایا جائے گا، اس لئے کہ وہ لوگ بھی شریعت کے مکلّف و مخاطب ہیں۔ ان میں سے بہت سے حضرات نے مختلف اوقات میں آپ سے ملاقات کی ہے۔

جب ان کو صحابی کہا جا سکتا ہے تو صحبت کی جو فضیلت اور صحابہ کے جو فضائل ہیں وہ اس کے مستحق ہیں، حافظ ابن حجرؒ نے چند ایک کا تذکرہ **"الاصابة فی تمییز الصحابة"** میں کیا ہے۔

البتہ وہ فرشتے جنہوں نے آپ کو دیکھا اور آپ سے ملاقات کی ان کو صحابی نہیں کہا جا سکتا، اس لئے کہ وہ شریعت کے مکلّف و مخاطب نہیں۔

اس طرح سے وہ انبیاء کرامؑ جنہوں نے شب معراج یا بیت المقدس، یا آسمان میں آپ کو دیکھا اور ملاقات کی ان کو بھی صحابی نہیں کہا جا سکتا، اس لئے کہ یہ ملاقات

حالت تکلیف میں نہیں بلکہ عالم ارواح میں ہوئی جو محل تکلیف نہیں، اور ان لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کو اپنی زندگی میں نہیں بلکہ موت کے بعد دیکھا۔

البتہ عیسیٰ علیہ السلام جن کی وفات ابھی تک نہیں ہوئی ہے ان کو اللہ کے رسول نے آسمان اور زمین دونوں جگہوں پر دیکھا اور انہوں نے بھی دیکھا۔ ان کو صحابی کہا جاسکتا ہے کہ نہیں محل خلاف ہے۔

کچھ حضرات کا یہ کہنا ہے کہ صحبت کا اطلاق آپ پر درست نہیں اسلئے کہ یہ ملاقات محل تکلیف میں نہیں ہوئی۔

دیگر حضرات کا یہ کہنا ہے کہ چونکہ آپ کو زندہ اٹھالیا گیا ہے اور ابھی تک باحیات ہیں اللہ کے رسول ﷺ نے آپ کو بیت المقدس میں نماز پڑھتے دیکھا اور آپ کو انہوں نے دیکھا، اس لئے ان پر صحبت کا اطلاق ہو سکتا ہے، اور آپ جب دوبارہ دنیا میں نزول فرمائیں گے تو شریعت محمدی پر عمل پیرا ہوں گے اور دوسروں کو اسی پر عمل کرائیں گے، اس اعتبار سے آخری زمانہ میں جن کی ملاقات آپ سے ہوگی ان کو تابعی کہا جاسکتا ہے۔ ان کی فضیلت کا ذکر مختلف احادیث میں وارد ہے اس وقت کے شہداء کا ذکر خیر بھی موجود ہے، وہ حضرات اس دور کے نہایت ہی متقی اور پرہیزگار بندے ہوں گے۔ [1]

معرفت صحبت کے ذریعے :-

صحبت کے ثبوت کیلئے اہل علم نے کچھ طریقوں کا ذکر کیا ہے ان طریقوں میں سے کسی بھی طریقے سے صحابی کی صحبت کا پتہ چل سکتا ہے۔

۱- خبر متواتر کے ذریعے: یعنی وہ حضرات جن کا ذکر مختلف روایتوں میں ہو جو حد تواتر کو پہنچے جیسے خلفاء اربعہ کی صحبت۔

۲- خبر مشهور کے ذریعے: یعنی صحابی کا ذکر ایسی روایت میں ہو جو باعتبار سند مشہور ہو جیسے کہ عکاشہ میں محصن جن کا ذکر صحیح بخاری کی روایت میں "سبقك بها عكاشة" [2] میں ہے، یہ ان ستر ہزار افراد میں سے ایک ہیں جو بلا حساب و کتاب

---

(۱) التقييد والايضاح ص ۲۹۵-۲۹۶، الباعث الحثيث ص ۱۸۱

(۲) صحيح بخاری، کتاب الطب ۱۰/۱۵۵ حديث نمبر (۵۷۰۵) صحيح مسلم کتاب الايمان ۱/۱۹۷ حديث نمبر (۲۱۶)

جنت میں جائیں گے۔

۳- صحابی کا خبر دینا:- کسی ایسے صحابی کا جن کی صحبت ثابت شدہ ہو۔ کسی دوسرے کے بارے میں یہ اطلاع دینا کہ فلاں شخص صحابی ہے، جیسے حممہ بن حممہ دوسی جن کا انتقال اصبہان میں ہوا تو حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے ان کے بارے میں یہ شہادت دی کہ ان کی ملاقات اللہ کے رسول ﷺ سے ہے اور آپ کی باتوں کو انہوں نے سنا ہے۔

٤- تابعی کا خبر دینا:- کسی ایسے تابعی کا جو فی نفسہ ثقہ و عادل ہو کسی شخص کے بارے میں یہ خبر دینا کہ وہ صحابی ہے، یہ اس بنیاد پر کہ فرد واحد اگر کسی کا تزکیہ یا تعدیل کرتا ہے تو راجح قول کے مطابق وہ قابل قبول ہے۔

۵- ذاتی خبر:- کسی شخص کا اپنے بارے میں یہ خبر دینا کہ وہ صحابی ہے بشرطیکہ وہ ثقہ و عادل اور رسول ﷺ کا ہم عصر ہو۔

اگر ایسا نہ ہو بلکہ رتن لال ہندی کی طرح رسول کے انتقال کے چار سو سال بعد کوئی یہ دعویٰ کرے کہ وہ صحابی ہے تو صحبت ثابت نہیں ہوتی، اسلئے کہ یہاں دونوں شرط مفقود ہے، نہ ہی رسول کا ہم عصر ہے اور نہ عدالت و صداقت موجود ہے۔ [1]

طبقات صحابہؓ:-

صحابہ کرامؓ کے مختلف درجات ہیں، ان میں سے بعض کو بعض پر سبقت و فضیلت حاصل ہے، ان میں سے باتفاق مہاجرین و انصار، و باجماع اہل سنت و جماعت خلفاء اربعہ، اور عشرہ مبشرہ سب پر مقدم ہیں، خلفاء اربعہ میں حضرت ابو بکر صدیقؓ سب سے بہتر اور افضل ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے بعد اس امت کے افضل ترین فرد ہیں، ان کے بعد حضرت عمرؓ، پھر حضرت عثمانؓ اور پھر حضرت علیؓ کا ترتیب وار درجہ ہے، اہل سنت و جماعت کے بعض حضرات (کوفہ والوں میں سے) نے حضرت علیؓ کو حضرت عثمانؓ پر مقدم کیا ہے جو درست نہیں۔

عشرہ مبشرہ کے بعد اصحاب بدر، پھر اصحاب اُحد، ان کے بعد اصحاب بیعت

---

(۱) علوم الحدیث ص ٢٦٤، الاصابة فی تمییز الصحابة ۱/۷

رضوان بالترتیب ایک دوسرے پر فضیلت رکھتے ہیں۔[1]

پھر رسول اللہ ﷺ کی صحبت کی مقدار اور آپ کے ساتھ رہنے، دیکھنے اور روایت کرنے کی مقدار کے اعتبار سے ایک دوسرے پر فضیلت حاصل ہے۔[2]

البتہ طبقات صحابہ کی ترتیب میں بہت سارے اہل علم نے تفاوت مراتب کی طرف توجہ نہ دیتے ہوئے مجرد صحبت کا اعتبار کیا ہے اور سارے صحابہ کو ایک طبقہ میں شمار کیا ہے، جیسا کہ علامہ ابن حبان نے "**الثقات**" میں اور حافظ ابن حجرؒ نے "**تقریب التھذیب**" میں کیا ہے۔ اس طرح کی تقسیم کیلئے "**خیر القرون قرنی، ثم الذین یلونھم، ثم الذین یلونھم، فذکر بعدہ قرنین أو ثلاثا**"[3] سے استدلال کیا ہے۔

جب کہ بعض دیگر اہل علم نے صحبت کے علاوہ دیگر خصوصیات مثلاً سبقت اسلام، ہجرت، شرکت غزوات کا اعتبار کرتے ہوئے ان کو مختلف طبقات میں تقسیم کیا ہے، چنانچہ ابن سعدؒ نے پانچ طبقوں اور امام حاکمؒ نے بارہ طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ یہ ہر ایک کا اپنا اپنا نقطہ نظر ہے۔[4]

امام حاکمؒ کی تقسیم سب سے زیادہ مفصل ہے اسلئے اس کا ذکر یہاں پر کیا جارہا ہے۔

پہلا طبقہ:- ان صحابہ کرامؓ کا ہے جو مکہ کے ابتدائی دور میں اسلام لائے، جیسے خلفاء اربعہؓ۔

دوسرا طبقہ:- أصحاب دار الندوۃ یعنی وہ حضرات جو حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے بعد مکہ والوں کی مجلس شوریٰ (دار الندوۃ) میں ایمان لائے۔

جس کا واقعہ یہ ہے کہ جب حضرت عمر ایمان لے آئے تو انھوں نے اللہ کے رسول کو اپنے ساتھ لیا اور دار الندوۃ میں جاکر اپنے ایمان کا اعلان کیا اور وہاں کے لوگوں کو دعوتِ ایمان دی۔ جس کو ایک جماعت نے قبول کرلیا۔[5]

تیسرا طبقہ:- حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والے صحابہ کرامؓ۔

---

(۱) الباعث الحثیث ص ۱۸۲-۱۸٤ (۲) نزھة النظر ۱۰۱

(۳) یہ روایت پہلے گذر چکی ہے دیکھئے صفحہ: ۴۷ (۴) فتح الباری شرح صحیح البخاری ٤/۳۹٥

(۵) کچھ اہل علم نے یہ فرمایا ہے کہ: اہل مکہ نے رسول کے خلاف جو مشورہ طے کیا تھا اس سے پہلے ایمان لانے والے "أصحاب دار الندوۃ" ہیں، دیکھئے: الباعث الحثیث ص ۱۸۴۔ حالانکہ امام حاکمؒ نے حضرت عمرؓ کے ایمان لانے اور دعوت دینے والوں کو اصحاب دار الندوۃ کہا ہے۔

چوتھا طبقہ:- پہلی بیعت عقبی میں شرکت کرنے والی جماعت اصحابؓ۔

پانچواں طبقہ:- دوسری بیعت عقبی میں شرکت کرنے والی جماعت اصحابؓ۔

چھٹا طبقہ:- مہاجرین مدینہ کا وہ قافلہ جو رسول ﷺ کے مدینہ میں داخل ہونے سے پہلے مقام قباء میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

ساتواں طبقہ:- غزوہ بدر میں شرکت کرنے والے اصحابؓ۔

آٹھواں طبقہ:- غزوہ بدر (رمضان ۲ھ) اور صلح حدیبیہ (ذی القعدہ ۶ھ) کے درمیان ہجرت کرنے والے صحابہ کرامؓ۔

نواں طبقہ:- بیعت رضوان میں شرکت کرنے والے اصحابؓ۔

صلح حدیبیہ (ذی القعدہ ۶ھ) کے موقع پر (صلح کی بات جاری ہونے سے پہلے) شہادت عثمانؓ کی افواہ پھیلی، ان کے خون کا بدلہ لینے کیلئے یہاں پر اپنی جاں قربان کرنے کی بیعت لی گئی تھی، جس پر اللہ تعالیٰ نے رضامندی کی بشارت کا اعلان کیا تھا اور ﴿لَقَدْ رَضِيَ اللهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْيُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ﴾[سورۃ فتح:۱۸] والی آیت نازل فرمائی تھی۔ اسی بیعت کو بیعت رضوان کہا جاتا ہے۔ جس میں تقریباً پندرہ سو صحابہ کرامؓ شریک تھے۔

دسواں طبقہ:- صلح حدیبیہ (ذی القعدہ ۶ھ) اور فتح مکہ (رمضان ۸ھ) کے درمیان مدینہ کی طرف ہجرت کرنے والے اصحابؓ۔

گیارھواں طبقہ:- وہ حضرات جنہوں نے فتح مکہ (رمضان ۸ھ) کے دن اسلام قبول کیا جس میں قریش اور اہل مکہ کے بیشتر باشندے تھے۔

بارھواں طبقہ:- وہ لوگ جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کو فتح مکہ یا حجۃ الوداع کے موقع پر یا اپنے بچپن میں سن شعور میں دیکھا تھا۔[جن کا شمار صحابہؓ میں ہوتا ہے] (۱)

عدالت صحابہ:-

عدالت کا مفہوم:- محدثین کے یہاں فن جرح و تعدیل میں عدالت کا کیا مفہوم ہے۔ اس کے کیا شرائط ہیں ان کا ذکر قواعد جرح و تعدیل کے باب میں آئے گا۔ (۲)

---

(۱) معرفة علوم الحديث ۲۲-۲٤ (۲) دیکھئے صفحہ:۱٦۰

یہاں لفظ عدالت کا استعمال اور صحابہؓ سے متعلق کون سا مفہوم مراد ہے اس کی وضاحت مقصود ہے۔

علامہ عبدالوہاب عبداللطیف نے "تدریب الراوی" کے حاشیہ میں اس موضوع کا ذکر کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ: عدالت مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے۔

۱- حقوق و معاملات میں انصاف پسندی کے معنی میں (بمقابل ظلم و جور)

۲- تقویٰ کے معنی میں (بمقابل فسق و فجور)

۳- عصمت (محفوظ رہنا) کے معنی میں۔ یعنی وہ قدرتی ملکہ جو نافرمانی سے محفوظ رکھے جیسے عصمت انبیاء۔

۴- گناہوں اور غلطیوں سے محفوظ رہنا۔ (اللہ کی مہربانی کی وجہ سے) جیسے اولیاء اللہ کا محفوظ رہنا۔

۵- اجتہاد میں غلطی سے محفوظ رہنا، جیسا کہ امام مہدی کے بارے میں منقول ہے۔

۶- روایت حدیث کرنے میں عمداً جھوٹ بولنے یا ایسی حرکت سے پرہیز کرنا جو راوی کو ساقط الاعتبار کر دیتی ہے۔

یہاں پر عدالت صحابہؓ کا یہی مفہوم مراد ہے۔

یعنی صحابہؓ کرام سے ایسی غلطی نہیں سرزد ہو سکتی ہے، جس پر تعمد کذب کا اطلاق ہو، اور نہ روایت میں ایسی غلطی کا ارتکاب ہو سکتا ہے جو انہیں ساقط الاعتبار کر دے، اگر بشری تقاضہ کی وجہ سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو وہ ایسی غلطی نہیں ہوتی جو روایت کے قبول کرنے میں اثر انداز ہو۔

علامہ انباری کہتے ہیں کہ عدالت صحابہؓ کا یہ مطلب ہے کہ ان کی روایت مطلق قابل قبول ہے، ان میں اسباب عدالت کی جستجو، طلب تزکیہ کے بحث و مباحث وغیرہ تکلفات کی ضرورت نہیں، الا یہ کہ کوئی ایسی غلطی ثابت ہو جائے جو روایت کے لئے قادح ہو، لیکن ایسی کوئی چیز ثابت نہیں۔

علامہ الوسی کا کہنا ہے کہ ان میں سے اگر کسی سے غلطی ہوئی بھی تو وہ اس پر

بر قرار نہیں رہے بلکہ نور نبوت کی برکت سے فوراً توبہ کر لیا اور اسی پر انتقال ہوا، جو ایک لازمی چیز ہے، اس لئے کہ صحبت ان کیلئے ایسی اکسیر اعظم ہے جس کی وجہ سے غلطی پر بر قرار نہیں رہ سکتے، مزید فرماتے ہیں کہ: "ویتضح بذلك أن المراد بالعدالة الثابتة لجميع الصحابة عند المحدثين هي تجنب تعمد الكذب في الرواية والانحراف فيها بارتكاب مايوجب عدم قبولها، فان الذنب علي فرض و قوعه لا يمنع من قبولها فهم عدول علي العموم." (۱)

یعنی یہیں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ عدالت جو سارے صحابہؓ کیلئے ثابت شدہ ہے اس کا مطلب محدثین کے یہاں یہ ہے کہ روایت حدیث میں عمداً دروغ گوئی کرنا اس میں ایسی کج روی اختیار کرنے سے دور رہنا جس کے ارتکاب سے روایت کا عدم قبول لازم آتا ہے۔ اگر غلطی کے سرزد ہونے کو فرض بھی کر لیا جائے تو بھی روایت کے قبول کرنے کیلئے وہ مانع نہیں، لہٰذا سارے صحابہؓ کرام عمومی طور پر عادل ہیں۔

جملہ صحابہؓ کرام عادل و ثقہ ہیں:-

جملہ صحابہؓ کرام کی عدالت ایک مسلمہ حقیقت ہے، خواہ وہ فتنہ سے پہلے کے ہوں یا اس کے بعد کے خواہ اس میں شریک رہے ہوں یا اس سے الگ تھلگ رہے ہوں، ان میں سے کسی کی عدالت و صداقت پر سوال کی گنجائش باقی نہیں ہے، ان کی صداقت کی شہادت، ان کی فضیلت، جنت میں داخلہ کی بشارت اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے دی ہے۔

یہی وہ صحابہؓ کرام ہیں جو ﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾[سورہ بقرہ:۱۱۰] کے پہلے مخاطب، امت وسط کے اولین مصداق ہیں، اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن کریم میں اور رسول پاک ﷺ نے احادیث صحیحہ میں ان حضرات کی تعریف جملۃً و تفصیلاً کیا ہے، ان سے رضامندی اور خوشنودی کا اظہار کیا ہے، اللہ اور اس کے رسول کا خبر دینا اور شہادت دینا ناقابل تنسیخ ہے، اس لئے کہ نسخ احکام میں ہوتا ہے خبروں میں نہیں ہوتا۔

---

(۱) تدریب الراوی ۲/۲۱۵-۲۱۶

ان کے درمیان بعض معاملات میں جو اختلافات ہوئے یہ انسانی فطرت اور اجتہادی غلطی کا نتیجہ تھا جس سے ان کی صداقت اور عدالت پر کوئی فرق نہیں پڑتا، جن لوگوں نے صحابہؓ کرام کی شان میں کسی قسم کی گستاخی کی ہے یا کسی بھی طرح سے ان کو بے اعتبار سمجھا ہے خواہ وہ فقاہت اور عدم فقاہت ہی کا معاملہ کیوں نہ ہو، وہ توہین عدالت نبوی کے مجرم ہیں۔

اور جنہوں نے اپنی خاص فکر و مقصد کی تائید کیلئے ان پر رکیک حملے کئے، ان پر سب وشتم روا رکھا، ان کی عزت واحترام میں کوتاہی کی، کتاب وسنت اور جملہ اہل علم نے اس کو مسترد کر دیا ہے، اور جن لوگوں نے ما قبل فتنہ اور مابعد فتنہ میں تمیز کیا ہے، یا یہ کہ حضرت علیؓ کے خلاف لڑائی کرنے اور نہ کرنے کی تمیز کی ہے وہ محض ان کے عقل کی پیداوار ہے جس پر کوئی دلیل نہیں لہٰذا وہ باطل ہے۔

عدالت صحابہ پر ہر قسم کے دلائل کی بھرمار ہے ان میں کچھ کا ذکر یہاں پر کیا جارہا ہے:

قرآنی دلائل:-

﴿لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِيْنَ الَّذِيْنَ أُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلاً مِّنَ اللهِ وَ رِضْوَاناً، وَيَنْصُرُوْنَ اللهَ وَرَسُوْلَهُ أُوْلَـئِكَ هُمُ الصَّادِقُوْنَ﴾[الحشر:۸]

وہ مسکین مہاجرین جن کو ان کی جائداد اور وطن سے بے دخل کر دیا گیا، وہ اللہ کا فضل اور اس کی خوشنودی کے طالب گار ہیں، اور اللہ اور اس کے رسول کے مددگار ہیں یہی سچے حضرات ہیں۔

﴿وَالسَّابِقُوْنَ الْأَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِإِحْسَانٍ رَّضِيَ اللهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ، وَأَعَدَّلَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِيْنَ فِيْهَا أَبَدًا، ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ﴾ [توبہ:۱۰۰]

پہلے پہل ایمان کی طرف سبقت کرنے والے مہاجرین وانصار اور جنہوں نے ان کی اتباع اچھی طرح سے کیا، یہ اللہ سے راضی ہوگئے اور اللہ ان سے راضی ہو گیا، اور ان کے لئے ایسے باغات تیار کروایا جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں، یہ ہمیشہ اس میں رہیں گے اور یہ تو بہت بڑی کامیابی ہے۔

﴿وَالَّذِيْنَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، وَالَّذِيْنَ آوَوْا، وَّنَصَرُوْآ أُوْلٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَّهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ﴾ [انفال:۷۴]

اور جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کیا اور اللہ کے راستہ میں جہاد کیا اور وہ جنہوں نے پناہ دیا اور مدد پہنچائی حقیقت میں یہی مومن ہیں، ان کیلئے بخشش اور عزت کی روزی ہے۔

﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَأَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَ أَثَابَهُمْ فَتْحاً قَرِيْباً﴾ [سورہ فتح:۱۸]

یقیناً اللہ تعالیٰ مومنوں سے راضی ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے آپ سے بیعت کر رہے تھے، ان کے دلوں میں جو تھا اس کو جان لیا اور ان پر اطمینان نازل فرمایا اور انہیں فتح قریب عطا فرمائی۔

﴿لَا يَسْتَوِي مِنْكُم مَّنْ أَنْفَقَ مِن قَبْلِ الْفَتْحِ وَ قَاتَلَ، أُوْلٰٓئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ انْفَقُوْا مِن بَعْدُ وَقَاتَلُوْا، وَكُلًّا وَّعَدَاللّٰهُ الْحُسْنٰى وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ﴾ [سورہ حدید:۱۰]

جن حضرات نے فتح مکہ سے پہلے اللہ کے راستے میں خرچ کیا اور جہاد کیا ان کا درجہ ان کے مقابلہ میں زیادہ ہے، جنہوں نے فتح مکہ کے بعد اللہ کے راستہ میں خرچ کیا اور جہاد کیا، اور اللہ کا ہر ایک سے بھلائی کا وعدہ ہے، اور اللہ تعالیٰ جو تم کرتے ہو اس کو بہت اچھی طرح سے جانتا ہے۔ اور دوسری جگہ فرمایا کہ:

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُم مِّنَّا الْحُسْنٰٓى أُوْلٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ، لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا وَهُمْ فِي مَا اشْتَهَتْ أَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ﴾ [انبیاء:۱۰۱-۱۰۲]

وہ لوگ جن کیلئے ہماری طرف سے بھلائی کا وعدہ پہلے کر لیا گیا وہ جہنم سے دور رہنے والے ہیں وہ تو دوزخ کی آہٹ بھی نہ سن سکیں گے، وہ لوگ اپنی من پسند چیزوں میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

﴿لَقَد تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهَاجِرِيْنَ وَالْأَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِي سَاعَةِ الْعُسْرَةِ﴾ [سورہ توبہ:۱۱۷]

یقیناً اللہ تعالیٰ نبی، مہاجرین اور انصار اور وہ لوگ جنہوں نے آپ کی تنگ دستی کے عالم میں اتباع کی ان کے توبہ کو قبول فرمالیا۔

یہ غزوہ تبوک ۹ ھ کا واقعہ ہے جو آپ کا آخری غزوہ تھا جس میں صحابہؓ کی بہت بڑی تعداد شریک تھی، کچھ معذور، منافقین اور چند افراد جو سستی کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے تھے ان کے علاوہ سب شریک تھے۔ حضرت کعب بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ: ”والمسلمون مع رسول الله صلى الله عليه وسلم كثير لا يجمعهم كتاب حافظ يريد الديوان“ (۱)

اس غزوہ میں صحابہ کی تعداد بہت زیادہ تھی کسی رجسٹر میں ان کا نام مذکور نہیں تھا۔

﴿يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ آمَنُوا مَعَهُ نُورُهُمْ يَسْعَىٰ بَيْنَ أَيْدِيْهِمْ وَ بِأَيْمَانِهِمْ، يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ أَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْلَنَا إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ [تحریم:۸]

جس دن اللہ تعالیٰ نبی اور ان کے ساتھ ایمان والوں کو رسوانہ کرے گا، ان کا نور ان کے سامنے اور دائیں دوڑ رہا ہوگا، یہ فرماتے رہیں گے اے ہمارے رب ہمارے نور کو کامل فرما اور ہمیں بخش دے یقیناً تو ہر ایک چیز پر قادر ہے۔

اس طرح کی بے شمار آیتیں ہیں جو صحابہ کی فضیلت ان کی صداقت اور دیانتداری پر دلالت کرتی ہیں، ظاہر بات ہے یہ فضیلت اور مغفرت، جنت کی بشارت، رضامندی کا اظہار ایسے لوگوں کو نہیں مل سکتی جو غیر معتمد، خائن اور کذاب ہوں۔

احادیث رسول ﷺ:-

سنت رسول میں صحابہ کرامؓ کی بڑی مفصل فضیلت وارد ہوئی ہے جس کا ذکر محدثین نے اپنی کتابوں میں ضمنا اور اصالۃ کتاب الفضائل میں کیا ہے، شخصی فضائل کے علاوہ عمومی فضائل بھی ثابت شدہ ہیں۔ چنانچہ آپ نے فرمایا کہ:

لاتسبوا أحدامن أصحابي فإن أحدكم لوانفق مثل أحد ذهبا ما أدرك مد أحدهم ولا نصيفه (۲)

---

(۱) صحيح بخاری، كتاب المغازی باب قصة كعب بن مالك ۱۱۳/۸، حديث نمبر (۴۴۱۸)

(۲) صحيح بخاری، فضائل أصحاب النبی ﷺ ۲۱/۷، حديث نمبر (۳۶۷۳)، و صحيح مسلم. كتاب فضائل الصحابة ۱۹۶۷/۴، حديث نمبر (۲۵۴۱)

میرے صحابہؓ میں سے کسی کو بھی برا نہیں کہنا، اگر تم میں کا کوئی شخص اُحد پہاڑ کے برابر بھی سونا خرچ کر دے تو ان کے ایک مد اور ادھا مد کے خرچ کی فضیلت کو نہیں پہنچ سکتا۔

نیز آپ نے فرمایا کہ: "أصحابي أمنة لأمتي" [1] میرے صحابہ میری امت کیلئے امان ہیں جب یہ نہیں رہیں گے تو دین میں فتنہ وفساد ہوگا۔

نیز حجۃ الوداع کے موقع پر آپ نے جملہ حاضرین صحابہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ: "ألا فليبلغ الشاهد منكم الغائب" [2]

ہوشیار! ان لوگوں کو چاہئے جو یہاں موجود ہیں کہ غیر موجود لوگوں تک ہماری باتیں پہنچادیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی باتوں کے پہنچانے کا حکم ان لوگوں کو دیا تھا جو قابل اعتماد، ثقہ اور صادق نہیں تھے؟ ہرگز نہیں اگر ایسا ہوتا تو ان کو تبلیغ کی یہ ذمہ داری نہیں دی جاتی، آپ کا ان کو یہ ذمہ داری دینا ان کی ثقاہت، صداقت، دیانت داری کی تصدیق اور اس پر شہادت ہے۔ (فاعتبروا يا أولي الأبصار)

اجماع امت:-

اہل علم کے اقوال جو صحابہؓ کی فضیلت کے سلسلہ میں وارد ہیں وہ شمار سے برتر ہیں۔ حافظ ابن عبدالبر (متوفی ۴۶۳ھ) فرماتے ہیں کہ: "أجمع أهل الحق من المسلمين على أن الصحابة كلهم عدول" [3] مسلمانوں میں سے جملہ اہل حق کا اس بات پر اجماع ہے کہ سارے صحابہ کرامؓ عادل ہیں۔

خطیب بغدادیؒ (متوفی ۴۶۳ھ) فرماتے ہیں کہ: کتاب وسنت کے واضح دلائل کی روشنی میں صحابہؓ کی عدالت وپاکیزگی کا قطعی پتہ چل جاتا ہے، اللہ اور اسکے رسول کی تعدیل کے بعد کسی کے تعدیل کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ آگے فرمایا ہے کہ: "هذا

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة ۱۹۶۱/٤، حدیث نمبر (۲۵۳۱)

(۲) صحیح بخاری. کتاب العلم ۱۹۹/۱، حدیث نمبر (۱۰۵)، صحیح مسلم، کتاب الحج ۹۸۸/۲، حدیث نمبر (۱۳۵٤)

(۳) الاستيعاب فى معرفة الأصحاب ۹/۱ مع الاصابة، التقييد والايضاح ص ۳۰۲

مذهب كافة العلماء و من يعتد بقوله من الفقهاء"[1] یہی سارے علماء اور ان فقہاء کا مذہب ہے جن کے قول کا اعتبار کیا جاتا ہے۔

امام نووی (متوفی ٦٧٦ھ) فرماتے ہیں کہ: سارے صحابہ رضی اللہ عنہم عادل ہیں آپسی لڑائیوں وغیرہ میں اجتہاد کیا تھا، اس اجتہادی غلطی سے ان میں سے کوئی بھی عدالت سے خارج نہیں ہوتا، اس لئے کہ انہوں نے اجتہاد کیا، مجتہدانہ مسائل میں اختلاف ناگزیر ہے لہٰذا جیسے مجتہدین میں اختلاف ہوتا ہے ان میں بھی اختلاف ہوا۔ آگے فرماتے ہیں: "ولهذا اتفق أهل الحق و من يعتد به في الاجماع على قبول شهاداتهم و مروياتهم و كمال عدالتهم رضى الله عنهم أجمعين"[2]

اسی وجہ سے اہل حق اور جن کے اجماع کا اعتبار ہے ان کا ان کی قبول شہادت و روایت اور کمال عدالت پر اتفاق ہے۔

علامہ ابن الصلاح (متوفی ٦٤٣ھ) فرماتے ہیں: "ثم إن الأمة مجتمعة على تعديل جميع الصحابة، ومن لا بس الفتن منهم...... الخ"[3] امت کا سارے صحابہؓ کی عدالت پر اجماع ہے چاہے وہ فتنے میں شریک رہے ہوں یا نہ رہے ہوں۔

قیاس:-

صحابہ کرامؓ کی صداقت و عدالت کو قیاس بھی چاہتا ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے جس دین کو ابدی اور دائمی بنایا، اور جس نبی کو آخری نبی بنایا، اور تا قیامت جس کے بقاء کی ذمہ داری لی ہے، کیا اس دین کا پہلا دستہ جن پر اس کی معرفت کا دارو مدار ہے وہ غیر معتمد ہو سکتا ہے، آپ کا اسوہ دیکھنے والے، آپ کی سنت و سیرت کے چشم دید گواہ، آپ کے اشارہ و کنایہ کو سمجھنے والے یہی حضرات ہیں، دین کی فہم و فراست کا سارا دار و مدار انہیں لوگوں پر ہے، پھر اگر یہی لوگ غیر معتمد ٹھہرے تو دین کے بقا کی کیا ضمانت رہ گئی؟

امام حرمین فرماتے ہیں کہ: یہی حضرات حقیقت میں شریعت کے حامل ہیں،

---

(١) الكفاية فى علم الرواية ص ٤٩
(٢) شرح صحيح مسلم ١٤٩/١٥، كتاب فضائل الصحابة نسخه بيروت
(٣) علوم الحديث ص ٢٦٥

اگر ان کی روایت میں توقف کیا جائے تو یہ شریعت رسول کے زمانہ تک منحصر ہو کر رہ جائے گی۔[۱]

لہٰذا کتاب و سنت، اجماع امت اور قیاس سے یہ ثابت ہو گیا کہ سارے صحابہ کرامؓ عادل اور صادق ہیں، اب اگر ان تمام تفصیلات ودلائل کے بعد کسی کو اس میں شک وشبہ باقی رہے تو اس پر امام ابوزرعہ رازی (متوفی ۲۶۵ھ) کا قول صادق آتا ہے کہ:

"إذا رأيت الرجل ينقص أحدا من الصحابة فأعلم أنه زنديق"[۲]

جب تم کسی آدمی کو دیکھو جو صحابہ کی تنقیص کر رہا ہے تو سمجھ لو کہ وہ بے دین ہے۔

صحابہؓ کا حصول علم اور اعتماد باہمی:-

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین رسول ﷺ کی باتوں اور آپ کی سنت و سیرت کو معلوم کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے، مختلف محلوں اور دور دراز علاقوں سے آکر آپ کی مجلس میں شریک ہونا باعث فخر سمجھتے تھے، ان میں ایک جماعت ایسی تھی جس کا کام صرف رسول کی باتوں کو معلوم کرنا اور محفوظ رکھنا تھا، یہ صفہ کے وہ حضرات تھے جنہوں نے اپنی زندگی کو دین کی خدمت کیلئے وقف کر رکھا تھا، اگر کوئی کسی وجہ سے مجلس میں حاضر نہیں ہو سکتا تو کسی دوسرے کو اس کا ذمہ دار بنا دیتا، جیسا کہ حضرت عمرؓ اور ان کے پڑوسی کے درمیان دربار رسالت میں حاضری کی باری لگی تھی، جو ایک دوسرے کو معلومات پہنچاتے تھے۔[۳]

اس طرح سے وہ اللہ کے رسول کی باتوں کو یا تو بہ نفس نفیس سنتے تھے یا اپنے کسی ساتھی کے واسطے سے سنتے جن پر ان کا مکمل اعتماد تھا۔

نور نبوت سے منور ہونے والے ان حضرات کا ماحول و معاشرہ اہل صدق و صفا، امانت و دیانت داری کا معاشرہ تھا، کذب بیانی دھوکہ دہی سے پاک تھا، اس لئے ایک دوسرے پر اعتماد کرنا بدیہی امر تھا۔

حضرت حذیفہ بن یمانؓ فرماتے ہیں کہ: لقد أتي علي زمان ما أبالي أيكم

---

(۱) تدریب الراوی ۲/۲۱۴

(۲) الكفاية في علم الرواية ص ۴۹، الاصابة في تمييز الصحابة ۱/۱۰

(۳) صحیح بخاری کتاب العلم، باب التناوب في العلم ۱/۱۸۵ نمبر (۸۹)

بايعت، لئن كان مسلما ليردنه علي دينه [1]

ایک زمانہ ایسا گذرا ہے کہ مجھ کو کوئی فکر نہیں ہوتی تھی کہ میں کس سے بیع و شراء کر رہا ہوں اگر کوئی مسلمان ہوتا تو اس کی دین داری، امانت کو واپس کرادیتی اور اگر غیر مسلم ہوتا تو حاکم وقت واپس کرادیتا۔

جب عام معاملات، خرید و فروخت میں اعتماد کا یہ عالم تھا تو ظاہر بات ہے کہ دین کے معاملے میں اعتماد کرنا بدرجہ اولیٰ موجود تھا۔

دین داری، تقویٰ و پرہیز گاری اور عام صالح معاشرہ کے علاوہ کچھ خصوصی باتیں بھی تھیں۔ جس کی بنیاد پر رسول پاک ﷺ کی باتوں کو یاد رکھنا اس کو دوسروں تک پہنچانا اپنی ذمہ داری اور اپنے لئے باعث نجات سمجھتے تھے۔ مثلاً اللہ کے رسول کی یہ بشارت کہ: "نضر الله إمرأ سمع مقالتي فحفظها ثم أداها إلى من لم يسمعها." [2]

اللہ تعالیٰ اس شخص کے چہرے کو ترو تازہ رکھے جس نے میری بات سنی اور اس کو یاد کرلیا اور ان لوگوں تک پہنچایا جس نے اس کو سنا نہیں تھا۔

اسی طرح سے "من كُذب علي متعمدا فليتبوا معقده من النار" [3] یعنی جو جان بوجھ کر میرے اوپر جھوٹ گھڑتا ہے تو وہ جہنم کو اپنا ٹھکانہ بنائے، کی وعید سے باخبر تھے۔

نیز: "عليكم بالصدق فإن الصدق يهدی إلى البرو إن البر يهدی إلى الجنة" [4] سچائی کو لازم پکڑو اس لئے کہ سچائی بھلائی کی طرف رہنمائی کرتی ہے، اور بھلائی جنت کی طرف لے جاتی ہے۔ کے ضابطہ سے واقف تھے۔

ان اصول و ضوابط، امید و بیم، خوف و رجاء، وعید و بشارت نے ان کو انتہائی

---

(١) صحيح بخاری كتاب الرقاق ١١/ ٣٣٣، حديث نمبر (٦٤٩٧) صحيح مسلم كتاب الإيمان ١/ ١٤٧ حديث نمبر (١٤٣)

(٢) مسند احمد ٢/ ٨٠، سنن دارمی ١/ ٦٥ حديث نمبر (٢٣٦) سنن ترمذی كتاب العلم ٥/ ٣٦ حديث نمبر (٢٦٥٧، ٢٦٥٨) وقال: حسن صحيح. یہ روایت مختلف الفاظ میں مختلف صحابہ سے وارد ہے جو حد تواتر کو پہنچتی ہے۔

(٣) صحيح بخاری، كتاب العلم ١/ ٢٠٠ حديث نمبر (١٠٧)، یہ روایت بھی متواتر ہے۔

(٤) صحيح بخاری، كتاب الأدب ١٠/ ٥٠٧، حديث نمبر (٦٠٩٤)، و صحيح مسلم كتاب البر والصلة، ٤/ ٢٠١٣ حديث نمبر (٢٦٠٧)

محتاط بنادیا تھا، جس کی وجہ سے ایک پر اعتماد معاشرہ وجود میں آیا، اگر اس طرح کے لوگوں اور اس ماحول پر اعتماد نہ کیا جائے پھر دنیامیں کوئی بھی قابل اعتماد نہیں۔

ایک مرتبہ حضرت انسؓ نے ایک حدیث بیان کی تو کسی نے سوال کیا کہ کیا آپ نے اللہ کے رسول ﷺ سے اسے خود سنا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ: یا تو اللہ کے رسول سے یا ایسے لوگوں سے سنا جو جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ پھر فرمایا کہ: "واللہ ماکنا نکذب ولا ندری ماالکذب" (۱)

بہ خدا نہ تو ہم جھوٹ بولتے تھے اور نہ جانتے تھے کہ جھوٹ کیا ہے۔ اس معنی کے اور آثار آپ سے مروی ہیں، جن کا ذکر علامہ ابن عدی نے "الکامل" کے مقدمہ میں "صفة من يؤخذ عنه العلم" میں کیا ہے۔

حضرت براء بن عازبؓ فرماتے ہیں کہ جو کچھ ہم آپ حضرات سے بیان کرتے ہیں سب اللہ کے رسول ﷺ سے نہیں سنا ہے بلکہ بعض خود بخود اور بعض اپنے ساتھیوں کے واسطہ سے سنا ہے، یہ لوگ جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ (۲)

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ: كنا نحدث رسول الله صلى الله عليه وسلم إذلم يكن يكذب عليه فلما ركب الناس الصعب والذلول تركنا الحديث عنه (۳)

ہم رسول اللہ ﷺ کی [طرف نسبت کرکے] حدیث بیان کر دیا کرتے تھے، جب آپ پر جھوٹ نہیں گھڑا جاتا تھا، لیکن جب لوگ رطب و یابس بیان کرنے لگے تو آپ کی جانب نسبت کرنا چھوڑ دیا [اور واسطہ کا نام طلب کرنے لگے]

اس سچائی، امانت داری اور احتیاط کے ماحول میں صحابہ کرامؓ حدیث رسول سنتے اور سناتے تھے، اور ایک دوسرے پر اعتماد کرتے تھے۔

صحابہ کا ایک دوسرے پر تنقید:-

بعض صحابہ نے دوسرے صحابہ پر تبصرہ اور علمی مناقشہ کرتے ہوئے کبھی کبھی ایسا جملہ استعمال کیا ہے جس سے بظاہر ان پر تنقید، ان کے قول پر شبہ کا اظہار، یا ان کی

---

(۱) الكامل فى ضعفاء الرجال ١/ ١٦٦، بحوث فى تاريخ السنة ص ٢٢

(۲) الكامل فى ضعفاء الرجال ١/ ١٦٤، و بحوث فى تاريخ السنة المشرفة ص ٢١

(۳) صحيح مسلم ١/ ٨٠ طبع بيروت

تکذیب معلوم ہوتی ہے، حالانکہ معاملہ ایسا نہیں ہے۔ مثلاً حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک روایت: من غسل میتا فلیغتسل و من حمله فلیتوضاء [(۱)] "جس شخص نے میت کو غسل دیا وہ خود غسل کرے، اور جس نے اٹھایا وہ وضوء کرے" کو جب حضرت عباسؓ نے سنا تو فرمایا کہ: خشک لکڑیوں کے اٹھانے سے ہم پر وضو تو نہیں لازم آتا۔

بظاہر یہ ان کی روایت پر شبہ کا اظہار ہے حالانکہ ایسا نہیں بلکہ یہ ان کے فہم پر مبنی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے اس کے وجوب کا پتہ چلتا ہے اور ابن عباسؓ کے قول سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ واجب نہیں بلکہ مندوب ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی یہ روایت مختلف الفاظ سے مروی ہے، نیز اس معنیٰ کی روایت مختلف صحابہ سے بھی مروی ہے اس میں غسل کا جو حکم ہے اہل علم کا خیال ہے کہ یہ غسل واجبی نہیں بلکہ احتیاطی ہے۔ کیوں کہ اگر میت نجس رہا ہو تو اس کی نجاست کے چھینٹے جو جسم وغیرہ پر پڑتے ہیں اس کو نجس کر دیں گے لہٰذا احتیاطاً غسل کر لینا چاہئے، "ومن حمله فلیتوضاء" کا حکم ارشادی ہے، مطلب یہ ہے کہ جو اس کو اٹھانا چاہتا ہے وہ پہلے سے وضو کر لے اور تیاری کر کے آئے تاکہ جنازہ رکھنے کے بعد وضوء کیلئے پانی وغیرہ کی تلاش میں مشغول نہ ہو جائے یہاں تک کہ نماز جنازہ ہی فوت ہو جائے۔ یہ ہدایت اس بنیاد پر نہیں کہ جنازہ یا وہ لکڑی جس پر جنازہ رکھا جاتا ہے وہ نجس ہوتا ہے، بلکہ یہ حکم اس لئے ہے کہ آدمی پہلے سے نماز جنازہ کی تیاری کر لے تاکہ اس کے فوت ہونے کا خطرہ نہ رہ جائے۔

اسی طرح سے عبداللہ بن عمرؓ کی یہ روایت کہ "إن الميت يعذب فى قبره ببكاء أهله عليه" اس روایت کو جب حضرت عائشہؓ نے سنا تو کہا کہ " وَهِل ابن عمر إنما قال رسول الله صلى الله عليه وسلم إن الميت يعذب بخطيئته و ذنبه و أن أهله ليبكون عليه الآن" ! [(۲)]

---

(۱) مسند احمد ۲/۴٥٤، مصنف ابن ابی شیبة ۳/۲٦٩، منحة المعبود ۱/۱٦۰ حدیث نمبر (۷٦۳)، ابن الملقن نے "البدر المنیر" میں اس کے مختلف طرق و شواہد کو جمع کیا ہے اور حسن قرار دیا ہے، دیکھئے باب الغسل حدیث نمبر (١٦٤)

(۲) صحیح مسلم کتاب الجنائز ۱/٦٤۳، حدیث نمبر (۹۳۲)، بعض روایتوں میں ہے حضرت عائشہؓ نے کہا کہ: لا واللہ ما حدث رسول الله صلى الله عليه وسلم ان الله يعذب المومن ببكاء أحد

اس سے ان کی تکذیب نہیں مراد ہے بلکہ چونکہ یہ حدیث ﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ﴾[انعام:۱۶۴] کے خلاف نظر آرہی تھی اس لئے انہوں نے یہ سمجھا کہ حضرت ابن عمرؓ کے سننے اور سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے جیسا کہ فرمایا: "ولكنه نسي أو أخطاء"(۱)

حالانکہ ایسی بات نہیں، حضرت ابن عمرؓ کا سننا اور سمجھنا دونوں اپنی جگہ پر درست ہے، اور یہ حدیث قرآنی آیت ﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ﴾ [انعام:۱۶۴] کے خلاف بھی نہیں ہے، کیونکہ حدیث اس حال پر محمول ہے جب کہ میت نوحہ و ماتم کرنے کی وصیت کر جائے جیسا کہ زمانہ جاہلیت کا رواج تھا، یا یہ معلوم ہوتے ہوئے کہ میرے انتقال کے بعد اہل و عیال گریہ وزاری کریں گے، اس کے باوجود منع نہیں کیا ایسی صورت میں جو عذاب ہوگا یہ میت کے اپنے عمل کے پاداش میں ہوگا۔

بہت سے مقامات ایسے بھی ملیں گے جہاں ایک صحابی نے دوسرے کیلئے لفظ کذب کا استعمال کیا ہے، اس لفظ کذب کا استعمال دروغ گوئی پر نہیں کیا گیا ہے بلکہ غلطی سرزد ہونے کے معنی میں کیا گیا ہے۔

علامہ ابن حبان فرماتے ہیں کہ: "أهل الحجاز يسمون الخطاء كذبا"(۲) حجاز کے لوگ غلطی کو کذب سے تعبیر کرتے تھے۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ: اس کی تائید عبادۃ بن الصامتؓ کے اس اطلاق سے ہوتی ہے جب ان کو یہ پتہ چلا کہ ابو محمد [مسعود بن زید] وجوب وتر کے قائل ہیں تو انہوں نے کہا "كذب أبو محمد" حالانکہ ابو محمد نے اس کو روایت نہیں کیا تھا۔ بلکہ انہوں نے اجتہاداً کہا تھا، اجتہادی غلطی پر کذب کا اطلاق نہیں بلکہ خطا کا اطلاق ہوتا ہے، معلوم ہوا کہ کذب سے مراد خطا ہے نہ کہ دروغ گوئی، حافظ ابن عبد البر نے اس پر بہت ساری مثالیں نقل کی ہیں۔(۳)

ابن منظور فرماتے ہیں کہ: کبھی کبھی عام اہل عرب نے کذب کا استعمال خطاء کی جگہ پر کیا ہے، یہ شعراء کے کلام میں بھی پایا جاتا ہے۔

---

(۱) صحیح مسلم ۶۴۳/۱ (۲) الثقات لابن حبان ۱۱۴/۶

(۳) هدى السارى ص ۴۲۷، نیز دیکھئے لسان العرب ۷۰۹/۱

حضرت عروۃ سے کسی نے حضرت ابن عباسؓ کی یہ بات ذکر کی کہ: "لبث رسول الله صلى الله عليه وسلم بمكة بضع عشر سنة" توانہوں نے کہا کہ: كذب، أي أخطاء. ایسے ہی جب حضرت سمرةؓ نے یہ کہا کہ: "المغمى عليه يصلي مع كل صلاة صلاة حتى يقضيها" تو حضرت عمران نے فرمایا کہ: "كذبتَ ولكنه يصليهن معا" أي أخطات (١)

معلوم ہوا کہ صحابہ کرامؓ نے جو ایک دوسرے کے سلسلے میں کبھی کبھی ایسا لفظ استعمال کیا ہے جس سے غلط بیانی کا شبہ ہوتا ہے حقیقت میں ایسا نہیں، اس کا مطلب غلط بیانی نہیں بلکہ غلط فہمی ہے، جو ہر کسی سے ہوتی ہے لہٰذا اس طرح کے تبصرے اور تنقید سے باہمی اعتماد پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

پہلے صحابی:-

سب سے پہلے کون ایمان لایا اس سلسلہ میں خود صحابہ ودیگر اہل علم کے مختلف اقوال ہیں، اس میں مندرجہ ذیل صحابہ کا نام آتا ہے، حضرت خدیجہؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابو بکر صدیقؓ، ورقہ بن نوفل، زید بن حارثہ، بلال بن رباح رضی اللہ عنہم۔

بہت سے اہل علم نے حضرت خدیجہ کے بارے میں اتفاق ذکر کیا ہے، اور ان کے بعد حضرت علی کے سلسلہ میں اجماع نقل کیا ہے، سیرت طیبہ کی روشنی میں یہی صحیح بھی معلوم ہوتا ہے۔

البتہ صحیح مسلم کی روایت جو عمرو بن عبسہؓ کے واقعہ اسلام کے سلسلہ میں مذکور ہے اس میں حضرت ابو بکرؓ وبلالؓ کا نام مذکور ہے، جب عمرو بن عبسہؓ نے آپ سے سوال کیا کہ: "من معك على هذا، قال: حر وعبد، وكان يومئذ أبوبكر وبلال ممن آمن به" (٢)

آپ کے ساتھ اس دین پر اور کون ہے، تو آپ نے فرمایا کہ ایک آزاد اور ایک غلامؑ اس وقت حضرت ابو بکر اور حضرت بلال آپ پر ایمان لا چکے تھے۔

اس روایت میں اور حضرت علی کی روایت میں اہل علم نے تطبیق دیا ہے وہ اس طرح سے ہے کہ ایمان سب سے پہلے حضرت علی لائے لیکن انھوں نے ابو طالب کے

---

(١) لسان العرب ٧٠٩/١

(٢) صحيح مسلم، كتاب صلاة المسافرين ٥٦٩/١ حديث (٨٣٢)

خوف سے اپنے ایمان کو چھپائے رکھا، حضرت ابو بکر نے اپنے ایمان کا اعلان سب سے پہلے کیا، لہٰذا یہ بات مشہور ہو گئی کہ سب سے پہلے حضرت ابو بکرؓ ایمان لائے۔[۱]

علامہ ابن صلاح فرماتے ہیں کہ اگر اس طرح سے کہا جائے تو زیادہ بہتر ہے کہ:

آزاد مردوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے حضرت ابو بکر صدیقؓ ہیں۔

خواتین میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا

بچوں میں حضرت علیؓ

آزاد کردہ غلاموں میں زید بن حارثہ

غلاموں میں حضرت بلال بن ابی رباح[۲]

[بوڑھوں میں ورقاء بن نوفل]

تو اس سے تمام روایتوں اور اقوال میں تطبیق بھی ہو جائے گی اور یہ سارے اصحاب منجملہ پہلے ایمان لانے والوں میں ہوں گے۔

تعداد صحابہ:-

صحابہ کرامؓ کی قطعی تعداد بتانا ممکن نہیں اس کا حقیقی علم اللہ ہی کے پاس ہے اس لئے کہ ان میں بہت سارے ایسے حضرات ہیں جو دور دراز علاقے، دیہات اور صحرا میں چلے گئے تھے، جن کا شمار ممکن نہیں، جب امام ابو زرعہ سے صحابہ کی تعداد کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: من یضبط هذا؟[۳] ان کو کون شمار کر سکتا ہے؟

جن حضرات نے شمار کرنے کی کوشش کی ہے وہ تقریبی عدد ہے۔

امام بخاریؒ نے صحیح بخاری میں غزوہ تبوک ۹ھ کے واقعے میں ذکر کیا ہے کہ: "أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم كثير، لا يجمعهم كتاب حافظ يعني الديوان."[۴]

یعنی صحابہؓ کی تعداد اس غزوہ میں بہت زیادہ تھی، کسی رجسٹر میں ان کا نام نہیں تھا، یہ تو ایک غزوہ کا واقعہ ہے، پھر وہ حضرات جنہوں نے آپ کو دیکھا، آپ سے

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے: التقييد والايضاح ص ۳۰۸-۳۱۲ (۳) علوم الحديث ص ۲۷۰

(۳) علوم الحديث لابن الصلاح ص ۲۶۷

(٤) صحيح بخاری، كتاب المغازی ۱۱۳/۸، حديث نمبر (٤٤١٨)

ملاقات کی ان کا شمار کیسے ممکن ہو سکتا ہے جب کہ ان میں ایک بڑی تعداد خواتین (صحابیات) کی بھی ہے۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ رسول کے انتقال کے وقت صحابہ کی تعداد ساٹھ ہزار تھی۔(۱)

ایک روایت میں ہے کہ آپ کے ساتھ حج کرنے والوں کی تعداد تقریباً نوے ہزار تھی۔(۲)

امام ابوزرعہؒ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا جب انتقال ہوا اس وقت ایک لاکھ چودہ ہزار صحابہ تھے جنہوں نے آپ سے سنا اور روایت کیا، جب ان سے یہ سوال کیا گیا کہ یہ لوگ کہاں تھے، اور آپ سے کہاں سنا؟ فرمایا مدینہ میں رہتے تھے، مکہ میں تھے اور ان کے درمیان مختلف مقامات میں رہتے تھے اور دیہات میں رہتے تھے، اور آپ کے ساتھ حجۃ الوداع میں جو لوگ شریک تھے، اور وہ لوگ جنہوں نے آپ کو عرفہ میں دیکھا اور آپ کا خطبہ سنا۔(۳)

امام عراقی فرماتے ہیں کہ امام ابوزرعہ کا یہ قول قابل گرفت ہے۔ اس لئے کہ تعداد صحابہ پر اطلاع ممکن نہیں، پھر ابوزرعہ سے جو قول متصل سند سے منقول ہے وہ تحدید کے خلاف ہے، انہوں نے صرف یہ کہا ہے کہ ان کی تعداد ایک لاکھ کے اوپر ہے جیسا کہ ابوموسیٰ مدینی نے اپنی ذیل میں ذکر کیا ہے، علامہ ابن صلاح نے ان کا جو قول تحدید کے سلسلہ میں ذکر کیا ہے وہ کسی مشہور تاریخی کتاب میں نہیں۔ ابوموسیٰ مدینی نے اپنی ذیل میں بغیر سند کے ذکر کیا ہے، لہٰذا ان کا شمار تحدید کی صورت پر ممکن نہیں۔(۴)

یہ علامہ عراقی نے ذکر کیا ہے، لیکن امام سیوطی نے فرمایا ہے کہ اس کی سند موجود ہے خطیب بغدادی نے اسکو اپنی سند سے ذکر کیا ہے، امام سیوطی نے اس سند کو تدریب میں ذکر کیا ہے۔(۵)

---

(۱) التقیید والایضاح ص ۳۰۶ (۲) نور الیقین فی سیرۃ سید المرسلین ص ۳۷۵
(۳) علوم الحدیث (مقدمہ ابن صلاح) ص ۲۶۸
(۴) التقیید والایضاح ص ۳۰۵-۳۰۶ (۵) تدریب الراوی ۲/۲۲۰

صحابہ کی تعداد کے تعلق سے عوام میں جو یہ مشہور ہے کہ ان کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء بنی اسرائیل کی تعداد کے برابر تھی اس کا ذکر مجھ کو اب تک کسی کتاب میں نہیں ملا ہے۔

افضل صحابہ:۔

یوں تو سارے صحابہ کرام کو مجموعی طور سے فضیلت حاصل ہے پھر ان میں سے بعض کو بعض پر فوقیت و فضیلت حاصل ہے، ان میں باتفاق صحابہ و تابعین و باجماع اہل سنت حضرت ابو بکر صدیقؓ سب سے افضل ہیں، ان کے بعد بقیہ خلفاء اربعہ حسب ترتیب، پھر عشرہ مبشرہ ہیں، ان کے بعد حسب ترتیب بقیہ حضرات ہیں جن کا ذکر طبقات صحابہ میں گذر چکا ہے۔ (۱)

عشرۂ مبشرۃ:۔

دس صحابہ کرامؓ ایسے ہیں جن کو اللہ کے رسول ﷺ نے جنت میں داخلہ کی بشارت بیک وقت ایک ہی حدیث میں اپنے نام کے ساتھ دیا ہے، جو ایک اصطلاحی کلمہ بن گیا ہے، ورنہ ان کے علاوہ اور بھی صحابہ کرامؓ ہیں جن کو اللہ کے رسول نے مختلف اوقات میں جنت کی بشارت دی ہے۔ بلکہ حضرت عکاشہ بن محصنؓ کے بارے میں تو یہ فرمایا ہے کہ یہ ان ستر ہزار افراد میں سے ہیں جو جنت میں بغیر حساب و کتاب کے داخل ہوں گے۔ (۲)

عشرہ مبشرہ کا ذکر اہل علم نے ان کی مزید فضیلت اور اہمیت کی وجہ سے بہت اہتمام کے ساتھ کیا ہے۔ وہ حضرات یہ ہیں:

خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ — متوفی ۱۳ھ
خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ — متوفی ۲۳ھ
خلیفہ سوم حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ — متوفی ۳۶ھ
خلیفہ چہارم حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ — متوفی ۴۰ھ
امین امت حضرت ابو عبیدہ عامر بن الجراح رضی اللہ عنہ — متوفی ۱۸ھ
تاجر امت حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ — متوفی ۳۶ھ
صاحب جود و سخا حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ — متوفی ۳۶ھ

(۱) دیکھئے صفحہ ۴۷–۴۸ (۲) یہ روایت معرفت صحبت کے ذریعے میں ص ۵۳ پر گزر چکی ہے۔

حواری رسول حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ متوفی ۳۶ھ
پیکر صدق ووفا حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ متوفی ۵۱ھ
فداہ ابی وامی حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ متوفی ۵۵ھ

حافظ ابن حجر نے ان کو ایک بیت میں اس طرح جمع کیا ہے۔

لقد بشر الهادی من الصحب زمرة
بجنات عدن کلهم فضله اشتهر
سعيد، زبير، سعد، طلحة، عامر
أبو بكر، عثمان، ابن عوف، علی وعمر

اور کسی شاعر نے اس طرح ذکر کیا ہے:

خيار عباد الله بعد نبيهم
هم العشر طرا، بشروا بجنان
زبير وطلح وبن عوف وعامر
وسعدان، والصهران، والختنان (۱)

عبادله:

عبادلہ عبد اللہ کی جمع ہے، یہ کلمہ بھی اصطلاحی کلمہ بن گیا ہے، اس اطلاق سے صرف چار صحابہ مراد ہوتے ہیں جن کا نام عبد اللہ ہے، جب کہ اس نام کے صحابہ کی تعداد تقریباً تین سو ہے۔

اس لئے کہ جب یہ اصطلاح بنی تھی اس وقت یہ چار افراد علم وفضل فقہ و فتاویٰ میں کافی شہرت یافتہ تھے، جب کسی مسئلہ پر ان کا اتفاق ہو جاتا تو لوگ یہ کہتے کہ یہ عبادلہ کا قول ہے، یہیں سے یہ اصطلاح بن گئی، اس سے مراد یہ چار افراد ہیں:

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ متوفی ۶۳ھ
حضرت عبد اللہ بن عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ متوفی ۶۸ھ
حضرت عبد اللہ بن زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ متوفی ۷۳ھ
حضرت عبد اللہ بن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ متوفی ۷۳ھ

اس اصطلاح میں عبد اللہ بن مسعودؓ کو شمار نہیں کیا گیا ہے، جب کہ وہ ان حضرات سے علم وفضل اور اسلام لانے میں متقدم ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب یہ

(۱) فتح المغيث بشرح الفية الحديث ٤/١١٩-١٢٠

اصطلاح وضع کی گئی تھی اس وقت آپ باحیات نہیں تھے بلکہ آپ کا انتقال ہو چکا تھا آپ کی وفات ۳۲ھ میں ہوئی ہے۔[1]

امام بیہقی (متوفی ۴۵۸ھ) فرماتے ہیں کہ:"هولاء عاشوا حتى احتيج إلى علمهم فاذا اجتمعوا على شئ قيل هذا قول العبادلة، وابن مسعود ليس منهم لأنه تقدم موته عنهم."[2]

مفتیان صحابہ:

صحابہ کرامؓ میں ایک سو تیس افراد ایسے ہیں جن سے فتاوے منقول ہیں، لیکن ان میں سے سات افراد بحیثیت مفتی کافی مشہور ہیں۔

علامہ ابن حزمؒ فرماتے ہیں کہ: ان میں سے ہر ایک کے فتاویٰ ایک ضخیم جلد میں جمع کئے جا سکتے ہیں وہ حضرات یہ ہیں:

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ	متوفی ۲۳ھ
حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ	متوفی ۴۰ھ
حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ	متوفی ۳۲ھ
حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ	متوفی ۴۵ھ یا اسکے بعد
حضرت عائشہ ام المومنین رضی اللہ عنہا	متوفی ۵۸ھ
حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ	متوفی ۶۸ھ
حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ	متوفی ۷۳ھ

ان کے علاوہ تیرہ افراد اور ہیں جن کے فتاوے ایک جزء میں جمع ہو سکتے ہیں، وہ یہ ہیں:

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ	متوفی ۱۳ھ
حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ	متوفی ۱۸ھ
حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ	متوفی ۳۴ھ
حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ	متوفی ۳۶ھ
حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ	متوفی ۵۰ھ یا اسکے بعد
حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ	متوفی ۵۵ھ
حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ	متوفی ۵۹ھ

(۱) علوم الحديث ص ۲٦٦ (۲) الباعث الحثيث ص ۱۸۹

حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا	متوفی ۶۲ھ
حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ	متوفی ۶۳ھ
حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ	متوفی ۷۳ھ
حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ	متوفی ۷۴ھ
حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ	متوفی ۷۸ھ
حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ	متوفی ۹۳ھ

ان کے ساتھ چند افراد کو اور ملایا جا سکتا ہے وہ یہ ہیں:

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ	متوفی ۳۴ھ
حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ	متوفی ۳۶ھ
حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ	متوفی ۳۶ھ
حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ	متوفی ۳۶ھ
حضرت ابو بکرہ نقیع بن الحارث رضی اللہ عنہ	متوفی ۵۱ھ یا اسکے بعد
حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ	متوفی ۵۲ھ
حضرت معاویہ بن ابو سفیان رضی اللہ عنہ (۱)	متوفی ۶۰ھ

کچھ مخصوص صفات والے :-

رسول اللہ ﷺ نے کچھ صحابہ کو مخصوص صفات سے متصف کیا ہے ان میں سے چند یہ ہیں:

أرحم أمتي بأمتي أبو بكر	میری امت میں امت پر سب سے زیادہ رحیم ابو بکرؓ ہیں۔
و أشدهم في أمر الله عمر	دین کے معاملہ میں سب سے زیادہ سخت حضرت عمرؓ ہیں۔
و أصدقهم حياء عثمان	سب سے زیادہ حیاء دار حضرت عثمانؓ ہیں۔
و أعلمهم بالحلال و الحرام معاذ	حلال و حرام کی معرفت میں سب سے بڑے معاذ بن جبلؓ ہیں۔
و أفرضهم زيد بن ثابت	علم فرائض کو سب سے زیادہ جاننے والے حضرت زیدؓ بن ثابتؓ ہیں۔
و أقرء هم أبي بن كعب	کتاب اللہ کے سب سے زیادہ پڑھنے والے ابی بن کعبؓ ہیں۔

(۱) أعلام الموقعين عن رب العالمين ۱/ ۱۲

وأمين هذه الأمة أبو عبيدة بن الجراح — اس امت کے امین ابو عبیدہ بن جراح ہیں۔[1]

ابن عبد البر کی روایت میں کچھ اضافہ ہے وہ یہ ہے۔

وأبو هريرة وعاء العلم — حضرت ابو ہریرہ علم کے محافظ ہیں۔

وعندسلمان علم لايدرك — حضرت سلمان کے پاس ایسا علم ہے جس پر گرفت نہیں ہو سکتی۔

وأصدقهم لهجة أبو ذر[2] — سب سے زیادہ سچائی ابوذر میں ہے۔

راویان صحابہ:-

صحابہ کرام کی ایک بڑی تعداد ہونے کے باوجود جنکے بارے میں کچھ معلومات میسر ہیں انکی تعداد نسبتاً کم ہے، تراجم صحابہ کے سلسلہ میں سب سے جامع کتاب حافظ ابن حجر کی کتاب "الاصابة فی تمییز الصحابة" ہے۔ اس میں سے اگر مخضر مین اور غلطی سے صحابہ میں نام آجانے والوں کو حذف کر دیا جائے تو صحابہ کی تعداد دس ہزار سے زیادہ نہیں ہو سکتی، جب کہ بعض صحابہ کے بارے میں معلومات انتہائی مختصر ہیں۔

پھر ان حضرات میں سے روایت کرنے والوں کی تعداد انتہائی کم ہے، چنانچہ مسند بقی بن مخلد میں جو سب سے عظیم مسند ہے اور جس سے صحابہ کرام کے روایتوں کی تعداد ماخوذ ہے یہ تعداد ایک ہزار آٹھ ہے۔[3]

جب کہ مسند احمد میں جملہ نو سو چار صحابہ کی روایتیں ہیں، پھر ان میں سے جن سے بکثرت روایتیں مروی ہیں وہی حضرات ہیں جو بیعت رضوان اور فتح مکہ سے پہلے ایمان لا چکے تھے۔

ڈاکٹر محمد سماحی فرماتے ہیں کہ: "أما مسلمة الفتح والأعراب الوافدون على رسول الله ﷺ فهؤلاء لم يتحملوا من السنة مثل ماتحملوا الصحابة الملازمون على رسول الله ﷺ، ومن تعرض منهم للرواية كحكيم بن

(۱) سنن ترمذی کتاب المناقب ٥/٦٦٤ حدیث (۳۷۹۰) وقال: حسن صحیح،سنن ابن ماجه ۱/٥٥

(۲) الاستیعاب فی معرفة الاصحاب ۱/۹ (۳) جوامع السیرة لابن حزم ص ۲۷۵-۳۱۵

حزام، وعتاب وغيرهم عرفوا بالصدق والأمانة" (۱)

فتح مکہ کے وقت ایمان لانے والے یا باہر دیہات سے آنے والوں نے سنت کو اتنا نہیں حاصل کیا جتنا کہ آپ کے ساتھ لگے رہنے والوں نے کیا، اگر کسی نے روایت بھی کیا ہے جیسے حکیم بن حزام وغیرہ تو وہ سب کے سب سچائی اور امانت داری میں معروف ہیں۔

وہ صحابہ کرامؓ جن سے روایتیں مروی ہیں حافظ ابن حزم نے ان کا ذکر ان کی روایتوں کی تعداد کے ساتھ "جوامع السیرۃ" کے آخر میں کیا ہے۔ (۲)

مکثرین صحابہ:-

ان میں سے کچھ صحابہ ایسے ہیں جن کی روایتوں کی تعداد زیادہ ہے، اصطلاح میں ان کو مکثرین صحابہ (زیادہ روایت کرنے والے صحابہ) کہا جاتا ہے، اور اس سے وہ حضرات مراد ہیں جن کے روایتوں کی تعداد ایک ہزار سے اوپر ہے وہ سات افراد ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

صحابی کا نام	تعدادروایت	سن وفات
حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ	۵۳۷۴	۵۹ھ
حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ	۲۶۳۰	۷۳ھ
حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ	۲۲۸۶	۹۳ھ
حضرت عائشہ ام المومنین رضی اللہ عنہا	۲۲۱۰	۵۸ھ
حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ	۱۶۶۰	۶۸ھ
حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ	۱۵۴۰	۷۸ھ
حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ (۱)	۱۱۷۰	۸۴ھ

کسی شاعر نے ان کو عربی شعر میں اس طرح ذکر کیا ہے:

سبع من الصحب فوق الألف قد نقلوا   من الحديث عن المختار خير مضر

أبو هريرة، سعد، جابر، أنس   صديقة، وابن عباس، و نجل عمر

(۱) السنة قبل التدوين ص ۴۰۱   (۲) جوامع السيرة لابن حزم ص ۲۷۵-۳۱۵

(۳) تدريب الراوي ۲/۲۱۶-۲۱۸ بہت سے اہل علم نے صرف ۶/ افراد کو مکثرین میں شمار کیا ہے، جب کہ ابوسعید خدری بھی قاعدے کے اعتبار سے اس میں شامل ہیں۔

یہاں پر مکثرین صحابہ کا مختصر تعارف اور سبب کثرت بیان کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

۱- حضرت ابو ھریرۃ رضی اللہ عنہ

(ولادت ۱۹ قبل ہجرت وفات ۵۹ ھجری)

مشہور قول کے مطابق آپ کا نام عبد الرحمٰن بن صخر الدوسی ہے، آپ یمن کے مشہور قبیلہ، قبیلہ دوس کے رہنے والے تھے، آپ نے طفیل بن عمرو الدوسی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا جو قدیم الاسلام ہیں، ۷ھ میں یمن سے ہجرت کر کے مدینہ روانہ ہوئے اتفاق سے موسم کی خرابی کی وجہ سے کشتی حبشہ چلی گئی، پھر وہاں سے مہاجرین حبشہ کے ساتھ مدینہ منورہ حاضر ہوئے، اس وقت رسول ﷺ خیبر میں تھے انہوں نے خیبر کا رخ کیا اور وہاں اس وقت پہنچے جب خیبر فتح ہو چکا تھا۔

آپ کی زیادہ تر روایتیں اللہ کے رسول ﷺ سے مروی ہیں، حضرت ابو بکر و عمر، و عائشہ اور دیگر قدیم الاسلام صحابہ سے بھی روایت کیا ہے، آپ سے روایت کرنے والوں کی تعداد تقریباً آٹھ سو ہے جن میں بعض صحابہ مثلاً حضرت ابن عمر، ابن عباس، جابرؓ وغیرہ شامل ہیں۔

کثرت روایت کے اسباب:-

روایتوں کی تعداد زیادہ ہونے کے مختلف اسباب ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:

(۱) رسول کے ساتھ بکثرت رہنا:- جب حضرت ابو ہریرہؓ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو انہوں نے اپنے آپ کو رسول کے ساتھ ایسا منسلک کر لیا کہ آپ کے ساتھ سایہ کی طرح لگے رہتے تھے، ہجرت کے بعد کی زندگی کو حدیث رسول کے پڑھنے اور پڑھانے کیلئے وقف کر دیا تھا اس لئے آپ کی روایتیں زیادہ ہو گئیں۔

(۲) حرص حدیث:- آپ حدیث رسول کو معلوم کرنے اور جمع کرنے پر بیحد حریص تھے، جسکی شہادت خود اللہ کے رسول ﷺ نے دی ہے، جب آپ نے اللہ کے رسول سے دریافت کیا کہ قیامت کے دن آپ کی سفارش حاصل کرنے والے خوش بخت کون ہوں گے، تو آپ نے عرض کیا کہ: "لقد ظننت يا أبا هريرة أن لا يسئلني

عن هذا الحديث أحد أول منك لما رأيت من حرصك على الحديث." [1]
ابو ہریرہ مجھ کو یقین تھا کہ اس حدیث کے بارے میں تم سے پہلے کوئی سوال نہیں کرے گا اس لئے کہ میں دیکھتا ہوں کہ تم کو میری حدیثوں کے حصول کا کتنا حرص ہے۔

ہجرت سے پہلے بھی آپ کو بہت ساری حدیثیں معلوم ہو چکی تھیں جس کی دلیل یہ ہے کہ فتح خیبر کے بعد آپ اور ابان بن سعید سے جو تکرار ہوئی تھی تو آپ نے ابان بن سعید پر یہ اعتراض کیا تھا کہ:"هذا قاتل ابن قوقل" جب کہ ابن قوقل کی شہادت ابان بن سعید کے ہاتھ سے غزوہ اُحد میں ہوئی تھی، معلوم یہ ہوا کہ مدینہ کے حالات وواقعات کے بارے میں پہلے ہی سے آپ کو معرفت حاصل تھی، جو آپ کی دلچسپی حدیث پر دلالت کرتا ہے۔

(۳) رسول صلی الله علیه وسلم کی دعا:- ایک مرتبہ حضرت ابوہریرہؓ دعا کرتے ہوئے فرمارہے تھے کہ:"اللهم إنى اسئلك علما لا ينسى" تو اللہ کے رسول نے فرمایا کہ آمین [2]

(٤) قوی حافظہ:- حدیثوں کو یاد رکھنے کیلئے قوت حافظہ کا بڑا نمایاں کردار ہوتا ہے، ابتدا میں آپ کو اپنے حافظہ میں کمزوری کا احساس ہوا تو آپ نے اللہ کے رسول سے اس کا ذکر کیا، اللہ کے رسول نے فرمایا کہ:"ابسط کساء ك فبسطه ثم قال: ضمه إلى صدرك فضممته" [3] اپنی چادر کو پھیلاؤ آپ نے پھیلا دیا پھر رسول نے کہا کہ اس کو سینے سے لگالو آپ نے لگالیا، حضرت ابوہریرۃ آگے فرماتے ہیں کہ: میں اس کے بعد کبھی کوئی حدیث نہیں بھولا۔

آپ کی قوت حافظہ کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب مروان بن حکم نے آپ کو بلا کر کچھ حدیثیں سنانے کی درخواست کی اور اپنے کاتب کو چھپا کر بیٹھا

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب العلم ۱۹۹/۱ حدیث نمبر (۹۹)

(۲) المستدرك ۵۰۸/۳، امام حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے لیکن امام ذہبی نے فرمایا کہ حماد ضعیف ہیں، بشار عواد فرماتے ہیں کہ اگرچہ حماد منفرد ہیں لیکن ان کی متابعت فضل بن علاء نے کی ہے، سیر أعلام النبلاء ۶۰۰/۲-۶۰۱ حاشیہ

(۳) صحیح بخاری، کتاب البیوع ۲۸۷/٤ حدیث نمبر (۲۰٤۷) صحیح مسلم فضائل اصحاب النبی ۱۳۳۹/٤ حدیث نمبر (۲٤۹۲)

دیا اس نے ساری حدیث خاموشی سے تحریر کرلی، ٹھیک ایک سال گذرنے کے بعد مروان نے آپ کو پھر طلب کیا اور سابقہ سنائی ہوئی حدیثوں کو دوبارہ سنانے کی درخواست کی آپ نے ان حدیثوں کو بالکل ہو بہو جیسے گذشتہ سال سنایا تھا بغیر کسی کمی و زیادتی، تقدیم و تاخیر کے سنادیا۔ ’’فما زاد ولا نقص ولا قدم ولا أخر فيها‘‘[1]

(۵) طول حیات:- آپ کی روایتوں کے کثرت سے انتشار کا سبب طول حیات بھی ہے ایک طویل وقفہ (تقریباً ۴۹ سال تک) رسول ﷺ کے بعد باحیات رہے، آپ کے حدیثوں کے معلوم کرنے اور دوسروں تک پہنچانے میں لگے رہے، لوگ آپ سے سوال کرتے آپ ان کو جواب دیتے، کچھ دنوں تک آپ نے افتاء اور قضاء کا کام خصوصیت کے ساتھ کیا ہے۔ ان اسباب کی بنیاد پر آپ کی روایتوں کی تعداد زیادہ ہو گئی جس کی شہادت صحابہ کرام نے دی ہے۔

حضرت طلحہ بن عبید اللہ فرماتے ہیں کہ: بلاشبہ حضرت ابو ہریرۃ نے اللہ کے رسول سے ایسی باتیں سنی ہیں جو ہم نہیں سن سکے۔[2]

حضرت ابن عمر فرماتے ہیں کہ: ’’كان يحفظ على المسلمين حديث النبي صلى الله عليه وسلم‘‘[3]

کچھ لوگوں کو آپ کی کثرت روایت پر اعتراض تھا آپ نے اس کا جواب یوں دیا ہے: میرے مہاجرین ساتھی اپنے زمینوں پر کام کرنے میں مصروف رہتے تھے، میں غریب آدمی تھا رسول ﷺ کے ساتھ پیٹ بھر کھانے پر لگا رہتا تھا اس لئے میں سب سے زیادہ آپ کی مجلسوں میں شریک رہتا تھا جب لوگ غیر حاضر رہتے تھے تو میں حاضر رہتا اور جب لوگ بھول جاتے تو میں یاد رکھتا۔[4]

آپ کی جملہ روایتیں پانچ ہزار تین سو چوہتر (۵۳۷۴) ہیں، جبکہ مسند أحمد میں (۳۸۴۸) اور صحیحین میں (۳۲۵) روایتیں ہیں۔[5]

---

(۱) البداية والنهاية ۱۰٦/۸، سير اعلام النبلاء ۵۹۸/۲
(۲) سير أعلام النبلاء ٦۰٦/۲
(۳) سير أعلام النبلاء ٤۳۵/۲، السنة قبل التدوين ص ٤۳۲
(٤) مسند أحمد ۲٤۰/۲، سير أعلام النبلاء ۵۹۵/۲
(۵) ترجمہ کیلئے دیکھئے الاصابة فی تمييز الصحابة ۲۰۲/٤، سير أعلام النبلاء ۵۷۸/٦، السنة قبل التدوين ص ٤۲۳، الحديث والمحدثون ص ۱۳۲-۱۳٤

۲- عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ

(ولادت ۱۰ سنہ قبل ہجرت وفات ۷۳ھ)

آپ خلیفہ دوم حضرت عمر بن خطاب کے صاحب زادے ابو عبدالرحمٰن عبداللہ بن عمر بن خطاب عدوی ہیں، کم سنی میں آپ ایمان لائے اور اپنے والد کے ہمراہ ہجرت کیا اس وقت آپکی عمر گیارہ سال کی تھی، سب سے پہلے غزوہ خندق (۵ھ) اور پھر دیگر غزوات میں شریک رہے۔

آپ نے اللہ کے رسول سے بکثرت روایتیں نقل کی ہیں، رسول کے علاوہ حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت عائشہ وغیرہ دیگر صحابہ سے روایت کیا ہے، آپ سے ایک جم غفیر نے روایت کیا ہے انہیں میں سے آپکے بیٹے سالم اور عبداللہ اور آزاد کردہ غلام نافع مولی ابن عمر اور حضرت سعید بن مسیّب وغیرہ شامل ہیں۔

اسباب کثرت:-

روایت کی کثرت کے مختلف اسباب ہیں ان میں سے مندرجہ ذیل اسباب قابل ذکر ہیں:

(۱) **حصول سنت کا حرص:**- اتباع سنت میں آپ کو بڑی شہرت حاصل ہے، آپ اپنے ہر قول و عمل میں سنت کو مشعل راہ سمجھتے تھے اسی وجہ سے سنت رسول کی معرفت کے حریص تھے، اس کے حصول کیلئے کوشش کرتے تھے، آپ کی مجلس میں ہمہ تن گوش رہتے آپ کے اعمال کو بڑی سنجیدگی سے دیکھتے، عدم موجودگی کی صورت میں دوسروں سے معلوم کرتے، جیسا کہ آپ کے والد حضرت عمرؓ کا طریقہ تھا۔

(۲) **قرابت رسول:**- چونکہ رسول ﷺ سے آپ کی قرابت تھی، حفصہ بنت عمر ام المومنین آپ کی بہن تھیں، اس بنیاد پر رسول کی خدمت میں حاضری دینے کا بہت موقع ملتا تھا جس سے معرفت سنت کے حصول میں بڑی مدد ملی۔

(۳) **تقدم اسلام:**- چونکہ آپ قدیم الاسلام ہیں اس لئے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ زیادہ دنوں تک رہنے کا موقع ملا، بنابریں آپ کے پاس زیادہ تعداد میں حدیثیں جمع ہو گئیں۔

(٤) علم کیلئے فراغت:- آپ کو علم حدیث کے حصول، اس کی نشر واشاعت کا بڑا شوق تھا اسلئے آپ اپنا وقت زیادہ سے زیادہ درس و تدریس میں صرف کرتے تھے، آپ کا نام خلافت کیلئے پیش کیا گیا لیکن آپ نے انکار کر دیا، ہر قسم کے فتن سے دور رہ کر علم وعبادت میں لگے رہے، اسلئے آپ کی روایتیں زیادہ ہو گئیں اور منظر عام پر آگئیں۔

(۵) طول حیات:- رسول اللہ ﷺ کے بعد ایک طویل مدت تقریباً ٦٢ سال باحیات رہے جس کی وجہ سے آپ کو حدیث کی معرفت اور اس کی نشر واشاعت کا زیادہ موقع ملا، اس طرح سے روایتوں کی تعداد میں اضافہ کے لئے طول حیات سے کافی مدد ملی۔

آپ کے جملہ روایتوں کی تعداد (۲٦۳۰) ہے جب کہ مسند احمد میں (۲۰۱۹) ہے، (١٦٧) روایتیں متفق علیہ ہیں۔

آپ کی وفات مکہ مکرمہ میں ۷۳ھ میں حضرت عبداللہ بن زبیر کے قتل کے تین ماہ بعد ہوئی اس وقت آپ کی عمر ۸۴ سال کی تھی۔[1]

۳ - أنس بن مالک انصاری رضی اللہ عنہ

(ولادت ۱۰ سنہ قبل ہجرت وفات ۹۳ھ)

آپ خادم رسول انس بن مالک بن نضر انصاری ہیں، جب آپ کی عمر دس سال کی تھی اس وقت آپ کی والدہ ام سلیم بنت ملحان نے آپ کو رسول کی خدمت میں اس وقت پیش کیا جب آپ مدینہ منورہ تشریف لائے یہ اُس وقت سے تا حیات آپ کی خدمت کرتے رہے اس طرح آپ کے ساتھ مکمل دس سال تک رہنے کا موقع ملا۔

آپ کی روایتیں زیادہ تر اللہ کے رسول ﷺ سے منقول ہیں، اسی طرح سے حضرت ابو بکر و عمر و عثمان اور ابن مسعود وغیرہ سے بھی آپ نے روایت کیا ہے۔ آپ سے روایت کرنے والے تابعین کی ایک بڑی تعداد ہے، جن میں حسن بصری، قتادۃ بن دعامہ سدوسی، ابن سیرین، امام زہری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

---

(۱) ترجمہ کیلئے دیکھئے : الاصابة فی تمییز الصحابة ٢/٣٤٧، السنة قبل التدوین ص ٤٦٩-٤٧١، الحدیث والمحدثون ص ١٤١

کثرت روایت کے اسباب:-

(۱) **خدمت رسول صلی الله علیه وسلم:-** جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے آپ نے پوری مدنی زندگی میں (تقریباً دس سال تک) رسول ﷺ کی خدمت کی، اس لئے آپ کے احوال و اخبار کی اطلاع کا آپ کو زیادہ موقع ملا اور ایسی ایسی چیزوں کا مشاہدہ کیا جو دوسرے نہ کر سکے۔

(۲) **علم کیلئے فراغت:-** آپ نے بصرہ کو اپنا وطن بنایا، اور درس و تدریس و افتاء کیلئے اپنے وقت کو وقف کر دیا، اس طرح سے آپ کو زیادہ تر روایتیں بیان کرنے کا موقع ملا اور آپ کی حدیثیں منتشر اور عام ہو گئیں۔

(۳) **طول حیات:-** آپ کو اللہ تعالیٰ نے طویل زندگی عطاء کی، راویان صحابہؓ میں اتنی لمبی عمر اور کسی کو نہ ملی جتنی کہ آپ کو ملی، رسول ﷺ کے بعد آپ تقریباً ۸۳ سال باحیات رہے اور حدیث کی نشر و اشاعت کرتے رہے،

آپ کی روایتوں کی تعداد (۲۲۸۶) ہے جب کہ مسند احمد میں (۲۱۷۸) حدیثیں ہیں۔ (۳۱۸) روایتیں متفق علیہ ہیں۔

آپ کا انتقال بصرہ میں ۹۳ھ میں ہوا جب کہ وہاں کوئی اور صحابی باقی نہ بچا تھا۔[1]

٤ - عائشة بنت أبی بكر صديق رضی الله عنهما

(ولادت ۷ قبل ہجرت وفات ۵۷ھ)

آپ اُم المومنین عائشہ بنت ابی بکر صدیق بن ابی قحافہ ہیں، آپ کی کنیت آپ کے بھانجے عبد اللہ بن زبیر کے نام پر ام عبد اللہ ہے، غزوہ بدر کے بعد ۲ھ میں آپ نے حرم نبوی میں قدم رکھا، آٹھ سال آپ کی زوجیت میں رہنے کا شرف ملا، جملہ امہات المومنین میں آپ اللہ کے رسول کے سب سے زیادہ قریب اور محبوب تھیں، نیز انتہائی ذہین و فطین تھیں۔

آپ کی زیادہ تر روایتیں اللہ کے رسول ﷺ سے مروی ہیں، نیز اپنے والد حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر، حضرت سعد بن ابی وقاص اور دیگر صحابہ سے بھی

---

(۱) ترجمہ کیلئے دیکھئے : الاصابة فی تمییز الصحابة ۷۱/۱، الحدیث والمحدثون ص ۱۳۷

روایت کیا ہے، امور خانہ کی زیادہ تر روایتیں آپ ہی سے مروی ہیں، آپ سے روایت کرنے والوں میں صحابہ کرام کی ایک جماعت ہے جن میں حضرت ابوہریرہ، ابوموسیٰ اشعری، ابن عمر وغیرہ شامل ہیں۔

تابعین میں حضرت عروۃ بن زبیر، سعید بن مسیب وغیرہ نے آپ سے روایت کیا ہے۔

کثرت روایت کے اسباب:-

(۱) رسول کی زوجیت:- چونکہ آپ رسول کی زوجیت میں تھیں، ازواج مطہرات میں آپ سب سے زیادہ رسول کے قریب اور آپ سے بے تکلف تھیں۔ لہٰذا کسی چیز کے سوال میں کوئی جھجھک نہیں محسوس کیا، گھریلو معاملات زن و شو کے تعلقات سے متعلق روایتوں کے ذکر کرنے میں کوئی تکلف نہیں کیا۔

(۲) ذھانت:- ازواج مطہرات میں آپ سب سے زیادہ ذہین و فطین تھیں، قرآن سے استدلال کا عجیب ملکہ آپ کو حاصل تھا، اس وجہ سے کئی ایک صحابہ کی روایتوں پر جو قرآن کے خلاف نظر آرہی تھیں تبصرہ بھی کیا ہے، پیچیدہ و مشکل مسائل کی وضاحت، بظاہر متعارض حدیثوں کا حل آپ کے ذریعہ کافی حد تک معلوم ہوا، جو آپ کی علمی بصیرت پر غماز ہے۔

(۳) طول حیات:- رسول ﷺ کے انتقال کے وقت آپ کی عمر صرف ۱۸ سال کی تھی رسول کے انتقال کے بعد تقریباً سینتالیس سال کا موقع آپ کو ملا جس میں آپ نے لوگوں کو اپنے علمی چشمہ سے سیراب کیا، حدیث رسول کی نشر و اشاعت، درس و تدریس کے ساتھ ساتھ افتاء کی ذمہ داری بھی نبھائی، اس طرح حدیثوں کے حصول اور تبلیغ کا آپ کو اچھا خاصہ موقع ملا، بنابریں آپ کی روایتوں کی تعداد زیادہ ہوگئی۔

آپ کی جملہ روایتوں کی تعداد (۲۲۱۰) ہے جس میں سے (۱۹۴) متفق علیہ ہیں۔
صحیح قول کے مطابق آپ کا انتقال ۱۸ رمضان ۵۷ھ میں ہوا۔ [1]

(۱) تفصیل کیلئے دیکھئے: الاصابة فی تمییز الصحابة ۳۵۹/٤، السنة قبل التدوين ص ٤٧٤-٤٧٥، الحديث والمحدثون ص ١٣٨

۵- عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ

(ولادت ۳ ؁ قبل ہجرت وفات ۶۸ ؁ھ)

آپ ابو العباس عبد اللہ بن عباس بن عبد المطلب ہاشمی ہیں، آپ رسول کے چچیرے بھائی اور آپ کی زوجہ مطہرہ حضرت میمونہ کے بھانجے تھے۔

آپ نے اللہ کے رسول ﷺ، حضرت ابو بکر و عمر، عثمان، و علی و ابو ہریرہ نیز اپنی خالہ میمونہ سے روایت کیا ہے، آپ کے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد ہے جس میں سعید بن میسّب، قاسم بن محمد، عکرمہ، عطاء، طاوس، مجاہد وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

آپ کی علم و فہم کی وجہ سے حضرت عمر نے آپ کو مجلس شوریٰ میں بڑے بڑے صحابہ کے ساتھ شامل کر رکھا تھا۔

اسباب کثرت روایت:-

(۱) قرابت رسول ﷺ:- رسول اللہ ﷺ سے آپ کا خاندانی رشتہ، نیز قرابت داری تھی اس لئے آپ کے ساتھ زیادہ تر اٹھنے بیٹھنے کا موقع ملا، اللہ کے رسول کو آپ سے کافی الفت تھی بنا بریں آپ اپنے ساتھ مجلسوں میں لے جایا کرتے تھے، اس وجہ سے آپ کو زیادہ حدیثوں کی معرفت کا موقع ملا حتی کہ مکثرین میں شمار ہونے لگے۔

(۲) دعائے رسول:- اللہ کے رسول ﷺ نے آپ کو اپنے سینے سے لگا کر یہ دعا کی تھی کہ: "اللهم علمه الكتاب والحكمة"[1] اے اللہ ان کو کتاب و سنت کا علم عطا فرما۔

آپ کی دعاؤں کی برکت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو کتاب و سنت کا علم اور فہم عطا کیا، یہاں تک کہ آپ کو ترجمان الأمۃ کا خطاب ملا آپ کو حبر الأمة (امت کا عالم) اور بحر العلم (علم کا سمندر) بھی کہا جاتا ہے۔

(۳) طبعی رجحان:- آپ کے اندر سنت رسول کی حفاظت کا طبعی رجحان پایا جاتا تھا، اس لئے آپ اس کے حصول کے لئے کوشاں رہتے تھے۔ رسول کے علاوہ دیگر صحابہ سے روایتیں معلوم کرتے تھے جس کی وجہ سے آپ کی روایتوں کی تعداد زیادہ ہو گئی۔

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الوضو ۲۴۴/۱ نمبر (۱۴۳)، و کتاب العلم ۱۶۹/۱ نمبر (۷۵)، وفضائل الصحابة ۲۴۴/۱ حدیث نمبر (۳۷۵۶)، و صحیح مسلم فضائل الصحابة ۱۹۲۷/۴ حدیث (۲۴۷۷)

(٤) طول حیات:- رسول ﷺ کے بعد آپ کو ایک طویل مدت (تقریباً ۵۸ سال) ملی جس میں آپ نے درس و تدریس اور افتاء کا کام کیا، لہٰذا ہر طرح کی روایتوں کے بیان کرنے کا موقع ملا۔ طول حیات کی وجہ سے کبار صحابہ سے روایت کرنے کا اچھا موقع ملا، اس وجہ سے آپ کی روایتیں کثیر اور منتشر ہوئیں۔

مسند بقی میں آپ سے (١٦٦٠) روایتیں مروی ہیں جب کہ مسند احمد میں (١٦٦٩) روایتیں ہیں، (۷۵) روایتیں متفق علیہ ہیں۔

آپ کا انتقال طائف میں ٦٨ھ میں ہوا، یہاں انتقال کرنے والے آپ آخری صحابی ہیں، آخری عمر میں آپ نابینا ہو گئے تھے۔[1]

٦- جابر بن عبداللّٰہ رضی اللّٰہ عنہ

(ولادت ١٦ قبل ہجرت وفات ۷۸ھ)

آپ ابو عبداللہ جابر بن عبداللہ بن عمرو بن حرام انصاری مفتی مدینہ ہیں، آپ بیعت عقبہ میں ستر انصار کے ساتھ شریک تھے۔ غزوہ بدر و اُحد کے بعد ہر غزوہ میں شریک تھے۔

آپ قدیم الاسلام صحابی ہیں اللہ کے رسول اور دیگر بڑے بڑے صحابہ حضرت ابو بکر و عمر و علی و ابو عبیدہ وغیرہ سے بھی روایت کیا ہے، آپ کے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد ہے۔

اسباب کثرت روایت:-

(١) معرفت سنت کا حرص:- آپ سنت رسول کی معرفت کے بڑے حریص تھے ایک ایک حدیث کو معلوم کرنے کیلئے آپ نے دور دراز علاقوں کا سفر کیا، مدینہ منورہ سے مصر تک صرف ایک حدیث کی معرفت کیلئے طویل سفر کیا جو کافی مشہور ہے۔[2]

(٢) طول حیات:- چونکہ آپ کو طویل زندگی ملی، رسول ﷺ کے بعد تقریباً (٦٨) سال باحیات رہے، جس سے آپ کو روایت کے جمع کرنے میں کافی مدد ملی، یہ اپنے زمانہ میں مدینہ کے مفتی بھی رہ چکے ہیں، مسجد نبوی میں آپ کا حلقہ درس بھی تھا،

(١) تفصیل کیلئے دیکھئے: الاصابة فی تمیز الصحابة ٢/٣٣٠، السنة قبل التدوین ٤٧٦-٤٧٧، الحدیث والمحدثون ص ١٣٩ (٢) صحیح بخاری کتاب العلم ١/١٧٣

اس لئے آپ کی روایتوں کی تعداد زیادہ ہوئی اور منظر عام پر لانے کا کافی موقع ملا۔

آپ کے حدیثوں کی تعداد (۱۵۴۰) ہے، مسند احمد میں (۱۲۰۶) روایتیں ہیں، ان میں سے ساٹھ حدیثیں متفق علیہ ہیں۔

آخری عمر میں آپ نابینا ہو گئے تھے۔ ۷۸ھ میں آپ کا انتقال مدینہ منورہ میں ہوا، بعض اہل علم کے مطابق مدینہ میں وفات پانے والے آپ آخری صحابی ہیں۔[1]

۷- ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ

(ولادت ۱۲ قبل ہجرت وفات ۷۴ھ)

آپ کا اسم گرامی سعد بن مالک بن سنان انصاری ہے، آپ کے والد غزوہ اُحد میں شہید ہو گئے تھے جس کی وجہ سے آپ غربت سے پریشان تھے اس لئے اصحاب صفہ میں شریک ہو گئے تھے، غزوہ اُحد کے بعد جملہ غزوات، نیز بیعت رضوان میں آپ شریک تھے۔

اللہ کے رسول ﷺ، خلفاء اربعہ اور دیگر صحابہ سے روایت کیا ہے، آپ سے حضرت ابن عباس، ابن عمر کے علاوہ، سعید بن مسیّب، ابو عثمان نہدی، عطاء، مجاہد وغیرہ نے روایت کیا ہے۔

اسباب کثرت روایت:-

(۱) مجلس رسول میں بکثرت شرکت:- آپ چونکہ اصحاب صفہ میں تھے اپنی زندگی کو طلب علم میں لگا رکھا تھا اسلئے مجلس رسول ﷺ میں شرکت کرنے کا زیادہ موقع ملا، لہٰذا روایتوں کی تعداد میں دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ ہو گئی۔

(۲) طول حیات:- آپ کو رسول ﷺ کی وفات کے بعد تقریباً ۵۲ سال کی طویل عمر ملی جس نے آپکو کبار صحابہ سے روایت کرنے پھر اس کی نشر و اشاعت کا زیادہ موقع دیا اس وجہ سے آپ کی روایتوں کی تعداد زیادہ ہوئی اور مکثرین میں شمار ہونے لگے۔

آپ کی جملہ مرویات کی تعداد (۱۱۷۰) ہے، مسند اُحمد میں (۹۵۸) روایتیں ہیں، متفق علیہ روایتیں ۴۳ ہیں۔

---

(۱) تفصیل کیلئے دیکھئے: الاصابة فی تمیز الصحابة ۲۱۲/۱، الحدیث والمحدثون ص ۱۳۵-۱۳۶

آپ کا انتقال مدینہ منورہ میں ۴۷ھ میں ہوا۔[1]

دیگر راویان صحابہ مع تعداد روایت:-

ان سات صحابہ کے علاوہ دو صحابی عبد اللہ بن مسعود اور عبد اللہ بن عمرو بن عاص کو کچھ لوگوں نے مکثرین میں شمار کیا ہے۔[2]

عبد اللہ بن مسعود کی روایتوں کی تعداد مسند بقی میں (۸۴۸) اور مسند احمد میں تکرار کے ساتھ (۸۹۲) ہے۔

عبد اللہ بن عمرو بن عاص کی روایتوں کی تعداد مسند بقی میں (۷۰۰) جبکہ مسند احمد میں (۷۲۴) ہے۔

ان راویان صحابہ میں دو صحابی اور ہیں جن کے روایتوں کی تعداد پانچ سو سے اوپر ہیں وہ یہ ہیں:

عمر بن خطاب آپ کی روایتوں کی تعداد ۵۳۷ ہے۔

علی بن اَبی طالب آپ کی روایتوں کی تعداد ۵۳۶ ہے۔

جن لوگوں کی روایتوں کی تعداد ایک سو سے اوپر ہے وہ یہ ہیں:

اُم سلمہ ہند بنت ابی امیہ رضی اللہ عنہا	۳۶۷
ابو موسی اشعری	۳۶۰
براء بن عازب	۳۰۵
ابوذر غفاری	۲۸۱
سعد بن اَبی وقاص	۲۷۱
ابو امامۃ الباہلی	۲۷۰
حذیفہ بن یمان	۲۲۵
سہل بن سعد الساعدی	۱۸۸
عبادۃ بن صامت	۱۸۱
عمران بن حصین	۱۸۰
ابو الدرداء	۱۷۹
ابو قتادہ	۱۷۰
بریدہ بن حصیب	۱۶۷

(۱) تفصیل کیلئے دیکھئے: الاصابة فی تمییز الصحابة ۳۴/۲، السنة قبل التدوین ص۴۸، الحدیث والمحدثون ص۱۳۴ (۲) الباعث الحثیث ص ۱۸۷

ابی بن کعب	۱۶۴
معاویہ بن ابوسفیان	۱۶۳
معاذ بن جبل	۱۵۷
ابوایوب انصاری	۱۵۵
عثمان بن عفان	۱۴۶
جابر بن سمرہ	۱۴۶
ابو بکر صدیق	۱۴۲
مغیرہ بن شعبہ	۱۳۶
ابو بکرۃ نفیع بن حارث	۱۳۲
اسامہ بن زید	۱۲۸
ثوبان مولی رسول اللہ	۱۲۸
نعمان بن بشیر	۱۱۴
ابو مسعود انصاری	۱۰۲
جریر بن عبداللہ البجلی	۱۰۰

ان کے علاوہ پچیس افراد ایسے ہیں جن کی روایتیں پچاس سے اوپر ہیں۔

۵۷ افراد ایسے ہیں جن کی روایتیں بیس سے پچاس کے درمیان ہیں۔
۶۱ افراد ایسے ہیں جن کی روایتیں دس سے بیس کے درمیان ہیں۔
۱۳۲ افراد ایسے ہیں جن کی روایتیں پانچ سے دس کے درمیان ہیں۔
۵۴ افراد ایسے ہیں جن کی چار چار روایتیں ہیں۔
۷۴ افراد ایسے ہیں جن کی روایتیں تین تین ہیں۔
۱۲۳ افراد ایسے ہیں جن کی روایتیں دو دو ہیں۔
۴۴۸ افراد ایسے ہیں جن کی روایتیں صرف ایک ایک ہیں۔ (۱)

اس طرح سے راویان صحابہ کی تعداد لگ بھگ ایک ہزار ہوتی ہے ان صحابہ سے جو روایتیں مروی ہیں عموماً مکثرین صحابہ سے بھی وہ روایتیں مروی ہیں، اور سب کے سب الحمد للہ ثقہ اور عادل اور صاحب فضیلت ہیں۔

(۱) ملاحظہ ہو جوامع السیرۃ صفحہ ۲۷۵-۳۱۵

کنیت سے مشہور صحابہ:-

بہت سارے صحابہ ایسے ہیں جو اپنی کنیت سے زیادہ معروف ہیں نام سے اتنا مشہور نہیں بلکہ ان میں سے بعض ایسے ہیں جن کی کنیت معلوم ہے نام معلوم نہیں۔

وہ حضرات جو کنیت سے معروف ہیں اور ان کا نام بھی ہے ان میں سے کچھ مشہور حضرات یہ ہیں:

کنیت	نام
ابو اُسید الساعدی	مالک بن ربیعہ
ابو امامہ الباہلی	صُدَیّ بن عجلان
ابوایوب انصاری	خالد بن زید
ابو بردہ اشعری	عامر بن قیس
ابو بردہ بلوی	ہانی بن نیار
ابو برزہ اسلمی	نضلہ بن عبید
ابو بکر صدیق	عبد اللہ بن ابی قحافہ
ابو بکرہ	نفیع بن الحارث
ابو ثعلبہ الخشنی	جرثوم
ابو جحیفہ السوائی	وہب بن عبد اللہ
ابو حمید الساعدی	عبد اللہ بن عمرو
ابو الدرداء	عویمر بن عامر
ابوذر الغفاری	جندب بن جنادۃ
ابو رافع مولی رسول اللہ	اُسلم یا (ابراہیم)
ابو رفاعہ العدوی	عبد اللہ بن الحارث
ابو سعید خدری	سعد بن مالک
ابو سفیان بن حرب	صخر بن حرب
ابو السمح خادم النبی ﷺ	زیاد

ابو شریح الخزاعی	کعب بن عمرو، (یا خویلد)
ابو الطفیل لیثی	عامر بن واثلہ
ابو طلحہ انصاری	زید بن سہل
ابو طیبہ حجام	میسرۃ
ابو عبیدہ بن الجراح	عامر بن عبد اللہ
ابو قتادہ	حارث بن ربعی
ابو قحافہ	عثمان والد ابو بکر
ابو کبشہ انماری	سلمان مولی النبی ﷺ
ابو لبابہ انصاری	رفاعہ بن عبد المنذر
ابو محذورہ	سمرہ بن معیر
ابو مرثد غنوی	کناز بن حصن
ابو مسعود البدری	عقبہ بن الحارث
ابو موسیٰ اشعری	عبد اللہ بن قیس
ابو ہریرہ دوسی	عبد الرحمٰن بن صخر
ابو ہند الداری	عبد اللہ بن اوس (تمیم داری کے بھائی)(۱)

وہ صحابہ جو صرف اپنی کنیت سے معروف ہیں جن کا نام یا تو ہے ہی نہیں، یا نام معلوم نہیں ان میں سے کچھ مشہور حضرات یہ ہیں:

ابو ازہر انماری	....
ابو رہم شاعر	....
ابو زرارہ انصاری	....
ابو سلمی خادم النبی ﷺ	....
ابو شاہ یمانی	....
ابو شعیب انصاری (طباخ)	....

(۱) یہ سارے کنی "اسماء من یعرف بکنیته من الصحابة للازدی" سے ماخوذ ہیں۔

ابو عزیز بن عمیر (مصعب بن عمیر کے بھائی)

ابو نہیک اشہلی ....

ابو غزیہ انصاری ....

ابو فراس اسلمی ....

ابو نیل خزاعی ....

ابو قاسم مولی ابو بکر ....

ابو ناجیہ ....

ابو وہب الجشمی ....

ابو لاس الخزاعی(۱) ....

وہ صحابیات جو کنیت سے مشہور ہیں وہ یہ ہیں۔

ام حبیبہ زوج النبی ﷺ	رملۃ بنت ابو سفیان
ام الدرداء الکبری	خیرۃ بنت حدرد
ام سلمہ زوج النبی ﷺ	ہند بنت ابی امیہ
ام عطیہ انصاریہ	نسیبہ بنت حارث
ام عمارہ انصاریہ	نسیبہ بنت کعب
ام فضل (امرأۃ عباس)	لبابہ بنت الحارث
ام معبد	عاتکہ بنت خلیف
ام ہانی	فاختہ بنت ابو طالب (۲)

آخری صحابی:۔

وہ صحابی جن کا انتقال سب سے آخر میں ہوا ہے وہ: عامر بن واثلہ ابو الطفیل لیثی ہیں، جن کا انتقال آخری قول کے مطابق ۱۱۰ھ ہے، یعنی رسول اللہ ﷺ کے اس قول کے ٹھیک ایک سو سال بعد، جس میں آپ نے فرمایا تھا کہ: جتنے حضرات آج روئے زمین پر موجود ہیں ایک سو سال کے اندر اندر سب کا انتقال ہو جائے گا۔(۳)

(۱) الکنی لمن لا یعرف له اسم من اصحاب رسول ﷺ للازدی

(۲) أسماء من یعرف بکنیته من الصحابة للازدی

(۳) مقدمة ابن الصلاح ص ۲۷۰. فتح المغیث ۱۲۸/٤

ان کی وفات کے سلسلہ میں کچھ اور اقوال بھی ہیں:[1]

البتہ مختلف شہروں میں جن صحابہ کا انتقال آخر میں ہوا ہے وہ یہ ہیں:

مکہ مکرمہ میں	ابوالطفیل	۱۱۰ھ
مدینہ منورہ میں	محمود بن ربیع	۹۹ھ وقیل جابر بن عبداللہ ۷۸ھ
طائف میں	عبداللہ بن عباس ۶۸ھ	
بصرہ میں	انس بن مالک	۹۳ھ
کوفہ میں	عبداللہ بن اُبی اوفی ۸۶ھ	ازروئے وفات بیعۃ الرضوان میں شریک ہونے والے آخری صحابی
شام میں	عبداللہ بن بسر	۸۸ھ یا ۹۶ھ
دمشق میں	واثلہ بن اسقع	۸۳ھ یا ۸۵،۸۶ھ
مصر میں	عبداللہ بن حارث بن جزء زبیدی ۸۶ھ	
جزیرہ میں	عرس بن عمیر کندی	
اصبہان میں	نابغہ الجعدی قیس بن عبداللہ شاعر جن کو طویل زندگی ملی تھی۔	
سمرقند میں	قثم بن عباس۔[2]	
یمامہ میں	ہرماس بن زیاد باہلی متوفی ۱۰۲ھ	
خراسان میں	ابو برزہ اسلمی متوفی ۶۴ھ	

مقام تراجم

صحابہ کرام کی سیرت، ان کے حالات وواقعات، ان کے بارے میں معلومات عام طور سے ان ساری کتابوں میں دستیاب ہیں، جو راویان حدیث کے حالات معلوم کرنے کیلئے تحریر کی گئی ہیں، مثلاً کتب طبقات، کتب ثقات، کتب بلدان، کتب تواریخ محلیہ، کتب تواریخ عامہ، کتب القاب وأنساب، کتب ضبطِ اسماء اور عام کتب رجال وغیرہ، اس سلسلہ میں متقدمین میں جن حضرات کی کتابیں مشہور ہیں ان میں علامہ ابن

(۱) صحیح بخاری، کتاب العلم ۲۱۱/۱ حدیث نمبر (۱۱٦) صحیح مسلم، فضائل الصحابة ۱۹٦٥/٤ حدیث نمبر (۲٥۳۷)

(۲) مقدمة ابن الصلاح ص ۲۷۰-۲۷۱، فتح المغیث ۱۳۳/٤-۱٤٤

سعد (متوفی ۲۳۰ھ) خلیفہ بن خیاط (متوفی ۲۴۰ھ) امام علی بن المدینی (متوفی ۲۳۴ھ) امام بخاری (متوفی ۲۵۶ھ) امام مسلم (متوفی ۲۶۱ھ) امام ترمذی (متوفی ۲۷۹ھ) ابن ابی خیثمہ (متوفی ۲۹۸ھ) خاص طور سے قابل ذکر ہیں، اسی طرح سے علامہ ابن حبان (متوفی ۳۵۴ھ) ابن ابی حاتم الرازی (متوفی ۳۲۷ھ) وغیرہ ہیں۔[1]

لیکن صرف ان کتابوں پر اکتفانہ کرتے ہوئے ان کے بارے میں مخصوص و متنوع کتابیں بھی تحریر کی گئی ہیں مثلاً مسانید، معاجم، مفردات و وحدان وغیرہ اور پھر معرفۃ الصحابہ کے عنوان سے مکمل سیرت و سوانح کی کتابیں تصنیف کی گئیں، جن میں ان سے متعلق معلومات کو اکٹھا کر دیا گیا، اس طرح کتابوں میں سب سے پہلے کتاب بقول حافظ ابن حجر امام بخاری کی کتاب ہے، جس سے امام ابو القاسم بغوی (متوفی ۳۱۷ھ) وغیرہ نے استفادہ کیا ہے۔[2] آپ کے بعد متاخرین میں دیگر حضرات نے آپ کے نقش قدم پر کام کیا، جن کی بہت بڑی تعداد ہے اور بقول ابن حجر جن کا شمار بہت مشکل ہے۔[3]

انہیں لوگوں میں محمد بن عبداللہ مطین (متوفی ۲۹۷ھ)، عبداللہ بن احمد عبدان (متوفی ۳۰۶ھ) وابو بکر عبداللہ بن ابو داود (متوفی ۳۱۶ھ)، وامام ابو القاسم عبداللہ بن محمد بغوی (متوفی ۳۱۷ھ)، ابو عبداللہ اسحٰق بن محمد بن مندہ (متوفی ۳۹۵ھ)، ابو نعیم احمد بن عبداللہ اصبہانی (متوفی ۴۳۰ھ)، ابو موسیٰ المدینی محمد بن ابو بکر (متوفی ۵۸۱ھ) وغیرہ ہیں۔ اس طرح سے اس فن میں بے شمار کتابیں وجود پذیر ہوئیں، لیکن ان میں سے جن کتابوں کو کافی شہرت ملی وہ چار ہیں اور وہی اس فن کی بنیادی اور اہم کتابیں ہیں۔ وہ یہ ہیں:

الاستيعاب في معرفة الأصحاب: تالیف حافظ ابن عبدالبر قرطبی (متوفی ۴۶۳ھ)

أسد الغابة في معرفة الصحابة: تالیف ابن اثیر جزری (متوفی ۶۳۰ھ)

تجريد أسماء الصحابة : تالیف امام ابو عبداللہ ذہبی (متوفی ۷۴۸ھ)

الاصابة في تمييز الصحابة : تالیف حافظ ابن حجر عسقلانی (متوفی ۸۵۲ھ)

ان کتابوں کا مختصر تعارف پیش خدمت ہے:

---

(۱) الاستیعاب ۱/۱۰، الاصابة ۱/۲-۳ (۲) الاصابة ۱/۲

(۳) الاصابة ۱/۲

۱- الاستیعاب فی معرفۃ الأصحاب

تالیف حافظ ابن عبدالبر قرطبی (متوفی ۴۶۳ھ)

مولف:- یہ کتاب حافظ مغرب ابو عمر یوسف بن عبد اللہ بن محمد بن عبدالبر قرطبی اندلسی (متوفی ۴۶۳ھ) کی تالیف ہے۔

مصادر:- اس کتاب کو تحریر کرنے کیلئے آپ نے سابقہ تحریر شدہ کتابوں پر اعتماد کیا ہے، اور ان سے گرانقدر معلومات لے کر اس کتاب میں اکٹھا کر دیا ہے، جن کتابوں سے زیادہ استفادہ کیا ہے ان کا ذکر اور جن واسطوں سے ان کو یہ کتابیں یا معلومات پہنچی ہے اس کی اسناد کو کتاب کے مقدمہ میں تحریر کر دیا ہے۔[1]

ترتیب:- یہ کتاب بنیادی طور سے حروف معجم پر مرتب ہے، لیکن ترتیب میں صرف پہلے حرف کا خیال کیا گیا ہے۔ یہی ترتیب اس دور میں بہتر تصور کی جاتی تھی، بعد میں ترتیب میں مزید ترقی ہوئی۔

ہر حرف میں مشترک ناموں سے موسوم صحابہ کو ذکر کرنے کے بعد آخر میں "باب الأفراد" کا عنوان قائم کیا ہے، اس باب میں ان ناموں کا ذکر ہے جو مفرد ہیں (یعنی اس نام کا کوئی دوسرا اصحابی نہیں) مشترک اسماء کو بھی باب کے تحت ذکر کیا ہے، مثلاً "باب ابراہیم" کتاب کا پہلا باب "باب اُبی" ہے، اس میں "اُبی" کے نام سے موسوم سارے صحابہ کو جو مؤلف کے علم میں آسکے ذکر کر دیا ہے، اس کے بعد اُسید، پھر اسامۃ، انیس، امیہ، اُہبان کا باب علی الترتیب ہے۔ حرف "الف" سے شروع ہونے والوں کے ختم ہونے کے بعد حرف "ب" سے شروع ہونے والے ناموں کا ذکر سابقہ ترتیب پر کیا ہے، ساری کتاب اسی ترتیب پر حرف "ی" تک مرتب ہے، ناموں کے خاتمہ کے بعد کنیت سے مشہور صحابہ کو سابقہ ترتیب پر ذکر کیا ہے، صحابہ کے تراجم کے خاتمہ کے بعد صحابیات کے نام و تراجم، پھر آخر میں ان میں سے جو کنیت سے مشہور ہیں ان پر کتاب کا خاتمہ کیا۔

موضوع:- اس میں ان صحابہ کے ساتھ ساتھ جن کی صحبت عرفی ثابت شدہ ہے، ان حضرات کا بھی تذکرہ کیا ہے جن کی رسول سے صرف ملاقات ہوئی ہے، اگرچہ

---

(۱) الاستیعاب ۱/۱۰-۱۲

زندگی میں ایک ہی بار کیوں نہ ہو، اس طرح سے ان کا بھی ذکر خیر کر دیا ہے جنہوں نے رسول کو دور سے دیکھا، یا جن کی پیدائش آپ کے دور میں (کسی مسلم گھرانے یا مسلمان والدین کے درمیان) ہوئی ہے، آپ نے ان کو دیکھا، دعا کیا یا **تحنیك** کی۔(۱)

نوعیت تراجم:- تراجم صحابہ میں نام و نسب کے بیان پر خصوصی توجہ دیا ہے، اس کے ساتھ ساتھ واقعات اور غزوات میں شرکت کا ذکر اور کبھی کبھی بر سبیل مثال صحابی کی ایک دو روایت کو نقل کیا ہے، صحابی نے کس شہر کو اپنا وطن بنایا اگر مل سکا تو اس کی جانب بھی اشارہ کر دیا ہے۔

وجہ تسمیہ:- کتاب کا نام آپ نے "الاستیعاب" رکھا ہے۔ حافظ ابن حجر اور علامہ کتانی کے کہنے کے مطابق نام رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ اس میں سارے اصحاب کا نام آگیا ہے، اس طرح سے یہ کام مکمل ہو گیا، حالانکہ ان سے بہت سارے نام فوت ہو گئے ہیں۔(۲)

ان بزرگوں کا یہی خیال ہے، حالانکہ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ انہو نے اس طرح کا دعویٰ نہیں کیا ہے، بلکہ انکا یہ کہنا ہے کہ "أرجو أن يكون كتابى أكثر كتبهم تسمية، و أعظمها فائدة، و أقلهامؤنة، على أنى لا أدعى الاحاطة بل اعترف بالتقصير" (۳)

میرا خیال ہے کہ میری یہ کتاب سابقہ کتابوں کے مقابلہ میں اسم با مسمیٰ ہونے میں زیادہ مناسب اور ان سے زیادہ مفید ہے، (اسکے استعمال میں) پریشانی و مشقت بہت کم ہے، لیکن میں احاطہ کا دعویٰ نہیں کرتا بلکہ کوتاہی کا اعتراف کرتا ہوں۔

حافظ ابن الصلاح کا تبصرہ:- حافظ ابن الصلاح (متوفی ۶۴۲ھ) فرماتے ہیں کہ: ابن عبدالبر کی کتاب "الاستیعاب" میں اگر دو چیزیں نہ ہوتیں تو بہت مفید ہوتی۔

۱- پہلی چیز یہ ہے کہ انہوں نے صحابہ کے درمیان بہ تقاضاء بشریت ہونے والے اختلاف اور ٹکراؤ کا ذکر کر دیا ہے۔

۲- دوسری چیز یہ ہے کہ انہوں نے اس طرح کے واقعات کو قصہ گو اور اخباریین کے

---

(۱) الاستيعاب ۱۳/۱ (۲) الاصابة ۳/۱، الرسالة المستطرفة ص ۹۶

(۳) الاستيعاب ۱۳/۱

واسطوں سے لیا ہے نہ کہ محدثین سے۔[1]

یہ تبصرہ بہت زیادہ وجیہہ نہیں معلوم ہوتا کیونکہ بحیثیت سیرت نگار یہ ان کی ذمہ داری تھی جو فائدے سے خالی نہیں، بظاہر اس کے ذکر کرنے میں ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ دشمنانِ دین یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے کہ محدثین نے اپنے بزرگوں کی بعض باتوں یا ان کے عیوب کو چھپالیا ہے۔

نیز ان واقعات کے ذکر کرنے کا مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صحابہ کرام بھی انسان تھے اور انسانوں سے جو فطری غلطی سرزد ہو سکتی ہے، وہ ان سے بھی ہوئی ہے، لہٰذا دوسرے لوگوں سے غلطی سرزد ہونے کا زیادہ امکان ہے، اس لئے شخصیات میں غلو پسندی سے پرہیز کرنا چاہئے، انبیاء کے علاوہ کوئی معصوم عن الخطاء نہیں ہے۔

مختصرات اور ذیول:- یہ کتاب چونکہ سابقہ کتابوں کے مقابلے میں زیادہ منظم اور زیادہ معلومات والی تھی اس لئے اہل علم کے درمیان اس کی بڑی پذیرائی ہوئی، کچھ لوگوں نے اس کی ذیل تحریر کی تو کسی نے مختصر کیا، ان مختصرات میں ”أعلام الإصابة بأعلام الصحابة“ محمد یعقوب خلیلی کی، اور ”روضة الأحباب في مختصر الاستيعاب“ شهاب الدين محمد یوسف اذرعی کی ہے، اس کے ذیول میں: ابن فتحون اندلسی کی ذیل سب سے اچھی ہے جو تقریباً اس کے مساوی ہے۔[2]

تعداد صحابہ:- اس کتاب میں (۴۲۲۵) صحابہ وصحابیات کا تذکرہ ہے۔

۲- أسد الغابة في معرفة الصحابة

تالیف ابن اثیر جزری (متوفی ۶۳۰ھ)

مؤلف:- یہ کتاب حافظ ابن اثیر جزری ابو الحسن علی بن محمد (متوفی ۶۳۰ھ) کی تالیف ہے۔

مصادر کتاب:- اس کتاب کی تالیف میں آپ نے جن کتابوں سے مدد لی ہے وہ اس فن کی سابقہ کتابیں ہیں، خصوصیت کے ساتھ چار کتابوں پر زیادہ انحصار کیا ہے۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ: صحابہ کے بارے میں جن لوگوں نے تالیفات

(۱) مقدمة ابن الصلاح ۲۶۲-۲۶۳ ۔ (۲) الرسالة المستطرفة ص ۱۵۲

کی ہیں ان کا شمار بہت مشکل ہے۔[اس لئے کہ یہ کام متقدمین اور متاخرین دونوں نے کیا ہے۔]اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہا یہاں تک کہ ساتویں صدی کی ابتدا میں حافظ ابن اثیر آئے جنہوں نے ایک بہت عظیم کتاب تیار کی جس میں بہت ساری سابقہ کتابوں کو جمع کر دیا۔[۱]

ان میں سے ہر کتاب میں جو اہم معلومات تھی ان کا خلاصہ اس کتاب میں جمع کر دیا ہے، اور ہر نام کے ساتھ ان کتابوں کا حوالہ اشارہ میں دے دیا ہے تاکہ یہ پتہ چل جائے کہ صاحب ترجمہ کے بارے میں معلومات کس کتاب یا کن کتابوں سے لی گئی ہے، وہ کتابیں یہ ہیں:

۱- حافظ ابو عبداللہ بن مندہ (متوفی ۳۹۵ھ) کی کتاب "معرفة الصحابة" جس کا اشارہ حرف (د) ہے۔

۲- حافظ ابو نعیم اصبہانی (متوفی ۴۳۰ھ) کی کتاب "معرفة الصحابة" جس کا اشارہ حرف (ع) ہے۔

۳- حافظ ابن عبد البر قرطبی (متوفی ۴۶۳ھ) کی کتاب "الاستیعاب" جس کا اشارہ حرف (ب) ہے۔

٤- حافظ ابو موسیٰ المدینی (متوفی ۵۸۱ھ) کی کتاب جسکا اشارہ حرف (س) ہے۔[۲]

بہت سارے صحابہ ایسے ہیں جن کا تذکرہ ان ساری کتابوں میں ہے ایسی صورت میں ہر کتاب کا حوالہ صاحب ترجمہ کے نام کے ساتھ دے دیا ہے، اور بہت سے ایسے ہیں جن کا تذکرہ ہر کتاب میں نہیں بلکہ بعض میں ہے اور بعض میں نہیں، لہٰذا جس کتاب میں ان کا تذکرہ ہے صرف اسی کا حوالہ دیا گیا ہے۔

بہت ساری معلومات اور ناموں کا اضافہ ایسا ہے جو مؤلف کی ذاتی معلومات پر مبنی ہے، جو انہوں نے اپنے مشایخ کے واسطہ سے حاصل کیا تھا۔

ترتیب:- کتاب کی ترتیب انتہائی دقیق اور منظم طور سے حروف معجم پر کی گئی ہے، اس لئے کسی بھی نام کو تلاش کرنے کیلئے کوئی پریشانی نہیں ہوتی، مطلوبہ نام جس حرف سے

---

(۱) الاصابة ۳/۱ (۲) اسد الغابة (۱ / ۵) مقدمہ کتاب

شروع ہوتا ہے اس حرف کی جگہ نکال کر جہاں ترتیب میں یہ نام فٹ ہوتا ہے وہاں دیکھنے سے بآسانی مل جائے گا۔ پوری کتاب کی ترتیب حرف ''الف'' سے لے کر حرف ''ی'' تک اسی طرح سے ہے، کتب صحابہ میں سب سے اچھی اور آسان ترتیب اسی کتاب کی ہے، ناموں کے ختم ہونے کے بعد کنیت سے معروف حضرات کا تذکرہ ہے، اس کے بعد خواتین (صحابیات) کاذکر سابقہ ترتیب پر کیا ہے، اور آخر میں کنیت سے معروف صحابیات کاذکر کیا ہے۔

نوعیت تراجم:- صحابہ کے تراجم میں ان کے حسب ونسب، ان سے متعلق اُن واقعات کا جس سے صحابی کی صحبت کا پتہ چلتا ہے خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے، مثال کے طور پر بعض حدیثوں کا بھی تذکرہ کیا ہے جس میں اختصار ملحوظ رکھا ہے، کثرت طرق، اسناد اور علل حدیث پر گفتگو نہیں کیا ہے، اس لئے کہ یہ چیزیں تراجم کے کتاب کیلئے موزوں نہیں۔[(۱)]

ابن حجر کی تنقید:- حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ: انہوں نے اس کتاب میں وہی غلطی کی ہے، جو سابقہ مصنّفین سے ہوئی تھی، اسی لئے بہت سے ایسے حضرات جو حقیقت میں صحابی نہیں ہیں اس کتاب میں ان کا ذکر آگیا ہے، نیز ان حضرات کی کتابوں میں جو دیگر غلطیاں تھیں جن پر نقد کی ضرورت تھی ان میں بہت ساری غلطیوں کو نظر انداز کردیا ہے۔[(۲)]

مختصرات:- چونکہ یہ کتاب اپنے دور تک کی کتابوں میں سب سے زیادہ جامع، سابقہ کتابوں کی نچوڑ اور حسن ترتیب میں ممتاز تھی اس لئے اہل علم نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور مختلف طرح سے اس کی خدمت کی، کچھ نے ذیل تحریر کیا تو کچھ نے اختصار کیا، ان ہی مختصرات میں سے ''تجريد أسماء الصحابة'' ہے جس کاذکر آرہا ہے۔

تعداد صحابہ:-

اس کتاب میں جملہ (۷۵۵۴) سات ہزار پانچ سو چون افراد کا ترجمہ ہے۔

---

(۱) بحوث فی تاریخ السنة ص ۷۳
(۲) الاصابة فی تمییز الصحابة ۳/۱

۳ - تجرید أسماء الصحابة

تالیف امام ابو عبداللہ ذہبی (متوفی ۷۴۸ھ)

مؤلف:-اس کتاب کے مصنف آٹھویں صدی کے ممتاز محدث، عظیم مورخ امام ابو عبداللہ محمد بن احمد بن عثمان ذہبی (متوفی ۷۴۸ھ) ہیں۔

مصادر مؤلف:- یہ کتاب علامہ ابن اثیر کی کتاب "أسد الغابة" کا خلاصہ اور اختصار ہے۔ اس میں ان سارے صحابہ و صحابیات کا مختصراً ذکر موجود ہے، جن کے تراجم "أسد الغابة" میں ہیں، لہٰذا اس کے بنیادی مصادر وہی ہیں جو "أسد الغابة" کے ہیں۔ کچھ اضافی کام دیگر مصادر سے بھی کیا ہے۔

نوعیت تراجم :-اس کتاب کے تراجم بہت مختصر ہیں، صرف راوی کا نام ونسب اور انتہائی ضروری معلومات ہی کا تذکرہ ہے، اس لئے تراجم عموماً سطر دوسطر کے ہیں۔

ترتیب کتاب:-کتاب کی ترتیب بالکل اپنے اصل کی طرح بڑی دقت سے حروف معجم پر مرتب ہے۔ پہلے صحابہ کا نام پھر ان کی نسبت، اس کے بعد صحابیات کے نام و کنیت ہے۔ جو بھی اضافی نام ذکر کیا ہے اس کو ترتیب میں جہاں فٹ ہو سکتا تھا تحریر کر دیا ہے، لہٰذا کتاب سے استفادہ بہت ہی آسان ہے۔

اضافه اور اصلاح:-امام ذہبی نے بہت سارے ناموں کا اضافہ ذاتی معلومات اور دیگر مصادر و مراجع سے کیا ہے مثلاً: تاریخ الصحابة الذین نزلوا حمص، و تاریخ دمشق، مسند أحمد، مسند بقی بن مخلد، حواشی الاستیعاب، طبقات کبری محمد بن سعد، ابو الفتح بن سید الناس کی کتاب الشعراء وغیرہ[1]

اس طرح ایک اہم کام یہ کیا ہے کہ جن کا نام غلطی سے صحابہ میں آگیا تھا، یا جن کی صحبت صحیح نہیں اس کی وضاحت کر دی ہے، آپ کے قلمی نسخہ میں جو نام سرخ قلم سے تحریر ہے وہ تابعی، اور جس نام پر سرخ قلم سے علامت تضبیب ہے یہ وہ حضرات ہیں جو غلطی سے صحابہ میں شمار ہیں۔[2]

---

(۱) تجرید أسماء الصحابة مقدمه مولف (۱/ب)

(۲) الاصابة فی تمییز الصحابة (۱/۳)

لیکن حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ :وہ یہ کام مکمل نہ کر سکے اور نہ تکمیل کے قریب پہنچے۔[1]

البتہ شروع میں جو اشارے میں وہ ان کا اضافہ ہے اور اس میں یہ بتانا مقصد ہے کہ صاحب ترجمہ کی روایت کتب ستہ میں سے کس کتاب میں موجود ہے، اس میں وہی حروف بطور اشارہ مستعمل ہیں جو کتب ستہ کیلئے معروف ہیں۔ (خ،م،د،ت،ن،ق)

اگر ابتداء میں حرف "ہ" کا اشارہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی روایت مسند احمد میں موجود ہے، اور اگر حرف "د"[2] کا اشارہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ: مسند بقی بن مخلد میں ان کی ایک روایت، اور اگر حرف "س" ہے تو اس کا مطلب ہے کہ مسند بقی میں ان کی دو روایتیں ہیں۔[3]

تعداد:- اس کتاب میں جملہ (٨٨٦٦) افراد کا ذکر ہے، اس طرح سے اپنی اصل پر تقریباً چار ہزار چھ سو اکتالیس تراجم کا اضافہ ہے جو اصل سے بھی زیادہ ہے، امام ذہبی فرماتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ :"إن المذكورين في كتابي هذا يبلغون ثمانمأة ألف نفس و أكثر هم لا يعرفون"[4] اس کتاب میں مذکور حضرات کی تعداد آٹھ ہزار ہے جن میں اکثر غیر معروف ہیں۔

٤ - الاصابة فی تمییز الصحابة

تالیف حافظ ابن حجر عسقلانی (متوفی ٨٥٢ھ)

مؤلف:- یہ کتاب اس فن کی سب سے اہم، جامع، مشہور اور آخری کتاب ہے، جس کے مولف خاتمۃ الحفاظ: حافظ شہاب الدین ابو الفضل احمد بن علی بن حجر عسقلانی (متوفی ٨٥٢ھ) ہیں۔

مصادر کتاب:- سابقہ کتابوں میں سے اس فن کی جتنی کتابیں آپ کو دستیاب ہو سکیں خواہ وہ چھوٹی رہی ہوں یا بڑی، حاشیہ ہو یا تعلیق ہر ایک سے استفادہ کیا ہے۔ ان کے علاوہ جرح و تعدیل و اسماء رجال کی کتابوں، کتب طبقات، کتب تواریخ محلیہ، کتب بلدان، ضبط اسماء رجال، کتب انساب، کتب القاب و کنی، کتب تواریخ عامہ، کتب

---

(١) تجريد أسماء الصحابة مقدمه مؤلف (١/ب)

(٢) ایسی صورت میں سنن ابو داؤد سے یہ رمز متعارض ہو جاتا ہے جو پریشانی کا باعث ہے۔

(٣) تجريد أسماء الصحابة (١/ج) (٤) تجريد أسماء الصحابة (١/ج)

حدیث و تفسیر، ادب و لغت وغیرہ سے بھی استفادہ کیا ہے، اس طرح سے مشہور اسلامی فنون کی کتابوں کو کھنگال ڈالا، اس وجہ سے ان سے کوئی نام شاذ و نادر ہی چھوٹا ہوگا۔

علامہ کتانی فرماتے ہیں کہ: مؤلف نے اس کتاب میں "الاستیعاب" اور اس کے جملہ ذیول" أسد الغابة " و"تجريد أسماء الصحابة" کے معلومات کو جمع کر کے بہت سارا اضافہ کیا ہے۔[1]

ترتیب کتاب:- یہ کتاب بنیادی اعتبار سے حروف معجم پر بڑی دقت سے مرتب ہے، سب سے پہلے اُسماء صحابہ پھر ان کی کنیت، ان کے بعد اسماء صحابیات اور پھر ان کی کنیت کا تذکرہ کیا ہے، مطبوعہ نسخہ کی پہلی طباعت کے اعتبار سے، پہلی دوسری اور تیسری جلد میں اُسماء صحابہ ہے، چوتھی جلد میں کنیت صحابہ، اُسماء صحابیات اور ان کی کنیت ہے، لیکن اس کتاب سے استفادہ کیلئے صرف اتنی معلومات کافی نہیں بلکہ اس کے اقسام کی معلومات ضروری ہے۔

اقسام کتاب:- اس کتاب کے ہر ہر حرف کو مؤلف نے چار قسموں میں تقسیم کیا ہے، اور پھر ہر قسم کو حروف معجم پر مرتب کیا ہے۔

۱ - **پہلی** قسم میں ان صحابہ کا ذکر ہے جن کے صحابی ہونے کی صراحت کسی روایت میں موجود ہو، خواہ اس کی سند صحیح ہو، یا حسن ہو، یا ضعیف ہو، یا کہیں اس طرح سے تذکرہ آیا ہو جو صحبت پر دلالت کرے۔

۲ - **دوسری** قسم میں ان کم سن بچوں کا ذکر ہے جو رسول کے زمانہ میں پیدا ہوئے لیکن رسول کے انتقال کے وقت وہ سن تمیز کو نہیں پہنچے تھے۔

ان حضرات کو اس بنیاد پر صحابہ میں شمار کیا ہے کہ اللہ کے رسول نے ان بچوں کو دیکھا ہوگا، ان کیلئے دعائیں کی ہوں گی، ان کی تحنيك کی ہوگی، جیسا کہ اہل مدینہ کی عام عادت تھی کہ بچوں کی ولادت کے بعد رسول کے پاس حصول برکت کیلئے لاتے تھے، حالانکہ حصول صحبت کا یہ طریقہ مختلف فیہ ہے اور صحابی کی تعریف میں بھی شامل نہیں، اس لئے کہ صحابی کی تعریف میں یہ ہے کہ جس نے رسول کو دیکھا، ایسا نہیں ہے

---

(۱) الرسالة المستطرفة ص ۵۳

جس نے رسول نے دیکھا، اس وجہ سے محققین اہل علم کے یہاں ان لوگوں کی روایتیں رسول سے مرسل مانی جاتی ہیں۔

۳- تیسری قسم میں ان حضرات کا ذکر ہے جو رسول کے زمانہ میں موجود تھے، لیکن رسول سے ملاقات ثابت نہیں خواہ رسول کے زمانہ میں ایمان لائے ہوں یا بعد میں، جن کو اصطلاح میں مخضر مین کہا جاتا ہے، کتب صحابہ میں ان کا نام صحابہ سے قربت کی وجہ سے ذکر کر دیا جاتا تھا۔

٤- چوتھی قسم میں ان لوگوں کا ذکر ہے جن کا نام غلطی اور وہم کی بنیاد پر صحابہ میں آگیا ہے حالانکہ وہ صحابی نہیں۔ (۱)

لہٰذا کتاب سے استفادہ کے وقت یہ ضرور خیال رہے کہ آپ کس قسم میں تلاش رہے ہیں ورنہ کسی مخضرم یا غیر صحابی کو صحابی سمجھ بیٹھیں گے، یا کسی ایک قسم میں نظر ڈالنے سے مطلوبہ نام نہ ملا تو یہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ نام اس کتاب میں موجود نہیں۔

ظاہر بات ہے پہلی قسم ہی کے حضرات صحابہ ہیں، دوسری قسم کے لوگ مختلف فیہ ہیں، جبکہ تیسری اور چوتھی قسم والے صحابی نہیں۔

نوعیت تراجم:-ترجمہ میں صحابی کا نام ونسب اور حتی الامکان جامع معلومات پیش کرنے کی کوشش کی ہے، خاص طور سے غزوات میں شرکت، وطن، علمی یا اداری منصب کا تذکرہ کیا ہے، کہیں کہیں صحابی کی روایت کو بطور مثال پیش کیا ہے، خاص طور سے اگر صحابی کی روایتیں کم ہیں تو اس کو ضرور ذکر کیا ہے، اگر صحابی کی روایت کتب ستہ میں سے کسی کتاب میں ہے تو اس کی بھی وضاحت کر دی ہے، مشکل نام جن کا پڑھنا دشوار ہوتا ہے اس کو ضبط کر دیا ہے، جن کی تاریخ وفات معلوم ہو سکی ان کی تاریخ وفات بھی ذکر کر دیا ہے۔

اضافہ:-سابقہ کتابوں کے مقابلہ میں اس کتاب میں تراجم میں کافی معلومات کا اضافہ ہے، اس کے علاوہ بعض نام جو "أسد الغابة" یا "تجريد أسماء الصحابة" اور ان کے اصول میں نہیں تھے۔ ان کا اضافہ کیا ہے۔ ایسے اضافی ناموں کے تراجم کے ختم ہونے کے بعد حرف "ز" کی علامت لگادی ہے جو زیادتی کی علامت ہے۔ (۲)

---

(۱) الاصابة فی تمییز الصحابة ۱/ ٤-٦ (۲) مقدمة الاصابة

مختصرات:- کتاب کی اہمیت کے پیش نظر حافظ سیوطی نے اس کو مختصر کیا ہے جس کا نام "عین الاصابۃ فی معرفۃ الصحابۃ" رکھا ہے۔

عدد تراجم:- اس کتاب میں جملہ مذکورین کی تعداد جس میں چاروں اقسام شامل ہیں بارہ ہزار تین سو بہتر ہے، اس میں سے پہلی قسم کی تعداد ایک اندازہ کے مطابق تقریباً دس ہزار ہو گی یہ تعداد اس عدد کا دسواں حصہ بھی نہیں جس کو امام ابوزرعہ نے ذکر کیا ہے۔ ان میں روایت کرنے والے صحابہ تقریباً ایک ہزار ہیں جو جملہ تعداد کے مقابلہ میں تقریباً ایک فیصد ہے۔

خلاصہ:- یہ کتاب اس فن کی سابقہ کتابوں کی نچوڑ اور دیگر فنون سے استفادہ کی وجہ سے سب سے جامع کتاب ہو گئی ہے جس پر مزید اضافہ تقریباً نا ممکن ہے، نیز انتہائی قیمتی معلومات، علمی تبصرہ، تحقیق و تدقیق اور دیگر خوبیوں کی وجہ سے سب پر فائق ہے، اس کے بعد کوئی نئی چیز نہیں پیش کی جا سکی، لہٰذا اب یہی مرجع خلائق ہے۔ یہ ساری کتابیں جن کا ذکر ابھی گذرا ہے سب عربی زبان میں ہیں، جو اردو داں طبقہ کیلئے سود مند نہیں۔

ایسے لوگوں کیلئے اردو زبان میں سب سے بہتر کتابیں دار المصنفین اعظم گڈھ کی تیار کردہ کتابیں ہیں، مثلاً خلفاء راشدین، مہاجرین حصہ اول و دوم، انصار حصہ اول و دوم، صحابیات، اُسوہ صحابہ وغیرہ۔ ان ساری کتابوں کو جس میں تابعین، و تبع تابعین بھی شامل ہیں، "سیر الصحابہ" کے نام سے مکمل ایک سٹ میں طبع کر دیا گیا ہے جو نو جلدوں میں ہے، یہ اردو جاننے والوں کیلئے گرانقدر تحفہ ہے۔

دوسرا طبقہ
تابعین عظام

تابعی کا لغوی معنی:-

تابعی: "تبع" سے ماخوذ ہے جو باب "سمع" سے آتا ہے جس کا مصدر تبعا اور تباعاً ہے، اور جس کا معنی ہے کسی کے پیچھے پیچھے چلنا، اس کی مفرد تابع ہے، جس کی جمع تُبَّع، تبَّاع، اور تَبَعَة ہے۔(۱)

علامہ ابن صلاح فرماتے ہیں کہ ان میں سے فرد واحد کو تابع اور تابعی کہا جاتا ہے۔(۲)

(۱) لسان العرب ۸/۲۷ (۲) علوم الحدیث ص ۲۷۱

اصطلاحی تعریف:-

تابعی اس شخص کو کہتے ہیں جس نے کسی صحابی سے حالت ایمان میں ملاقات کیا ہو اور اسی پر اس کا انتقال ہوا ہو۔[1]

یہی تعریف مشہور ہے اور اکثر محدثین کے یہاں معمول بہ ہے۔

علامہ ابن حبان فرماتے ہیں کہ: یہاں اس دیدار اور ملاقات کا اعتبار ہوگا جو سن تمیز میں ہو۔[2]

کچھ حضرات نے یہاں تابعی کے ثبوت کیلئے مجرد ملاقات اور دیدار صحابی کو کافی نہیں سمجھا ہے بلکہ صحبت عرفی ضروری قرار دیا ہے، جبکہ رسول اور صحابی کے درمیان مجرد ملاقات اور دیدار کو صحبت کیلئے کافی سمجھا گیا ہے، اس لئے کہ رسول سے شرف ملاقات کا جو رتبہ ومقام ہے وہ اپنی مثال آپ ہے اس کو یہاں معیار نہیں بنایا جاسکتا اس لئے انہوں نے تابعی کی یہ تعریف کی ہے کہ: "هو من صحب الصحابی"[3]

خطیب بغدادی نے بھی یہی تعریف کی ہے۔

حافظ عراقی فرماتے ہیں کہ خطیب بغدادی نے جو تعریف کی ہے عملاً انہوں نے اس کے خلاف کیا ہے، کیونکہ منصور بن معتمر کو انہوں نے تابعین میں شمار کیا ہے، جب کہ ابن اَبی اُوفی سے ان کی صرف ملاقات ہے صحبت عرفی نہیں ہے، لہٰذا خطیب کی تعریف میں صحبت کو لقاء پر محمول کرنا چاہیئے، تاکہ ان کے قول وفعل میں تضاد نہ ہو، ایسی صورت میں تابعی کی تعریف میں کوئی اختلاف بھی باقی نہیں رہتا۔[4]

تابعی کی مشہور تعریف پر اس حدیث سے استدلال کیا گیا ہے جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ: "طوبى لمن رآنی و آمن بی، و طوبى لمن رأى من ر آنی"[5]

اس لئے کہ یہاں دونوں جگہوں پر مجرد دیدار کا خیال کیا گیا ہے، لہٰذا دونوں مقامات پر حکم ایک جیسا ہوگا۔

تابعین کی معرفت کا فائدہ:-

تابعین کی معرفت کے جو اہم فائدے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:

---

(۱) نزهة النظر ص ۱۰۲ (۲) التقیید والایضاح ص ۳۱۹

(۳) مقدمة ابن الصلاح ص ۲۷۱ (٤) التقیید والایضاح ص ۳۱۹-۳۲۰

(۵) المستدرك ٤/۸٦، علامہ البانی نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ دیکھئے سلسلة الأحادیث الصحیحة، ۳/۳۵۳ حدیث نمبر (۱۵۵٤)

١- ان کی معرفت سے مرسل اور متصل روایت میں فرق معلوم ہو جاتا ہے، صحابہ اور تابعین میں بھی آسانی سے تفریق ہو جاتی ہے، جس سے ہر ایک کے مقام وفضیلت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

٢- تابعین اور تبع تابعین میں تمیز ہو جاتی ہے، اور ان کے مقام میں جو فرق ہے وہ واضح ہو جاتا ہے، اور چونکہ تابعین میں ضعفاء کی تعداد کم ہے اس لئے اس تمیز سے تابعین کی ثقاہت کا ایک رجحان بھی واضح ہو جاتا ہے۔

جو شخص صحابہ اور تابعین، نیز تابعین و تبع تابعین میں فرق نہیں جانتا وہ مرسل و متصل میں فرق نہیں کر سکتا، اور نہ ہی اس فضل کو سمجھ سکے گا جو اللہ تعالیٰ نے ان کیلئے ﴿وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ﴾ [توبہ:١٠٠] میں کیا ہے، اور نہ ہی اس "خیر" کا مصداق معلوم کر سکے گا جس کی بشارت "خير الناس قرني ثم الذين يلونهم" میں دی گئی ہے۔(١)

مخضرمین:-

تابعین کی سب سے پہلی جماعت وہ ہے جو رسول کے زمانے میں تھے ایمان بھی لائے لیکن آپ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ اصطلاح میں ان کو مخضرم کہا جاتا ہے جس کے بارے میں کچھ معلومات یہ ہیں:

مخضرم:- "خضرمة" سے ماخوذ ہے جو "قطع" (کٹا ہو) کے معنی میں آتا ہے۔ "ناقة مخضرمة" اس اونٹنی کو کہا جاتا ہے جس کے کان کٹے ہوئے ہوں۔

زمانہ جاہلیت میں علامت کے طور پر لوگ اونٹنیوں کا کان کاٹ دیا کرتے تھے، اللہ کے رسول ﷺ نے زمانہ جاہلیت میں جس مقام سے کان کاٹ دیا جاتا تھا اسکو منع کر دیا اور دوسری جگہ پر (اشعار کے طور پر) علامت لگانے کا حکم دیا۔(٢) ایسی صورت میں

---

(١) فتح المغيث ٤/١٤٤

(٢) سبط ابن عجمی نے اس روایت کو غلط قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اگر مخالفت مقصود ہوتی تو آپ کاٹنے سے منع کرتے نہ کہ کاٹنے کا حکم دیتے۔ (تذكرة الطالب المعلم فيمن يقال انه مخضرم ص٨)
سنن ابو داؤد میں ایک روایت ہے "قد كنا أسلمنا و خضرمنا آذان النعم" جسکو خطابی نے ضعیف قرار دیا ہے، اور ابو عمر نے حسن کہا ہے۔ جبکہ اس میں شعیث بن زینب متکلم فیہ راوی ہیں۔
دوسرا جواب یہ ہے کہ ان لوگوں نے رسول کو اطلاع دیئے بغیر ایسا کیا تھا، اور اگر حکم دیا ہو گا تو وہ (فليبتكن آذان الانعام) کے نزول کے پہلے کا ہو گا۔ (تذكرة الطالب ص٩)

مخضرم: "أدرك الخضرمتين" کے معنی میں ہوگا، جنہوں نے دونوں قطع (یا دونوں نشان) کا زمانہ پالیا، جو زمانہ جاہلیت میں ہوتا تھا اور جو زمانہ اسلام میں ہوتا تھا۔ (١)

یا اس قطع کے معنی میں ہے جو "مقطوع عن نظرائه" کے معنی میں ہے جس کا حکم اپنے ہم عصروں (ہم مثلوں) سے کٹا ہوا ہے۔ (٢)

ابن اثیر فرماتے ہیں کہ خضرمۃ کا اصل معنی "بین بین" (درمیان) کے ہیں، اس لئے کہ جس کا کان کاٹ دیا جاتا تھا وہ کامل اور ناقص کے درمیان ہو جاتا تھا۔ (٣)

اس لئے خضرمۃ کا معنی "متردد بین الشیئین" سے بھی کیا گیا ہے، گویا کہ ان کے حکم میں تردد ہے کہ یہ صحابی ہیں یا غیر صحابی۔

علامہ جوہری کہتے ہیں کہ "لحم مخضرم" اس گوشت کو کہتے ہیں جس کے بارے میں معلوم نہ ہو کہ یہ نر کا ہے یا مادہ کا ہے۔ (٤)

یہ بھی ممکن ہے کہ مخضرم نقص (کمی) کے معنی میں ہو، صاحب محکم فرماتے ہیں کہ: "رجل مخضرم" ناقص حسب نسب والے کو کہا جاتا ہے، کیونکہ مخضرمین کا درجہ صحابہ کے مقابلہ میں کم ہوتا ہے۔ (٥)

اصطلاحی تعریف:-

محدثین کی اصطلاح میں مخضرم اس شخص کو کہتے ہیں جو جاہلیت اور اسلام دونوں کا زمانہ پایا ہو لیکن رسول سے ملاقات نہ ہوئی ہو۔ (٦)

اہل لغت کی اصطلاح میں: جو جاہلیت اور اسلام دونوں کو پایا ہو اس کو مخضرم کہتے ہیں ان کی تعریف میں ملاقات اور عدم ملاقات کا ذکر نہیں ہے۔

ابن سیدہ کہتے ہیں کہ: جو شخص حالت کفر میں ساٹھ سال اور حالت ایمان میں ساٹھ سال زندہ رہا ہو اس کو مخضرم کہتے ہیں۔ (٧)

---

(١) النهاية فی غريب الحديث ٤٢/٢

(٢) مقدمة ابن الصلاح ص : ٢٧٣، التقييد والايضاح ص ٣٢٢

(٣) النهاية فی غريب الحديث ٤٢/٢ — (٤) الصحاح ١٩١٤/٥

(٥) تذكرة الطالب المعلم فيمن يقال انه مخضرم ص ٨، التقييد والايضاح ص ٣٢٣

(٦) مقدمة ابن الصلاح ص ٢٧٣ — (٧) تذكرة الطالب المعلم ص ٩

ابن حبان نے بھی ان کی موافقت کی ہے۔

لیکن یہ بظاہر غیر صحابہ کیلئے ہے، کیونکہ اس تعریف کے اعتبار سے حضرت حسان، حضرت حکیم بن حزام جیسے حضرات جو ساٹھ سال جاہلیت اور ساٹھ سال حالت ایمان میں باحیات رہے، مخضرم ہوں گے جو صحیح نہیں، نیز یہاں مطلوب محدثین کی اصطلاح ہے نہ کہ لغویین کی۔

جاہلیت کے پانے کا مطلب یہ ہے کہ اپنی قوم یا غیر قوم کو حالت کفر میں فتح مکہ سے قبل پایا ہو، اس لئے کہ اہل عرب فتح مکہ کے بعد بکثرت اسلام میں داخل ہو گئے تھے اور دور جاہلیت یہیں سے ختم ہو گیا تھا۔[1]

مخضرمین کی اچھی خاصی تعداد ہے لیکن امام مسلمؒ نے اپنی کتاب میں صرف بیس افراد کا ذکر کیا ہے، حافظ ابن حجر نے "الاصابة فی تمییز الصحابة" کی قسم ثالث میں ان کا تذکرہ کیا ہے، حافظ برہان الدین حلبی سبط بن عجمی (متوفی ۸۴۱ھ) نے ایک خاص کتاب مخضرمین کے سلسلہ میں تالیف کی ہے جس کا نام "تذکرة الطالب المعلم فیمن یقال إنه مخضرم" رکھا ہے۔ جس میں تقریباً ایک سو چپن افراد کا ذکر کیا ہے انہیں میں سے کچھ مشہور مخضرمین یہ ہیں:

مشہور مخضرمین:-

ابوذویب ہذلی:- (متوفی فی خلافة عثمان) جب یہ مدینہ منورہ پہنچے تو لوگوں کی نگاہیں اشک بار تھیں اور وہ رسول کی رحلت پر سسک رہے تھے، انہوں نے رسول ﷺ کو وفات کے بعد دیکھا اور دفن میں شریک رہے، وہ فرماتے ہیں: قدمت المدينة ولأهلها ضجيج بالبكاء كضجيج الحجيج إذا أهلوا جميعا.[2]

سوید بن غفلہ:- (متوفی ۸۰ھ) ۱۳۰ سال کی عمر میں وفات پائی، یہ اس وقت مدینہ پہنچے جب صحابہ رسول کو دفن کر کے اپنا ہاتھ جھاڑ رہے تھے۔ ع قسمت کی خوبی دیکھئے ٹوٹی کہاں کمند

---

(۱) التقیید والایضاح ص ۳۲٤ (۲) الاصابة ج٤ ق۳/٦٥-٦٦

زید بن وہب جہنی:- (متوفی ۸۴ھ وقیل ۹۶ھ) ہجرت کر کے مدینہ آرہے تھے راستہ میں رسول کی وفات کی خبر ملی۔

قیس بن أبی حازم:- (متوفی ۹۷ھ)

ابو مسلم خولانی:- (متوفی ۶۲ھ) یزید بن معاویہ کے زمانہ تک زندہ رہے۔

ابو عبداللہ صنابحی:- (متوفی ۷۰-۸۰ھ) کے درمیان عبدالملک کی خلافت میں انتقال ہوا۔

ان حضرات کے مدینہ پہنچنے سے چند روز قبل آپکی وفات ہو گئی تھی۔[۱]

کچھ دیگر مخضرمین :-

کعب بن مانع حمیری (کعب احبار) متوفی ۳۲ھ یا ۳۴ھ ۱۴۰ سال کی عمر میں وفات پائی

اُویس القرنی	متوفی ۳۶ھ جنگ صفین میں قتل کیے گئے۔
علقمۃ بن قیس نخعی	متوفی ۶۲ھ
مسروق بن اجدع	متوفی ۶۷ھ
عبیدہ سلمانی	متوفی ۷۲ھ
اسود بن یزید نخعی	متوفی ۷۴ھ
اسلم مولیٰ ابن عمر	متوفی ۸۰ھ
جبیر بن نفیر	متوفی ۸۰ھ
شریح بن حارث قاضی	متوفی ۸۰ھ یا اس کے بعد۔
ابو وائل شقیق بن سلمۃ	متوفی ۸۲ھ یا اس کے بعد۔
ابو العالیہ ریاحی رفیع بن مہران	متوفی ۹۰ھ
ابو عثمان نہدی عبدالرحمٰن بن مل	متوفی ۹۵ھ یا اس کے بعد۔
ابو رجاء العطاردی عمران بن ملحان[۲]	متوفی ۱۰۵ھ

فضائل تابعین:-

راویان حدیث و محافظین سنت کا یہ دوسرا دستہ ہے جنہوں نے صحابہ رسول

(۱) معرفة علوم الحديث ص ٤٤، فتح المغيث ١٥٧/٤

(۲) تذكرة الطالب المعلم "سبط بن عجمي".

سے ملاقات کیا، ان کی صحبت سے فیض یاب ہوئے، ان سے شرف تلمذ حاصل کیا، رسول کی سنت وسیرت کوان سے سیکھا۔

حاملین سنت اور اس کے محافظین کی جو فضیلت ہے وہ اس فضیلت میں برابر کے حقدار ہیں، اس کے علاوہ ان کے کچھ مخصوص فضائل ہیں۔

یہی وہ جماعت ہے جو ﴿وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ﴾[توبہ:۱۰۰] اور"فرب مبلغ أوعى له من سامع"(۱) کی پہلی حقدار ہے، ان کی فضیلت کے سلسلہ میں آپ کا یہ واضح فرمان ہے۔"طوبى لمن رآني وآمن بي، و طوبى لمن رأى من رآني"(۲)

خوشخبری ہے ان لوگوں کے لئے جنہوں نے مجھ کو دیکھا اور میرے اوپر ایمان لائے اور خوشخبری ہے ان لوگوں کیلئے جنہوں نے مجھ کو دیکھنے والوں کو دیکھا۔

رسول کا دیدار کرنے والوں کو جنہوں نے دیکھا انہیں کو تابعین کہا جاتا ہے۔

نیز آپ نے فرمایا کہ:-

يأتي على الناس زمان فيغزوفئام من الناس فيقولون:فيكم من صاحب رسول الله؟ فيقولون لهم: نعم. فيفتح لهم.ثم يأتي على الناس زمان فيغزوفئام من الناس فيقال: فيكم من صاحب أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم؟ فيقولون : نعم. فيفتح لهم. ثم يأتي على الناس زمان فيغزو فئام من الناس فيقال: هل فيكم من صاحب من صاحب أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم؟ فيقولون: نعم. فيفتح لهم.(۳)

ایک زمانہ آئے گا جس میں کچھ لوگ غزوہ کریں گے، پھر وہ کہیں گے کہ کیا تم میں کوئی ہے جو صحابی رسول ہو، جواب میں لوگ کہیں گے کہ ہاں، توان کو فتح حاصل ہوگی۔

پھر ایک زمانہ آئے گا جس میں کچھ لوگ غزوہ کریں گے [صحابہ کا دور ختم ہو جائے گا] تو وہ کہیں گے کیا کوئی ایسا شخص ہے جو اصحاب رسول کے ساتھ رہ چکا ہو۔

---

(۱) صحيح بخاری کتاب الحج ۵۷٤/۳ حديث نمبر (۱۷٤۱)
(۲) صحيح بخاری کتاب الحج ۵۷٤/۳ حديث نمبر (۱۷٤۱)
(۳) صحيح بخاری، فضائل أصحاب النبی ۱/۷ نمبر (۳٦٤۹)

لوگ جواب دیں گے کہ جی ہاں۔ پھر ان کو فتح نصیب ہو گی۔
پھر ایک زمانہ آئے گا لوگ غزوہ کریں گے [صحابہ اور تابعین کا دور ختم ہو جائے] تو وہ تبع تابعین کے بارے میں سوال کریں گے پھر ان کی وجہ سے فتح حاصل ہو گی۔
نیز آپ نے فرمایا کہ "خير القرون قرني، ثم الذين يلونهم" (۱)
سب سے بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے، پھر وہ لوگ ہیں جو اس کے بعد ہیں۔
اس خیر میں بھی یہ برابر کے شریک ہیں، ان میں بہت سارے لوگ ایسے ہیں جو قرن اول میں موجود تھے بلکہ اس قرن میں ان کا انتقال ہوا ہے، پھر دوسرے قرن میں بھی یہ لوگ موجود تھے۔
اس روایت کے پیش نظر بعض اہل علم نے جملہ تابعین کی عدالت کا رجحان ظاہر کیا ہے، اگرچہ جمہور اہل علم نے اس کو قبول نہیں کیا پھر بھی فضیلت تو حاصل ہی ہے۔ جمہور نے ان کی عدالت کی معرفت کو ضروری قرار دیا ہے، اور یہ فرمایا ہے کہ صحابہ کے بعد کی صدی کو جو فضیلت دی گئی ہے اس میں اکثریت کا خیال کیا گیا ہے، لہٰذا اس سے ہر ہر فرد کی عدالت پر استدلال درست نہیں، اس دور میں ایسے افراد بھی تھے جن کے اندر مذموم صفات پائے جاتے تھے۔ (۲)
ہاں یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اس دور میں ضعفاء کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی، اور عام طور سے اسباب ضعف میں سوء حفظ کا دخل تھا، دروغ گوئی اور کذب بیانی کرنے والے خال خال پائے جاتے تھے جن کا تعلق راویان حدیث سے نہیں تھا، بلکہ جھوٹوں کی یہ ایک الگ جماعت تھی۔
امام ذہبی فرماتے ہیں کہ: "أما التابعون فيكاد يعدم فيهم من يكذب عمدا، لكن لهم غلط وأوهام" (۳) تابعین میں عمداً جھوٹ بولنے والے تقریباً ناپید ہیں البتہ ان کے یہاں اوہام اور غلطیاں پائی جاتی ہیں۔
نیز فرمایا کہ اس زمانے میں ضعفاء کے قلت کی وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں کے

---

(۱) صحيح بخاري، فضائل أصحاب النبي ۷/۱ نمبر (۳۶۵۰-۳۶۵۱)
(۲) فتح المغيث ۱۵۲/٤ (۳) الثقات الذين تكلم فيهم ص

اساتذہ یا تو صحابہ کرام تھے یا کبار تابعین جو ثقہ وعادل تھے، صرف خال خال لوگوں پر کچھ کلام تھا جیسے حارث اعور، عاصم بن ضمرہ، ہاں ان میں سے کچھ خوارج وشیعہ وقدریہ کے یہاں بدعات پائے جاتے تھے جیسے ابن ملجم، مختار بن ابی عبید اور معبد جہنی پھر دوسری صدی کی ابتداء میں وساط اور صغار تابعین میں ضعفاء کی ایک جماعت پائی گئی جن کے حافظہ میں خلل یا ان میں بدعت پائی گئی جیسے عطیہ عوفی، فرقد سبخی، جابر جعفی، ابوہارون عبدی۔ (۱)

حجیت مرسل کی بحث میں امام سخاوی فرماتے ہیں کہ: مرسل کو حجت ماننے والوں کے دلائل میں یہ بھی ہے کہ: "إن احتمال الضعف في الواسطة حيث كان المرسِل تابعيا لاسيما الكذب بعيد جدا، فان النبي ﷺ اثنى على عصر التابعين." (۲)

یعنی اگر مرسل تابعی ہے ایسی صورت میں اس واسطہ (سند) میں ضعف کا ہونا، خاص طور سے دروغ گوئی انتہائی بعید بات ہے، اسلئے کہ اللہ کے رسول نے دور تابعین کی تعریف فرمائی ہے۔

نیز فرمایا کہ: لا يكاد يوجد في القرن الأول الذي انقرض في الصحابة وكبار التابعين ضعيف، إلا الواحد بعد الواحد كالحارث الأعور والمختار الكذاب .....الخ (۳)

یعنی پہلی صدی جو صحابہ اور کبار تابعین میں ختم ہو گئی اس میں ضعفاء نہیں پائے جاتے تھے، صرف کچھ خال خال لوگ حارث اعور اور مختار کذاب جیسے پائے جاتے تھے۔ لیکن پہلی صدی کے خاتمہ کے بعد دوسری صدی کی ابتداء میں تابعین کے متوسط دور میں ضعفاء کی ایک جماعت پائی جاتی تھی، جن کا ضعف غالبا تحمل اور ضبط میں خلل کی وجہ سے تھا، پھر جب تابعین کا آخری دور تقریباً ۱۵۰ھ کے آس پاس کا دور تھا تو اہل علم نے راویوں پر کلام کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ امام ابو حنیفہ (متوفی ۱۵۰ھ) نے فرمایا کہ: "مارأيت أكذب من جابر الجعفي" جابر جعفی سے بڑا جھوٹا میں نے نہیں دیکھا۔

---

(۱) ذكر من يعتمد قوله في الجرح والتعديل ص ۱۶۰-۱۶۲

(۲) فتح المغيث ۱/۱۹۴

(۳) الاعلان بالتوبيخ لمن ذم التاريخ ص ۱۶۳، نیز دیکھئے ذكر من يعتمد ص ۱۶۱-۱۶۲

امام اعمش (متوفی ۱۴۸ھ) نے توثیق و تجریح پر کام شروع کیا، امام شعبہ (متوفی ۱۶۰ھ) نے راویوں پر گہری نظر رکھی غیر ثقہ سے روایت نہیں کیا، اسی طرح سے امام مالک بھی تھے۔[1]

تابعین کی خدماتِ حدیث:-

تابعین عظام کی خدمات حدیث، ان کا شوق طلب آب زر سے تحریر کرنے کے قابل ہے، کتاب و سنت کے حصول، امانت و دیانت داری کے ساتھ اس کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں انہوں نے جو قربانیاں پیش کی ہیں وہ قابل فخر و احترام ہیں۔

حضرت سعید بن میسب (متوفی ۹۳ھ) فرماتے ہیں کہ: میں ایک حدیث کی جستجو میں راتوں رات اور دن کے دن چلتا رہتا تھا۔[2]

امام شعبی (متوفی ۱۰۴ھ) سے جب علی بن مدینی سے سوال کیا کہ آپ کے پاس جو علم عظیم ہے وہ کیسے ملا تو انہوں نے کہا کہ: "بنفي الاعتماد، والسير في البلاد، و صبر كصبر الجماد، وبكور كبكور الغراب."[3]

اپنے آپ پر اعتماد (دعوی ہمہ دانی) کو ترک کر کے، شہروں کی خاک چھان کر، پتھروں کی طرح صبر کرکے، اور کوؤں کی طرح صبح صبح نکل کر۔ بعض روایات میں "بنفي الاغتمام" ہے یعنی غموں کو غلط کر کے اور مشقت کو برداشت کر کے۔

ابوالزناد فرماتے ہیں کہ: "كنا نطوف مع الزهري و معه الألواح والصحف يكتب كلما يسمع "[4] ہم امام زہری کے ساتھ چکر لگاتے تھے ان کے ساتھ تختی اور صحیفے رہتے تھے جو کچھ سنتے تھے اس کو تحریر کرتے رہتے تھے۔

امام زہری نے گھر گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا اور جس کے پاس جو علم ملا اس کو جمع کیا، حتی کہ پردہ نشین عورتوں کے یہاں دستک دیا۔[5]

وہ خود فرماتے ہیں کہ: "ما صبر أحد على العلم صبري، ولا نشره أحد

---

(۱) السنة قبل التدوين ص ۲۳۶

(۲) معرفة علوم الحديث ص ۸ ، الرحلة فى طلب الحديث ص ۱۲۹

(۳) تذكرة الحفاظ ۸۱/۱، سير اعلام النبلاء ۳۰۰/۴

(۴) تذكرة الحفاظ ۱۰۹/۱ (۵) تهذيب التهذيب ۴۴۹/۹

نشری"(۱) علم پر میری طرح کسی نے صبر نہیں کیا اور نہ میری طرح اس کو کسی نے نشر کیا۔

جی ہاں! اس طرح سے ان تابعین نے علم حدیث کو در در سے نکالا اور گھر گھر پہنچایا۔

ابو العالیہ ریاحی فرماتے ہیں: "کنا نسمع الروایة عن أصحاب رسول اللہ و نحن بالبصرۃ فما نرضی حتی نرکب إلی المدینة فنسمعها من أفواههم"(۲) ہم بصرہ میں اصحاب رسول کے واسطہ سے روایت سنتے تھے اس پر بس نہیں کرتے بلکہ خود سفر کر کے مدینہ جاتے اور بلا واسطہ اصحاب رسول سے روایت سنتے۔

حضرت علقمہ اور اسود کو جب کوئی روایت حضرت عمر کے واسطہ سے ملتی تو وہ سفر کر کے ان سے ملاقات کرتے اور بلا واسطہ ان سے حدیث سنتے۔(۳)

ان کا ہر ہر فرد عالم با عمل اور علمی خزانہ ہوتا تھا، جب حضرت جابر بن ابو الشعثاء (متوفی ۹۳ھ) کا انتقال ہوا تو حضرت قتادہ (متوفی ۱۱۷ھ) نے فرمایا کہ: آج زمین کا علم دفن ہو گیا۔(۴)

عاصم احول (متوفی ۱۴۰ھ) امام شعبی (متوفی ۱۰۴ھ) کے بارے میں فرماتے ہیں کہ: کوفہ، بصرہ اور حجاز کے علم کو شعبی سے زیادہ جان کار میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔(۵)

امام احمد بن حنبل (متوفی ۲۴۱ھ) فرماتے ہیں کہ: حضرت قتادہ (متوفی ۱۱۷ھ) بصرہ میں سب سے بڑے حافظ تھے، جو بھی سنتے یاد ہو جاتی تھی۔(۶)

امام مکحول (متوفی ۱۱۸ھ یا اس سے قبل) فرماتے ہیں: جب مجھ کو مصر میں غلامی سے آزادی ملی تو اپنے خیال کے مطابق میں نے وہاں کا سارا علم جمع کر لیا، پھر عراق گیا، اس کے بعد مدینہ آیا، یہاں کے علمی ذخیرہ کو جمع کیا، پھر شام گیا اور وہاں ان علوم کو کھنگال ڈالا۔(۷)

طبقات تابعین:-

تابعین کے طبقات کی تعیین میں اہل علم نے اپنے ذوق و فہم کے اعتبار کے

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ۱/۱۰۹
(۲) مقدمة ابن الصلاح ص ۲۲۳، الکفایة ص ۴۰۳
(۳) مقدمة ابن الصلاح ص ۲۲۳
(۴) تذکرۃ الحفاظ ۱/۷۲
(۵) تذکرۃ الحفاظ ۱/۸۵
(۶) تذکرۃ الحفاظ ۱/۱۲۳
(۷) تذکرۃ الحفاظ ۱/۱۰۸

اختلاف کیا ہے، چنانچہ امام مسلمؒ نے ان کو تین طبقات میں تقسیم کیا ہے، جبکہ ابن سعد نے چار طبقوں میں، اور علامہ ابن حبان نے صرف ایک طبقہ میں سب کو شمار کیا ہے۔
امام حاکم یہاں ان کے بارہ طبقات ہیں۔

امام حاکم نے ان طبقات میں سے ہر ایک کی تعریف تو نہیں کی ہے، صرف پہلے اور آخری کی تعریف کی ہے، دوسرے اور تیسرے کی صرف مثال دی ہے۔
چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ:

تابعین میں پہلا طبقہ ان لوگوں کا ہے جنکی ملاقات عشرہ مبشرہ سے ہوئی ہو۔ جیسے:

سعید بن مسیّب بن حزن (متوفی ۹۳ھ)
قیس بن ابی حازم (متوفی ۹۷ھ)
ابو عثمان نہدی (متوفی ۹۵ھ)
قیس بن عباد (متوفی ۸۰ھ کے بعد)
ابو وائل شقیق بن سلمۃ (متوفی ۸۲ھ)
ابو رجاء عطاردی (متوفی ۱۰۵ھ) وغیرہ۔(۱)

علامہ ابن الصلاح فرماتے ہیں کہ: حافظ ابن خراش کا کہنا ہے کہ: قیس بن ابی حازم کے علاوہ کوئی ایسا نہیں جس نے جملہ عشرہ مبشرہ سے روایت کیا ہو، جبکہ امام ابو داؤد کا یہ کہنا ہے کہ: ان کی ملاقات عبد الرحمٰن بن عوف سے نہیں ہے۔(۲)

ایسی صورت میں یہ طبقہ صرف نظری ہو گا جس کی کوئی مثال نہیں اور اس طبقہ کے تحت جو نام ذکر کئے گئے ہیں وہ تو پہلا ہی رہے گا لیکن قاعدہ یہ بنے گا کہ:

پہلا طبقہ ان تابعین کا ہو گا جن کی ملاقات عشرہ مبشرہ میں سے کسی سے ہوئی ہو، ایسی صورت میں دوسرے اور تیسرے طبقہ میں جو نام آئے ہیں مثلاً علقمہ اور شریح، ان کو پہلے طبقہ میں ہونا چاہئے کیونکہ ان کی ملاقات حضرت عمرؓ و علیؓ سے ہے۔

دوسرا طبقہ: امام حاکم فرماتے ہیں دوسرا طبقہ:

اسود بن یزید (متوفی ۷۴ھ)
علقمہ بن قیس (متوفی ۶۲ھ)

---

(۱) معرفۃ علوم الحدیث ص ۴۲ (۲) مقدمہ ابن الصلاح ص ۲۷۲-۲۷۳

مسروق بن اجدع (متوفی ۶۲، ۶۳ھ)
ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن (متوفی ۹۴ھ)
خارجہ بن زید (متوفی ۱۰۰ھ) وغیرہ کا ہے۔

تیسرا طبقہ: نیز فرمایا کہ تیسرا طبقہ:
عامر بن شرحبیل شعبی (متوفی ۱۰۴ھ)
عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ (متوفی ۹۹ھ)
شریح بن الحارث قاضی (متوفی) ۸۰ھ) اور ان کے اقران کا ہے۔

نیز آخری طبقہ ان لوگوں کا ہے جنہوں نے بصرہ میں انس بن مالک، کوفہ میں عبد اللہ بن ابی اوفی، مدینہ میں سائب بن یزید، حجاز میں عبد اللہ بن خارث، شام میں ابو امامہ باہلی سے [آخری دور میں] ملاقات کی ہے۔(۱)

طبقات تابعین کے باب میں امام حاکم نے صرف اتنا ہی ذکر کیا ہے، البتہ مخضرین کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ:

مخضرین کے بعد تابعین کا وہ طبقہ ہے جو رسول کے زمانہ میں پیدا ہوئے، جیسے عبد اللہ ابن ابی طلحہ، یوسف بن عبد اللہ بن سلام، محمد بن ابی بکر صدیق، بشیر بن ابی مسعود انصاری، ابو امامۃ اسعد بن سہل بن حنیف، ابو ادریس خولانی، عبید اللہ بن عامر... وغیرہ۔(۲)

امام حاکم کے اس قول سے پتہ چلتا ہے کہ مخضرمین کا ایک طبقہ ہے اور پھر ان حضرات کا ہے جو رسول ﷺ کے دور میں پیدا ہوئے، جبکہ پہلے طبقہ کی جو تعریف کی ہے اور مثال دیا ہے اس میں سعید بن مسیب کا نام بھی جو مخضرم نہیں۔

جبکہ علامہ ابن الصلاح اور امام نووی کے پہلے طبقہ کے بعد انہیں بچوں کا ذکر کیا ہے۔(۳)

علامہ بلقینی فرماتے ہیں کہ: جو لوگ رسول کے زمانہ میں پیدا ہوئے ان کو دوسرے طبقہ میں شمار کرنا عقلاً و نقلاً کسی صورت میں صحیح نہیں بلکہ ان کو پہلا طبقہ، اور

---

(۱) معرفة علوم الحديث ص ٤٢ (۲) معرفة علوم الحديث ص ٤٥
(۳) مقدمة ابن الصلاح ص ۲۷۳، التقريب مع التدريب ۲۳۷/۲

جس کو پہلا طبقہ کہا ہے، ان کو دوسرا طبقہ ہونا چاہئے، ورنہ جو بعد میں پیدا ہوئے [جیسے سعید بن مسیب] یہ پہلے طبقہ میں آجاتے ہیں اور جو رسول کے زمانہ میں پیدا ہوئے وہ بعد کے طبقہ میں ہو جاتے ہیں۔ (۱)

امام حاکم کے طبقات کی تقسیم میں دوسرے اور تیسرے طبقہ میں جو نام ہیں وہ بھی مخضرم ہیں، اس طرح طبقات کی تقسیم کا یہ معاملہ بڑا پر پیچ ہو جاتا ہے اور اس تقسیم سے کوئی خاص وضاحت نہیں ہو پاتی خاص طور سے اس صورت میں جس امام حاکم نے بقیہ طبقات کو مہمل ذکر کیا ہے۔ لہٰذا یہ طبقات اگر کم از کم ہوں تو زیادہ قابل فہم ہوں گے اور بہتر نظر آتا ہے کہ صحابہ کے طبقات کی بنیاد پر تابعی کے طبقات کی تعیین کر لی جائے، جس کی ملاقات پہلے طبقہ والوں سے ہو اس کو پہلا طبقہ اور جس کی دوسرے والوں سے ہو اس کو دوسرے طبقہ میں شمار کیا جائے۔ وعلی هذا القیاس۔ اس طرح سے تابعین کے بھی صحابہ کی طرح بارہ طبقات ہوں گے۔ ورنہ علامہ ابن حبان نے جو جملہ تابعین کو ایک طبقہ قرار دیا ہے وہ آسان معلوم ہوتا ہے، رہی ایک دوسرے پر فضیلت تو وہ الگ چیز ہے۔

افضل تابعی:-

تابعین کی بہت بڑی تعداد ہے یہ حضرات مختلف شہروں میں پھیلے ہوئے تھے، ہر شہر میں چند افراد ایسے تھے جو بڑے نامور اور مشہور تھے۔ عام طور سے اپنے قرب و جوار کے تابعین کو لوگوں نے علم و شہرت و تقویٰ کی بنیاد پر بہتر اور افضل قرار دیا ہے اور ان کی تعریف کی ہے۔ چنانچہ:

مدینہ والوں نے: سعید بن مسیّب کو

بصرہ والوں نے: حسن بصری کو

کوفہ والوں نے: علقمہ بن قیس نخعی، اسود بن یزید اور اویس قرنی کو۔

مکہ والوں نے: عطاء بن ابی رباح کو افضل قرار دیا ہے۔ (۲)

لیکن ان میں سب سے افضل کون ہیں اس میں اہل علم کا قدرے اختلاف ہے۔

---

(۱) تدریب الراوی ۲/۲۳۷

(۲) اختصار علوم الحدیث لابن کثیر ص ۱۹٤، مقدمة ابن الصلاح ص ۲۷٤

اہل مدینہ امام احمد بن حنبل (متوفی ۲۴۱ھ) اور عام طور سے محدثین نے سعید بن میسّب کو سب سے افضل قرار دیا ہے۔

جبکہ کچھ دوسرے حضرات نے اُویس قرنی کو افضل کہا ہے، اور انہوں نے صحیح مسلم کی ایک روایت: "خير التابعين رجل يقال له أويس"[1] سے استدلال کیا ہے، کچھ دوسرے لوگوں نے افضلیت اور خیریت میں فرق کر کے سعید بن میسّب کو افضل، اور اویس قرنی کو بہتر بتایا ہے جو بظاہر نا قابل فہم ہے۔

علامہ بلقینی (متوفی ۸۰۵ھ) کہتے ہیں کہ: زہد و تقوی کے اعتبار سے اویس قرنی افضل ہیں علم حدیث میں حفظ اور مہارت کے اعتبار سے سعید بن میسّب افضل ہیں۔[2]

امام عراقی کہتے ہیں کہ صحیح قول کوفہ والوں کا ہے (یعنی اویس قرنی کا افضل ہونا) اس لئے کہ صحیح مسلم کی روایت اس مسئلہ میں فیصلہ کن ہے۔ اہل مدینہ اور امام احمد کے قول کو فضیلت علم پر محمول کیا جا سکتا ہے نہ کہ عام افضلیت پر۔[3]

امام عراقی کا کہنا صحیح ہو سکتا تھا اگر اس حدیث کے بعض الفاظ میں لفظ "من" کا اضافہ نہ ہوتا، امام احمد بن حنبل نے اس روایت کو "من" کے اضافے کے ساتھ اس طرح روایت کیا ہے کہ: "إن من خير التابعين أويس القرني"[4]

امام حمد نے اس روایت کو اپنے مسند میں نقل کیا ہے، اور سعید بن میسّب کو افضل قرار دیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے عام فضیلت مراد لی ہے اور اویس قرنی کو افضل ترین لوگوں میں شمار کیا ہے، جیسا کہ اور چند حضرات کا نام آپ نے لیا ہے، دیگر افراد میں سے فقہاء سبعہ بھی ہیں۔

فقہاء سبعہ:-

یہ سب مدینہ کے رہنے والے اہل فقہ و فتاوی ہیں، جو اکابر تابعین میں شمار کئے جاتے ہیں، وہ حسب ترتیب وفات اس طرح ہیں:

سعید بن میسّب (متوفی ۹۳ھ)

---

(۱) صحيح مسلم، كتاب فضائل الصحابة ۱۹۶۸/۳ حديث نمبر (۲۵٤۲)

(۲) تدريب الراوى ۲٤۱/۲ (۳) التقييد والايضاح ص ۳۲٦

(٤) مسند احمد ٤۸۰/۳

سلیمان بن یسار (متوفی ۹۳ھ)
عروۃ بن زبیر (متوفی ۹۴ھ)
ابو سلمۃ بن عبد الرحمٰن بن عوف (متوفی ۹۴ھ)
عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ بن مسعود (متوفی ۹۹ھ)
خارجہ بن ثابت (متوفی ۱۰۰ھ)
قاسم بن محمد بن ابی بکر (متوفی ۱۱۲ھ)

کچھ لوگوں نے ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن بن عوف کی جگہ: سالم بن عبد اللہ بن عمر (متوفی ۱۰۶ھ) کو شمار کیا ہے۔

جب کہ ابو الزناد (متوفی ۱۱۸ھ) نے ان دونوں کے بدلے میں: ابو بکر بن عبد الرحمٰن بن حارث بن ہشام (متوفی ۹۴ھ) کو شمار کیا ہے۔

محمد بن یوسف حلبی (متوفی ۶۱۴ھ) نے ان کو نظم میں پرویا ہے، اور ساتویں کے سلسلہ میں ابو الزناد کے قول کو ترجیح دیا ہے۔

ألا كل من لا يقتدى بأئمة فقسمته ضيزى عن الحق خارجه
فخذهم عبيد الله عروة قاسم سعيد، أبوبكر، سليمان، خارجة. (1)

ان کے علاوہ **مدینه** کے دیگر مشہورین میں یہ حضرات بھی ہیں۔

نافع مولی ابن عمر (متوفی ۱۱۷ھ)
ابن شہاب زہری (متوفی ۱۲۴ھ)
ابو الزناد عبد اللہ بن ذکوان (متوفی ۱۳۰ھ)

اور **مکة** کے رہنے والوں میں کچھ یہ ہیں:

عکرمۃ مولیٰ ابن عباس (متوفی ۱۰۵ھ)
عطاء بن ابی رباح (متوفی ۱۱۵ھ)
ابو زبیر محمد بن مسلم (متوفی ۱۲۸ھ)

اور **کوفه** کے رہنے والوں میں:

(1) فتح المغيث ٤/١٥٦

علقمۃ بن قیس نخعی ابو شبل (متوفی ۶۲ھ)
مسروق بن اجدع (متوفی ۶۳ھ)
اسود بن قیس نخعی (متوفی ۷۵ھ)
ابراہیم بن یزید نخعی ابو عمران (متوفی ۹۶ھ)
عامر بن شراحیل شعبی (متوفی ۱۰۴ھ)

اور **بصرہ** میں رہنے والوں میں:

حسن بن ابی الحسن یسار بصری (متوفی ۱۱۰ھ)
محمد بن سیرین (متوفی ۱۱۰ھ)
قتادۃ بن دعامہ سدوسی (متوفی ۱۱۷ھ)

اور **شام** میں رہنے والوں میں:

قبیصۃ بن ذویب (متوفی ۸۶ھ)
عمر بن عبد العزیز (متوفی ۱۰۱ھ)
مکحول (متوفی ۱۱۸ھ)

نیز **یمن** کے رہنے والوں میں:

طاؤس بن کیسان (متوفی ۱۰۶ھ)
وہب بن منبہ صنعانی (متوفی ۱۱۶ھ)

مصر کے رہنے والوں میں:

ابو الخیر مرثد بن عبد اللہ یزنی (متوفی ۹۰ھ)
یزید بن ابی حبیب مصری (متوفی ۱۲۸ھ)

اسی طرح سے افضل تابعیات میں:

حفصہ بنت سیرین (متوفی ۱۰۰ھ) کے بعد
عمرہ بنت عبد الرحمٰن (متوفی ۱۰۰ھ) کے پہلے۔

نیز ام الدرداء الصغری (متوفی ۸۱ھ) ہیں جو دونوں سے مرتبہ میں کم ہیں۔[1]

---

(۱) علوم الحدیث ص ۲۷۵

ملاحظہ:-

کچھ اہل علم نے بعض تابعین کو (بکثرت تابعین سے روایت کرنے کی وجہ سے) تبع تابعین میں شمار کیا ہے۔ مثلاً:

ابوالزناد:- عبد اللہ بن ذکوان (متوفی ۱۱۸ھ) جنہوں نے حضرت انس اور ابو امامہ سے روایت کیا ہے، اور جن کی ملاقات کہا جاتا ہے کہ ابن عمر سے بھی ہے۔

هشام بن عروه:- (متوفی ۱۴۵ھ) ان کو ابن عمر نے دیکھا ان کے سر پر مسح کیا اور دعائیں دیں۔ انہوں نے حضرت جابر، سہل بن سعد اور حضرت انس کو دیکھا ہے اور اپنے چچا عبد اللہ بن زبیر سے روایت کیا ہے۔

موسیٰ بن عقبة:- (متوفی ۱۴۱ھ) جنہوں نے عبد اللہ بن عمر، سہل بن سعد، اور حضرت انس کو دیکھا ہے۔ نیز ام خالد بنت خالد بن سعید سے روایت کیا ہے۔

عمرو بن شعیب:- (متوفی ۱۱۸ھ) انہوں نے زینب بنت ابی سلمة، اور ربیع بنت معوذ بن عفراء سے روایت کیا ہے۔(۱)

اسی طرح سے بعض افراد نے کچھ تبع تابعین کو تابعین میں شمار کیا ہے، حالانکہ ان میں سے کسی کی ملاقات کسی صحابی سے ثابت نہیں: مثلاً

ابراهیم بن أسود نخعی:- ان کی روایتیں عام طور سے علقمہ اور اسود کے واسطہ سے ہیں کسی صحابی سے ان کی ملاقات ثابت نہیں۔

بکیر بن ابی السَمیط مِسمعی:- حضرت انس سے ایک روایت کیا ہے جس میں حقیقت میں قتادہ کا واسطہ ہے۔

سعید بن واصل بن عبدالرحمن:- عبد اللہ بن حارث بن جزء سے ان کی ملاقات ثابت نہیں عموماً ان کی روایتیں تابعین سے ہیں۔

ثابت بن عجلان انصاري:- ابن عباس سے ان کی روایت ثابت نہیں، اس میں عطاء اور سعید بن جبیر کا واسطہ ہے۔

سعید بن عبدالرحمن رقاشی:-

واصل ابو حمزه بن عبدالرحمن:- ان دونوں نے حضرت انس سے

---

(۱) فتح المغیث ۱۶۲/۴

روایت کیا ہے جو صحیح نہیں۔[1]

تعداد تابعین:۔

تابعین کی معرفت کا دارومدار صحابی سے ملاقات اور ان سے روایت کرنے پر ہے، اور پہلے یہ گذر چکا ہے کہ خود صحابہ کرام کی صحیح تعداد تعیین کے ساتھ معلوم نہیں، لہٰذا تابعین کی بھی صحیح تعداد معلوم نہیں ہو سکتی اور چونکہ صحابہ کرام مختلف مقامات میں منتشر ہو گئے تھے جس میں شہروں کے علاوہ صحراء و دیہات بھی شامل تھے۔ لہٰذا ان سے کس نے روایت کیا اس کا ضبط ناممکن ہے۔

کچھ محدثین نے تابعین کو خاص تالیف میں جمع کرنے کی کوشش کی ہے، مثلاً امام ابو حاتم رازی، ابو القاسم بن مندہ وغیرہ لیکن یہ عمل تقریبی ہے۔[2]

علامہ ابن حبان (متوفی ۳۵۴ھ) نے "الثقات" میں صرف ثقہ تابعین کی ایک بڑی تعداد ذکر کی ہے۔

امام سخاوی (متوفی ۹۰۲ھ) فرماتے ہیں کہ کتب رجال میں تلاش و جستجو کر کے ان کی تقریبی تعداد بیان کرنا ممکن ہے لیکن بظاہر اس سے کوئی فائدہ نہیں۔[3]

مقام تراجم:۔

تابعین کے حالات کتب رجال کے مختلف انواع و اُقسام کے ضمن میں پائے جاتے ہیں، اسی طرح سے تابعین پر جو مخصوص کتابیں تحریر کی گئی ہیں ان کی سیرت پر سب سے بہترین کتابیں ہیں، لیکن افسوس یہ ہے کہ اسطرح کی کتابیں دستیاب نہیں۔

ایسے ہی کتب طبقات میں جو کتابیں تحریر کی گئی ہیں ان کے حالات و تراجم ان میں بہتر طریقے سے مل سکتے ہیں۔ مثلاً ابن سعد کی "الطبقات الکبریٰ" اور خلیفہ بن خیاط کی "الطبقات" وغیرہ۔

چونکہ تابعین عموماً ثقہ ہوتے ہیں اس لئے ان کے مختصر تراجم کیلئے سب سے بہتر کتاب "الثقات" ابن حبان کی ہے۔ جس میں ان کے نام کو حروف معجم پر پہلے

---

(۱) معرفة علوم الحديث ص ٤٥، فتح المغيث ١٦٢/٤

(۲) فتح المغيث ١٤٤/٤ (۳) فتح المغيث ١٤٤/٤

حرف کاخیال کر کے مرتب کیا گیا ہے۔اس میں جو تعداد ہے وہ اقرب ترین عدد ہے۔

اردو زبان میں اس سلسلہ میں ایک مستند تصنیف ”تابعین کرام“ کے نام سے ادارہ ”دار المصنفین“ اعظم گڑھ کے رفیق الحاج مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے کی ہے جو اردو داں طبقہ کیلئے کافی مفید ہے اس میں چھانوے (۹۶) مشہور اکابر تابعین کی مفصل سوانح حیات اور ان کے علمی و عملی کارناموں کا بیان ہے، اس میں بطور ضمیمہ امام ابو حنیفہؒ کا ترجمہ بھی موجود ہے۔ اس کو ملا کر جملہ ۹۷ نام ہوتے ہیں، یہ کتاب ۶۱۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

یہ کتاب ”سیر الصحابہ“ کے ساتویں جلد میں جدید طبعہ میں مطبوع ہے۔

از روئے وفات پہلا و آخری تابعی:-

علامہ بلقینی کہتے ہیں کہ از روے وفات سب سے پہلے تابعی ابو زید معمر بن زید ہیں، جو خراسان یا آذربیجان میں ۳۰ھ میں قتل کر دیئے گئے اور آخری تابعی خلف بن خلیفہ جن کی وفات ۱۸۱ھ میں ہوئی ہے۔ (۱)

تیسرا طبقہ
اتباع تابعین

تبع تابعی:-

اس شخص کو کہتے ہیں جس نے کسی تابعی سے ایمان کی حالت میں ملاقات کیا ہو اور اسی پر اس کا انتقال ہوا ہو۔

تبع تابعین راویان حدیث کا تیسرا دستہ ہے جنہوں نے تابعین عظام سے شرف تلمذ حاصل کیا، اور انہیں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے، تقدس و پرہیزگاری، صداقت و دیانتداری سے حدیث رسول کی حفاظت کی ہر ممکن کوشش کی، اپنے دور کے ضروریات و حالات کے مطابق ان طریقوں کو اپنایا جس کی ضرورت پڑی، تابعین نے جمع حدیث پر اہم کام کیا تھا، تو تبع تابعین نے کتابت حدیث کو جدید رخ پر موڑا اور اس کو ترقی دی۔

(۱) تدریب الراوی ۲/ ۲۴۳

فضائل تبع تابعین:-

ان کی فضیلت کا ذکر اسی روایت میں ہے جس میں تابعین کی فضیلت کا ذکر ہے جس میں آپ نے فرمایا تھا کہ:"طو بی لمن رآنی و آمن بی، و طوبی لمن رأی من رآنی، ولمن رأی من رأی، من رآنی. طوبی لھم وحسن مآب" (۱)

بشارت ہے ان لوگوں کیلئے جنہوں نے میری دیدار کی اور مجھ پر ایمان لائے، بشارت ہے ان لوگوں کیلئے جنہوں نے ان حضرات کو دیکھا جنہوں نے میری دیدار کی، بشارت ہے ان لوگوں کیلئے جنہوں نے میری دیدار کرنے والوں کو دیکھا، ان کیلئے بشارت اور بہترین ٹھکانہ ہے۔

ان کی فضیلت کا ذکر اس حدیث میں بھی ہے جہاں آپ نے قرن صحابہ و تابعین کا ذکر خیر کیا ہے چنانچہ آپ نے فرمایا کہ:خیر الناس قرنی، ثم الذین یلونھم، ثم الذین یلونھم، ثم یأتی من بعدھم قوم ...... (۲)

سب سے بہتر میری صدی کے لوگ ہیں، پھر وہ لوگ ہیں جو ان کے قریب ہیں، اور پھر وہ لوگ ہیں جو ان کے قریب ہیں اس کے بعد ایسی قوم ظاہر ہوگی جو گواہی طلب کرنے سے پہلے گواہی دیں گے۔

علامہ ابن حبان فرماتے ہیں کہ:

تابعین کے بعد اس دور کے حضرات سب سے زیادہ بہتر ہیں جن کے اور اصحاب رسول کے درمیان صرف ایک صدی کا فاصلہ ہے، یہ اتباع تابعین کی جماعت ہے جنہوں نے صحابہ کرام کے شاگردوں کو دیکھا، ان سے علم حاصل کیا، حدیثوں کے حاصل کرنے میں انتہائی توجہ دیا، احکام کی معرفت، دین کی سمجھ میں بڑی دقت سے کام لیا، سلف کے اقوال کو ایسے مسائل میں محفوظ کر لیا جسمیں کوئی سنت نبوی نہیں تھی، واضح دلائل سے صحیح مسائل کا استنباط کیا، اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ سے دین کی حفاظت فرمائی اور ان کو اونچا مقام عطا کیا، آثار کے سلسلہ میں انہیں کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ (۳)

---

(۱) یہ روایت گذر چکی ہے دیکھئے ص: ۱۱۰ (۲) اس کی تخریج گذر چکی ہے دیکھئے ص: ٤٦

(۳) الثقات ٦/٢

تبع تابعین کا زمانہ:-

تبع تابعین کا دور عام طور سے دوسری صدی کے تقریباً وسط کا دور تھا، جہاں سے نقد رجال پر فنی طور سے کام شروع ہوا، انہیں حضرات میں:

امام اوزاعی	متوفی ۱۵۷ھ
امام شعبہ بن حجاج	متوفی ۱۶۰ھ
امام سفیان ثوری	متوفی ۱۶۱ھ
امام مالک بن انس	متوفی ۱۷۹ھ
امام عبداللہ بن مبارک	متوفی ۱۸۱ھ
وکیع بن جراح	متوفی ۱۹۷ھ
سفیان بن عیینہ	متوفی ۱۹۸ھ
یحییٰ بن سعید قطان	متوفی ۱۹۸ھ
امام محمد بن ادریس شافعی	متوفی ۲۰۴ھ وغیرہ ہیں۔

آخری تابعی کا انتقال ۱۸۰ھ میں ہوا ہے اس سے قبل جو دور تھا تقریباً ۱۵۰ھ کے لگ بھگ یہ تابعین کے خاتمہ کا دور تھا اور تبع تابعین کا ابتدائی دور تھا جو تقریباً ۲۲۰ھ تک رہا، امام سخاوی فرماتے ہیں کہ: اتباع تابعین میں آخری فرد جن کا قول قبول کیا جاتا تھا وہ ہیں جو ۲۲۰ھ کے حدود میں باحیات تھے، پھر یہیں سے بدعتوں کا ظہور ہوا، معتزلہ نے زبان دراز کیا، فلاسفہ نے سر اٹھایا، اہل علم خلق قرآن کے فتنہ میں آزمائش میں مبتلا کئے گئے، حالات بد سے بدتر ہوتے گئے اور آج تک انحطاط چلا آرہا ہے اللہ ہی محافظ ہے۔[1]

اس دور کی خصوصیات:-

تابعین کے دور میں سلسلہ اسناد بہت مختصر ہوا کرتا تھا، عام طور سے صرف صحابی کا واسطہ ہوتا تھا، ضعفاء کی تعداد شاذ و نادر تھی، لیکن تبع تابعین اور ان کے بعد سلسلہ اسناد قدرے طویل ہو گیا، حدیث رسول سرزمین عرب سے باہر عجم کے دور

---

(۱) فتح المغیث ۱۵۲/٤

دراز علاقوں تک پہنچ گئی، اسباب ضعف مختلف قسم کے ہوگئے، ضعفاء کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا، کذابین و وضاعین کی تعداد میں جو حدیث رسول میں رخنہ ڈالنے کی کوشش کررہے تھے اضافہ ہونے لگا۔

خاص طور سے بدعتی فرقوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا، کذابین کی تعداد جو انگلیوں پر گنی جاسکتی تھی (اور جو ابن سبا، ابن ملجم، مختار بن عبید، حارث اعور اور معبد جہنی کے نام سے معروف تھے) ان کا خاندان بڑھنے لگا، گھڑنے والوں کے مقاصد الگ الگ ہوگئے، کسی نے اپنی سیاسی برتری کیلئے یہ کام کیا تو کسی نے رد عمل کے طور پر کیا، کچھ اصحاب مذاہب نے مذہب اور امام کی تائید اور ان کی فضیلت کیلئے یہ ذمہ داری سنبھالی، تو کچھ عبد دینار اور درہم نے بھی اس میں حصہ بٹایا، تو کچھ نام و نمود والے خطباء بھی شامل ہوگئے، چاپلوسوں کی جماعت بھی یہاں پیچھے نہ رہی، اس طرح سے سیاسی دینی اور شخصی مفادات کی خاطر وضع حدیث کیا جانے لگا، اور اس طرح سے یہ ایک تحریک بن گئی۔

تبع تابعین کی حدیثی خدمات:-

لہٰذا اس دور کے پاسداران سنت نبوی نے جو تبع تابعین کے نام سے جانے جاتے تھے ان داخلی فتنوں کا مقابلہ کیا، مختلف محاذ پر دفاعی نظام قائم کیا، ان کے ذمہ داریاں دوسروں کے مقابلہ میں بڑھ گئیں، چنانچہ انہوں نے مختلف تدابیر کیا، طالب علم کی کثرت، صحیح وضعیف کی تمیز، تدقیق و تحقیق میں اضافہ، جمع و تدوین، دروغ گوؤں کی تلاش اور دیگر تدابیر کے ساتھ ساتھ راویان حدیث کی معرفت، ان کی جانچ پڑتال کا کام بڑی دقت سے شروع کیا، اور وہ کام جو حدیث پر تنقید و تبصرہ، احتیاط و تفتیش کی شکل میں نمودار ہوا تھا ایک فنی شکل اختیار کر گیا۔ اس کیلئے جرح و تعدیل کے قانون و ضوابط بنائے گئے، بڑے بڑے ائمہ نقد و جرح پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی زندگی کو راویان حدیث کی معرفت، ان کی جانچ پڑتال کیلئے وقف کردیا، یہاں تک کہ کذابین کا ناطقہ بند کردیا، کتنوں کو صفحہ ہستی سے مٹنا پڑا۔

ان کی وجہ سے اطمینان کا یہ عالم تھا کہ جب ایک مرتبہ ہارون رشید کے دربار

میں ایک زندیق کو قتل کیلئے لایا گیا تو اس نے کہا کہ میں تو ختم ہو جاؤں گا لیکن وہ ایک ہزار حدیثیں جو میں نے گھڑی ہیں اس کو کیا کرو گے تو انہوں نے جواب دیا کہ: "أين أنت يا عدوالله عن أبي اسحاق الفزاری و ابن المبارك ينخلانها فيخر جانها حرفا حرفا." [۱] اے اللہ کے دشمن تو ابو اسحٰق فزاری اور عبداللہ بن مبارک جیسے ائمہ نقاد سے کیسے بچ سکتا جو ان کو چھان چھان کر ایک ایک حرف الگ کر رہے ہیں۔

اور جب ابن مبارک سے کسی نے سوال کیا: "هذه الأحاديث الموضوعة؟ قال: يعيش لها الجهابذة" [۲] کہ یہ جو موضوع حدیثیں ہیں ان کا کیا ہو گا؟ انہوں نے کہا کہ اس لئے بڑے بڑے ماہرین فن زندہ ہیں۔

عبدالرحمٰن بن مہدی نے بھی اسی طرح کا خیال ظاہر کیا ہے۔ [۳]

یحییٰ بن یمان فرماتے ہیں کہ: ان اُحادیث کیلئے ایسے افراد ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے زمین و آسماں کی تخلیق کے وقت پیدا کر دیا تھا، انہیں میں سے وکیع بن جراح ہیں۔ [۴]

ابن ابی حاتم فرماتے ہیں کہ: ائمہ اصحاب حدیث اور نقاد فن یہی وہ افراد ہیں جنکے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ﴿وليمكنن لهم دينهم الذى ارتضى لهم﴾ [نور:۵۵] اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ مومنوں کو اس دین پر قادر کر دے گا جس کو ان کیلئے پسند کیا ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کو جس دین سے راضی تھا اس پر قدرت عطا کیا، اہل بدعت اور اہل زیغ و ضلال سے وہ راضی نہ تھا لہٰذا وہ اس پر قادر نہ ہو سکے۔ [۵]

تراجم کے مقامات:-

تبع تابعین کے تراجم کے وہی مقامات ہیں جو تابعین میں گذر چکا ہے "الثقات ابن حبان" میں ثقہ تبع تابعین کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔

اردو زبان میں ادارہ دار المصنفین نے "تبع تابعین" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی ہے جس میں ان خوش نصیبوں کا ذکر اردو داں طبقہ کیلئے کر دیا ہے، یہ کتاب

---

(۱) تهذيب التهذيب ۱/۱۵۲
(۲) الجرح والتعديل ۲/۱۸
(۳) توضيح الافكار ۲/۷۹
(۴) الجرح والتعديل ۲/۱۹-۲۰
(۵) الجرح والتعديل ۲/۱۹

دو جلدوں میں مطبوع ہے، پہلی جلد کے مرتب جناب مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی ہیں جنہوں نے اس میں ۱۹ جلیل القدر تبع تابعین کا ذکر کیا ہے جن کی تفسیر، حدیث، فقہ، وتصوف میں روشن کارنامے ہیں۔

دوسری جلد کے مرتب رفیق دار المصنفین جناب ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی صاحب ہیں۔اس میں آپ نے ۴۷ جلیل القدر تبع تابعین کا ذکر کیا ہے۔

"سیر الصحابہ" کے مجموعہ میں یہ کتاب آٹھویں اور نویں جلد پر مشتمل ہے۔

چوتھا طبقہ

تابع اتباع التابعین

تابع اتباع تابعین:-

اس شخص کو کہتے ہیں جس کی ملاقات کسی تبع تابعی سے حالت ایمان میں ہوئی ہو اور اسی پر اس کا انتقال ہوا ہو۔

فضیلت:-

تابع اتباع تابعین راویان حدیث کا چوتھا اور آخری دستہ ہے، ان کے دور کو بھی "خیر القرون" ہونے کا شرف حاصل ہے، سابقہ روایت جس میں آپ نے فرمایا تھا کہ: "خیر القرون قرنی، ثم الذین یلونھم، ثم الذین یلونھم" میں تین صدیوں کو خیر القرون کے شرف سے نوازا گیا ہے۔

یہ اس صورت میں ہوگا جب لفظ قرن صدی کے معنی میں مستعمل ہو، لیکن اگر یہ نسل کے معنی میں مستعمل ہے تو صرف تبع تابعین تک ہی مشتمل ہوگا۔

لیکن جعدہ بن ہبیرہ سے ابن ابی شیبۃ اور طبرانی میں ایک روایت مروی ہے جس میں "ثم الذین یلونھم" تین بار مذکور ہے۔[۱]

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ: س کے رجال ثقہ ہیں البتہ جعدہ کی صحابی ہونے میں اختلاف ہے۔[۲]

---

(۱) المعجم الکبیر ۲/۳۲۰ حدیث نمبر (۲۱۸۷)، فتح الباری ۷/۷

(۲) فتح الباری ۷/۷

ایسی صورت میں یہ روایت مرسل ہوگی۔ طبرانی کی روایت کے بارے میں علامہ ہیثمی نے فرمایا ہے کہ اس کے راوی صحیح کے راوی ہیں البتہ ادریس بن یزید اودی نے جعدہ سے نہیں سنا ہے۔ (۱)

لیکن جن لوگوں نے اس کی تخریج کی ہے انہوں نے اس شبہ کا ذکر نہیں کیا ہے۔

اس کی ایک شاہد بریدہ اسلمی کی روایت ہے جس کو ابن حبان نے روایت کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اس کے روایت کرنے میں حماد بن سلمہ منفرد ہیں اور چونکہ وہ ثقہ ہیں اس لئے یہ زیادتی قابل قبول ہے۔ (۲)

اس روایت کے صحیح ہونے کی صورت میں تابع اتباع التابعین کا دور بھی خیر القرون میں شمار ہوگا، جو تیسری صدی کے لگ بھگ خاتمہ تک جاتا ہے۔

علامہ ابن حبان فرماتے ہیں کہ یہ وہ لوگ ہیں: جنہوں نے تبع تابعین سے شرف تلمذ حاصل کیا، حدیث رسول کی حفاظت اور اس کو ہر طرح کی دخل اندازیوں و فتنہ سامانیوں سے محفوظ رکھنے کیلئے انہیں کے نقش قدم پر چلے، راویان حدیث کے اس آخری دستہ کے خاتمہ کے ساتھ ساتھ خیر القرون کا خاتمہ ہوتا ہے اور راویان حدیث کا سلسلہ بھی تقریباً ختم ہو جاتا ہے۔ (۳)

تابع اتباع تابعین کا دور اور ان کی خدمات:-

ان کا دور تیسری صدی کے پہلے چوتھائی سے شروع ہوتا ہے جو لگ بھگ ۲۲۰-۲۳۰ھ کا دور ہے اور اس صدی کے لگ بھگ خاتمہ تک مکمل ہو جاتا ہے۔ یہی وہ دور ہے جس میں فن حدیث کے بڑے بڑے ائمہ، کتب ستہ کے مصنفین اور ان کے مشائخ پائے جاتے تھے، جنہوں نے علم حدیث کی حفاظت اسکے جمع و تدوین کیلئے عرب و عجم کا سفر کیا، بلاد خراسان و ماوراء نہر سے لے کر اندلس تک پھیلے ہوئے سلطنت اسلامیہ کے شہروں اور علمی مراکز کو چھان ڈالا، دنیا کے عیش و آرام کو خیر باد کہہ کر

---

(۱) مجمع الزوائد ۱۰/۲۰

(۲) الثقات ۸/۱، اس کی ایک شاہد نعمان بن بشیر کی روایت ہے جو مسند احمد میں ۴/۲۶۷،۲۷۶،۲۷۷ پر ہے جس کی سند حسن ہے، ہیثمی نے مجمع (۱۰/۱۹) میں فرمایا ہے کہ احمد، بزار، طبرانی نے عاصم بن بہدلہ کے واسطہ سے روایت کیا ہے وہ حسن الحدیث ہیں اور احمد کے بقیہ رجال صحیح کے رجال ہیں۔

(۳) الثقات ۸/۲

روئے زمین کا چپہ چپہ جہاں اہل علم پائے جاتے تھے تلاش کر کے ان سے استفادہ کیا اور اس طرح سے اس دور میں جہاں سنت کو طرح طرح کی فتنوں اور آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑ رہا تھا، بڑے صبر وضبط اور استقامت کے ساتھ اس کا دفاع کیا، باطل فرقوں، اہل کلام کی یلغار کا جواب دیا، کذابین اور وضاعین کے حوصلوں کو خاک میں ملا دیا۔

حدیث کی بڑی بڑی کتابوں کو مقبول اسانید کے ذریعہ تدوین کر کے ہر قسم کی رخنہ اندازیوں سے اس کو پاک کر دیا۔

اس دور کے مشہور اہل علم:-

امام علی بن مدینی	۲۳۳ھ
امام یحییٰ بن معین	۲۳۴ھ
امام احمد بن حنبل	۲۴۱ھ
امام عبدالرحمٰن بن عبداللہ دارمی	۲۵۵ھ
امام محمد بن اسماعیل بخاری	۲۵۶ھ
امام مسلم بن حجاج قشیری	۲۶۱ھ
امام احمد بن عبداللہ عجلی	۲۶۱ھ
امام ابوزرعہ رازی	۲۶۴ھ
امام محمد بن یزید بن ماجہ	۲۷۳ھ
امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث	۲۷۵ھ
امام ابوحاتم رازی	۲۷۷ھ
امام ابوعیسیٰ ترمذی	۲۷۹ھ وغیرہ پائے جاتے تھے۔

یہی وہ دور ہے جس میں فن حدیث کی عظیم کتابیں فنی ترتیب پر منظر عام پر آئیں، مسانید، صحاح، سنن، جوامع وغیرہ جیسی مختلف النوع کتابوں کو ترتیب دیا گیا۔

یہی وہ دور ہے جس میں کتب ستہ اور دیگر دواوین اسلام کا ظہور ہوا، اور اس خیر القرون کے ختم ہوتے ہی تدوین حدیث کا کام تقریباً مکمل ہو گیا، اس کے بعد متن حدیث کی جو کتابیں تحریر کی گئی ہیں عموماً ان میں اضافے بہت کم ہیں، سابقہ تحریر کردہ

حدیثوں کا اعادہ اس کی تکمیل، استدراک، استخراج، جمع و ترتیب وغیرہ کا کام زیادہ ہوا ہے، تھوڑا بہت جو سلسلہ تھا وہ رفتہ رفتہ ختم ہو تا گیا۔

سلسلہ اسناد کا خاتمہ:-

اور یہیں سے سلسلہ اسناد کا بھی خاتمہ ہو گیا، یہ اللہ کا بہت بڑا کرم تھا ورنہ خدانخواستہ اگر سندوں کا یہ سلسلہ جاری رہتا تو اس کا محفوظ رکھنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا، حدیث کے ایک جملہ کیلئے پچاسوں افراد کے ناموں پر مشتمل سندوں کا ذکر کرنا اس کو یاد رکھنا، اس کا تحریر کرنا اور ایک حدیث کیلئے ان کا بیان کرنا نا ممکن تھا۔

یہ سلسلہ اسناد جو فرداً فرداً ہر حدیث کے ساتھ لگا ہوا تھا وہ تو ختم ہو گیا، البتہ حدیث کی تحریر کردہ کتابوں کی سندوں کا سلسلہ باقی رہا، ان کتابوں کو ان کے مولفین سے کس نے سنا پھر ان کے شاگرد کون تھے؟ پھر ان سے پڑھنے والے کون ہوئے، یہاں تک کہ یہ سلسلہ موجودہ دور کے مدرس تک پہنچتا ہے، یہ اب تک کسی نہ کسی حد تک موجود ہے جو مجرد سلف کے سلسلہ اسناد کی یاد اور مثال ہے۔

علامہ ابن صلاح فرماتے ہیں ہے کہ متصل روایتوں سے بیان کرنے کا مقصد ہمارے زمانہ اور اس سے ماقبل کے زمانے میں مرویات کے ثبوت کے لئے نہیں بلکہ سلسلہ اسناد کی بقاء کے لئے ہے جو اس امت کی خصوصیت ہے۔(۱)

اس زمانے میں کسی بھی کتاب کی نسبت جب مؤلف کتاب کی طرف صحیح ہو تو کتاب کا نسخہ اعتماد کیلئے کافی ہو تا ہے۔

موجودہ کتب حدیث کی نسبت مولفین کی جانب بدیہی امر ہو گیا ہے جو حد تواتر سے بھی اوپر پہنچ گیا ہے، ہر دور میں اس کے پڑھنے اور پڑھانے والے لاکھوں کی تعداد میں پڑھتے اور پڑھاتے رہے، اس طرح سے یہ سلسلہ تاقیامت انشاء اللہ باقی رہے گا۔

تابع اتباع تابعین اور ان کے بعد کے دور میں سلسلہ اسناد پہلے کے مقابلہ میں طویل ہو گئی تھی، ضعفاء کی تعداد میں اضافہ، اسباب ضعف میں تنوع، دروغ گوئی کی کثرت سابقہ دور کے مقابلہ میں زیادہ تھا، لہٰذا اسانید پر کلام، راویوں کے حالات

---

(۱) علوم الحدیث ص ۳

زندگی کی معرفت بحیثیت جرح وتعدیل ان پر حکم لگانے کا کام بھی زیادہ ہو گیا۔

لہٰذا ان حضرات نے جمع وترتیب احادیث کے ساتھ ساتھ راویان پر اپنی نگاہوں کو مرکوز رکھا، معلومات کو جمع کیا، قواعد و ضوابط کو بڑی دقت سے استعمال کیا۔ اسلوب حکیم اور آداب سلیم کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر ایک کی حیثیت واضح کردی۔

اور پھر جرح و تعدیل و اسماء رجال کی متنوع کتابیں منظر عام پر آنے لگیں۔ صحابہ، تابعین، تبع تابعین کے حالات خاص خاص کتابوں میں قلمبند ہونے لگے، ثقات اور ضعفاء کو الگ الگ کر دیا، جملہ راویان پر بلا تفریق بھی کتابیں تیار کی گئیں اور اس طرح سے ایک عظیم تاریخی سرمایہ جمع ہو گیا، جس سے آج تک راویوں کی معرفت کا کام باسانی ہو رہا ہے اور تاقیامت ان شاءاللہ ہوتا رہے گا، اس پر ملت اسلامیہ جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔

حتی کہ اعداء دین بھی اس قابل فخر کارنامہ کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ایک جرمنی مستشرق عالم "شبرنجر" الاصابۃ کے پیش لفظ میں جو کلکتہ سے ۱۸۵۳ء ۱۸۶۴ء میں طبع ہوئی ہے۔ لکھتا ہے:

سابقہ امتوں میں جتنی بھی امتیں گذری ہیں اور موجودہ دور میں جو اقوام پائے جاتے ہیں، وہ کوئی ایسا کام نہ کر سکیں جس طرح مسلمانوں نے علم اسماء الرجال کے پُر خطر علم میں کیا جن میں تقریباً پانچ لاکھ افراد کے حالات و واقعات کو قلمبند کر کے محفوظ کر دیا۔ (١)

یہ سلف صالحین کے ان کاوشوں کا نتیجہ تھا جو انہوں نے سنت رسول کی حفاظت کے لئے کیا تھا، انہوں نے کوئی ایسا گوشہ نہیں چھوڑا جس سے حدیث رسول میں رخنہ کی گنجائش ہو۔ اللہ تعالیٰ ان کو اجر عظیم سے نوازے۔ آمین۔

تراجم کے مقامات:-

ان حضرات کے تراجم بھی کتب رجال حدیث میں دیگر راویان حدیث کے ساتھ مشترکہ طور پر پائے جاتے ہیں، علامہ ابن حبان نے "الثقات" کے چوتھے طبقہ میں ان کا ذکر کیا ہے جو مطبوعہ نسخہ کے اعتبار سے آٹھویں اور نویں جلد میں ہے۔

اردو زبان میں اس سلسلہ میں کوئی خاص تصنیف میرے علم میں نہیں ہے۔

---

(١) السنة قبل التدوين ص ٣٣٨ بحواله اضواء على التاريخ الاسلامى ص ٣٦

البتہ محدثین کے تذکروں میں عام طور سے ان کا ذکر پایا جاتا ہے۔

اسناد اور طبقات رجال کا ایک عام خاکہ ذہن میں ضرور آگیا ہوگا جملہ راویان حدیث کے حالات، ان کے رہن سہن، ان کا نام ونسب، سیرت وسلوک اساتذہ وتلامذہ، طلب علم، پیدائش ووفات اور دیگر زندگی کے حالات کے ساتھ ساتھ ان کے مزاج کی معرفت، تقویٰ ومروت، عدالت وصداقت اور ان کے درجات کا پتہ چلانے کیلئے آج ہم جس علم کے شدید محتاج ہیں اس کو "علم جرح وتعدیل" اور "علم اسماء رجال" کہا جاتا ہے۔

علم اسماء رجال میں راویان کے عام حالات پر گفتگو کی جاتی ہے اور علم جرح و تعدیل میں خاص گوشہ حیات، عدالت و ثقاہت اور ان کے مراتب پر بحث کی جاتی ہے، یہ دونوں علم ایک دوسرے کیلئے لازم وملزوم ہیں، لہٰذا اب "جرح وتعدیل" کے اصول وضوابط، ائمہ جرح وتعدیل اور کتب جرح وتعدیل کا تذکرہ پیش خدمت ہے۔

دوسرا باب

قواعد جرح و تعدیل کے بارے میں

جرح

جَرْحَ:-فَعَلَ کے وزن پر ہے۔ جو باب "فَتَحَ" سے آتا ہے، جس کا مصدر "جَرحا"۔ راء ساکنہ کے ساتھ ہے۔ اور جس کا معنی ہے زخمی کرنا اور یہی کلمہ جب جَرِحَ [فَعِلَ] کے وزن پر باب "سمع" سے ہوتا ہے تو اس کا مصدر جَرَحا۔ راء کے فتحہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور اس کا معنی ہوتا ہے زخمی ہونا۔ (۱)

جَرْح:- حرف جیم کے فتحہ کے ساتھ - ہتھیار یا دھار دار چیز سے زخم لگانے کو کہا جاتا ہے۔ اور حاکم کا شاہد پر جرح کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس نے کوئی ایسا عیب بتایا ہے جس سے اس کی عدالت ختم ہو گئی ہے۔ (۲)

جُرح:- جیم کے ضمہ کیساتھ زخم کو کہا جاتا ہے۔ یقال: جَرحه أي كَلَمه. (۳)

بعض فقہاء و اہل لغت نے یہ کہا ہے کہ:

جُرح:- ضمہ کیساتھ - جسم میں لوہے یا کسی چیز سے زخم لگانے کو کہتے ہیں اور

جَرح:- فتحہ کے ساتھ زبان سے زخم لگانے اور توہین کرنے کو کہتے ہیں۔ یہی معنی لغویوں کے یہاں متداول ہے، حالانکہ دونوں ایک دوسرے کے معنیٰ میں مستعمل ہوتے ہیں۔ (۴)

اصطلاحی تعریف:-

راویوں کے ایسے عیوب کو بیان کرنا، جو ان کی عدالت اور ضبط کو ختم کر دے یا عیب دار بنادے جس سے ان کی روایت مردود ہو جائے۔ (۵)

عدالت اور ضبط کی تعریف تعدیل کے باب میں آئے گی۔ (۶)

---

(۱) المعجم الوسيط ۱/۱۱۵ (۲) لسان العرب ۲/۴۲۲

(۳) ترتيب القاموس المحيط ۱/۴۷۰ (۴) تاج العروس ۶/۳۳۷

(۵) دراسات في الجرح و التعديل ص ۴۵ (۶) دیکھئے ص: ۱۶۰، ۱۷۶

جرح کا شرعی حکم:-

جرح ایک دینی ضرورت اور فطری عمل ہے، جس کا مقصد صرف شریعت کی حفاظت کرنا ہے، نہ کہ لوگوں پر طعن و تشنیع کرنا یا غیبت کرنا، چنانچہ اگر کوئی شخص کسی پر جرح صرف عیب جوئی کے لئے کرتا ہے تو اس کی جرح قابل قبول نہیں ہوتی ہے۔

امام مسلمؒ نے اپنی کتاب صحیح مسلم کے مقدمہ میں ایک باب قائم کیا ہے جس میں راویانِ حدیث پر نقد کرنے کی دلیلیں ذکر کی ہیں اور بڑے بڑے محدثین کے اقوال راویوں کے بارے میں نقل کیا ہے اور فرمایا کہ: "إنما ألزموا أنفسهم الكشف عن معايب رواة الحديث و ناقلي الأخبار وأفتوا بذلك حين سئلوا لما فيه من عظيم الخطر إذ الأخبار في أمر الدين إنما تأتي بتحليل أو تحريم أو أمر أو نهي...... الخ "(۱)

محدثین کرام نے اخبار و احادیث کے ناقلین اور راویوں کے عیوب کو بیان کرنا ضروری جانا اور جب ان سے اس کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے اس کے عظیم خطرات کے پیش نظر جواز کا فتویٰ دیا، اس لئے کہ کسی چیز کی حلت و حرمت یا امر و نہی کا پورا دارومدار راویوں کی ان خبروں پر ہے جو دین کے بارے میں وہ دیتے ہیں۔

امام نوویؒ نے اسکو ایک دینی فریضہ بتاتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا ہے:

"راویوں پر جرح کرنا جائز ہی نہیں بلکہ باتفاق علماء واجب ہے اس لئے کہ اس سے شریعت اسلامیہ کی حفاظت، اللہ و رسول نیز مسلمانوں کے ساتھ نصیحت مقصود ہے نہ کہ کسی کی عیب جوئی، بڑے بڑے اہل علم کا اسی پر عمل رہا ہے۔"(۲)

امام احمد بن حنبلؒ ایک مرتبہ کسی راوی پر نقد کر رہے تھے تو ایک صوفی صاحب نے ان سے بطور اعتراض عرض کیا کہ آپ علماء کی غیبت کرتے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ یہ غیبت نہیں بلکہ نصیحت ہے۔(۳)

ابو بکر بن خلاد نے یحییٰ بن سعید سے کہا کہ: "أما تخشى أن يكون هؤلاء

---

(۱) صحیح مسلم مع النووی ۱/۱۲۳ - طبع بیروت (۲) شرح سلم ۱/۱۲۴

(۳) تدریب الراوی ۲/۳۶۹

خصمائك عندالله" کہ کیا آپ کو اس بات کا خوف نہیں ہے کہ وہ راویان حدیث جن کی حدیثوں کو آپ نے ترک کر دیا ہے، اللہ کے یہاں آپ کے بر مقابل خصم بن کر آئیں، تو آپ نے جواب دیا کہ :"لأن يكون هؤلاء خصمائي أحب إلي من أن يكون خصمي رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: لِمَ لم تذب الكذب عني" (١)

یعنی یہ لوگ ہمارے بد مقابل ہوں یہ میرے نزدیک زیادہ محبوب ہے اس بات سے کہ میرے خصم قیامت کے دن اللہ کے رسول ﷺ ہوں اور آپ کہیں کہ تم نے میرے اوپر جو جھوٹ گھڑا جا رہا تھا اس کا دفاع کیوں نہیں کیا؟

لہٰذا راویوں کے سلسلے میں جو کچھ کلام کیا جاتا ہے اور ان کا عیب ذکر کیا جاتا ہے وہ ایک دینی ضرورت ہے، غیبت محرمہ میں نہیں ہے۔

ابن حبان فرماتے ہیں کہ :"إنما الغيبة ما يريد القائل القدح في المقول فيه، وائمتنا رحمهم الله إنما بينوا هذه الأشياء، واطلقوا الجرح في غير العدول، لئلايحتج بأخبارهم لا أنهم أرادوا ثلبهم والوقيعة فيهم، والإخبار عن الشئ لا يكون غيبة إذا أراد القائل به غير الثلب." (٢) یعنی اگر کسی پر مجرد عیب لگانے کیلئے جرح کیا جائے تو اس کو غیبت کہا جاتا ہے، ہمارے ائمہ رحمہم اللہ نے ان چیزوں کا جو بیان کیا ہے اور غیر عدول پر جو جرح کا استعمال کیا ہے تو اس کا مقصد یہ تھا کہ ان کی روایت قابل قبول نہیں، نہ کہ ان پر عیب لگانا مقصد تھا، کسی چیز کی خبر دینا اگر خبر دینے والے کا مقصد عیب جوئی نہ ہو تو غیبت نہیں ہوتی۔

عفان بن مسلم کہتے ہیں کہ اسماعیل بن علیہ کی مجلس میں ایک شخص نے دوسرے شخص کے واسطہ سے روایت بیان کیا۔ میں نے کہا کہ ان سے مت روایت قبول کرو یہ ثقہ نہیں ہے، تو انہوں نے کہا تم نے ان کی غیبت کر دی، اسماعیل بن علیہ نے کہا کہ غیبت نہیں کیا بلکہ ان پر نہ ثقہ ہونے کا حکم لگایا ہے۔ (٣)

امام شعبہ کہتے تھے: "قم حتى نغتاب في الله تبارك و تعالىٰ." (٤)

---

(١) تدريب الراوي ٢/٣٦٩ (٢) المجروحين ١/١٨

(٣) المجروحين ١٨-١٩ (٤) مصدر سابق ١/١٩

علامہ اثیر فرماتے ہیں کہ: "کچھ لوگوں نے علمائے محدثین پر یہ عیب لگایا ہے کہ وہ راویانِ حدیث کی برائی بیان کرتے ہیں یہ ایسے لوگ ہیں جن کو ان کا عظیم مقصد معلوم نہیں ہے، اس کا اصل مقصد صرف دینی مسائل میں احتیاط برتنا ہے تاکہ آدمی کسی ایسی چیز پر عمل نہ کرے جو دین سے خارج ہو۔"(۱)

غیبت کے معنی ہیں پس پردہ کسی کی برائی بیان کرنا جو اس میں موجود ہو، اور اگر وہ برائی اس میں موجود نہ ہو تو اس کو بہتان کہتے ہیں اور موجود برائی کو سامنے بیان کرنے کو گالی گلوج کہا جاتا ہے۔(۲)

راویوں کے بیان کردہ عیوب غیبت ہیں کہ نہیں اس میں علماء کے دو قول ہیں، لیکن صحیح قول یہ ہے کہ یہ بھی غیبت ہے لیکن غیبتِ مذمومہ میں داخل نہیں ہے بلکہ ضرورت کے تحت ایسا کرنا جائز ہے اور اللہ کے رسول ﷺ کے قول: "**أنزل الناس منازلهم**"(۳) کے عین مطابق ہے۔

غیبت حرام ہوتے ہوئے بھی چند جگہوں پر جائز ہے اس کی تفصیل امام نوویؒ نے اس طرح بیان کی ہے کہ:

غیبت انسان کی زندگی میں یا مرنے کے بعد شرعی ضرورت کے پیش نظر چھ جگہوں پر جائز ہے بشر طیکہ غیبت کے علاوہ کسی دوسرے طریقے سے وہ مقصد حاصل نہ ہو:

۱- کسی بادشاہ یا قاضی یا صاحب قدرت آدمی سے ظالم کا ظلم بیان کیا جائے تاکہ وہ اسے ظلم سے باز رکھے۔

۲- منکر اور غلط کام کے خاتمہ کیلئے کسی کی برائی ایسے شخص سے بیان کی جائے جو اس کو غلط کاری سے باز رکھ سکے۔

۳- مفتی سے فتویٰ حاصل کرنے کیلئے۔

٤- مسلمانوں کو شر و فساد سے محفوظ رکھنے اور ان کے ساتھ خیر خواہی کرنے کیلئے جس کی چند شکلیں ہیں اور اسی میں راویوں اور شاہدوں پر جرح کرنا بھی شامل ہے جو بالاتفاق جائز ہے بلکہ ضرورت کے وقت واجب ہے۔

---

(۱) جامع الاصول ۱/ ۳۰ بحواله دراسات في الجرح والتعديل ٤٦

(۲) كتاب التعريفات للجرجاني ص ۱٦۳ (۳) مقدمة صحيح مسلم ۱/ ۵۵ نحوه

۵- ایسے شخص کی برائی بیان کرنا جو کھلم کھلا فسق و فجور کرتا ہو۔
٦- کسی شخص کا تعارف اور اسکی تعیین کیلئے عیب بیان کرنا مثلاً اُعرج، اُعمش وغیرہ۔[1]

اسباب جرح:-[اسباب ضعف]

راوی کی عدالت و ضبط کو ختم کرنے یا اس کو عیب دار بنانے کے مختلف اسباب ہوتے ہیں، انہیں کو اسباب ضعف یا اسباب طعن کہا جاتا ہے، ان میں سے پانچ عیب کا تعلق عدالت سے ہے اور پانچ کا تعلق ضبط سے ہے۔

عدالت سے متعلق	ضبط سے متعلق
۱-حدیث رسول میں دروغ گوئی کرنا۔	۱-بہت زیادہ غلطی کرنا۔
۲-دروغ گوئی کا الزام لگنا۔	۲-بہت زیادہ مغفل ہونا۔
۳-فسق (گناہ کبیرہ) کرنا یا صغیرہ پر اصرار کرنا۔	۳-بکثرت وہم ہونا۔
٤-جہالت یا ابہام پایا جانا۔	٤-ثقات کی مخالفت کرنا۔
۵-بدعت	۵-حافظہ کا خراب ہونا۔

عیب کے اعتبار سے ان کی ترتیب کچھ اس طرح سے ہے:

۱- کذب : حدیث رسول میں دروغ گوئی کرنا۔
۲- متہم بالکذب : دروغ گوئی کا الزام لگنا۔
۳- فحش غلط : بہت زیادہ غلطی کرنا۔
٤- فحش غفلت : بہت زیادہ مغفل ہونا۔
۵- فسق : گناہ کبیرہ کرنا یا صغیرہ پر اصرار کرنا۔
٦- وہم : صحیح کو غلط بیان کرکے صحیح سمجھنا (غلط بیانی کو صحیح سمجھنا)
۷- مخالفت ثقات : ثقہ یا ثقات کی مخالفت کرنا۔
۸- جہالت : راوی کا مجہول یا مبہم ہونا۔
۹- بدعت : شریعت میں ایسی چیز ایجاد کرنا جو اس میں نہ ہو۔
۱۰- سوء حفظ : حافظہ کا خراب ہونا۔[2]

---

(۱) ریاض الصالحین ص ٥٥٤
(۲) نزهة النظر شرح نخبة الفكر ص ٦٨-٦٩، شرح قصب السكر ص ٦٨

جس کی تفصیل یہ ہے:

(۱) الکذب:- (حدیث رسول میں جھوٹ بولنا)

اس کا مطلب یہ ہے کہ راوی جان بوجھ کر اللہ کے رسول ﷺ کی جانب غلط بات منسوب کرے، خواہ اس کو اس نے خود وضع کیا ہو یا دوسرے کی وضع کردہ ہو۔

اسی زمرہ میں وہ شخص بھی داخل ہے جس سے حدیث بیان کرنے میں غلطی ہو جاتی ہے جس پر اس کو تنبیہ کی جاتی ہے لیکن عناد کی وجہ سے وہ اس غلطی کو تسلیم نہیں کرتا اس لئے اس کو بھی قصداً جھوٹ بولنے والوں میں شمار کیا جاتا ہے۔[1]

اس لئے کہ اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے کہ: "**من حدث عني حديثا وهويرى أنه كذب فهو أحد الكاذبين**" [2] جو شخص میری جانب منسوب کر کے کوئی حدیث بیان کرتا ہے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ یہ نسبت جھوٹی ہے، تو اس کا بھی شمار جھوٹوں میں ہوگا۔

ایسے راویوں کی حدیثوں کو اصطلاح میں **موضوع** کہا جاتا ہے، اور ان کی روایتیں ہمیشہ کیلئے جمہور کے یہاں مردود ہوتی ہیں، اگرچہ زندگی میں ایک ہی مرتبہ ایسا کیوں نہ کیا ہو، حتی کہ توبہ کرنے کے باوجود بھی ان کی روایتیں مقبول نہیں ہوتیں تاکہ کوئی دوسرا شخص ایسی جرأت نہ کرے۔

علامہ ابن صلاح فرماتے ہیں کہ: "**التائب من الكذب متعمداً في حديث رسول الله صلى الله عليه وسلم فانه لا تقبل روايته أبدا، وإن حسنت توبته على ما ذكر عن غير واحد من أهل العلم، منهم أحمد بن حنبل وأبوبكر الحميدي شيخ البخاري.**" [3] حدیث رسول میں قصداً جھوٹ بولنے والوں کی روایت توبہ کرنے کے باوجود بھی بے شمار اہل علم کے یہاں ہمیشہ کیلئے مردود ہو جاتی ہے، ان اہلِ علم میں امام احمد اور ابو بکر حمیدی امام بخاری کے استاذ بھی شامل ہیں۔

---

(۱) فتح المغيث ۳۱۱/۱

(۲) سنن الترمذی ۳٦/۵ نمبر (۲٦٦۲) وقال حسن صحيح. مقدمه صحيح مسلم، مسند احمد ۱۱۳/۱، وابن ماجة ۱۴/۱-۱۵، حديث نمبر ۳۸-۴۱

(۳) علوم الحديث لابن الصلاح ص ۱۰۴

علامہ نووی کا خیال ہے کہ اصول کے اعتبار سے توبہ کرنیوالے کی روایت قابل قبول ہونی چاہئے، جس طرح سے کافر کی روایت اسلام لانے کے بعد قابل قبول ہوتی ہے۔ (۱)

جمہور اہلِ علم نے امام نووی کی اس دلیل کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دیا ہے اس لئے کہ کافر کے اسلام لانے اور مسلم صادق کے کاذب ہونے میں بڑا فرق ہے کیونکہ شر سے خیر کی طرف آنا ایک فطری بات ہے لیکن خیر سے شر کی طرف جانا غیر فطری عمل ہے۔

بلکہ کاذب جب کوئی حدیث گھڑتا ہے اور وہ لوگوں میں مشہور ہو جاتی ہے تو اس کے توبہ کرنے یا نہ کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا اس لئے کہ اس کا ضرر ہمیشہ اس کو "من سنَ سنة سيئة" کے تحت پہنچتا رہے گا۔

نیز حدیث رسول کی حفاظت کیلئے یہ قاعدہ وضع کیا گیا ہے اس لئے بطور تشدید وتغلیظ اور احتیاط یہی بہتر ہے۔ (۲)

نیز حدیث رسول "إن كذبا علي ليس ككذب على أحد" (۳) سے بھی یہی پتہ چلتا ہے۔

زکریا انصاری فرماتے ہیں کہ پہلے میرا میلان بھی امام نووی کی طرف تھا لیکن بعد میں یہ سمجھ میں آیا کہ جمہور اہل علم کی بات صحیح ہے اس لئے کہ کافر کے اسلام لانے کے بعد اس کے گناہ کا معاف ہونا یہ نص قرآن کی وجہ سے ہے، عام نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ زانی توبہ کرنے کے بعد بھی محصن نہیں سمجھا جاتا اور اس پر تہمت لگانے والے پر حد نہیں نافذ کیا جائے گا۔ (۴)

البتہ جو شخص فضائل اعمال میں یہ سمجھ کر حدیث گھڑتا ہے کہ اس کا یہ عمل قابلِ ضرر نہیں پھر اس کو اس کے ضرر کا اندازہ ہوتا ہے، اور وہ توبہ کرتا ہے تو بعض متأخرین کے یہاں اس کی روایت قابلِ قبول ہے۔ (۵)

---

(۱) شرح مسلم ۷۰/۱

(۲) تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو فتح المغیث ۳۱۴/۱، و حاشیہ توضیح الأفکار ۲۴۰/۲-۲۴۱

(۳) صحیح بخاری ۱۶۰/۳ نمبر (۱۲۹۱)

(۴) فتح الباقی شرح ألفیة العراقی ۳۳۵/۱ (۵) فتح المغیث ۳۱۱/۱

یہ قول محل نظر ہے اسلئے کہ جو علت پہلی صورت میں پائی جاتی ہے وہی علت یہاں بھی پائی جاتی ہے، نیز کذب بیانی میں دونوں برابر شریک ہیں چاہے فضائل اعمال میں ہو یا غیر فضائل میں "من کذب علی" دونوں پر صادق آتا ہے اس لئے اس کی بھی روایت مردود ہوگی۔

(۲) متهم بالکذب:- (جھوٹ کا الزام لگنا)

اسکا مطلب یہ ہے کہ راوی پر جھوٹ کا الزام لگایا گیا ہے اگرچہ حدیث رسول میں اس کا جھوٹ بولنا ثابت نہ ہو۔ راوی تین چیزوں کی بناء پر متہم بالکذب ہوتا ہے:

ایک تو یہ کہ اس کا دنیاوی امور و معاملات میں جھوٹا ہونا مشہور ہو اگرچہ حدیث نبوی میں جھوٹ بولنا ثابت نہ ہو۔

دوسرے یہ کہ وہ ایسی حدیث روایت کرنے میں منفرد ہو جو دین کے بنیادی اصول اور عام قاعدوں کے منافی ہو، اور اس کے علاوہ دوسرا راوی اس میں متہم ہونے کے لائق نہ ہو۔

تیسرے یہ کہ وہ ایسی روایت بیان کرے جس سے اسکی غلط بیانی واضح ہو جائے۔

متہم بالکذب راوی کی روایت کو **متروک** کہتے ہیں۔[۱]

اس کا درجہ کذاب سے کچھ کم ہوتا ہے، ایسے لوگوں کی روایت توبہ سے قبل مردود ہوتی ہے البتہ توبہ کرنے کے بعد مقبول ہوتی ہے۔

علامہ ابن صلاح فرماتے ہیں کہ: عام لوگوں سے گفتگو میں جھوٹ بولنے والا یا دیگر اسباب فسق کرنے والا توبہ کرلے تو اس کی روایت مقبول ہوتی ہے۔[۲]

(۳) فحش الغلط:- (بکثرت غلطی کرنا)

اس کا مطلب یہ ہے کہ راوی حدیث کی روایت کرنے میں بکثرت غلطی کرتا ہو، اور درست بہت کم روایت کرتا ہو۔ حتی کہ متابعات میں بھی قابل اعتبار نہ ہو۔ نہ تو دوسروں کو طاقت دیتا ہو اور نہ دوسروں کی طاقت دینے سے طاقت قبول کرتا ہو۔ ایسے راوی کی روایت کو **منکر** کہا جاتا ہے۔

---

(۱) شرح قصب السكر ص ۷۳ من أطيب المنح فى علم المصطلح ص ۳۳.

(۲) علوم الحدیث ص ۱۰٤

علامہ ابن حبان ضعفاء کے بہت سے اقسام کاذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:"ومنهم من كثر خطأه و فحش، و كادأن يقلب صوابه فاستحق الترك من أجله" (۱)

ضعفاء کے اقسام میں سے ایک قسم ان لوگوں کی ہے جنکی غلطیاں بیشمار ہوں اور عموماً صحیح چیزوں کو الٹ دیتے ہوں اس وجہ سے یہ لوگ بھی ترک کئے جانے کے لائق ہوتے ہیں۔

(۷) كثرة الغفلة:- (بہت زیادہ مغفل ہونا)

راوی کے مغفل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی روایتوں کو اچھی طرح سے محفوظ نہیں رکھتا یہاں تک کہ اپنے اور دوسروں کی روایتوں میں تمیز بھی نہیں کر سکتا، اور اگر کوئی شخص دوسرے کی روایت کو اس کے سامنے بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ آپ ہی کی روایت ہے تو اس کو قبول کر لیتا ہے، یا وہ خود ہی اپنی روایت کو بیان کرتا ہے لیکن وہ اس قدر غافل ہوتا ہے کہ سننے والا اس کو بار بار تنبیہ کرتا ہے کہ اس طرح نہیں بلکہ اس طرح ہے تو وہ فوراً اس کو تسلیم کر لیتا ہے۔ اصطلاح میں اس روک ٹوک کو تلقین کہتے ہیں اور جو اس کو تسلیم کرتا ہے اس کو تلقین قبول کرنے والا کہتے ہیں، [كان يلقن فيتلقن] ایسے شخص کی روایت کو بھی **منکر** کہا جاتا ہے۔ (۲)

اس زمرہ میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو غیر معتمد کاتب یا بیٹے یا پڑوسی وغیرہ کے پالے پڑ گئے تھے، جیسا کہ عبد اللہ بن ربیعہ مصیصی کی روایتوں میں ان کے لڑکے نے دوسروں کی حدیثوں کو شامل کر دیا تھا، اسی طرح سے سفیان بن وکیع کا ایک کاتب جس کا نام قرطمہ تھا اسنے ان کی حدیثوں میں دوسروں کی حدیثوں کو شامل کر دیا تھا جس کو وہ اپنی روایت سمجھتے تھے۔ اسی طرح سے عبد اللہ بن صالح کاتب لیث بن سعد کا ایک پڑوسی تھا، جس کی تحریر ان کی تحریر سے ملتی جلتی تھی، تو وہ پڑوسی دوسروں کی حدیثوں کو لکھ کر ان کے گھر میں ڈال دیا کرتا تھا جس کو یہ اپنی مرویات سمجھتے تھے۔ (۳)

اس زمرہ میں وہ بھی آتا ہے جو روایت کے سننے یا سنانے میں تساہل کرتا ہو یا غیر تصحیح شدہ نسخہ سے درس دیتا ہو۔ (۴)

---

(۱) المجروحین ۱/۷٦ (۲) نزهه النظر ص ۷۳

(۳) المجروحین ۱/۷۷، الكشف الحثيث عمن رمى بوضع الحديث ص ٤۷۷

(٤) مقدمة ابن الصلاح ص ۱۰۷

(۵) الفسق:- (ارتکاب کبیرہ یا صغیرہ پر اصرار)

راوی کے فاسق ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دروغ گوئی کے علاوہ دیگر گناہ کبیرہ کا ارتکاب، یا گناہِ صغیرہ پر اصرار کرے[۱] یا اس سے ایسے غلط اعمال واقوال سرزد ہوں جو باعث عقاب ہوں، لیکن کفر کی حد تک پہنچانے والے نہ ہوں، اس کی روایت بھی مردود ہوتی ہے، البتہ اگر توبہ کرلے تو مقبول ہوتی ہے جیسے کہ اشارہ پہلے گزر چکا ہے اسکو بعض محدثین۔ جنکے یہاں منکر کیلئے مخالفت کی شرط نہیں ہے۔ **منکر** کہتے ہیں۔[۲]

منکر اس روایت کو بھی کہتے ہیں جسکو ضعیف راوی ثقہ کے مخالف روایت کرتا ہو، اسی طرح سے فاسق، مغفل اور فحش غلط راوی کی روایت کو بھی **منکر** کہتے ہیں۔[۳]

(٦) الوھم:-

اسکا مطلب یہ ہے کہ راوی اپنی روایتوں کو غلط بیان کرے اور اس غلط بیانی کو صحیح سمجھے۔

اس کا وقوع حفظ اور کتابت دونوں میں ہوتا ہے۔[۴] مثلاً مرفوع کو موقوف، اور مرسل کو متصل روایت کرے، یا ایک حدیث کو دوسری حدیث میں داخل کردے، ایسے راوی کی روایت کو اصطلاح میں **معلل** کہتے ہیں۔

حدیث میں یہ ایک ایسا قدح ہے جو اس کی صحت میں مانع ہوتا ہے، جس کو ہر شخص سمجھ بھی نہیں سکتا، اس کو صرف ماہرین فن جن کو اللہ تعالیٰ نے خاص ملکہ، سیال ذہن اور علم غزیر سے نواز ہے، وہی سمجھ سکتے ہیں، طرق حدیث میں تتبع، راویوں کے حالات پر اطلاع، اور دیگر قرائن سے اس کی معرفت ممکن ہے۔

معلل :- اس حدیث کو کہتے ہیں جس میں علت پائی جائے۔

علت:- وہ پوشیدہ و مخفی سبب ہے جو حدیث کی صحت کیلئے مانع ہو، حالانکہ بظاہر اس سے محفوظ ہو۔[۵]

وھم کا حکم:-

وہم اگر بکثرت صادر ہو تو راوی کی روایتیں ضعیف و مردود ہوتی ہیں اور اگر

---

(۱) من عرف بارتکاب کبیرۃ أو بإصرار علی صغیرۃ، فتح المغیث ۲/٤

(۲) نزھۃ النظر ص ۷۳، فتح المغیث ۱/ ۲۷۰

(۳) تیسیر مصطلح الحدیث ص ۹٤

(٤) الجواھر والدرر ۱/ ۲۸۳

(۵) شرح قصب السکر ص ۷۳

نادر ہو تو موہوم روایت کے علاوہ دیگر روایتیں مقبول ہوتی ہیں۔

وہم اور غفلت میں فرق:-

وہم ایسی غلطی ہے جو کبھی کبھی سرزد ہوتی ہے، اس سے کم ہی لوگ محفوظ رہتے ہیں۔ غفلت ایسی صفت ہے جو ہمیشہ لگی رہتی ہے، ان میں جب کثرت پائی جاتی ہے تو روایت ضعیف ہو جاتی ہے۔[1]

(۷) مخالفة الثقة: (ثقہ کی مخالفت)

کوئی راوی اپنے سے زیادہ ثقہ یا مختلف ثقات کے خلاف روایت بیان کرے، یعنی دونوں راوی ایک ہی روایت یا قصہ ایک ہی استاذ سے روایت کرتے ہیں، ثقہ کچھ کہتا ہے اور اوثق کچھ اور کہتا ہے۔ (یا ثقہ کچھ کہتا ہے اور بہت سارے ثقات کچھ اور کہتے ہیں) اس مخالفت کی بنیاد پر اس راوی کی جہت کمزور پڑ جاتی ہے اور اس کی روایت مشتبہ ہو جاتی ہے، ایسے راوی کی روایت کو **شاذ** اور مخالف کی روایت کو **محفوظ** کہا جاتا ہے۔

اس طرح کی مخالفت اگر ثقہ اور ضعیف کے درمیان ہو تو ثقہ کی روایت کو معروف اور ضعیف کی روایت کو منکر کہا جاتا ہے۔

مخالفت کا حکم:- مخالفت کی نوعیت کے اعتبار سے اس کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں جس پر حکم اس کی نوعیت کے اعتبار سے لگایا جاتا ہے۔ بنیادی قاعدہ یہ ہے کہ اگر راوی بکثرت مخالفت کرتا ہے تو مردود اور شاذ و نادر کرتا ہے تو مقبول ہے۔ مخالفت کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں:

مدرج :- سند یا متن میں ایسی تبدیلی کر کے مخالفت کی جائے جو اس میں نہ ہو تو اس کو اصطلاح میں مدرج کہا جاتا ہے اس کی دو قسمیں ہیں: مدرج اسناد، مدرج متن۔

مدرج اسناد:- حدیث کی سند میں ایسی تبدیلی کر کے مخالفت کی جائے جو اس میں نہ ہو۔

مدرج متن:- حدیث کے لفظ میں ایسی تبدیلی کر کے مخالفت کی جائے۔ بغیر الگ کئے ہوئے۔ جو اس میں نہ ہو۔

---

(۱) ضوابط في الجرح والتعديل ص۱۱۷

ادراج کا حکم:-ادراج اگر کسی مشکل کلمہ کی تشریح کیلئے ہو تو مقبول ہے ورنہ سب مردود ہے۔

مقلوب:-سند یا متن میں تقدیم و تاخیر کر کے مخالفت کی جائے۔اس کو مقلوب کہا جاتا ہے، اگر یہ امتحان کیلئے کیا جائے تو درست ہے بشرطیکہ اسی مجلس میں تصحیح کر دی جائے۔ ورنہ مردود ہے۔

مزید فی متصل الأسانید:-سند میں ایک راوی کا اضافہ کر کے مخالفت کی جائے۔اس کو مزید فی متصل الاسانید کہا جاتا ہے۔

اس میں اگر زیادتی مخالف سے زیادہ قوی راوی کی طرف سے ہے اور تصریح سماع موجود ہے تو مقبول ہے ورنہ مردود۔

اضطراب:-سند یا متن میں ایک راوی کو یا ایک کلمہ کو دوسرے سے بدل کر مخالفت کی جائے جس میں کوئی راجح نہ ہو تو اس کو اضطراب [اور اس روایت کو مضطرب] کہا جاتا ہے۔

کسی طرح سے اگر ایک کی ترجیح ہو جائے تو اضطراب ختم ہو جاتا ہے ورنہ باقی رہتا ہے اور روایت مردود ہو جاتی ہے۔

تحریف:-کلمہ کی شکل باقی رکھتے ہوئے حرکت میں تبدیلی کر کے مخالفت کی جائے جیسے "عَقیل، عُقَیل" تو اس کو تحریف [اور اس کلمے کو محرف] کہتے ہیں۔

تصحیف:-کلمہ کی شکل باقی رکھتے ہوئے نقطہ میں تبدیلی کر کے مخالفت کی جائے۔ جیسے: "شَیًا، ستا" تو اس کو تصحیف [اور اس کلمے کو مصحف] کہتے ہیں۔[1]

(۸) الجهالة:-(مجهول هونا)

راوی میں جہالت یا تو اس کے نام کے ابہام کی بناء پر ہوتا ہے، یا اس سے روایت کرنیوالوں کی قلت کی بناء پر ہوتا ہے، یا کثرتِ صفات کی بناء پر ہوتا ہے، یعنی ایک راوی ایسا ہے جس کے کئی نام یا کئی کنیت ہے اس میں سے ایسا نام یا ایسی کنیت ذکر کی جائے جو غیر معروف ہو۔

---

(۱) نزهة النظر ۷۵-۸۲، شرح قصب السكر ص ۷۷-۷۹

مبهم:- مبہم کا مطلب یہ ہے کہ راوی کا نام ذکر کئے بغیر روایت کی جائے، مثلاً حدثنا رجل، یا حدثنا رجل من بنی فلان.

مبهم کا حکم:- مبہم راوی کی روایت غیر مقبول ہوتی ہے، اسلئے کہ روایت کے مقبول ہونے کیلئے ضروری ہے کہ راوی عادل ہو، لیکن جب راوی کا نام معلوم ہی نہیں تو اسکی شخصیت اور حالت سب غیر معروف ہوتی ہے جس پر عدالت کا حکم لگایا ہی نہیں جاسکتا۔

راوی سے روایت کرنے والوں کی قلت کی صورت میں مجہول کی دو قسمیں ہیں۔ مجہول عین اور مجہولِ حال۔

مجهولِ عین:-اس راوی کو کہتے ہیں جس سے صرف ایک ہی شخص نے روایت کیا ہو اور کسی نے اس کی توثیق نہ کی ہو۔

مجهولِ حال:- اس راوی کو کہتے ہیں جس سے دو یا اس سے زیادہ راویوں نے روایت کیا ہو لیکن کسی نے توثیق نہ کی ہو۔[1]

مجهول کا حکم:- مجہولِ عین راوی کی روایت کے قبول اور عدل قبول کے بارے میں چند اقوال ہیں، لیکن جمہور کے یہاں ان کی روایت مطلق مردود ہوتی ہے، اس لئے کہ جب راوی کی شخصیت ہی مجہول ہے تو اس کی عدالت بدرجۂ اولیٰ مجہول ہوگی، خطیب بغدادی فرماتے ہیں:"المبهم الذی لم یسم أو من سمی ولا یعرف عینه لا یقبل روایته أحد علمناه."[2] یعنی مبہم راوی جسکا نام غیر معروف ہے، یا نام معلوم ہے لیکن شخصیت معلوم نہیں۔ تو ایسے راوی کی روایت کو کسی نے میرے علم کے مطابق قبول نہیں کیا ہے۔

یہی حال مجہولِ حال کی روایت کا ہے جس کو مستور بھی کہا جاتا ہے، اس لئے کہ دو یا دو سے زیادہ راویوں کی روایت سے راوی کا تعارف تو ضرور ہوتا ہے لیکن تعدیل نہیں ہوتی ہے، مجہول حال کی روایت کے بارے میں جمہور کا خیال ہے کہ توقف کیا جائے گا۔

---

(١) نزهة النظر ص ٨٦-٨٧ (٢) فتح المغيث ٢٩٧/١

جہالت عین اکثر اہل علم کے نزدیک دو یا دو سے زیادہ ثقہ راویوں کی روایت سے ختم ہو جاتی ہے، البتہ جہالت حال کسی محدث کی توثیق سے ہی ختم ہو سکتی ہے۔

علامہ ابن رشید فرماتے ہیں: "لا فرق فی جهالة الحال بين رواية واحد واثنين مالم يصرح الواحدأ وغيره بعدالته، نعم كثرة رواية الثقات عن الشخص تقوىٰ حسن الظن فيه." [1] جہالت حال میں ایک یا دو راوی کی روایت سے کوئی فرق نہیں پڑتا جب تک کہ کسی نے اس کی عدالت کی تصریح نہ کی ہو۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ راویوں کی کثرت سے اس کے بارے میں حسن ظن قائم ہوتا ہے۔

امام دار قطنیؒ کے یہاں جہالت حال بھی دو یا دو سے زائد ثقہ راویوں کی روایت سے ختم ہو جاتی ہے۔ [2]

یہاں پر یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ اگر کسی شخص کو کسی امام نے مجہول کہہ دیا ہے تو ضروری نہیں کہ وہ سب کے یہاں مجہول ہی ہو، اس لئے کہ مجہول وہی ہو سکتا ہے جس کی کسی نے توثیق نہ کی ہو، مثلاً حکم بن عبد اللہ البصری کو ابو حاتم نے مجہول کہا ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ وہ مجہول نہیں، کیونکہ ان سے چار ثقہ راویوں نے روایت کیا ہے اور امام ذہبی نے ان کو ثقہ کہا ہے۔ [3]

اسی طرح سے امام ترمذیؒ، امام ابو القاسم بغوی، اسماعیل بن محمد الصفار اور ابو العباس اصم کو علامہ ابن حزم نے مجہول کہا ہے، جبکہ یہ حضرات ائمہ وقت ہیں۔ [4]

خواتین میں جو ضعف پائی جاتی ہے وہ عموماً جہالت کی بنیاد پر ہے۔ [5]

(۹) البدعة :-

بدعت اس اعتقاد کو کہتے ہیں جو اللہ کے رسول ﷺ کے مشہور طریقے کے برعکس مخالفت میں نہیں بلکہ بطور شبہ رائج کر دیا گیا ہو۔ [6]

اس میں وہ سارے فرقے شامل ہیں جنہوں نے سنت کا طریقہ چھوڑ دیا مثلاً خوارج، روافض، قدریہ، جہمیہ مرجئہ، شیعہ وغیرہ، ان مبتدعین کی روایتوں کے قبول

---

(۱) فتح المغیث ۱/۲۹۷ (۲) الرفع والتکمیل ۲۴۸
(۳) ھدی الساری ۳۹۸ (٤) الرفع والتکمیل ۲ ۱-۱۸۵
(۵) تدریب الراوی ۱/۳۲۱، ضوابط فی الجرح ص ۸۱ (٦) نزھة النظر ص ۲۹

اور عدم قبول کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ مطلق مردود ہیں حسن بصری فرماتے ہیں: "لا تسمعوا من أهل الأهواء"[٢]

اور کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ایسا راوی اگر صاحبِ صدق وامانت ہو تو اس کی روایت مقبول ہوگی۔ حافظ ابن مدینی فرماتے ہیں کہ:"لو تركت أهل البصرة للقدر و تركت أهل الكوفة للتشيع لخربت الكتب"[٢] یعنی اگر بصرہ والوں کو قدر کی وجہ سے اور کوفہ والوں کو تشیع کی وجہ سے ترک کر دیا جائے تو ساری کتابیں بیکار ہو جائیں گی۔

علامہ ابن حبان کہتے ہیں کہ:" يحتج بأخبارهم إذا كانوا ثقات ونكل مذاهبهم وما تقلدوا فيما بينهم و بين خالقهم جل و علا، إلا أن يكونوا دعاة إلى ما انتحلوا" [٣]

کچھ لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ اگر بدعت کی طرف دعوت دیتا ہے تو غیر مقبول، ورنہ مقبول ہے۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ:"لا يؤخذ العلم من صاحب هوى يدعوا الناس إلى هواه" [٤]

علامہ ابن رجب علماء کے اقوال اور ان کے دلائل کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ:"فيخرج من هذا أن البدع الغليظة كالتجهم يردبها الرواية مطلقا،والمتوسطة كالقدر،إنما يردرواية الداعي إليها، والخفيفة كالإرجاء هل تقبل معها الرواية مطلقا أو يرد عن الداعية على روايتين."[٥] یعنی خلاصہ یہ ہے کہ بدعتِ غلیظہ - جیسے جہمیت اختیار- کرنے والے کی روایت مطلق مردود ہے اور بدعت متوسطہ - جیسے تقدیر کا انکار- کرنے والے کی روایت، اگر وہ اس کی طرف داعی نہ ہو تو مقبول ہے، اور بدعتِ خفیفہ - جیسے ارجاء- کرنے والے کی روایت مطلق مقبول ہے یا نہیں تو اس میں اختلاف ہے۔

لیکن صحیح بات یہ ہے کہ بدعت کی دو قسمیں ہیں، بدعت مکفرہ (کافر بنادینے

---

(١) الجرح والتعديل ٢/ ٢٣ (٢) شرح علل الترمذی ص ٨٤
(٣) الجرح والتعديل ابولبابة ص ١١٤ (٤) معرفة علوم الحديث للحاكم ص ١٣٥
(٥) شرح علل الترمذی ص ٨٦

والی بدعتیں) اور بدعت مفسقہ (فاسق بنانے والی بدعتیں)۔ اگر کوئی شخص دین کے ضروری اور فطری امور سے انکار کر دیتا ہے جو تواتر سے ثابت ہو، یا اس کے برعکس اعتقاد رکھتا ہو تو اس کو بدعت مکفرہ کہتے ہیں، جیسے روافض کے متشدد فرقے اور جس بدعتی کی یہ صفت ہو تو جمہور کے یہاں اس کی روایت مردود ہوتی ہے۔[۱]

اور اگر آدمی ایسی بدعت کرتا ہے جو اس کو فاسق بنا دیتی ہے، جیسے خوارج و روافض کے معتدل فرقے، تو اس کی روایت قابل قبول ہو گی بشرطیکہ وہ عادل و ضابط ہو، اور اپنی بدعت کی طرف دعوت نہ دیتا ہو اور نہ ایسی روایت کرتا ہو جو اس کی بدعت کو تقویت پہنچاتی ہو۔[۲]

امام بخاری نے عمران بن حطان سدوسی سے جو روایت کی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ انہوں نے اصل کتاب میں نہیں بلکہ متابعات میں روایت کیا ہے اور وہ بھی پوری کتاب میں صرف ایک جگہ کتاب التوحید میں، یا یہ اس کی ان حدیثوں میں سے ہے، جس کو بدعتی ہونے سے پہلے روایت کیا تھا۔[۳]

(۱۰) سوء الحفظ:-

اس کا مطلب یہ ہے کہ راوی کی حدیثوں میں خطاء و غلطی کا ہو جانا راجح و غالب ہو، اور صحیح ہونا نادر ہو، سوء حفظ کی دو قسمیں ہیں: دائمی و عارضی۔

سوء حفظ دائمی [سوء حفظ لازم] اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی یہ صفت بچپن ہی سے ہو اور ہمیشہ رہے، ایسے شخص کی روایت کو بعض محدثین شاذ کہتے ہیں اور اس کی روایت بھی مردود ہوتی ہے۔

سوء حفظ عارضی [سوء حفظ طاری] اس کا مطلب یہ ہے کہ راوی فی نفسہ ثقہ ہو لیکن کسی عارضی سبب کی بناء پر وہ سوء حفظ کا شکار ہو جاتا ہے، مثلاً کبر سنی، یا اندھاپن، یا کتابوں کا جل جانا، یا کسی مصیبت سے دوچار ہو جانا- ایسے راوی کی روایت کو

---

(۱) نزہۃ النظر ص ۸۷-۹۰

(۲) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: مقدمۃ ابن الصلاح ص ۱۰۳، شرح علل الترمذی ص ۸۳، ھدی الساری ص ۳۸۵، فتح المغیث ۳۰۳/۱

(۳) فتح المغیث ۳۰۹/۱

اصطلاح میں **مختلط** کہتے ہیں۔

ایسی روایت کا حکم یہ ہے کہ: ''جو حدیثیں اختلاط سے پہلے کی ہیں وہ مقبول ہیں اور جو بعد کی ہیں یا جس کے بارے میں یہ پتہ نہ چلے کہ اختلاط سے پہلے کی روایت ہے یا بعد کی، تو اس کیلئے متابعت کی ضرورت ہے''[۱]

مختلط راویوں کے حالات معلوم کرنے کیلئے سب سے بہتر کتاب ''الکواکب النیرات فی معرفة من اختلط من الرواة الثقات'' ہے۔ جو ابن کیال (متوفی ۹۳۹ھ) کی تصنیف ہے۔

ملاحظہ:۔

سوء حفظ، مستور، مختلط، مرسل اور مدلس کی روایت اگر اپنے ہم مثل یا اقویٰ سے قوت حاصل کر لے تو ضعف کے حد سے نکل کر مجموعی اعتبار سے حسن لغیرہ ہو جاتی ہے۔[۲]

کچھ اور اسباب جرح:۔

راوی کے عادل و ضابط ہونے کے باوجود بعض حالات ایسے ہوتے ہیں جس کی وجہ سے روایت قابل قبول نہیں ہوتی، جس کی بنیادی وجہ سند میں انقطاع کا ہونا، یا کسی نہ کسی طرح سے غفلت برتنا ہے۔

انقطاع کا سبب اگر فی نفسہ راوی ہے تو بعض صورتوں میں راوی مشتبہ ہو جاتا ہے جس کا اثر بہر صورت اس کی عدالت اور ضبط پر پڑتا ہے۔ اسلئے اسکو اگر اسباب عدالت و ضبط میں خلل کی بنا پر جو اسباب ہوتے ہیں اسمیں شمار کیا جائے تو بیجا نہ ہو۔

لیکن اہل علم نے ان کو عدالت و ضبط سے الگ ذکر کیا ہے، لہٰذا ان کا ذکر الگ کیا جارہا ہے، وہ اسباب یہ ہیں:

(۱) ارسال:۔

ارسال کی صورت یہ ہے کہ راوی کسی ایسے شخص سے روایت کرے جو اس کا ہم عصر نہ ہو، یا ہم عصر ہو لیکن ملاقات نہ ہوئی ہو، اس طرح سے روایت کرے جس

(۱) نزهة النظر ص ۹۰-۹۱ (۲) نزهة النظر ص ۹۱-۹۲

سے اس سے سماع کا وہم ہو رہا ہو۔

اس کی دو قسمیں ہیں: ارسال ظاہر، ارسال خفی

ارسال ظاهر: یہ ہے کہ راوی ایسے شخص سے روایت کرے جس کا ہم عصر نہ ہو۔

ارسال خفی: یہ ہے کہ راوی ایسے شخص سے روایت کرے جس کا ہم عصر ہو مگر ملاقات نہ کیا ہو۔(۱)

ارسال کا حکم:-

مرسل راوی جس سے ارسال کرتا ہے چونکہ اس سے ملاقات نہیں ہوئی ہوتی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ درمیان میں کوئی راوی ساقط ہے لہٰذا انقطاع کی بنیاد پر روایت ضعیف ہوتی ہے، لیکن اگر یہ معلوم ہو کہ ثقہ سے ارسال کیا ہے تو درست ہے۔

تدلیس اور ارسال میں فرق:-

اصطلاحی اعتبار سے ارسال اور تدلیس میں فرق ضرور ہے اس لئے کہ ارسال ایسے راوی سے ہوتی ہے جس سے ملاقات نہیں ہوئی ہوتی ہے، اور تدلیس ایسے راوی سے ہوتی ہے جس سے ملاقات ہو چکی ہوتی ہے۔ لیکن باعتبار حکم دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے اس لئے کہ دونوں صورتوں میں راوی درمیان سے دوسرے کو ساقط کر دیتا ہے۔(۲)

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ: مدلس اور مرسل خفی میں بہت دقیق فرق ہے۔ تدلیس جس سے لقاء ثابت ہے اس کے ساتھ خاص ہوتا ہے، اور اگر ملاقات نہ ہو تو وہ مرسل خفی ہے۔ جن لوگوں نے تدلیس کی تعریف میں بغیر ملاقات کے معاصرت کا ذکر کیا ہے تو اس سے مرسل خفی کی تعریف اس میں شامل ہو جاتی ہے۔ حالانکہ صحیح یہ ہے کہ دونوں میں فرق ہے۔(۳)

امام سخاوی فرماتے ہیں کہ: تدلیس تو ارسال کو شامل ہے، لیکن ارسال تدلیس کو شامل نہیں، کیونکہ جس سے ملاقات ہی نہیں ہوئی اس سے سماع کا وہم ممکن نہیں،

---

(۱) النكت على ابن الصلاح لابن حجر ۲/۶۲۳
کچھ محدثین نے مرسل کو مرسل ظاہر اور ارسال کو مرسل خفی کہا ہے، اور ارسال کی کوئی قسم نہیں کی ہے۔

(۲) شرح قصب السكر ص ۶۶-۶۷ (۳) نزهة النظر ص ۶۶

اسی وجہ سے علماء نے تدلیس کی مذمت کی ہے [اس لئے کہ وہ مخفی ہوتا ہے] اور ارسال کی نہیں، کیونکہ ارسال میں سقوط واضح ہے۔ (۱)

علامہ ابن صلاح نے تدلیس کی جو تعریف کی ہے اس پر ارسال کی بھی تعریف صادق آتی ہے۔ (۲)

حافظ عراقی فرماتے ہیں کہ تدلیس کی یہی تعریف (جو ابن صلاح نے کیا ہے) اہل حدیث کے یہاں مشہور ہے۔ (۳)

علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ: تدلیس کا انجام یہ ہے کہ وہ ارسال کی ایک قسم ہے (جو اس کے پاس ثابت شدہ روایت ہے) اس کو خطرہ رہتا ہے کہ اگر اپنے شیخ کے نام کی تصریح کر دے گا تو روایت مردود ہو جائے گی۔ (۴)

امام سخاوی فرماتے ہیں کہ: خلاصہ یہ ہے کہ ان لوگوں کے یہاں ارسال خفی و ظاہر اور تدلیس کا حکم برابر ہے۔ (۵)

(۲) تدلیس:-

تدلیس "دَلَس" سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں ظلمت اور تاریکی اور تدلیس کے معنی ہیں عیب کو چھپا کر مخاطب کو تاریکی میں ڈال دیا جائے، اسی سے تدلیس اسناد ماخوذ ہے۔ (۶)

یعنی عیب دار سند کو بظاہر حسین بنا کر سامع کو تذبذب میں ڈالنا۔

اصطلاحی تعریف:-

راوی کا اپنا استاذ سے نہ سنی ہوئی روایت کو اس طرح سے بیان کرنا جیسے اس نے اس سے سنا ہو۔

اس کی دو قسمیں ہیں تدلیس اسناد اور تدلیس شیوخ۔

تدلیس اسناد:-

تدلیس اسناد یہ ہے کہ راوی اپنے استاذ سے نہ سنی ہوئی روایت ایسے صیغہ سے

---

(۱) فتح المغیث ۲۰۹/۱
(۲) مقدمة ابن الصلاح ص ٦٦
(۳) التقييد والايضاح ص ٩٨
(٤) اختصار علوم الحديث ص ٥٥
(٥) فتح المغيث ١٥٨/١
(٦) لسان العرب ٨٦/٦

بیان کرے جس سے سماع کا وہم ہو رہا ہو (مثلاً: قال، عن) جب کہ اس کے پاس استاد کی طرف سے اجازت یا وجادہ بھی موجود نہ ہو۔

اسکی چند صورتیں ہیں: تدلیس تسویہ، تدلیس عطف، تدلیس قطع۔

تدلیس تسویه:- یہ ہے کہ کوئی راوی دو ثقہ راویوں کے درمیان سے جن کی ملاقات ایک دوسرے سے ہو چکی ہو، کسی ضعیف راوی کو حذف کر کے ایسا صیغہ استعمال کرے جس سے سماع کا احتمال ہو رہا ہو۔

تدلیس عطف:- یہ ہے کہ راوی دو افراد سے روایت کرے (جب کہ اس نے یہ روایت صرف ایک سے سنی ہے دوسرے سے نہیں۔) پھر پہلے استاد کے لئے صیغہ سماع استعمال کر کے دوسرے کو اسکے ساتھ بیان کر دے جس سے سماع کا وہم ہو رہا ہو۔

تدلیس قطع:- یہ ہے کہ راوی صیغہ ادا استعمال کر کے خاموش ہو جائے [جس کا مقصد سند کو حذف کرنا ہو] پھر کچھ وقفہ کے بعد آگے کی سند بیان کرے۔

اس کو تدلیس سکوت، نیز تدلیس حذف بھی کہا جاتا ہے۔[۱]

تدلیس شیوخ:-

یہ ہے کہ راوی اپنے استاد کو کسی ایسی صفت سے بیان کرے جو غیر معروف ہو۔[۲]

تدلیس کا حکم:-

تدلیس اسناد کی جتنی بھی صورتیں ہوتی ہیں ان میں "تدلیس تسویہ" سب سے بدتر ہے، علماء نے اس کی بڑی مذمت بیان کی ہے۔

تدلیس تسویہ اور تدلیس قطع کی صورت میں روایت ضعیف ہوتی ہے اس لئے کہ پہلی صورت میں ضعیف راوی محذوف ہوتا ہے اور دوسری صورت میں انقطاع پایا جاتا ہے، جب کہ اس شر کو چھپانے کیلئے ایسا کلمہ ادا استعمال کیا ہے جو سماع کا وہم دلاتا ہے، اگرچہ راوی نے عدم سماع ہی مراد لیا ہے پھر بھی سننے والوں کو دھوکہ ہو سکتا ہے۔

تدلیس عطف کی صورت میں روایت صحیح ہو سکتی ہے اگر وہ سلسلہ اسناد جس پر عطف کیا ہے وہ صحیح ہے۔ اس لئے کہ اس میں انقطاع نہیں پایا گیا۔

---

(۱) شرح قصب السكر ص ٦٣-٦٤ (۲) طبقات المدلسين ص ٢٦

تدلیس شیوخ کبھی راوی کے صغر سنی یا کم علمی، یا ضعف کے باعث کیا جاتا ہے، کبھی طلبہ کا امتحان لینے کیلئے کیا جاتا ہے، لہٰذا اس پر حکم اسی اعتبار سے لگایا جاتا ہے۔ اگر عیب کو چھپانے کیلئے کیا ہے تو ضعیف ہوگی ورنہ مقبول ہوگی۔(۱)

تدلیس اسناد کا عام حکم یہ ہے کہ بکثرت تدلیس کرنے والا مدلس راوی، یا ضعفاء و مجاہیل سے تدلیس کرنے والا مدلس اگر محتمل صیغہ [عنعنة یا أنأنة یا قال] استعمال کرتا ہے تو روایت مرسل ہوگی اور اگر صریح صیغہ استعمال کرتا ہے [حدثنا، سمعت، اخبرنا وغیرہ] تو روایت صحیح ہوگی۔(۲)

مدلس کی کچھ مخصوص حالتیں:-

اگر کوئی مدلس راوی ایسے استاذ سے معنعن روایت کرتا ہے جس سے اس نے بکثرت روایت کی ہے تو وہ عنعنہ (مدلس ہونے کے باوجود بھی) قابل قبول ہوتا ہے۔ جیسے امام اعمش کی روایت ابو وائل شقیق بن سلمۃ، ابراہیم نخعی، ابو صالح ذکوان وغیرہ سے۔(۳)

ایسے ہی اگر کوئی راوی مدلس کی روایتوں کی چھان بین کر کے اسکے عنعنہ کی ذمہ داری لے لے تو وہ بھی قال قبول ہے۔ جیسے امام شعبہ کی روایت اعمش، ابو اسحٰق، اور ابو قتادہ سے، نیز لیث بن سعد کی روایت ابو الزبیر سے، یحیٰی قطان کی روایت ابو اسحٰق سے بواسطہ زہیر بن معاویہ، نیز یحیٰی قطان کی روایت سفیان ثوری سے(۴)

ایسے ہی اگر کوئی مدلس راوی صرف ثقہ ہی سے تدلیس کرتا ہے، یا جملہ روایتوں کے مقابلہ میں تدلیس بہت کم ہے تو اس کی بھی معنعن روایت قابل قبول ہوتی ہے۔(۵)

مدلس راویوں کے درجات:-

مدلس راویوں کے طبقات اور درجات ہوتے ہیں اس اعتبار سے بھی ان کی روایت پر حکم لگانے میں فرق ہوتا ہے۔

---

(۱) مقدمة ابن الصلاح ص ٦٨ (٢) مقدمة ابن الصلاح ص ٦٧

(٣) ميزان الاعتدال ٢/٢٢٤ (٤) طبقات المدلسين ١٥١، ٢٣، فتح الباری ١/٢٥٨

(٥) طبقات المدلسين ص ٢٣

ان کے کل پانچ طبقات ہیں۔

۱۔ جس نے شاذ ونادر تدلیس کیا ہو جیسے یحیٰ بن سعید انصاری ایسے راویوں کی تعداد ۳۳ ہے۔

۲۔ وہ عظیم مرتبہ والے محدثین جن کی تدلیس کی تعداد نسبتاً کم ہے، جیسے امام سفیان ثوری، یا صرف ثقہ سے تدلیس کیا ہو جیسے سفیان بن عیینہ۔ان کی بھی تعداد ۳۳ ہے۔

۳۔ جس نے بکثرت تدلیس کیا ہے جیسے ابوالزبیر محمد بن مسلم ان کی تعداد ۵۰ ہے۔

٤۔ جس نے ضعفاء و مجاہیل سے تدلیس کیا ہے جیسے بقیہ بن ولید۔ان کی تعداد صرف ۱۲ ہے۔

۵۔ جو تدلیس کے علاوہ دیگر سبب سے ضعیف ہوں جیسے عبد اللہ بن لہیعہ۔ ان کی تعداد ۲۴ ہے۔[1]

پہلے اور دوسرے قسم کے لوگوں کی تدلیس قابل قبول ہوتی ہے۔

تیسرے اور چوتھے قسم کے لوگوں کی روایتیں سماع کی تصریح ہو تو قابل قبول ہوگی ورنہ نہیں، تیسرے قسم والوں کی روایت کو کچھ لوگوں نے مطلق قابل قبول مانا ہے۔

پانچویں قسم کے لوگوں کی روایت تصریح سماع کے باوجود بھی قابل قبول نہیں، الا یہ کہ راوی کا ضعف خفیف ہو اور ائمہ نے اسکی توثیق کی ہو جیسے ابن لہیعہ۔[2]

معرفت کے ذریعے:-

تدلیس اور ارسال کی معرفت خود اس راوی کے بتانے سے حاصل ہوتی ہے یا کسی امام کی وضاحت سے جس نے یہ بتادیا ہو کہ دونوں میں ملاقات نہیں ہے، یا ہے تو اس روایت کو جس میں تدلیس کیا ہے نہیں سنا ہے۔

مقام تدلیس:-

امام حاکم فرماتے ہیں کہ: حرمین، حجاز، مصر، عوالی، خراسان، اصبہان، بلاد فارس، خوزستان، ماوراء نہر کے ائمہ میں سے کسی سے تدلیس نہیں سنا گیا ہے، زیادہ تر

---

(۱) مصدر سابق ص ۲۳ – ٢٤ (۲) مصدر سابق ص ٢٤

تدلیس کوفہ کے ائمہ سے سرزد ہوئی ہے، اور کچھ بصرہ کے لوگوں سے، بغداد والوں میں بھی کسی سے تدلیس ابو بکر باغندی کے زمانہ تک ثابت نہیں، سب سے پہلے تدلیس بغداد میں باغندی نے کیا ہے۔[۱]

(۳) ضعفاء سے روایت:-

انسانی زندگی میں صحبت کا بڑا اثر پڑتا ہے۔ اللہ کے رسول نے اچھی صحبت کو صاحب مسک اور بری صحبت کو صاحب کیر (بھٹی پھونکنے والا) قرار دے کر اچھی صحبت میں رہنے کی ترغیب اور بری صحبت سے نفرت دلائی ہے۔ شیخ سعدی فرماتے ہیں کہ:

صحبت صالح تراصالح کند　　　صحبت طالح تراطالح کند

محدثین کے یہاں اس طرح ضابطہ ہے کہ اگر کوئی راوی ضعفاء و مجہولین سے بکثرت روایت کرتا ہے تو وہ مشکوک ہو جاتا ہے اس لئے کہ اس نے:

۱- اپنے مشائخ کے انتخاب میں کوئی توجہ نہیں دی جو غفلت کی دلیل ہے۔

۲- مجہولین کی حالت پر اطلاع پانے میں ناکام رہا۔

۳- ایسے لوگوں سے روایت کیا جو کسی کو تقویت نہیں دے سکتے لہٰذا اس طرح سے غیر مفید کام کیا۔[۲]

چنانچہ امام ابوزرعہ احمد بن صالح مکی کے بارے میں فرماتے ہیں کہ: "صدوق لکنه يحدث عن الضعفاء والمجهولين."[۳]

امام ابو حاتم فرماتے ہیں کہ:

عبدالرحمٰن محاربی مجہولین سے منکر روایت بیان کرتے ہیں لہٰذا روایت فاسد ہو جاتی ہے، لیکن جب ثقات سے روایت کرتے ہیں تو صدوق ہوتے ہیں۔[۴]

محمد عمر واقدی کو بہت سارے نقاد نے اسی بنا پر متہم قرار دیا ہے۔

امام بخاری نے عبداللہ بن عبدالقدوس سعدی کے بارے میں فرمایا کہ:

صدوق ہیں لیکن ضعفاء سے روایت کرتے ہیں۔[۵]

---

(۱) الباعث الحثيث ص ٥٤　　(۲) ضوابط فی الجرح والتعدیل ص ۱۲۹

(۳) الجرح والتعديل ٥٦/٢　　(٤) الجرح والتعديل ٢٨٢/٥

(٥) تهذيب التهذيب ٣٠٣/٥

اسی طرح سے عبدالحمید بن بہرام فزاری کو شہر بن حوشب سے بکثرت روایت کرنے کی وجہ سے ضعیف قرار دیا گیا ہے۔[۱]

بڑے بڑے محدثین نے ضعفاء و مجہولین سے جو روایت کیا ہے تو وہ ان کی معرفت اور ان کی احادیث سے تحذیر وخوف دلانے کیلئے کیا ہے، اسی لئے ان کی روایتوں کو کتب جرح و تعدیل میں بھی ذکر کیا ہے۔[۲]

(٤) صحیفه سے روایت کرنا:-

کبھی کبھی راوی اس وجہ سے ضعیف ہو جاتا ہے کہ وہ حدیث کو کسی استاد سے پڑھے بغیر پڑھتا اور پڑھاتا ہے، جس کی وجہ سے تصحیف و تحریف بکثرت ہوتی ہے ایسے لوگوں کو محدثین صحفی کہتے ہیں اور ان سے روایت کرنا نہیں پسند کرتے۔

امام مسلمؒ نے زہیر بن حرب کے واسطہ سے ایک روایت ذکر کیا ہے جنہوں نے اسحٰق بن عیسیٰ سے اور انہوں نے ابن لہیعہ سے روایت کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ موسی بن عقبہ نے میرے پاس لکھ کر کے بھیجا کہ بسر بن سعید نے ہم سے زید بن ثابت کے واسطہ سے یہ روایت ذکر کیا ہے کہ: "إن رسول الله صلى الله عليه وسلم احتجم في المسجد." یعنی آپ نے مسجد میں حجامت کرایا۔

ابن لہیعہ سے جب پوچھا گیا کہ گھر کے اندر کی مسجد مراد ہے؟ تو انہوں نے کہا نہیں، مسجد نبوی مراد ہے۔ امام مسلم فرماتے ہیں کہ یہ روایت ہر طرح سے سنداً و متناً فاسد ہے۔ ابن لہیعہ نے متن میں تصحیف کیا ہے اور سند میں غفلت کی ہے۔ اصل روایت اس طرح ہے: "احتجر في المسجد بخوصة أو حصير يصلي فيها."

مسجد میں چٹائی سے حجرہ کی مانند گھیر لیا اور اس میں نماز پڑھتے تھے۔ (قیام اللیل کرتے تھے۔)

پھر فرماتے ہیں ابن لہیعہ سے غلطی اس وجہ سے ہوئی کہ انہوں نے موسی بن عقبہ کی کتاب سے روایت کیا ہے۔ "وهي الآفة التي تخشى على من أخذ الحديث من الكتب من غير سماع من المحدث أو عرض عليه" اس مصیبت کا خوف

(۱) تهذيب التهذيب ۱۱۰/٦ (۲) شرح علل الترمذی ص ۱۱۳

ہر اُس شخص پر ہوتا ہے جو حدیث کو کتابوں سے پڑھ لیتا ہے نہ کسی محدث سے سنتا ہے نہ سناتا ہے۔[1]

ایسے ہی عبد الحمید بن بہرام کو صحیفہ سے روایت کرنے کی وجہ سے (جو شہر بن حوشب کے پاس تھا) ضعیف کہا گیا ہے۔[2]

(۵) کفر:-

(٦) عدم بلوغت:-

(۷) جنون:-

(۸) فاقد مروت:-

اسباب عدالت میں جن چیزوں کا ہونا شرط ہے مثلاً: اسلام، بلوغت برائے وقت ادا، عقل، خوارم مروت سے محفوظ رہنا ان کا فقدان بھی اسباب ضعف میں شامل ہے، مثلاً: کافر ہونا، جو کذب سے بھی بڑھ کر ہے، نابالغ ہونا، مجنون ہونا، اسباب مروت سے محفوظ رہنا۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ محدثین نے لفظ فسق میں کفر کو شامل مانا ہے اس لئے کہ ادنیٰ کا وجود اگر کسی چیز کیلئے مانع ہے تو اعلیٰ کا وجود بدرجہ اولیٰ مانع ہوگا، اور کفر فسق سے اعلیٰ ہے۔ اسی طرح سے خوارم مروت کو بھی اس میں شامل مان لیا ہے، اسلئے کہ جو شخص گناہِ صغیرہ پر اصرار نہیں کرتا اور گناہِ کبیرہ کا ارتکاب نہیں کرتا تو اس کے اندر مروت کا وجود ضرور ہے، جو اس کو تقویٰ اور پرہیز گاری پر ابھارتا ہے۔ البتہ مجنون اور نابالغ دونوں غیر مکلّف ہوتے ہیں، اور چونکہ غیر مکلّف کا اعتبار نہیں ہوتا ہے جو بدیہی امر ہے، اس لئے اسباب تعدیل میں اس کی جانب اشارہ کو کافی سمجھا ہے، اور اسباب جرح کی تفصیل میں ذکر نہیں کیا، لہٰذا ان چاروں چیزوں کو اسباب جرح میں شمار کر لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اسباب ضعف کا خاکہ ملاحظہ فرمائیں:

---

(۱) کتاب التمیز ص ۱۸۸، محقق ڈاکٹر محمد مصطفی اعظمی۔

(۲) تهذيب التهذيب ٦/١١٠

اسباب ضعف کا خاکہ
کچھ دیگر اسباب
صحیفہ سے روایت کرنا
مجہول و ضعفاء سے روایت کرنا
کثرت ارسال
تدلیس
جہالت سے متعلق
مبہم
مجہول حال
مجہول عین
ضبط سے متعلق
سوء حفظ
مخالفت ثقات
مصحف
محرف
مضطرب
مزید فی
مقلوب
مدرج
کثرت وہم
کثرت غفلت
فحش غلط
عدالت سے متعلق
سن تمییز میں نہ ہونا
جنون
ختم مروت
بدعت
فسق
متہم بالکذب
کذب
کفر

تعدیل
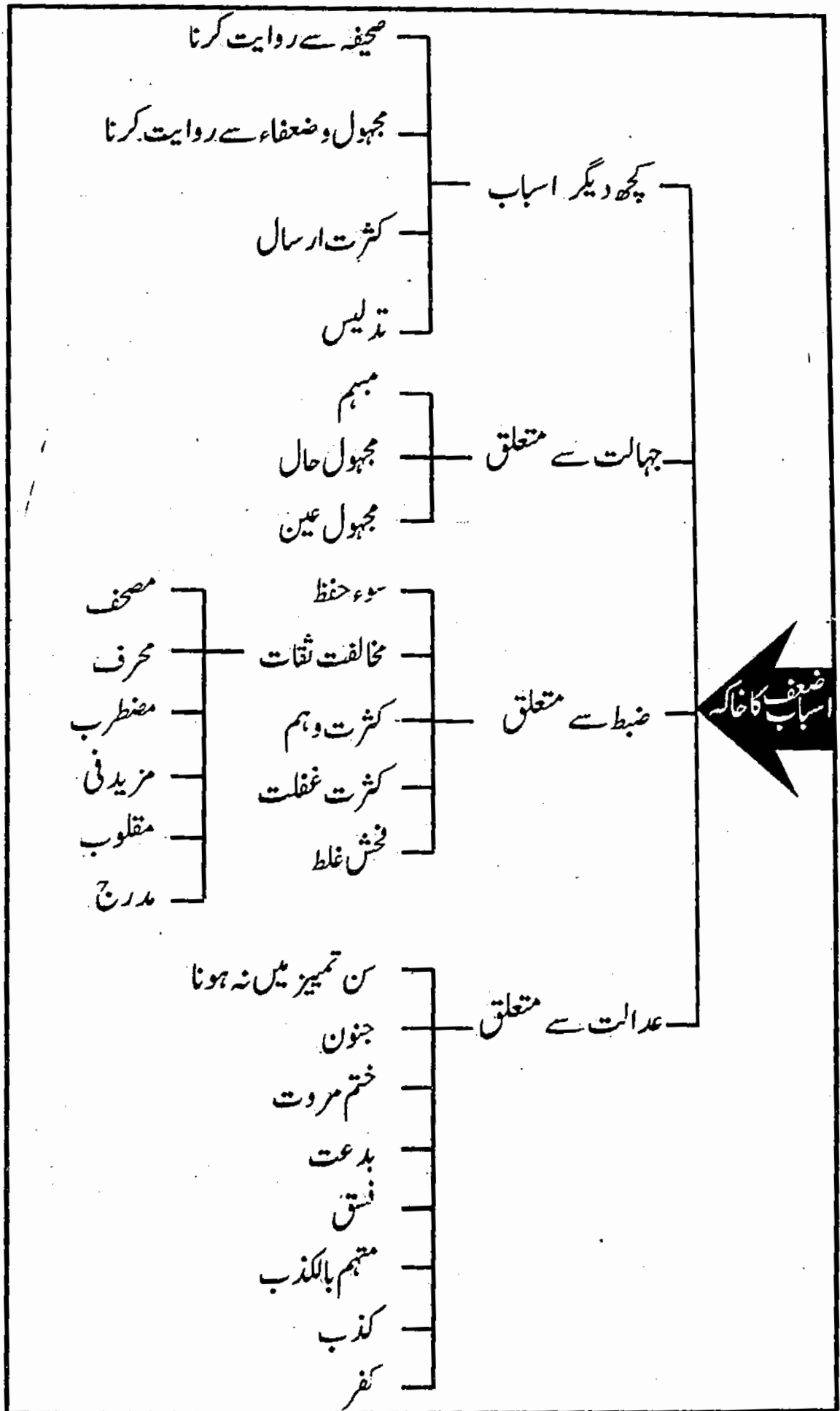
تعدیل کا لغوی معنیٰ:-

تعدیل ”عدل“ سے ماخوذ ہے جو عام طور سے انصاف کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے جو ظلم و جور کے مخالف ہے، اس طرح سے ہر وہ چیز جس کی درستگی پر دل کو اطمینان ہو اس کو بھی عدل کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے اور دیگر معانی ہیں۔ [1]

تعدیل کا معنی ہے کسی کو درست کرنا، ”تعدیل الشهود“ کا مطلب ہے کہ ان کو (گواہان کو) عادل (درست) قرار دیا جائے۔ [2]

اصطلاحی تعریف:-

راوی پر یہ حکم لگانا کہ وہ عادل اور ضابط ہے۔ [3]

راوی کے مقبول ہونے کی شرط اور اس کی دلیل:-

لہٰذا راوی کے مقبول ہونے میں دو بنیادی چیزیں ضروری ہیں: عدالت اور ضبط۔ علامہ ابن صلاح فرماتے ہیں: ”يشترط فيمن يحتج بروايته أن يكون عدلا ضابطا لما يرويه“ [4] راوی کے قابل قبول ہونے کی شرط یہ ہے کہ وہ عادل ہو اور جس چیز کو بیان کرتا ہے اس کا ضابط ہو۔ راوی کے عادل ہونے کی جو شرط ہے اس کی دلیل قرآن کریم کی یہ آیت ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا إِنْ جَاءَ كُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاءٍ فَتَبَيَّنُوْا﴾ [حجرات:٦]
جس میں فاسق کے خبر کی حقیقت معلوم کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اور غلط خبر دینے والے کو ”فاسق“ کہا گیا ہے۔

عدالت:- عدالت ایک فطری ملکہ ہے جو انسان کو تقویٰ و مروت کے لزوم پر ابھارتا ہے۔ [5]

تقویٰ:- اعمال حسنہ پر عمل کرنا اور اعمال سیئہ (فسق، بدعت وغیرہ) سے اجتناب کرنا۔

مروت:- وہ فطری ملکہ ہے جو انسان کو ناپسندیدہ چیزوں سے اجتناب اور پسندیدہ چیزوں پر عمل کیلئے ابھارتا ہے۔ [6]

---

(١) لسان العرب ١١/٤٣٠-٤٣١ — (٢) الصحاح ٥/١٧٦١
(٣) مقدمه ابن الصلاح ص ٩٤ — (٤) مصدر سابق
(٥) نزهة النظر ص ٣٢، فتح المغيث ٢/٣ — (٦) مصدر سابق

علامہ ابن حبان نے مروت کی تعریف میں تقریباً بیس اقوال ذکر کیا ہے اور اسکے بعد فرمایا ہے کہ میرے نزدیک مروت دو خصلتوں کا نام ہے: "اجتناب ما یکرہ اللہ و المسلمین من الفعال، و استعمال ما یحب اللہ و المسلمین من الخصال" (۱)

علامہ زنجانی فرماتے ہیں کہ: مروت ایک عرفی چیز ہے مجرد شرعی نہیں، عرفی اصطلاحات عام طور سے کسی قاعدہ میں نہیں آتے بلکہ یہ مختلف اشخاص و بلدان کے اعتبار سے بدلتے رہتے ہیں۔ (۲)

شروط عدالت (اسباب تعدیل):-

کسی راوی کی روایت کو قبول کرنے کیلئے مجموعی طور سے دو شرطوں کا ہونا ضروری ہے: عدالت اور ضبط۔ اور چونکہ عدالت کی تعریف میں علماء کے مختلف اقوال ہیں، اسی لئے اس کے اسباب بھی مختلف فیہ ہیں۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ اگر انسان پر اطاعت غالب ہے تو وہ عادل ہے اور اگر معصیت غالب ہے تو مجروح ہے۔

امام ابراہیم کہتے ہیں کہ مسلمانوں میں عادل وہ ہے جس پر کسی قسم کا کوئی شبہ نہ ہو۔

اہل عراق کہتے ہیں کہ اظہارِ اسلام اور فسق ظاہر سے محفوظ رہنے کا نام عدالت ہے۔ (۳)

خطیب بغدادی نے اسکی تردید کی ہے۔ (۴)

علامہ ابن عبد البر نے عدالت کی بڑی وسیع تعریف کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہر وہ عالم جو علم کی طرف توجہ دینے میں معروف ہے وہ عادل ہے الا یہ کہ اسکا جرح واضح ہو۔

علامہ ابن صلاح فرماتے ہیں کہ یہ وسعت ناپسندیدہ ہے۔ (۵)

علامہ ابن حبان فرماتے ہیں کہ: عادل وہ شخص ہے جس کے بارے میں جرح کا پتہ نہ ہو، اس لئے کہ جرح تعدیل کے مخالف ہے، لہٰذا جو مجروح نہیں وہ عادل ہے حتی

---

(۱) روضة العقلاء ص ۲۳۲ (۲) فتح المغیث ۲/۵

(۳) الکفایة ۸۱-۸۲

(٤) ملاحظہ ہو ان اقوال کی تفصیل کے لئے الکفایة فی علم الروایة ص ۷۸-۷۹،

(۵) مقدمہ ابن الصلاح ص ۹۵

کہ اس کا جرح واضح ہو جائے۔[1]

ابن مبارک فرماتے ہیں کہ: جو نماز میں حاضر رہے، شراب نہ پئے، دین میں خرابی نہ ہو، جھوٹ نہ بولتا ہو، عقل صحیح ہو تو وہ عادل ہے۔[2]

علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ: **العدل فی کل زمان و مکان و کل قوم بحسبه**[3]

البتہ عدالت کیلئے کچھ ایسی شرطیں ہیں جن پر تقریباً سب کا اتفاق ہے اور سارے لوگوں کی تعریف کا محور بھی وہی ہے وہ شرطیں یہ ہیں:

(۱) اسلام:-

یعنی راوی حدیث کا مسلمان ہونا ضروری ہے، اس لئے کہ کافر کی خبر کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا إِنْ جَاءَ كُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاءٍ فَتَبَيَّنُوا﴾ [حجرات:٦]

اے مومنو! اگر کوئی فاسق تمہارے پاس خبر لے کر آئے تو تم اسکی تحقیق کرو۔

تو جب فاسق کی خبر کیلئے یہ حکم ہے تو کافر کی روایت بدرجہ اُولیٰ غیر مقبول ہوگی۔ کافر کی روایت قبول نہ ہونے پر امت کا اجماع ہے اگر چہ وہ اپنے دین والوں میں غیر متہم اور نیک تصور کیا جاتا ہو۔[4]

علامہ حازی فرماتے ہیں کہ اہل شرک کی روایت مردود ہوتی ہے جس پر کتاب و سنت و اجماع سے دلیل موجود ہے،[5]

یہ شرط صرف روایت کی اداء کیلئے شرط ہے تحمل کیلئے نہیں، اس لئے اگر کوئی شخص کوئی روایت حالتِ کفر میں سنتا ہے اور حالت ایمان میں ادا کرتا ہے تو وہ مقبول ہے۔[6] بہت سارے صحابہ کی اس طرح کی روایتیں جس کو انہوں نے حالت کفر میں سنا تھا اور ایمان کے بعد بیان کیا تھا۔ اس کو اہل علم نے قبول کیا ہے۔[7] جیسے جبیر بن

---

(۱) الثقات ١٢/١ — (۲) الكفاية ص ٧٩

(۳) توجيه النظر ص ٢٩ — (٤) الجرح والتعديل ابو لبابه حسين ص ٢٩

(٥) شروط الائمة الخمسة ص ٤٥ — (٦) توضيح الأفكار ١١٥/٤-١١٦

(۷) الكفاية ص ١٣٥

مطعم کی روایت "سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم قرأ فی المغرب بالطور" اور بعض الفاظ میں ہے کہ وذلك أول ما وقر الإیمان فی قلبی [۱]

(۲) بلوغت:۔

عدالت کے لئے محدثین نے بالغ ہونا شرط قرار دیا ہے جس پر سب کا اجماع ہے، اس لئے کہ نابالغ بچہ غیر مکلّف ہوتا ہے اور ناسمجھی کی بناء پر کچھ بھی کہہ سکتا ہے، حتیٰ کہ جھوٹ بولنے کا بھی اندیشہ ہوتا ہے اور اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے کہ:

"رفع القلم عن ثلاثة عن النائم حتی یستیقظ وعن الصبی حتی یحتلم و عن المجنون حتی یفیق" [۲]

یعنی تین قسم کے لوگوں سے قلم کو روک رکھا گیا ہے، سونے والے سے یہاں تک کہ وہ بیدار ہو جائے، اور بچے سے یہاں تک کہ وہ بالغ ہو جائے، اور پاگل سے یہاں تک کہ وہ تندرست ہو جائے۔ نیز بچہ بھی عدم تمیز میں مجنون کے حکم میں ہوتا ہے۔

البتہ اگر کوئی بچہ ایسا ہے جو ممیز ہو اور خیر و شر کے درمیان فرق کرتا ہو تو اس کی بلوغت سے قبل سنی ہوئی روایت، بلوغت کے بعد روایت کرنے پر قابل قبول ہوگی جیسے کہ صغار صحابہ کی روایتوں مثلاً ابن عباس، حضرت حسین، حضرت حسن کو امت نے قبول کیا ہے۔ [۳]

مثلاً محمود بن الربیع کی روایت: أنه عقل مجة مجها النبی صلی اللہ علیہ وسلم من دلو فی بیته. [۴] صحیح بخاری میں ہے۔

(۳) عقل:۔

یہ ایک بدیہی امر ہے کہ ہر خیر و شر کا دارومدار عقل پر ہوتا ہے۔ اگر آدمی کا

---

(۱) صحیح بخاری ۲۴۶/۲ نمبر (۷۶۵) نیز دیکھئے نمبر (۳۰۵۰، ۴۰۲۳، ۴۸۵۴)

(۲) یہ روایت مختلف صحابہ سے مختلف طرق سے مروی ہے۔ دیکھئے سنن ابو داؤد ۵۵۸/۴، نمبر (۴۳۹۸)، وسنن نسائی ۱۵/۶، وسنن ابن ماجہ ۶۵۸/۱، نمبر (۲۰۴۱). ومسند احمد ۱۰۰/۶، ۱۴۴، والإحسان ۲۰۱/۱، نمبر (۱۴۲)، ابن الملقن نے البدر المنیر میں اس کی بڑی تفصیل سے تخریج کی ہے۔ دیکھئے حدیث نمبر (۶۲۹)، علامہ البانی نے اسکو صحیح کہا ہے۔ دیکھئے ارواء الغلیل ۴/۲

(۳) الجرح والتعدیل ابو لبابة ص ۷۹

(۴) دیکھئے صحیح بخاری ۱۷۷/۱ نمبر (۷۷)، ۳۲۳/۲ نمبر ۸۳۹

عقل صحیح نہ ہو تو اس کی کوئی چیز صحیح نہیں ہوتی، اسی لئے مجنون کے کسی قول کا اعتبار نہیں ہوتا۔ رسول پاک ﷺ کا فرمان ہے کہ: "رفع القلم عن ثلاثة" جس میں مجنون کا ذکر بھی کیا گیا ہے جیسے کہ پہلے گذر چکا ہے، اس لئے روایت کے تحمل و اداء دونوں کیلئے عاقل ہونا شرط ہے۔[1]

علامہ حازمی فرماتے ہیں کہ مذکورہ روایت کی سند دیکھنے کی ضرورت نہیں اسلئے کہ مجنون راوی فاسق سے کم تر ہوتا ہے، کیونکہ فاسق غلط کاری پر اللہ سے ڈرتا ہے، مجنوں کو تو کوئی خوف بھی نہیں ہوتا لہٰذا اس کی خبر بدرجہ اولیٰ مردود ہے۔[2]

(٤) اسباب فسق :-

(٥) خوارم مروت سے محفوظ رہنا:-

فسق:- کا مطلب یہ ہے کہ آدمی گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہو اور صغیرہ پر اصرار کرے۔[3]

مروت:- کمالِ انسانیت کو کہتے ہیں، اس کی مجمل تعریف یہ ہے کہ آدمی ہر چیز سے پرہیز کرے جو عرفِ عام میں مذموم سمجھی جاتی ہو۔

لہٰذا راوی کے عادل ہونے کیلئے ضروری ہے کہ وہ فسق کے اسباب سے محفوظ رہے، اور مروت کو ختم کر دینے والی اشیاء سے بھی بچتا رہے۔

غیر مقبول اسباب عدالت:-

بعض اہل علم نے شروط عدالت کیلئے کچھ اور چیزوں کا اضافہ کیا ہے جو متفق علیہ نہیں، بلکہ راجح قول کے مطابق صحیح بھی نہیں، مثلاً:

راوی کا مذکر ہونا:- یہ شرط امام ابو حنیفہ کی جانب منسوب کی جاتی ہے، اس میں سے انہوں نے حضرت عائشہ اور ام سلمٰی کو مستثنیٰ کر دیا ہے۔[4]

حالانکہ اہل علم کا عمل اور ان کا اجماع اس کے بر خلاف رہا ہے۔

علامہ ماوردی نے اس قول کو نقل کرنے کے بعد اس کی تردید کی ہے۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ اگر یہ نقص مانع ہوتا تو عام ہوتا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کا فتویٰ قابل قبول ہے لہٰذا ان کی خبریں بھی قابل قبول ہونا چاہئے کیونکہ فتویٰ کے

---

(١) توضيح الافكار ٢/١١٥ — (٢) شروط الائمة الخمسة ص ٤٥

(٣) فتح المغيث ١/٢٧٠ — (٤) فتح المغيث ٢/٦

شروط خبر سے زیادہ شدید ہیں۔[1]

راوی کا فقیہ ہونا:- یہ قول امام ابو حنیفہ کی جانب منسوب ہے، لیکن یہ اس وقت شرط ہے جب راوی کی روایت قیاسی اصولوں کے بر خلاف ہو۔[2]

علاء الدین بخاری فرماتے ہیں کہ: قیاس کے خلاف ہونے پر راوی کے فقیہہ ہونے کی شرط عیسیٰ بن اَبان اور اکثر متأخرین حنفیہ کی رائے، ہے البتہ متقدمین احناف خبر واحد کو قیاس پر مقدم مانتے ہیں راوی فقیہ ہو یا نہ ہو، امام ابو حنیفہؒ نے قہقہہ والی روایت کو قیاس کے مخالف ہونے کے باوجود قبول کیا ہے۔[3]

راوی کا بینا ہونا:-

سماع حدیث میں مشہور ہونا:-

معروف نسب ہونا:-

امام سخاوی فرماتے ہیں کہ اس طرح سے جن لوگوں نے راوی کا بینا ہونا، سماع حدیث میں مشہور ہونا، معروف نسب ہونا وغیرہ شرط لگائی ہے وہ صحیح نہیں۔[4]

راوی اصل کے بھولنے پر فرع کا انکار نہ کرنا:- یہ شرط بھی بعض احناف نے لگائی ہے، جیسا کہ **ربیعة الرای، عن سهيل بن أبی صالح، عن أبيه، عن أبی هريرة** والی روایت میں ہے کہ **"قضى رسول الله صلى الله عليه وسلم بشاهدو يمين"**[5]

عبد العزیز دراوردی فرماتے ہیں کہ میں نے سہیل سے ملاقات کیا۔ اور اس حدیث کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے لاعلمی ظاہر کی اور پھر سہیل اس

---

(۱) أدب القاضی للماوردی ۳۸۵/۱ (۲) فتح المغيث ۷/۲

(۳) ضوابط فی الجرح والتعديل ص ۱۹، بحواله کشف الأسرار ۳۸۳/۲ حديث القهقهة: یہ ہے کہ ایک نابینا آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے آپ لوگوں کے ساتھ نماز ادا کر رہے تھے وہ ایک کنویں میں گر گئے۔ جس پر کچھ لوگ ہنسنے لگے۔ آپ نے ہنسنے والوں کو وضو لوٹانے کا حکم دیا۔
امام نووی کہتے ہیں کہ اس معنیٰ کی ساری روایتیں انتہائی ضعیف ہیں۔ نیز اس پر ضعف کا اثر واضح ہے۔ اس لئے کہ صحابہ کرام کا آپس میں تعاون کرنا معروف ہے نہ کہ کسی کی پریشانی پر ہنسنا۔ المجموع ۶۱/۲

(٤) فتح المغيث ۷/۲

(٥) سنن أبی داؤد كتاب الأقضية ٣٤/٤، حديث نمبر (۳٦۱۰)، صحیح مسلم میں ابن عباس سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ دیکھئے حدیث نمبر (۱۷۱۲)

روایت کو اس طرح روایت کرتے تھے، حدثني ربيعة، عني، عن أبي صالح.

حالانکہ یہ "من حدث ونسي" کا معاملہ ہے راوی اصل (یعنی استاد) اگر انکار بھی کردے خواہ قطعی طور ہی سے انکار کیوں نہ کرے تو راوی فرع (یعنی شاگرد) پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لہٰذا یہ شرط بھی قابل قبول نہیں۔[1]

یہ اسوجہ سے بھی قابل قبول نہیں کہ بے شمار دلائل اس پر موجود ہیں کہ خبر واحد کا راوی اگر ثقہ ہے تو روایت مقبول ہوگی، اب اگر کوئی نسیان کی وجہ سے انکار کرتا ہے تو یہ حقیقت کا انکار نہیں بلکہ اپنے حفظ کا انکار ہے۔ پھر مثبت کا قول نافی پر مقدم ہوگا۔[2]

امام سخاوی فرماتے ہیں کہ یہ سب جمہور کے قول کے خلاف ہے۔ اس لئے کہ آیت کریمہ ﴿إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا﴾ کا منشا یہ ہے کہ غیر فاسق کی خبر میں تثبت ضروری نہیں۔

نیز اللہ کے رسول کا فرمان: "نضر الله امرءا سمع مقالتي فوعاها"[3] بھی اس کی واضح دلیل ہے، بلکہ "رب حامل فقه غير فقيه، ورب حامل فقه إلى من هو أفقه منه"[4] میں یہ تصریح موجود ہے کہ راوی کا فقیہ ہونا ضروری نہیں۔[5]

دو اشخاص کا تعدیل کرنا:-

کچھ لوگوں نے شہادت کی طرح تعدیل میں بھی عدد شرط لگائی ہے اور یہ کہا ہے کہ کم از کم عدالت کی صحت کیلئے دو دو افراد کی تعدیل کا ہونا ضروری ہے، یہ قول شاذ ہے اور اہل علم کے عمل کے مخالف ہے۔ اسلئے کہ اہل علم نے فرد واحد کی روایت کو قبول کیا ہے اگر اس میں قبول کے اوصاف پائے جاتے ہوں، اس پر بے شمار اور مشہور دلائل ہیں۔[6]

---

(۱) نزهة النظر ص ۱۱٤ (۲) ضوابط فی الجرح والتعدیل ص ۲۱

(۳) اس کی تخریج گذر چکی ہے۔ دیکھئے ص ٦٥

(٤) سنن ابی داؤد ٦٩/٤، حدیث نمبر (٣٦٦٠)، و سنن الترمذی ٣٣/٥، حدیث نمبر (٢٦٥٦) وقال حسن، و سنن ابن ماجه ٨٤/١، حدیث نمبر (٢٣٠)

(٥) فتح المغیث ٧/٢ (٦) فتح المغیث ٧/٢

✓ مقبول اسباب عدالت				
اسلام	بلوغت	عقل	اسباب فسق سے محفوظ رہنا	خوارم مروت سے محفوظ رہنا

✗ غیر مقبول اسباب عدالت						
دو افراد کا تزکیہ ہونا	استاد کا بھولے لیکن پھر انکار نہ کرنا	معروف نسب ہونا	عالم باعمل مشہور ہونا	بینا ہونا	فقیہ ہونا	راوی کا مذکر ہونا

عادل کی تعریف اور اس سے خارج ہونے والے افراد:-

عادل:-ہر وہ شخص جو مسلمان، عاقل، بالغ ہو، نیز اسباب فسق اور مروت کو نقصان پہنچانے والی چیزوں سے محفوظ ہو۔[1]

کبھی کبھی عادل مطلق ثقہ کے معنی میں بھی مستعمل ہوتا ہے، جو عدالت اور ضبط دونوں کو شامل ہوتا ہے۔

عادل کی اس تعریف سے ہر وہ شخص خارج ہو جاتا ہے جو:

کافر یا بدعت مکفرہ کرنے والا ہو،

نابالغ بچہ ہو جو سن رشد کو نہ پہنچا ہو،

لہٰذا جو شخص حدیث رسول بیان کرتا ہے اس کیلئے بیان کرتے وقت مسلمان اور بالغ ہونا ضروری ہے، حدیث کے سنتے وقت اگر کوئی کافر یا متمیز بچہ رہا ہو تو اسکی روایت مقبول ہوگی اگر بیان کرتے وقت حالت کفر اور حالت طفلی سے نکل گیا ہو۔

مجنون و بے عقل خواہ دائمی ہو یا عارضی، اس لئے کہ یہ مکلّف نہیں اور نہ ہی اس کا کوئی اعتبار ہوتا ہے، اللہ کے رسول کا فرمان اس سلسلہ میں "رفع القلم عن

---

(۱) مقدمۃ ابن الصلاح ص ۹٤

ثلاثة" میں موجود ہے۔

کاذب ہو۔

متہم بالکذب ہو۔

فاسق ہو۔

یہ سب عادل کے زمرہ سے خارج ہو جاتے ہیں اس لئے کہ یہ فسق سے محفوظ نہیں رہ گئے۔

تقویٰ و پرہیزگاری سے عاری ہو وہ بھی خارج ہو جاتا ہے اس لئے کہ وہ صاحب مروت نہیں رہا۔

ثبوت عدالت کا طریقہ:-

راوی کی عدالت دو طرح سے ثابت ہوتی ہے: شہرت، تعدیل ائمہ۔

۱- شہرت کا مطلب یہ ہے کہ راوی فی نفسہ تقویٰ و پرہیزگاری، صداقت و امانت، علم و فہم میں معروف و مشہور ہو، لوگ اس کی تعریف کرتے ہوں، جیسے بڑے بڑے ائمہ فن مالک، شافعی وغیرہ۔

ثبوت عدالت کا یہ طریقہ سب سے قوی ہے، اسلئے کہ اس سے راوی کے سلسلہ میں بالکل اطمینان ہو جاتا ہے جو ایک دو آدمیوں کی تعدیل کے مقابلہ زیادہ قوی ہوتا ہے۔[1]

۲- تعدیل ائمہ کے سلسلہ میں بعض اہل علم نے تین اور بعض نے دو کی قید لگائی ہے جبکہ صحیح یہ ہے کہ ایک امام کی تعدیل سے بھی عدالت ثابت ہوتی ہے اور جب ایک کی تعدیل سے عدالت ثابت ہونا درست ہے تو دو، یا تین یا اس سے زائد کی تعدیل سے بدرجہ اولیٰ تعدیل ثابت ہوگی، اس سلسلہ میں ہر ایک کی وجہت نظر اس طرح ہے:

(أ) ائمہ کی تعدیل سے عدالت ثابت تو ہوتی ہے لیکن کم از کم تین افراد کی تعدیل ہونی چاہئے۔ دلیل یہ ہے کہ اللہ کے رسول نے بھیک مانگنے والے کیلئے یہ فرمایا ہے کہ "یقوم ثلاثة من ذوی الحجی فیشهدون له" [2]

---

(۱) فتح المغیث ۲/۱۰-۱۱ (۲) صحیح مسلم کتاب الزکاۃ ۲/۷۲۲ نمبر (۱۰۴٤)

کم از کم تین عقل مند افراد یہ شہادت دیں کہ مذکورہ شخص بھیک مانگنے کا مستحق ہے، جب دنیاوی امور میں تین افراد کی شہادت کی ضرورت ہے تو دین کے معاملہ میں بھی کم از کم تین ائمہ کی شہادت ہونی چاہئے۔

امام سخاوی نے اس قول کو غیر معتمد قرار دیا ہے اور حدیث کو استحباب پر محمول کیا ہے۔(۱)

نیز راوی کی تعدیل خبر ہے شہادت نہیں، اس لئے کہ اس کا تعلق تجربہ اور اجتہاد سے ہوتا ہے لہٰذا اس میں شہادت کی شرط جاری نہیں ہوگی۔

(ب) دو افراد کی تعدیل سے عدالت ثابت ہوگی اس لئے کہ تزکیہ و تعدیل یہ صفت ہے، لہٰذا اس کے ثبوت کیلئے کم از کم دو افراد کی تعدیل مطلوب ہوگی جیسے سن رشد کے پہنچنے اور خود کفیل ہونے کا معاملہ ہے، نیز عام حقوق میں شہادت پر قیاس بھی یہی چاہتا ہے۔(۲)

چونکہ راوی اور شاہد میں فرق ہوتا ہے لہٰذا یہ قیاس درست نہیں۔ نیز اس کے بعد میں جو قول ہے اس بنیاد پر بھی یہ صحیح نہیں۔

(ج) کسی ایک امام کی تعدیل سے عدالت ثابت ہوتی ہے، صحیح قول یہی ہے، اسلئے کہ تزکیہ کرنیوالا یا تو کسی غیر کا قول نقل کرتا ہے یا اپنے تجربہ واجتہاد کی بنیاد پر خبر دیتا ہے، دونوں صورتوں میں سے کسی میں بھی عدد شرط نہیں۔ لہٰذا یہاں بھی عدد شرط نہیں ہوگی۔(۳)

دوسری بات یہ ہے کہ جب حدیث کے قبول کرنے میں عدد شرط نہیں (جو راوی کے واسطہ سے معلوم ہوتی ہے) بلکہ فردِ واحد اگر شروط صحت کا حامل ہے تو اس کی روایت سب کے یہاں صحیح ہوتی ہے۔ تو راوی کے جرح وتعدیل میں بھی عدد شرط نہیں ہوگی۔(۴)

کچھ بزرگوں کا یہ کہنا ہے کہ بڑے سے بڑے اہل علم کی روایت کرنے سے بھی عدالت ثابت ہوتی ہے(۵) لیکن صحیح وہی ہے جو پہلے گذر چکا۔

---

(۱) فتح المغیث ۹/۲ (۲) فتح المغیث ۸/۲

(۳) الکفایة ص ۹٦، نزهة النظر ص ۱۳٤، فتح المغیث ۸/۲

(٤) الکفایة ص ۹٦-۹۷ (٥) فتح المغیث ۱۲/۲-۱۳

عورت و غلام کا تزکیہ:-

تزکیہ کرنے والا فرد واحد مرد ہو یا عورت، غلام ہو یا آزاد اگر اس میں شروط نقد پائی جاتی ہے تو اس کا تزکیہ قابل قبول ہوگا۔(۱)

امام عراقی فرماتے ہیں کہ عدل واحد میں مرد، عورت، غلام سب شامل ہیں۔ قاضی ابو زکریا فرماتے ہیں کہ : "إنه يقبل تزكية المرأة، مطلقا في الرواية والشهادة، إلا تزكيتها في الحكم الذي لا تقبل شهادتها فيه"

جبکہ صاحب محصول وغیرہ نے بغیر کسی شرط کے اس کو قابل قبول مانا ہے۔(۲)

خطیب بغدادی فرماتے ہیں کہ اس سلسلہ میں بنیادی دلیل اللہ کے رسول کا حضرت بریرۃ سے حضرت عائشہ کے سلسلہ میں سوال کرنا ہے۔(۳)

اور چونکہ غلام کی خبر قابل قبول ہوتی ہے اسلئے اس کا تزکیہ قابل قبول ہے۔

تعدیل مبہم:-

اگر کسی شخص نے کسی راوی کی تعدیل کی ہے لیکن اس کا نام ذکر نہیں کیا ہے مثلاً یہ کہا ہے کہ "حدثنی الثقة" اور تعیین نہ ہو کہ اس ثقہ سے کون مراد ہے، تو کیا ایسے راوی کو عادل و ثقہ تصور کیا جائے گا کہ نہیں؟ اس میں علماء کے مختلف اُقوال ہیں:

۱- پہلا قول یہ ہے کہ اسے عادل نہیں تسلیم کیا جائے گا۔

۲- دوسرا قول یہ ہے کہ اس کو عادل تسلیم کیا جائے گا۔

۳- تیسرا قول یہ ہے کہ اس کو عادل اس وقت مانا جائے گا، جب کسی عالم مجتہد کی طرف سے توثیق صادر ہوئی ہو۔

٤- چوتھا قول یہ ہے کہ :اس کو عادل سمجھا جائے گا اگر کسی عالم کی طرف سے صادر ہوا ہو، بشرطیکہ یہ تصریح اس کی جانب سے موجود ہو کہ میں جس شخص سے روایت کرتا ہوں وہ ثقہ ہوتا ہے۔(۴)

---

(۱) شرح الفية العراقي ۲۹۵/۱ (۲) شرح الفية العراقي ۲۹٦/۱

(۳) الكفاية ص ۹۷، اس سے اشارہ "سل الجارية تصدقك" کی جانب ہے جو واقعہ افک میں ہے اور صحیح بخاری میں مختلف جگہ موجود ہے۔ (۴) حاشیہ توضيح الافكار ۱٦۸/۲

لیکن صحیح بات یہ ہے کہ وہ قائل کے یہاں تو ثقہ ہو سکتا ہے لیکن عام لوگوں کے یہاں ثقہ نہیں سمجھا جائے گا، اس لئے کہ ممکن ہے اگر وہ نام ذکر کرتا تو عدم ثقاہت کا پتہ چلتا، بلکہ اس کا نام ترک کر دینے سے سامع کو شک و شبہ ہو جاتا ہے کہ آخر نام ترک کرنے کی وجہ کیا ہے؟[1]

جیسے امام شافعی نے ابراہیم بن محمد بن ابی یحییٰ سے روایت کیا ہے، اور انہوں نے ان کے بارے میں "حدثنی الثقة" کا صیغہ استعمال کیا ہے، حالانکہ وہ باتفاق محدثین ضعیف ہیں۔ اسی طرح سے امام مالک نے عبدالکریم بن ابی المخارق سے "حدثنی الثقة" کہہ کر روایت کیا ہے، حالانکہ وہ ضعیف ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس ثقہ کی تعیین کبھی بے حد مشکل ہوتی ہے، اور کبھی مختلف فیہ ہوتی ہے اور جب راوی کی تعیین ہی نہ ہو تو دوسروں کی اس کے بارے میں کیا رائے ہے اس کی بھی تعیین نہیں ہو سکتی اور نہ ہی اس کی عدالت کا پتہ لگ سکتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کے بارے میں قطعی فیصلہ ناممکن ہے۔

مثلاً جب امام مالکؒ "حدثني الثقة" عن عمرو بن شعیب روایت کرتے ہیں تو اس ثقہ سے کون مراد ہے اس کی تعیین میں لوگوں کا اختلاف ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس سے مراد عبداللہ بن وہب ہیں، اور دوسرے کہتے ہیں کہ اس سے مراد امام زہری ہیں، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس سے مراد عبداللہ بن لہیعۃ ہیں۔

اسی طرح سے جب امام شافعی "حدثنی الثقة" کہتے ہیں تو ہر جگہ اس سے ابراہیم بن محمد بن ابی یحییٰ اسلمی ہی نہیں مراد ہوتے ہیں بلکہ آنے والی سند کے اعتبار سے اس کی تعیین ہوتی ہے۔

مثلاً اگر وہ "حدثنی الثقة" عن ابن أبی ذئب کہتے ہیں تو اس سے مراد ابن ابی فدیک ہیں۔

اور اگر عن الثقة، عن لیث کہتے ہیں تو اس سے مراد یحییٰ بن حسان ہیں۔

اور اگر عن الثقة، عن الولید بن کثیر کہا ہے تو اس سے مراد ابو اسامہ ہوتے ہیں۔

اور اگر عن الثقة، عن أوزاعی کہا ہے تو اس سے مراد عمرو بن ابی سلمہ ہوتے ہیں۔

---

(۱) مقدمة ابن الصلاح ص ۹۹، فتح المغیث ۲/۳٤

اور اگر "حدثنی الثقة" عن صالح مولی التوء مة کہا ہے تو اس سے مراد ابراھیم بن محمد بن أبی یحیی ہوتے ہیں۔
اور اگر عن الثقة کے بعد کسی عراقی راوی کا ذکر کیا ہے تو اس سے مراد امام احمد بن حنبل ہوتے ہیں۔(۱)
علامہ ابن صلاح فرماتے ہیں کہ: صحیح یہ ہے کہ جو شخص حدثنی الثقہ کہتا ہے اور نام نہیں لیتا یہ توثیق کیلئے کافی نہیں۔(۲)

ثقہ سے روایت کی عادت کا حکم:-

اگر کسی شخص کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ اسکی عادت صرف ثقہ سے روایت کرنے کی ہے پھر وہ کسی سے روایت کرتا ہے تو یہ شخص ان کے یہاں ثقہ تصور کیا جائیگا۔
حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ: "من عرف من حالہ أنہ لا یروی إلا عن ثقة کما لك و شعبة وغیرھما، أنہ إذا روی عن رجل و صف بکونہ ثقة عندہ"(۳)
لیکن محققین کے یہاں یہ قاعدہ کلیہ نہیں بلکہ اغلبیہ ہے، اسلئے کہ یہاں جن اہل علم کا نام اس تعلق سے لیا جاتا ہے انکی روایتیں ضعفاء سے بھی پائی گئی ہیں، مثلاً امام مالک نے: عاصم بن عبید اللہ، عمرو بن ابی عمر، شریک بن ابی نمیر، عبد الکریم بن ابی المخارق سے روایت کیا ہے جبکہ یہ سب ضعیف ہیں۔ ایسے میں عطاء خراسانی اور داؤد بن حسین مدنی پر بھی کلام ہے جن سے امام مالک نے روایت کیا ہے۔
ابن حجر فرماتے ہیں: "کل من روی عنہ مالك فھو ثقہ إلا عبدالکریم بن أبی المخارق"(۴)
اسی طرح امام شعبہ نے جابر جعفی، ابراہیم ہجری، محمد بن عبید اللہ عزرمی وغیرہ سے روایت کیا ہے جو ضعیف ہیں۔
اور بظاہر ایسا کوئی نہیں جن کے مشائخ میں کوئی نہ کوئی ضعیف نہ ہو خاص طور سے اس زمانہ میں جب ضعفاء کی تعداد زیادہ پائی جاتی تھی۔ جہاں تک قرن اولیٰ کی بات ہے جیسے حضرت سعید بن مسیّب وغیرہ تو اس زمانے میں راویان حدیث میں ضعفاء

---

(۱) فتح المغیث ۲/۳۶-۳۷
(۲) مقدمة ابن الصلاح ص ۹۹
(۳) لسان المیزان ۱/۱۵
(۴) تھذیب التھذیب ۹/۳۰۴

پائے ہی نہیں جاتے تھے۔

خود امام شعبہ فرماتے ہیں کہ: لو لم أحدثكم إلا عن الثقات لم أحدثكم إلا عن نفر يسير [1]

اور ابن قطان کا فرمان ہے کہ: إن لم أرو إلا عمن أرضى ما رويت إلا عن خمسة أو نحو ذلك. [2]

ثقہ سے روایت کرنے والے:-

جن حضرات کا نام اس ضمن میں لیا جاتا ہے ان میں سے کچھ حضرات یہ ہیں:

سعید بن میسّب	الجوهر النقی ۱۰۹/۵
امام شعبی	سير اعلام النبلاء
ابراہیم نخعی	التمهيد ۳۰/۸
قاسم بن محمد	سنن الدارمی ۴٦/۱ باب التورع عن الجواب
یحییٰ بن ابی کثیر طائی	تهذيب التهذيب ۳٦۹/۱۱
ابن ابی ذئب	جابر بیاضی کے علاوہ جن سے روایت کیا ہے سب ثقہ ہیں۔ تهذيب التهذيب ۳۰۵/۹
حریز بن عثمان	لسان الميزان ۳٦۰/۲
ابوالولید محمد بن الولید حمصی	تهذيب التهذيب ۵۰۳/۹
یحییٰ بن سعید قطان عبد الرحمٰن بن مہدی	تدريب الراوی ۳۱۷/۱
علی بن مدینی احمد بن حنبل	تهذيب التهذيب ۱۱۴/۹
سلیمان بن حرب شعبۃ بن حجاج مالک بن انس	فتح المغيث ۴۲/۲

(۱) الكفاية ص ۹۰ (۲) شرح علل الترمذی ص ۱۰۵

امام ابوزرعہ رازی	لسان المیزان ٤١٦/٣
امام نسائی	لسان المیزان ١١٥/١
محمد بن سیرین یحییٰ بن معین امام ابو حنیفہ امام شافعی امام بخاری امام مسلم امام ابوداؤد	قواعد فی علوم الحدیث ٢١٧، ٢١٨، ٢١٩، ٢٢١، ٢٢٣، ٢٢٤
بقی بن مخلد	تهذیب التهذیب، ٢٢/١، فتح المغیث ٤٢/٢

ثقہ کی روایت نام کے ساتھ :-

کوئی ثقہ آدمی اگر کسی شخص سے نام کیساتھ روایت کرتا ہے تو یہ اس کی توثیق کی دلیل نہیں، اکثر اہل علم کا یہی خیال ہے۔ اس لئے کہ یہ ممکن ہے کہ عادل و ثقہ غیر ثقہ و غیر عادل سے روایت کرے، لہٰذا مجرد روایت کرنا تعدیل کیلئے کافی نہیں۔(۱) الا یہ کہ اس عدل کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ یہ صرف ثقہ ہی سے روایت کرتا ہے۔

امام سخاوی فرماتے ہیں کہ: یہی قول اصولیوں اور محدثین کی ایک جماعت کے یہاں صحیح ہے۔ کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ مجرد روایت کرنا تعدیل ہے اس لئے کہ اگر وہ کوئی عیب جانتا تو ضرور بیان کرتا۔(۲)

بیشتر اہل علم نے اس کو مسترد کر دیا ہے اس لئے کہ کوئی ضروری نہیں کہ روایت کرنے والے کو اس کے بارے میں جرح یا تعدیل معلوم ہو، یا اگر معلوم ہے تو ضروری نہیں کہ اس کا ذکر بھی کرے۔(۳)

صیرفی نے بھی اس کو غلط قرار دیا ہے اسلئے کہ: عدالت تجربہ سے حاصل ہوتی ہے اور مجرد روایت تجربہ پر دلالت نہیں کرتی بلکہ صرف تعریف پر دلالت کرتی ہے۔(۴)

---

(۱) الكفاية ٨٩، توضیح الأفكار ١٧١/٢ (۲) فتح المغیث ٤١/٢-٤٢
(۳) الكفاية ص ٨٩-٩١ (٤) فتح المغیث ٤١/٢

نیز واقعہ بھی یہی ہے کہ بہت سارے ثقہ حضرات نے دوسرے راویوں سے نام کیساتھ روایت کیا ہے لیکن وہ ضعیف ہیں مثلاً امام شعبی نے حارث سے روایت کیا جبکہ وہ کذاب ہے، سفیان ثوری نے ثویر بن ابی فاختہ سے روایت کیا ہے وہ رکن الکذب ہے۔ یزید بن ہارون نے ابوروح سے روایت کیا ہے جبکہ وہ مجنون اور کذاب ہے۔[1]

لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ہر شخص جس سے میں نام کے ساتھ روایت کرتا ہوں تو وہ ثقہ ہے، تو اس شخص کی جانب سے اس کی تعدیل سمجھی جائے گی، جسے عبدالرحمٰن بن مہدی کا طریقہ تھا۔

اور اگر یہ کہتا ہے کہ میں جس سے روایت کرتا ہوں وہ ثقہ ہے اگرچہ نام نہ لوں تو اس شخص کے یہاں یہ ثقہ سمجھا جائے گا۔ لیکن یہ تزکیہ عموم پر نہیں محمول کیا جائے گا۔ اس لئے کہ ممکن ہے اگر اس کا نام ذکر کرتا ہے تو اس کے کہے ہوئے قول کے خلاف کوئی دوسرا حکم معلوم ہوتا۔[2]

راوی کے عمل و فتویٰ کا حکم:-

اگر کوئی شخص کسی حدیث کے موافق یا مخالف عمل کرتا ہے یا فتویٰ دیتا ہے تو خطیب کے یہاں عمل کی صورت میں اس کی توثیق ہے۔ اور مخالفت کی صورت میں جرح نہیں۔

جبکہ ابن صلاح فرماتے ہیں کہ اس سے حدیث کی تصحیح نہیں سمجھی جائے گی۔[3]

اس لئے کہ ممکن ہے کہ عمل کی صورت میں اسکے پاس اس حدیث کے علاوہ اور دلیل اجماع یا قیاس سے موجود ہو، جیسے یہ ممکن ہے کہ اس کا مذہب قیاس کے مقابلہ میں ضعیف پر عمل کرنے کا ہو، نیز اس کا عمل احتیاطی بھی ہو سکتا ہے، اور مخالفت کی صورت میں تضعیف نہیں۔ کیونکہ: ممکن ہے کہ اس نے کسی معارض یا قیاس وغیرہ کی وجہ سے عمل ترک کر دیا ہو، یا یہ اس کے یہاں منسوخ ہو، یا یہ سمجھتا ہے کہ اس حدیث کے مقابلہ میں قیاس پر عمل کرنا زیادہ بہتر ہے۔[4]

---

(۱) الکفایۃ ص ۸۹، نیز دیکھئے مقدمۃ ابن الصلاح ص ۱۰۰، شرح علل الترمذی ص ۱۰

(۲) الکفایۃ ۹۲ (۳) مقدمۃ ابن الصلاج ۱۰۰

(٤) فتح المغیث ۲/۳۹

ضبط

ضبط کا لغوی معنی :-

ضبط : ضبط یضُبطُ، وضبط یضبِطُ کا مصدر ہے یعنی باب کَرُمَ اورسَمِعَ دونوں سے آتا ہے اگرچہ باب "سمع" زیادہ مشہور ہے۔ جسکا معنی ہے کسی چیز کو لازم پکڑنا اور مضبوطی سے روک لینا۔ ضبط الشئی: کا مطلب ہے الحفظ بالجزم: بہت مضبوطی سے یاد کرنا، والرجل ضابط کا معنی ہے: حازم، ورجل ضابط کا معنی ہے: قوی اور شدید[1]

اصطلاحی تعریف:- راوی کا روایت کردہ چیزوں کو بہت مضبوطی سے یاد رکھنا۔

شرعی دلیل:- ضبط کی شرعی دلیل اللہ کے رسول ﷺ کے اس فرمان میں ہے۔

"نصر اللہ امرءا سمع مقالتی فحفظها ووعا ها، وأداها کماسمع" [2]

اللہ تعالیٰ اس شخص کے چہرے کو تروتازہ رکھے جس نے میری بات سنی، اس کو اچھی طرح سے یاد کیا اور محفوظ کرلیا اور جیسے سنا تھا ویسے دوسروں تک پہنچادیا۔

اس روایت میں حدیث کے پڑھنے اور پڑھانے دونوں کے لیے حفظ (ضبط) شرط قرار دیا ہے۔ "حفظها ووعا ها، وأداها کماسمع" اس پر نص ہے، پھر یہ ضبط کرنا عام ہے۔ چاہے دل ودماغ سے ہو یا کتاب وتحریر سے ہو۔

ضبط کی قسمیں :اس کی دو قسمیں ہیں۔ ضبط صدر اور ضبط کتاب۔

ضبط صدر : راوی اپنی پڑھی ہوئی حدیث کو اس طرح یاد رکھے کہ جب چاہے اور جہاں چاہے بیان کرنے پر قادر ہو۔

ضبط کتاب: راوی اپنی تحریر کردہ حدیثوں کو وقت اداء تک ہر طرح کی خرد برد سے محفوظ رکھے اور جب چاہے اسکے حاضر کرنے پر قادر ہو۔[3]

شروط ضبط : راوی کی روایت کردہ حدیثوں کے ضبط کی شرط یہ ہے۔

---

(۱) لسان العرب ۳٤۰/۷

(۲) یہ حدیث متواتر ہے اس کی تخریج پہلے گزر چکی ہے۔ دیکھئے ص ٦٥

(۳) نزهة النظر ص: ۳۲

۱- راوی بیدار مغز، چاق وچوبند ہو، اس میں کسی طرح کی غفلت نہ پائی جاتی ہو۔
۲- اگر روایت کو حفظ سے پڑھا رہا ہے تو اس کو بہت اچھی طرح سے یاد ہو۔
۳- اگر کتاب سے روایت کرتا ہے تو اس کو اچھی طرح سے محفوظ رکھنے والا ہو۔
٤- اگر روایت بالمعنی کرتا ہے تو معنی و مفہوم کو سمجھتا ہو اور ترجمانی پر قادر ہو۔

یہاں تک کہ اس کی روایت پر نظر رکھنے والے، اور اسکے حالات کی خبر و جستجو کرنے والے کو یہ اطمینان ہو جائے کہ اس نے اپنا حق ادا کر دیا۔(۱)

اسی بنیاد پر اسکو ضابط کہا جائے گا لہٰذا:

ضابط: ہر اس راوی کو کہتے ہیں جو بیدار مغز، اپنی روایتوں کو اچھی طرح محفوظ رکھنے والا اور روایت بالمعنی کرتے وقت معنی و مفہوم کو سمجھنے والا ہو۔

شرط ضبط سے خارج ہونے والے افراد:-

ضبط کی ان شروط کی وجہ سے مندرجہ ذیل راوی اس دائرہ سے خارج ہو جاتے ہیں۔
۱- مغفل، جس پر اسطرح سستی غالب ہو کہ اپنی مرویات میں غلط اور صحیح کی تمیز نہ کر سکے
۲- بہت زیادہ غلطی کرنے والا جس کی غلطی درستی پر غالب ہو۔
۳- خراب حافظہ والا جس کی غلطی درستی پر غالب نہ ہو بلکہ دونوں برابر ہوں۔
٤- جس سے بکثرت وہم سرزد ہو، غلط کو صحیح، صحیح کو غلط کر دے، مثلاً مرسل کو متصل مرفوع کو موقوف یا اس کے برعکس کرے۔
۵- ثقہ یا ثقات کی بکثرت مخالفت کرنے والا۔
٦- متساہل، جو اپنی روایت کو یاد رکھنے، تحریر و تصحیح کرنے اور کتاب کو محفوظ رکھنے میں تساہل برتتا ہو۔
۷- جو اپنی مرویات کے معنی و مفہوم کو نہ جانتا ہو اور ترجمہ پر قادر نہ ہو۔

ضبط پہچاننے کا طریقہ:-

راوی کا ضبط ثقہ راویوں کی روایت سے مقابلہ کے ذریعے پہچانا جاتا ہے۔ اگر اس کی روایت (عموماً) ان کی روایت کے مطابق ہو تو اس کو ضابط سمجھا جائے گا۔

---

(۱) الباعث الحثیث ص ۹۲-۹۳

معمولی مخالفت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، اور اگر عموماً مخالفت ہو تو اس کی روایت مردود ہو جائے گی۔[1]

امتحان کے ذریعے بھی راوی کا ضبط معلوم کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ امام بخاریؒ کے ساتھ بغداد والوں نے کیا تھا۔[2]

نیز بعض دوسرے ائمہ نے بھی اس طرح کیا ہے۔[3]

جبکہ کچھ اہل علم نے روایت میں کسی طرح خلل ڈالنے کو خواہ وہ امتحان ہی کیلئے کیوں نہ ہو ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔

حافظ ابن حجر نے امتحان لینے کیلئے خلل کو راجح قرار دیا ہے، اس لئے کہ اس میں مصلحت کار فرما ہے اور راوی کا ضابط ہونا بآسانی معلوم کیا جاسکتا ہے، لیکن اس کو ضرورت ہی کے وقت استعمال کیا جاسکتا ہے۔[4]

روایت کے صحیح ہونے کی شرط:-

جب راوی مذکورہ صفات کے اعتبار سے عادل و ضابط ہو تو اس کو ثقہ کہا جاتا ہے۔ لیکن روایت کی صحت کیلئے صرف ثقہ ہونا کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ:

۱- راوی بہت زیادہ تدلیس نہ کرتا ہو۔

۲- بہت زیادہ ارسال نہ کرتا ہو۔

۳- ضعفاء و مجاہیل سے کے بکثرت روایت نہ کرتا ہو۔

٤- صحیفہ سے روایت نہ کرتا ہو۔

اس لئے کہ اس طرح کرنے سے راوی شک و شبہ کے دائرے میں آجاتا ہے اور اس کی روایت پر سوالیہ نشان لگ جاتی ہے اور بہت ساری صورتوں میں مردود بھی ہو جاتی ہے۔

---

(۱) مقدمة ابن الصلاح ص ۹۵

(۲) تاریخ بغداد ۲/۲۰-۲۱

(۳) النكت على ابن الصلاح ۲/۸٦٦-۸٦٧

(٤) فتح المغيث ۲/۲۰، النكت ۲/۸٦٦

علم جرح و تعدیل

یہ ایک ایسا علم ہے جس کے ذریعے سے راویوں کے جرح و تعدیل کے بارے میں مخصوص کلمات اور ان کے مراتب کے بارے میں بحث کی جاتی ہے۔ (۱)

جرح و تعدیل کا شرعی حکم:۔

جرح و تعدیل کا اصل مقصد شریعت کی حفاظت کرنا، ہر طرح کی فتنہ سامانیوں سے اس کو پاک رکھنا، مدخول چیزوں سے محفوظ رکھنا ہے، اس سے نہ کسی کی عیب جوئی کرنا مقصد ہے نہ کسی کی خوشنودی حاصل کرنا، بلکہ اس کا مقصد اظہار حقیقت ہے تاکہ اس کی روشنی میں احادیث رسول کی دیکھ بھال اور جانچ پڑتال کی جاسکے، اس لئے شریعت نے اس کی اجازت دے رکھی ہے، چنانچہ قرآن کریم میں اللہ کا ارشاد ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا إِنْ جَاءَ كُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاءٍ فَتَبَيَّنُوْا﴾ [حجرات:٦]

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے ایسے شخص کو جو جھوٹی خبریں دیتا ہے اسکی حقیقت معلوم کرنے کا حکم دیا ہے اور اس پر فاسق کا حکم لگایا ہے، جو اس پر ایک طرح سے جرح ہے۔

اسی طرح سے اللہ کے رسول ﷺ سے جرح و تعدیل دونوں ثابت ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں حضرت عائشہ کی روایت کافی مشہور ہے جس میں یہ ہے کہ ایک شخص نے آپ سے ملنے کی اجازت طلب کی جب آپ کی نگاہ اس پر پڑی تو آپ نے فرمایا کہ: "إئذنوا له بئس أخو العشيرة". اس کو اندر آنے کی اجازت دو اپنے خاندان کا کیا ہی بُرا فرد ہے۔

پھر جب وہ شخص اندر آیا تو آپ نے بڑی خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کیا، حضرت عائشہ نے آپ سے جب اسکا سبب پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ: عائشہ تم نے مجھ کو بد اخلاق کب پایا ہے؟ یقیناً قیامت کے دن اللہ کے نزدیک سب سے برا شخص وہ ہو گا جس کو لوگوں نے اس کے شر کی وجہ سے چھوڑ رکھا ہو۔ (۲)

---

(۱) كشف الظنون ٥٨٢/١، الحطة في ذكر الصحاح الستة ص ٨٩، مفتاح كنوز السنة ص ١٤٦

(۲) صحيح بخارى كتاب الأدب ٤٥٠/١٠، نمبر (٦٠٢٢)، و صحيح مسلم كتاب البر والصلة ٢٠٠٢/٤ حديث نمبر (٢٥٩١)

معلوم یہ ہوا کہ کسی کے شر سے بچنے کیلئے اس کا ترک کرنا درست ہے، اس طرح سے راویوں کے شر سے بچنے کیلئے ان کو متروک قرار دینا درست ہے، اس لئے کہ "بئس أخو العشيرة" جرح صریح کے مترادف ہے۔

یہاں پر اللہ کے رسول نے صرف بداخلاقی سے بچنے کیلئے خندہ پیشانی سے ان سے ملاقات کی اور ان کی خاطر مدارات کی، لیکن جو شر تھا اس کو بھی بتادیا اس میں کوئی رعایت نہیں کی تاکہ لوگ اس طرح کے لوگوں سے ہوشیار رہیں۔

رسول پاک ﷺ سے تعدیل بھی ثابت ہے، چنانچہ حضرت ابن عمر فرماتے ہیں کہ میں نے ایک خواب دیکھا اس کو حضرت حفصہ کو بتایا، حضرت حفصہ نے آپ سے ذکر کیا تو آپ نے فرمایا کہ: "إن عبدالله رجل صالح" اور ایک روایت میں ہے: "إن عبدالله رجل صالح لو كان يكثر الصلاة في الليل"[1] یعنی عبداللہ بن عمر بہت نیک آدمی ہیں، کاش کہ یہ رات میں زیادہ نماز ادا کرتے (یعنی تو اور بہتر ہوتا) حضرت عمر نے اپنی نماز میں اضافہ کردیا۔

یہ ایک طرح سے ان کی تعدیل ہے اہل علم نے لفظ "صالح" کو بھی عدالت کیلئے استعمال کیا ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ اگر "صالحیت" مراد ہوتی تو صرف "صالح" کہتے اور اگر "صلاحیت" مراد ہوتی ہے تو "صالح الحدیث" کہتے ہیں۔[2]

نیز حضرت فاطمہ بنت قیس نے اپنے نکاح کے سلسلہ میں اللہ کے رسول ﷺ سے مشورہ کیا اور فرمایا کہ معاویہ بن ابوسفیان اور ابو جہم بن صفوان اور [اسامہ بن زید] نے پیغام دیا ہے کس سے نکاح کرنا بہتر ہوگا؟ آپ نے فرمایا کہ:

"أما أبو جهم فلا يضع عصاه عن عاتقه، و أما معاوية فصعلوك لا مال له، انكحي أسامة بن زيد، فكرهته ثم قال: انكحي اسامة فنكحته فجعل الله فيه خيرا واغتبطت.[3]

---

(۱) صحيح بخارى كتاب التعبير ۱۲/٤۱۸–٤۱۹ نمبر (۲۹ - ۷ - ۷۰۳۰)
(۲) النكت على ابن الصلاح ۲/ ٦۸۰، ضوابط فى الجرح والتعديل ص۱٤۱
(۳) صحيح مسلم كتاب الطلاق ۲/ ۱۱۱٤، نمبر (۱٤۸۰)

یعنی ابو جہم عورتوں کو بہت مارتے ہیں اور معاویہ فقیر آدمی ہیں اسامہ سے نکاح کر لو، محل شاہد یہ ہے کہ یہاں اللہ کے رسول نے دو آدمیوں کا عیب بیان کیا جو جرح کے مترادف ہے، اور ایک سے نکاح کرنے کا حکم دیا جوان کی تعریف اور تعدیل ہے۔

یہاں پر معاملہ صرف شادی بیاہ کا تھا جس میں زوجین کی خیر خواہی مقصود تھی، اگر ان کی بھلائی اور حقوق کی حفاظت، نیز شر سے محفوظ رکھنے کیلئے کسی کی اچھائی اور خرابی بیان کی جا سکتی ہے تو شریعت محمدی جس سے پورے امت کی بھلائی وابستہ ہے اس کی حفاظت کیلئے راویوں کی خوبی اور خرابی کیوں نہیں بیان کی جا سکتی؟

ایک جگہ آپ نے فرمایا کہ: "من روى عني حديثا وهو يعلم أنه كذب فهو أحد الكاذبين" (۱) یعنی جو شخص میری جانب منسوب کر کے حدیث بیان کرتا ہے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ وہ جھوٹی بات ہے تو جھوٹوں میں ایک جھوٹا وہ بھی ہے۔ (یعنی جس نے اس کو وضع کیا ہے اور جو اس کو روایت کرتا ہے۔)

یہاں پر اللہ کے رسول نے صحیح اور ضعیف کی معرفت کی ترغیب دی ہے اور ضعیف اور موضوع روایتوں کی روایت سے منع کیا ہے، وہیں اس طرح کا کام کرنے والے کو دروغ گو اور "کذاب" بھی کہا ہے، جو جرح شدید ہے۔

عقل سلیم اور فطرت صحیحہ کا بھی یہی تقاضہ ہے کہ جب دنیاوی اغراض و مقاصد کیلئے گواہوں پر باجماع امت جرح کی جا سکتی ہے اور ان کا تزکیہ کیا جا سکتا ہے تو دین کی حفاظت کیلئے راویوں پر جرح بدرجہ اولیٰ کی جا سکتی ہے۔

اس لئے کہ انہیں لوگوں پر شریعت کا دار و مدار ہے، حلال و حرام کی معرفت میں احتیاط برتنا حقوق و معاملات میں احتیاط برتنے سے زیادہ اہم ہے۔ (۲)

نیز اگر جرح و تعدیل کرنا جائز نہ ہوتا تو صحیح اور ضعیف کے درمیان تمیز کرنا ممکن نہ ہوتا اور اس طرح سے یہ شریعت خلط ملط ہو کر صحیح و غلط کا مجموعہ بن جاتی۔ (۳)

غرض و غایت:-

اس علم کے سیکھنے اور استعمال کرنے کی غرض و غایت یہ ہے کہ صحیح اور

---

(۱) اس کی تخریج گذر چکی ہے دیکھئے ص ۱۳۹

(۲) کشف الظنون ۵۸۲/۱ (۳) الحطة فی ذکر الصحاح الستة ص ۸۹

ضعیف کے درمیان تمیز کیا جاسکے۔

جارح اور معدل کے شروط:-

جرح و تعدیل ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں، یہ کام وہی کر سکتا ہے جو اس کا اہل ہو، اس کی اہلیت کیلئے مختلف چیزوں سے اس کو متصف ہونا ضروری ہے، جب یہ صفات اس میں پائے جائیں گے تو یہ شخص اس کا اہل سمجھا جائے گا وہ صفات یہ ہیں۔

۱- جو شخص جرح و تعدیل کا کام کر رہا ہے اس کو فی نفسہ عادل اور بیدار مغز ہونا چاہئے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ: جرح و تعدیل اسی سے قبول کیا جانا چاہئے جو عادل اور چاق و چوبند ہو۔[۱]

نیز فرمایا کہ: اس فن میں گفتگو کرنے والے کو جرح و تعدیل میں تساہل پسندی سے ڈرنا چاہئے اس لئے کہ تساہل پسند شخص سے خطرناک غلطی کا امکان ہو سکتا ہے، وہ ثقہ کو ضعیف اور ضعیف کو ثقہ قرار دے سکتا ہے۔

۲- راویوں کے سلسلہ میں جان کار، نیز متقی و پرہیز گار، تعصب و تنگ نظری سے پاک، غیظ و غضب سے دور رہنا چاہئے،، تاکہ صحیح فیصلہ کر سکے، اگر ایسا نہیں ہے تو پھر اس سے الٹ پھیر کا امکان ہو سکتا ہے۔ امام ذہبی فرماتے ہیں کہ:

اگر تم اپنے آپ کو سمجھدار، سچا، دیانت دار اور پرہیز گار سمجھتے ہو تو یہ کام کرنے کی جرأت کرو، اور اگر ایسا نہیں تو بلاوجہ پریشان مت ہو، اگر خواہش نفس، تعصب و تنگ نظری اور مذہب پرستی تم پر غالب ہے تو برائے مہربانی اس کام کیلئے تکلیف نہ اٹھاؤ۔[۲]

علامہ سبکی فرماتے ہیں کہ: جارح کا جرح اگر مفسر بھی ہو تو بھی قابل قبول نہیں اگر یہ پتہ چل جائے کہ یہ عصبیت یا دنیاوی چپقلش کی بنیاد پر کی گئی ہے۔[۳]

۳- اسباب جرح و تعدیل کا جاننے والا ہو، اس لئے کہ جو شخص اسباب جرح و تعدیل کو نہیں جانتا اس کا حکم غلط ہو سکتا ہے لہٰذا غیر عارف (اسباب) سے جرح و تعدیل

---

(۱) نزهة النظر ص ۱۳۵ (۲) تذكرة الحفاظ ۱/ ٤
(۳) طبقات الشافعية ۱/ ۱۸۸، ترجمہ احمد بن صالح مصری، قواعد فی الجرح والتعدیل ص ۲۳

صادر ہو تو مقبول نہیں۔

علامہ ابن جماعہ فرماتے ہیں کہ: جو شخص اسباب کو نہیں جانتا ہے اس کی جرح و تعدیل مقبول نہیں۔(۱)

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ: اگر جرح و تعدیل اسباب کے جاننے والے کی طرف سے صادر نہ ہو تو اس کا کوئی اعتبار نہیں۔(۲)

نیز فرمایا کہ: جو شخص حد سے تجاوز کرتا ہے اور ایسی چیز کی بنیاد پر جرح کرتا ہے جو مجروح کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی تو وہ جرح مقبول نہیں، یہی معاملہ تزکیہ کا ہے، جو شخص ظاہری شکل و صورت دیکھ کر تعدیل کر دیتا ہے تو اس کی بات قابل قبول نہیں۔(۳)

میمونی نے امام احمد سے کہا کہ حران والے احمد بن عبد الملک حرانی کی بڑی شکایت کرتے ہیں، انہوں نے کہا کہ حران والے کبھی کسی سے خوش نہیں رہ سکتے، ان کی کچھ زمین اور جائداد کا معاملہ تھا جس کی بنا پر وہ سلطان کے یہاں آتے جاتے تھے، اسی بنیاد پر لوگ ان کو برا کہنے لگے۔(۴)

لہٰذا اسباب کا جاننا ضروری ہے کہ کون سا سبب قادح ہے اور کون غیر قادح۔

۴- کلام عرب، اس کے محاورات، الفاظ کے مدلولات اور خاص طور سے عرفی کلمات کا معنی و مفہوم جو عرف میں بدلتا بھی رہتا ہے اس کا جاننا ضروری ہے، تاکہ جرح و تعدیل کیلئے مناسب کلمہ استعمال کر سکے، ایسا نہ ہو کہ بہت زیادہ مبالغہ اور شدت یا نرمی ہو جائے یا مدلول پر دلالت نہ کرے۔(۵)

۵- شرعی احکام کی معرفت رکھتا ہو، تاکہ حلال کو حرام، اور حرام کو حلال نہ سمجھ بیٹھے اسی بنیاد پر کسی پر فیصلہ سنادے گا۔(۶)

---

(۱) الرفع والتکمیل ص ۹۸ (۲) نزهة النظر ص ۱۳٤

(۳) نزهة النظر ص ۱۳٥ (٤) هدی الساری ص ۳۸٤

(٥) قاعدة فی الجرح والتعدیل ص ٥۲-٥۳

(٦) نیز اس موضوع کے لئے دیکھئے قاعدة فی الجرح والتعدیل ص ٥٤، نزهة النظر ص ۱۲٤-۱۲٦ الرفع والتکمیل ص ٦۷، أسباب اختلاف المحدثین ج ۱/٤۸، درسات فی الجرح والتعدیل ص ٥۷

جرح و تعدیل میں ذکرِ اسباب[1]:-

جب کوئی شخص کسی راوی پر جرح یا کسی کی تعدیل کرتا ہو اور سبب ذکر کر دیا ہو تو سارے علماء کے یہاں یہ جرح و تعدیل بالاتفاق قابل قبول ہے، لیکن اگر بغیر سبب کے جرح یا تعدیل کیا ہے تو اس کا حکم کیا ہے اس کی بات بغیر دلیل کے قابلِ قبول ہو گی کہ نہیں؟ اس میں علماء کے مختلف اقوال ہیں:

۱- پہلا قول یہ ہے کہ تعدیل مبہم مقبول ہے لیکن جرح مبہم مقبول نہیں، اس لئے کہ عدالت کے اسباب بے شمار ہیں جن کا ذکر کرنا مشکل ہے اس کے مقابلے میں جرح کے اسباب کم ہوتے ہیں جن کا بیان کرنا آسان ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اسباب جرح کے سمجھنے میں غلطی ہو سکتی ہے، بہت سے حضرات ایسی چیزوں کو جرح سمجھ لیتے ہیں جو حقیقت میں قابل جرح نہیں۔ مثلاً امام شعبہ سے کسی نے کسی کے بارے میں پوچھا کہ ان کی روایت آپ نے کیوں ترک کر دی تو انہوں نے جواب دیا کہ "رأيته يركز على برذون"

اور انہیں سے جب زاذان کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا: "كان كثير الكلام" نیز ابو غالب سے انہوں نے اس بنیاد پر روایت نہیں قبول کیا اس لئے کہ وہ دھوپ میں حدیث بیان کر رہے تھے۔[2]

اکثر محدثین نے اسی قول کو صحیح قرار دیا ہے۔ علامہ ابن صلاح نے فرمایا ہے کہ جرح مبہم قابل قبول نہیں، لیکن اگر کوئی کہے کہ جرح مبہم نہ قبول کرنے سے بہت ساری کتابیں بیکار ہو جائیں گی اس لئے کہ اہل علم نے ہر ہر جگہ جرح مفسر نہیں بیان کیا ہے۔

تو اس جواب یہ ہے کہ جرح کی بابت ہم ان کو مطلق رد نہیں کرتے، ہاں اتنا ضرور ہے کہ جس کے بارے میں انہوں نے جرح کا حکم لگا دیا ہے، اس پر توقف ضرور کرتے ہیں، اسلئے کہ وہ مشتبہ ہو گیا پھر جب تلاش کے بعد شبہ ختم ہو جاتا ہے تب اسکی

(۱) مقدمة ابن الصلاح ص ٩٦، الكفاية فى علم الرواية ص ٩٩، ١٠١، ١٠٧، نزهة النظر ص ١٣٢، فتح المغيث ١/ ٢٨٠، توضيح الافكار ٢/ ١٣٣-١٤٤

(۲) الكفاية ص ١١٠، ١١٣

حدیث مقبول ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ کتابیں بے سود نہیں۔[1]

علامہ جمال الدین قاسمی فرماتے ہیں: اس طرح کی کتابیں عموماً مختصرات ہیں مطولات میں اس کی تفصیل ضرور موجود ہے، ان میں اختصار کے طور پر ایسا کیا گیا ہے لہٰذا یہ سب کتابیں مفید اور قابل قبول ہیں۔[2]

۲- دوسرا قول یہ ہے کہ عدالت کے اسباب بیان کرنا ضروری ہے لیکن جرح کے اسباب بیان کرنا ضروری نہیں، کیونکہ عدالت کا حکم لگانے میں آدمی کو ظاہری شکل وصورت دیکھ کر دھوکہ ہو سکتا ہے جیسا کہ امام مالکؒ کو عبدالکریم بن اُبی المخارق کے بارے میں ہو گیا تھا۔

۳- تیسرا قول یہ ہے کہ دونوں میں اسباب بیان کرنا ضروری ہے اس لئے کہ جس طرح اسباب جرح میں غلطی کا امکان ہے اسی طرح سے اسبابِ تعدیل میں بھی غلطی کا امکان ہوتا ہے، کیونکہ بسااوقات لوگ ظاہری شکل وصورت دیکھ کر ثقاہت کا حکم لگادیتے ہیں حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے۔

٤- چوتھا قول یہ ہے کہ اگر کسی صاحبِ بصیرت شخص نے جرح یا تعدیل کی ہے جس کے افعال واعتقاد اطمینان بخش ہیں تو کسی میں سبب کا ذکر کرنا ضروری نہیں، ورنہ ضروری ہے۔

پہلے قول کو اکثر علماء نے راجح اور قابل قبول قرار دیا ہے۔

لیکن اگر یہ کہا جائے کہ یہ قول متقدمین کے حق میں بہتر تھا لیکن متأخرین کیلئے بہتر نہیں تو بے جانہ ہوگا، کیونکہ متأخرین کا اعتماد اس فن میں تصنیف شدہ کتابوں پر ہے لہٰذا ان کے حق میں یہ بہتر ہے کہ اگر جرح یا تعدیل کسی امام فن، عالم بالاسباب کی طرف سے صادر ہوا ہے تو بغیر ذکر اسباب قابل قبول ہونا چاہیۓ، اس لئے کہ یہ تصنیف شدہ کتابیں جس میں بے شمار اقوال جرح وتعدیل موجود ہیں، بسا اوقات اسباب کا ذکر بھی نہیں۔ اگر اسباب تلاش کیا جائے تو یہ ساری کتابیں بے سود ہو جائیں گی۔

---

(۱) علوم الحدیث ص ۹٦ (۲) قواعد التحدیث ص ۱۹۹

علامہ ابن صلاح فرماتے ہیں:"وأكثر ما يوجد في كتب الجرح والتعديل فلان ضعيف، أو متروك أو نحو ذلك فان لم نكتف به انسد باب كبير في ذلك"[1] جرح و تعدیل کی کتابوں میں عموماً یہ پایا جاتا ہے کہ فلاں ضعیف ہے اور فلاں متروک ہے وغیرہ جس میں سبب مذکور نہیں ہوتا، اب اگر اس پر اکتفاء نہ کیا جائے تو علم کا بہت بڑا دروازہ بند ہو جائے گا۔

لہٰذا ہر جگہ اس کی ضرورت نہیں بلکہ جہاں شک و شبہ ہو جائے وہیں اس کے بیان کی ضرورت پڑتی ہے۔

کیا جرح و تعدیل میں عدد شرط ہے ؟:-

جرح و تعدیل میں صرف ایک آدمی کا قول کافی ہے یا اس میں متعدد افراد کا قول ہونا ضروری ہے ؟ اس میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔

۱- پہلا قول یہ ہے کہ کم از کم تین افراد کی تعدیل ضروری ہے اس لئے کہ اللہ کے رسول نے بھیک مانگنے کیلئے کم از کم تین آدمیوں کی شہادت کا ذکر کیا تھا۔

۲- دوسرا قول یہ ہے کہ کم از کم دو آدمیوں کا قول ہونا ضروری ہے جیسا کہ شاہدوں کی جرح و تعدیل میں ہوتا ہے۔

۳- تیسرا قول یہ ہے کہ اگر معدل ایسا شخص ہے جس کی تعدیل قبول ہونی چاہئے مثلاً امامِ وقت ہو تو ایک شخص کی تعدیل کافی ہے ورنہ نہیں۔

٤- چوتھا قول یہ ہے کہ عدد شرط نہیں ہے بلکہ اگر ایک شخص جرح و تعدیل کرتا ہے تو وہ کافی ہے، اس لئے کہ جرح و تعدیل کی حیثیت خبر کی ہے جس طرح خبر کیلئے عدد شرط نہیں ہے، اسی طرح سے اس کیلئے بھی عدد شرط نہیں ہے۔ خطیب بغدادی اور ابنِ صلاح نے اسی قول کو صحیح قرار دیا ہے۔ البتہ خطیب بغدادی کے یہاں کم از کم دو کا ہونا مستحب ہے۔[2]

---

(۱) مقدمة ابن الصلاح ص ۹٦ ، اختصار علوم الحديث ابن كثير ص ۹٤ . نیز اس موضوع کے لئے دیکھئے الكفاية ۹۹ ، ۱۰۱ ، ۱۰۷ ، فتح المغيث ۲/۲٥ ، توضيح الافكار ۲/۱۳۳-۱۳٤

(۲) الكفاية في علم الرواية ص ۹٦ ، مقدمة ابن الصلاح ص ۹۸ . نیز دیکھئے ص ۱٦۸

راوی و شاھد میں فرق:-

راوی حدیث بیان کرنے والے کو کہتے ہیں اور شاہد حقوق و معاملات میں قاضی کے یہاں دیکھی یا سنی ہوئی چیزوں کے بیان کرنے والے کو کہتے ہیں۔

راوی و شاہد کی حالتوں میں مختلف طرح سے فرق ہوتا ہے:

ایک وجہ تو یہ ہے کہ: جو لوگ راویوں پر کلام کرتے ہیں وہ بڑے بڑے ائمہ ہوتے ہیں، لیکن جو شاہدوں پر کلام کرتے ہیں نہ تو وہ ائمہ ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کے مرتبہ کے ہوتے ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ شاہدوں پر جرح مجمل کافی ہے، لیکن راویوں پر بعض اوقات میں جرح مجمل کافی نہیں۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ قاضی شاہدوں کی حالت معلوم کرنے کیلئے جب چاہے یا جب ضرورت پڑے معلوم کر سکتا ہے، لیکن محدث راوی کی حالت معلوم کرنے پر اس طرح سے قادر نہیں ہو سکتا اس لئے کہ راویوں کا زمانہ گذر گیا۔ صرف لوگوں کے اقوال ان کے بارے میں موجود ہیں، انہیں کے اعتبار سے ان پر فیصلہ کیا جاتا ہے۔[1]

چوتھی وجہ یہ ہے کہ شہادت میں حریت اور مذکر ہونا شرط ہے روایت میں شرط نہیں ہے۔ نیز شہادت میں عدد ضروری ہے روایت میں ضروری نہیں۔

شہادت میں جس واقعہ کی شہادت دے رہا ہے اس کا دیکھنا ضروری ہے لیکن روایت میں راوی یا روایت کا دیکھنا ضروری نہیں۔ بلکہ اگر کوئی ضریر (نابینا) شخص بھی روایت کرے تو اس کی روایت ویسے ہی قابل قبول ہوگی جیسے کہ کسی بصیر (بینا) کی ہوتی ہے۔

شاہد کیلئے ضروری ہے کہ جس کے لئے شہادت دے رہا ہے وہ اس کا قریبی رشتہ دار نہ ہو، روایت کیلئے یہ ضروری نہیں، معلوم ہوا کہ روایت و شہادت نیز راوی و شاہد میں بہت فرق ہے، لہٰذا راوی کو شاہد پر قیاس کرنا درست نہیں۔[2]

امام سیوطی نے اکیس وجہوں سے راوی و شاہد میں فرق واضح کیا ہے۔[3]

---

(۱) التنکیل بما فی تانیب الکوثری من الأباطیل ۱/ ۶۰

(۲) الجرح والتعدیل ابو لبابہ ص ۸۸

(۳) تدریب الراوی ۱/ ۳۳۲، ۳۳۴

تعارض جرح وتعدیل:-

تعارض عام طور سے دو یا اس سے زائد اماموں کے اقوال کے درمیان ہوتا ہے۔ لیکن کبھی ایک امام کا قول بھی آپس میں متعارض ہوتا ہے، اگر تعارض مختلف ائمہ کے قول کے درمیان، یا دو اماموں کے قول کے درمیان ہو، مثلاً ایک محدث کسی راوی کو ثقہ کہتا ہے تو دوسرا اسی کو ضعیف قرار دیتا ہے۔ مثال کے طور پر محمد بن اسحٰق مدنی، صاحبِ مغازی، ان کو امام شعبہ نے "أمير المؤمنين في الحديث" کہا ہے۔(۱) انہیں کو امام مالکؒ نے "دجّال من الدجاجلة" کہا ہے۔(۲)

یہاں پر تعدیل کا اعلیٰ مرتبہ اور تجریح کا ادنیٰ (بدترین مرتبہ) متعارض ہے۔

اسی طرح سے جابر جعفی کے بارے میں امام ابو حنیفہؒ کہتے ہیں- جو ان کے استاد حدیث ہیں- کہ:"ما رايت أكذب من جابر الجعفي"

انہیں کے بارے میں امام شعبہ کہتے ہیں کہ:"إذا قال جابر حدثنا فهو أوثق الناس"(۳)

یہاں پر بھی "أوثق" اور "أكذب" دونوں اسم تفضیل کے صیغے ہیں، ایک ثقاہت کا اعلیٰ مرتبہ ظاہر کرتا ہے، تو دوسرا جرح کا ادنیٰ مرتبہ بتاتا ہے یعنی دونوں ایک دوسرے کے بالکل برعکس ہیں۔

ایسی صورت میں طالبعلم کو کیا کرنا چاہئے؟ اس کے لئے بھی کچھ اصول و ضوابط ہیں:

تعارض کب ہوگا؟:-

لیکن اصول و ضوابط کے معلوم کرنے سے قبل یہ جان لینا مناسب ہے کہ جرح و تعدیل میں تعارض کب تصور کیا جائے گا؟

تو معلوم ہونا چاہئے کہ حقیقت میں جرح و تعدیل میں تعارض اس وقت ہوگا جب اقوال میں تطبیق ناممکن ہو، اس لئے کہ بہت سے حالات ایسے ہوتے ہیں جس میں

---

(۱) الجرح والتعديل ۱۹۲/۷، والثقات لابن حبان ۳۸۳/۷

(۲) ميزان الاعتدال ۴۶۹/۳ (۳) ميزان الاعتدال ۳۷۹/۱

راوی ضعیف ہوتا ہے اور اگر وہ حالات نہ ہوں تو ثقہ ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر ایک راوی ایسا ہے جو ابتدائی زمانہ میں ثقہ تھا لیکن آخری ایام میں مختلط ہو گیا۔ پہلی حالت کو جس نے پایا اس نے ثقہ قرار دیا۔ تو یہ تعارض نہیں ہو گا بلکہ حالات کا اعتبار کر کے فیصلہ کر دیا جائے گا۔

مثلاً عبد اللہ بن لہیعہ جو سنن اربعہ کے راویوں میں سے ہیں اور بہت مشہور ہیں۔ ابتدائی ایام میں یہ ثقہ تھے۔ لیکن جب ان کے کتب خانے میں آگ لگ گئی اور ساری کتابیں جل گئیں اس کے بعد سے یہ مختلط ہو گئے، لہٰذا ان کی روایتیں جو اختلاط سے پہلے کی ہیں وہ صحیح ہیں اور جو بعد کی ہیں، وہ ضعیف ہیں۔

ان کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ جب عبادلہ اربعہ ان سے روایت کریں تو ان کی روایت صحیح ہوتی ہے۔ وہ عبادلہ اربعہ یہ ہیں:

۱- عبد اللہ بن مبارک ۲- عبد اللہ بن یزید مقری

۳- عبد اللہ بن وہب ٤- عبد اللہ بن مسلمۃ قعنبی۔ (۱)

لہٰذا جن لوگوں نے ثقہ کہا ہے ان کو پہلے حالات کا علم تھا، اور جنہوں نے ضعیف کہا ہے ان کو آخری حالات کا علم تھا، لہٰذا اس کو تعارض نہیں کہا جائے گا۔

اسی طرح سے بہت سے راوی ایسے ہیں جو کہ خاص جگہ میں ثقہ مانے جاتے ہیں اور دوسری جگہوں میں ضعیف۔ مثلاً اسماعیل بن عیاش شامی، جب یہ اپنے ملک یعنی شامیوں سے روایت کرتے ہیں تو ثقہ اور جب غیر شامیوں سے روایت کرتے ہیں تو ضعیف ہوتے ہیں۔ (۲)

اسی طرح سے بہت سے راوی ایسے ہیں تو جو خاص استاذ میں ضعیف اور دوسروں میں ثقہ ہوتے ہیں، مثلاً ہشیم بن بشیر، جو صحیحین کے راویوں میں سے ہیں اور ثقہ ہیں، لیکن جب امام زہری سے روایت کرتے ہیں تو انکی روایت ضعیف ہوتی ہے۔ (۳)

تو جس نے ان کو ضعیف قرار دیا ہے انہوں نے صرف امام زہری کی روایتوں

---

(۱) میزان الاعتدال ۲/٤٨٢، کچھ لوگوں نے ان کو مطلق ضعیف کہا ہے۔ دیکھئے المجروحین ۱/۸٦

(۲) میزان الاعتدال ۱/۲٤١ (۳) میزان الاعتدال ٤/٣٠٨

میں ضعیف کہا ہے، لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔

اسی طرح مذکورہ مثال میں یہ تطبیق دی جاتی ہے، کہ جابر جعفی ابتدائی ایام میں ثقہ تھے لیکن بعد میں عقیدہ خراب ہو گیا، رجعت پر ایمان لے آئے اور جھوٹ گھڑنا شروع کر دیے۔ جن کو ان کا ابتدائی زمانہ معلوم تھا انہوں نے ثقہ، اور جن کو آخری حالت معلوم تھے انہوں نے ضعیف کہا۔

اسی طرح سے محمد بن اسحق کے بارے میں یہ تطبیق دی جاتی ہے کہ جن لوگوں نے ثقہ کہا ہے انہوں نے اس سبب کا اعتبار نہیں کیا جس پر امام مالک نے اعتماد کیا ہے۔ یعنی ہشام بن عروہ کا یہ کہنا کہ چونکہ محمد بن اسحق نے میری بیوی فاطمہ بنت منذر سے روایت کیا ہے جو میرے گھر سے کبھی باہر نہیں گئی لہٰذا محمد بن اسحق جھوٹے ہیں۔ اس لئے کہ یہ ممکن ہے کہ محمد بن اسحق نے شادی سے پہلے روایت کی ہو، اسی طرح یہ امکان بھی ہے کہ انہوں نے گھر کے دروازہ پر بیٹھ کر پردے کے پیچھے سے حدیثیں سنی ہوں، جیسا کہ اس زمانہ میں رواج تھا۔[1]

امام بخاریؒ کہتے ہیں کہ: "لو صح عن هشام جاز أن تكتب إليه، فإن أهل المدينة يرون الكتاب جائزا لأن النبي صلى الله عليه وسلم كتب لأهل السرية"[2]

یہ بات جو ہشام کی جانب منسوب کی جاتی اگر صحیح بھی ہو تو یہ بھی ممکن ہے کہ ان کی عورت نے امام محمد بن اسحق کے پاس لکھ کر بھیجا ہو، اس طرح کی روایت مدینہ والوں کے یہاں جائز ہے، اسلئے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے اس طرح سے دستوں کے پاس لکھ کر بھیجا تھا۔

اسی طرح سے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ امام مالک نے جو کچھ ان کو کہا تھا غصہ میں کہا تھا، ان کے اوپر حکم لگانا مقصد نہیں، لہٰذا ان کے قول کا اعتبار نہیں ہوگا۔

اسی طرح سے تطبیق کی بہت ساری شکلیں نکل سکتی ہیں جن کو راویوں کے حالات سے شغف رکھنے والے ماہر تجربہ کار بہ خوبی سمجھ سکتے ہیں۔

---

(۱) رسالة في الجرح والتعديل للمنذري ص ٤٣-٤٤ و ميزان الاعتدال ٣/ ٤٧٠، ٤٧١

(۲) جزء القرأة خلف الامام ص ٤٠

تعارض کی صورت میں عمل کی نوعیت:-

لیکن اگر تطبیق کی صورت ممکن نہ ہو تو ایسی صورت میں طالبعلم کو کیا کرنا چاہئے؟اس سلسلے میں علماء کے کئی اقوال ہیں اور ان کے دو بنیادی نظریئے ہیں:

ایک نظریہ راویوں پر حسنِ ظن کا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ راویوں میں اصل ثقاہت ہے اور ضعف عارضی چیز ہے۔

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ اصل مقصد حفاظت حدیث ہے جرح اصل ہے، اب جن کے یہاں جرح اصل ہے وہ جرح کو مقدم کرتے ہیں اور جن کے یہاں تعدیل اصل ہے وہ تعدیل کو مقدم کرتے ہیں، اقوال کی تفصیل اس طرح سے ہے: (۱)

۱- پہلا قول یہ ہے کہ جرح مقدم ہے، اس لئے کہ عدالت کرنے والا شخص ظاہری حالت کی بنیاد پر خبر دیتا ہے، اور جارح کسی باطن مخفی چیز کی بنیاد پر خبر دیتا ہے جو معدل کو معلوم نہیں، لہٰذا اس کے پاس زائد علم ہے جس کا قبول کرنا لازم ہے۔

نیز ایسی صورت میں اگر جارح کے قول پر عمل کیا جاتا ہے تو معدل پر کوئی حرف نہیں آتا، لیکن اگر تعدیل پر عمل کیا جاتا ہے تو اس سے جارح کی تکذیب ہوتی ہے۔ (۲)

البتہ اگر جارح کوئی ایسا سبب بیان کرتا ہے جو معدل کے علم میں ہے لیکن معدل اس کی نفی کرتا ہے تو ایسی صورت میں تعدیل مقدم ہے۔ (۳)

۲- دوسرا قول یہ ہے کہ: تعدیل مقدم ہے، اس لئے کہ راویوں میں اصل عدالت ہے جرح امر عارضی ہے۔ لہٰذا مجرد جارح کے کلام سے عادل کے عدالت ساقط نہیں کی جاسکتی۔ شعرانی نے اس کو جمہور کی جانب منسوب کیا ہے۔ (۴)

۳- تیسرا قول یہ ہے کہ: اگر جارحین کی تعداد زیادہ (یا معدلین کے مساوی ہے) تو جرح مقدم ہو گا اور اگر معدلین کی عدد زیادہ ہے تو تعدیل مقدم ہو گی، اس لئے کہ کثرت عدد سے خبر کی تائید ہوتی ہے۔

---

(۱) اقوال کی تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو: الكفاية ص ۱۰۶، فتح المغيث ۲۸۶/۱، ۲۸۷، مقدمة ابن الصلاح ۹۹، حاشية توضيح الأفكار ۱۵۸/۲، و توضيح الافكار ۱۶۱/۲، ۱

(۲) الكفاية فى علم الرواية ص ۱۰۶ (۳) تدريب الراوى ۳۰۹/۱

(۴) قواعد التحديث ص ۱۹

خطیب بغدادی نے اس علت کو غلط قرار دیا ہے۔[1]

٤- چوتھا قول یہ ہے کہ: جب جارح و معدل حفظ میں برابر ہوں یا جارح احفظ ہو تو جرح مقدم ہے۔ اور اگر معدلین احفظ و اضبط ہیں تو تعدیل مقدم ہے اس لئے کہ خبر میں بنیادِ صحت اور عدم صحت کی ہوتی ہے۔ جب کوئی ضابط آدمی خبر دیتا ہے تو قیاس یہی چاہتا ہے کہ اس کی بات تسلیم کی جائے۔

یہ دونوں قول درست نہیں اس لئے کہ اگر کسی طرح سے ترجیح ممکن ہے تو پھر تعارض ہوگا ہی نہیں۔ نیز قلت و کثرت کا اعتبار تعدیل و تجریح میں معتبر نہیں لہٰذا، ترجیح میں بھی معتبر نہیں۔

٥- پانچواں قول یہ ہے کہ: دونوں برابر ہے لہٰذا ترجیح کی صورت پیدا کی جائے گی، یعنی یہ دیکھا جائے گا کہ کن لوگوں کی عدد زیادہ ہے جارحین کی یا معدلین کی؟ علمی صلاحیت و بصیرت کے اعتبار سے کون آگے ہیں جارحین یا معدلین؟ تقویٰ و پرہیزگاری کے اعتبار سے کون افضل ہیں جارحین یا معدلین؟ اس اعتبار سے ترجیح دی جائے گی۔

مثلاً جارح نے اگر بڑے بڑے اہل علم اور ائمہ فن پر کلام کیا ہے جن کی ثقاہت مشہور و راجح ہے، ایسی صورت میں جارح کا قول مرجوح ہوگا۔ اس لئے کہ اگر ایسا نہیں کرتے، تو ثقہ کے مقابلے میں اوثق کی مخالفت لازم آتی ہے، نیز جارح کا جرح، ان کی ثقاہت اور امامت کے مقابلے میں خبر غریب ہے اگر واقعی یہ چیز ان میں پائی جاتی تو اور لوگ بھی اس کو نقل کرتے ہیں۔

اور اگر جرح متوسط قسم کے لوگوں پر کیا ہے تو جہاں جارح کی سچائی راجح ہے اور مجروح سے جرح کے صدور کا امکان ہے تو ایسی صورت میں یہ دیکھا جائے گا کہ جرح مبہم ہے یا مفسر، اگر مبہم ہے تو اس کا اعتبار نہیں ہوگا، بلکہ مجروح کے حالات معلوم کئے جائیں گے۔ جس طرح سے حالات ہوں گے اسی طرح سے فیصلہ کیا جائے گا اور اگر جرح مفسر ہے تو سبب دیکھا جائے گا۔ اگر سبب مناسب ہے تو جرح کا اعتبار ہوگا ورنہ نہیں۔[2]

صاحب تنقیح الأنظار نے اسی کو راجح قرار دیا ہے۔ حالانکہ اسی سے شخصیت

---

(۱) الکفایة ص ۱۰۷

(۲) قدرے تفصیل سے اس قول کو توضیح الافکار ٤/١٦١-١٦٧ میں ذکر کیا گیا ہے۔

پرستی کی بو آتی ہے اور اکثر صورتوں میں جارح کی تکذیب ہو رہی ہے جو غیر مقبول ہے، اور اس کے پاس جو زائد علم ہے اس کا ضیاع ہو رہا ہے، جب کہ زیادتی ثقہ مقبول ہوتی ہے۔

نیز یہ کوئی ضروری نہیں کہ جارح جس چیز کی خبر دے رہا ہو، وہ سب کو معلوم ہو، ممکن ہے وہ کسی ایسی چیز کی خبر دے رہا ہو جو مجروح سے کبھی اتفاقیہ سرزد ہوئی ہو، یا اس کے سمجھنے ہی میں غلطی ہو گئی ہو، تو کم از کم اس کی بات تو سننی چاہئے۔

نیز ترجیح کی جو صورتیں بیان کی گئی ہیں ان سے یہ قول کئی اقوال کا مجموعہ بن جاتا ہے، کیونکہ قول نمبر تین اور چار میں تقریباً یہی باتیں مذکور ہیں۔ نیز ترجیح کی صورت اگر پائی جائے تو اس کو تعارض کہتے ہی نہیں، جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔

٦- چھٹا قول یہ ہے کہ: یہ دیکھنا چاہئے کہ جرح مبہم ہے یا مفسر (٢) اگر جرح مبہم ہے۔ (تعدیل مبہم ہو یا مفسر) تو تعدیل راجح ہے، اور اگر جرح مفسر ہے۔ (تعدیل مفسر ہو یا مبہم) تو جرح راجح ہے۔

جرح مبہم	+	تعدیل مبہم	=	تعدیل راجح
جرح مفسر	+	تعدیل مفسر	=	جرح راجح
جرح مبہم	+	تعدیل مفسر	=	تعدیل راجح
جرح مفسر	+	تعدیل مبہم	=	جراح راجح

تاکہ جارح کا علم ضائع نہ ہو جیسا کہ پہلے قول میں گذر چکا ہے۔ اسی طرح سے "ذکر اسباب جرح و تعدیل" میں یہ بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ اکثر محدثین کے نزدیک وہی جرح قابلِ اعتماد ہے جو مفسر ہو، جرح مبہم کا کوئی اعتبار نہیں، لہٰذا تعارض جرح و تعدیل میں بھی اس اصول سے مدد لینی چاہئے۔

رجال حدیث کے بارے میں علمائے جرح و تعدیل کے اقوال جو ایک دوسرے کے مخالف ہیں ان کے سلسلے میں امام بخاری کہتے ہیں کہ: "**لم يلتفت أهل العلم إلى هذا النحو إلا ببيان وحجة ولم يسقط عدالتهم إلا ببرهان ثابت**

---

(١) یہاں پر جرح مفسر سے مقصد یہ ہے کہ اسباب کے ساتھ ساتھ اس میں جرح کی صلاحیت بھی موجود ہو اس لئے کہ بعض مرتبہ جرح مفسر تو ہوتے ہیں لیکن اسباب کے اندر جرح کی صلاحیت نہیں ہوتی۔

وحجة"[1] اہل علم اس طرح کی باتوں کی پرواہ نہیں کرتے جبکہ دلیل موجود نہ ہو اور نہ ہی کسی کی عدالت بغیر واضح دلیل کے ساقط کرتے ہیں۔

اور امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ: "كل رجل ثبتت عدالته لم يقبل فيه تجريح أحد حتى يتبين ذلك عليه بأمر لا يحتمل غير جرحه"[2]

اس لئے کہ اہل علم جب کسی کی تعدیل کرتے ہیں تو مجرد ظن و تخمین سے نہیں کرتے بلکہ بڑے تجربہ اور علم کے بعد کرتے ہیں، لہٰذا بغیر کسی صریح دلیل کے ان کے حکم کو رد نہیں کیا جاسکتا۔[3]

حافظ ابن حجر نے اس میں قدرے تفصیل کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی ایسا شخص ہے جس کی کسی امام نے تعدیل کی ہے، تو اس کے خلاف کوئی بھی قول بغیر سبب کے معتبر نہیں ہے، اس لئے کہ اس امام کی تعدیل کی وجہ سے اس کی ثقاہت ثابت ہو چکی ہے لہٰذا کوئی واضح دلیل ہی اس کو ختم کر سکتی ہے۔

لیکن اگر کوئی ایسا راوی ہے جس کی تعدیل کسی نے نہیں کی ہے تو اس کے خلاف جرح بغیر سبب ذکر کئے بھی مقبول ہے بشرطیکہ یہ جرح صاحبِ بصیرت کی طرف سے صادر ہوا ہو۔ اس لئے کہ یہ شخص- جس کی کسی نے تعدیل نہیں کی ہے- مجہول تھا، لہٰذا جارح کے قول پر عمل کرنا اس کے ترک کرنے سے بہتر ہے، اس تفصیل کو متأخرین علماء نے پسندیدہ قرار دیا ہے۔[4]

شیخ احمد شاکر فرماتے ہیں کہ: وهو الذي يطمئن إليه النفوس.... علوم حدیث کی تدوین قواعد و ضوابط کی تعیین کے بعد اسی قول پر اطمینان ہوتا ہے۔[5]

علامہ جمال الدین قاسمی فرماتے ہیں کہ: جب جرح مفسر اور تعدیل کا اجتماع ہو جائے تو جمہور کے یہاں جرح مقدم ہوتا ہے، چاہے جارح کی تعداد معدل کے مقابلے میں کم ہی کیوں نہ ہو۔[6]

---

(۱) جزء القراءة خلف الامام ص ۳۹ طبع لاهور.

(۲) تهذيب التهذيب ۲۷۳/۷، و دراسات في الجرح والتعديل ص ۲۰۶

(۳) نزهة النظر ص ۱۳۶-۱۳۷، تدريب الراوى ۳۰۸/۱

(٤) نزهة النظر ص ۱۳۶-۱۳۷، فتح المغيث ۳۰/۲

(٥) الباعث الحثيث ۹۵-۹۶، نیز دیکھئے فتح المغيث ۳۳،۳۰/۲

(٦) قواعد التحديث ص ۱۸۸

بعض متاخرین کا یہ کہنا ہے کہ :یہ اس صورت میں ہے جب کہ یہ معلوم نہ ہو سکے کہ جرح کسی تعصب مذہبی یا منافست کی بنیاد پر ہے اور اگر ایسا ہے تو مقبول نہیں ہو گا۔ (۱)

یہ طریقے اس صورت میں ہیں جب تعارض مختلف ائمہ کے اقوال میں ہو۔

لیکن اگر ایک امام کے اقوال آپس میں متعارض ہوں جیسا کہ امام ابن معین کے یہاں پایا جاتا ہے، تو ایسی صورت میں یہ دیکھا جائے گا کہ کون سا قول متاخر ہے اگر یہ معلوم ہو گیا تو اس پر عمل کیا جائے گا اور یہ سمجھا جائے گا کہ امام کی رائے بعد میں بدل گئی ہے۔

اس سلسلہ میں امام دوری کی روایت پر اعتماد کیا جائے گا اس لئے کہ یہی سب سے زیادہ متاخر روایت ہے جو "التاريخ ليحيى بن معين" کے نام سے معروف ہے۔

عباس دوری ثواب بن عتبہ کے ترجمہ میں فرماتے ہیں کہ امام یحییٰ سے میں نے سنا کہ :وہ "شیخ صدوق" ہیں، اگر آپ نے اس سے پہلے ان کے بارے میں امام ابوزکریا سے "ضعیف" کہتے ہوئے سنا ہو تو معلوم ہونا چاہئے کہ انہوں نے پہلے قول سے رجوع کر لیا ہے اور ان کا آخری قول ان کے بارے میں یہ ہے کہ وہ "صدوق" ہیں۔ (۲)

لیکن اگر یہ معلوم نہ ہو سکے تو ان اقوال میں جمع اور تطبیق کی کوشش کرنی چاہئے۔

مثلاً: تضعیف کو کسی خاص شیخ، شہر، یا مقام پر محمول کرنا چاہئے اور توثیق کو کسی اور پر۔

یا یہ نسبتی حکم ہو گا یعنی یہ کہ مطلق توثیق یا تضعیف نہیں بلکہ دوسرے کے بہ نسبت ایسا ہے، اس کا اندازہ عام طور سے سوال کی کیفیت سے ہوتا ہے، اگر کہیں کسی متوسط شخص کے ساتھ ضعیف کا نام لے کر سوال کیا جاتا ہے، مثلاً فلاں فلاں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے تو جواب یہ دیا کہ فلاں ثقہ ہے یعنی جس کے ساتھ اس کا نام لیا گیا ہے اس کے مقابلہ میں یہ قوی ہے اور وہ کمزور ہے۔ (۳)

اور کبھی ثقہ اور اوثق کو لیکر ساتھ میں سوال کیا جاتا ہے تو ثقہ کے بارے میں جواب یہ ملتا ہے کہ وہ کمزور ہے یعنی اوثق کے مقابلہ میں کمزور ہے نہ کی مطلق کمزور ہے۔

چنانچہ ایک مرتبہ امام دارمی نے علاء بن عبد الرحمٰن کے بارے میں امام یحییٰ

---

(۱) فتح المغيث ۲/ ۳۰ (۲) التاريخ ٤/ ٢٧٢

(۳) لسان الميزان ۱/ ۱۷

بن معین سے سوال کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ "لیس به بأس" پھر دارمی نے کہا کہ وہ بہتر ہیں یا سعید المقبری تو فرمایا سعید اوثق ہیں اور علاء ضعیف۔ (۱)

یعنی ان کے مقابلہ میں ضعیف ہیں۔

اور اگر جمع ممکن نہ ہو تو دیگر قرائن سے ترجیح کی صورت پیدا کی جائے گی مثلاً خود دونوں قول کے روایت کرنے والوں میں سے کون امام کیساتھ بکثرت رہتے تھے، یا تعداد کس کی زیادہ ہے، یا اضبط اور اوثق کون ہیں وغیرہ وغیرہ۔ (۲)

اگر ایسا بھی نہ ہو سکے تو ائمہ نقد کے اقوال سے اقرب ترین قول کو لے لیا جائے گا، یا پھر توقف کیا جائے گا۔ (۳)

امام یحییٰ بن معین کے متضارب اقوال کے سلسلہ میں امام سخاوی فرماتے ہیں کہ:

هذا يكون نسبيا فى أحدهما، أو ناشئا عن تغيير اجتهاد. (۴)

یعنی یہ یا تو نسبتی معاملہ ہے یا اجتہاد کی تبدیلی ہے۔ ایسی صورت میں یہ کسی خاص قاعدہ کلیہ کے تحت نہیں آسکتا اگرچہ بعض متاخرین نے یہ کہا ہے کہ اگر معلوم ہو تو آخری قول معمول بہ ہوگا ورنہ توقف کیا جائے گا۔

متفق علیہ شخص پر جرح و تعدیل کا حکم:-

ہر وہ شخص جس کی ثقاہت و عدالت یا ضعف کے بارے میں ائمہ نقد کا اتفاق ہو مگر ایک شخص ان کی مخالفت کرتا ہے اور ان کے برخلاف حکم لگاتا ہے، تو اس کا حکم شاذ ہوگا اور اس کا اعتبار نہیں ہوگا، الا یہ کہ اس کے پاس کوئی ایسی واضح برہان یا دلیل قاطع ہو جس کا اعتماد انہیں چیزوں پر ہو جس پر شاہد اپنی شہادت میں کرتا ہے۔ (۵)

حافظ مغرب ابن عبد البر قرطبی فرماتے ہیں کہ: ہر وہ شخص جس کی عدالت، دیانت داری، ثقاہت اور علم دوستی واضح ہو اس کے بارے میں کسی کا قول قابل توجہ

---

(۱) تاريخ عثمان بن سعيد الدارمى ص ۱۷۳-۱۷٤

(۲) اس سلسلہ میں عباس دوری کی روایت کو کثرت ملازمت کی بنیاد پر ترجیح دی جاسکتی ہے۔

(۳) قواعد فى الجرح والتعديل ص ٤٦، ٤٧

(٤) فتح المغيث ۲/ ۳۳، ۲/ ۱۲۸

(٥) قاعدة فى الجرح والتعديل ص ۹، طبقات الشافعية الكبرى ۱/ ۱۸۸

نہیں الا یہ کہ جرح پر شہادت کی طرح دلیل موجود ہو جو عینی مشاہدہ پر قائم ہو۔ (۱)

حافظ محمد بن نصر مروزی کہتے ہیں کہ :وہ شخص جسکی عدالت ثابت شدہ ہے اس کے بارے میں کسی کا جرح قابل قبول نہیں الا یہ کہ جارح کوئی ایسی دلیل پیش کرے جس میں کسی قسم کا کوئی احتمال نہ ہو۔ (۲)

علامہ سبکی کہتے ہیں کہ: ہمارے نزدیک صحیح یہ ہے کہ جس کی امامت اور عدالت ثابت شدہ ہو، اور اس کی ثقاہت بیان کرنے والے بے شمار ہوں، جرح کرنے والا نادر ہو، اور وہاں ایسا قرینہ موجود ہو جو دلالت کرتا ہے کہ یہ جرح تعصب مذہبی یا کسی دیگر دنیوی اغراض کے لئے کیا گیا ہے جیسا کہ ہم عصروں میں ہوتا ہے تو ایسا جرح قابل قبول نہیں، اگر اس طرح کا دروازہ کھول دیا جائے تو کوئی شخص جرح سے محفوظ نہیں رہ سکتا ہے۔ (۳)

یہی وجہ ہے کہ ابن ابی ذئب کی جرح کو جو انہوں نے امام مالک پر کیا ہے، اور یحییٰ بن معین کی جرح کو جو انہوں نے امام شافعی پر کیا ہے۔ (۴) اور امام نسائی کی جرح کو جو انہوں نے احمد بن صالح مصری پر کیا ہے محدثین نے قبول نہیں کیا ہے، اس لئے کہ یہ سب مشہور اہل علم ہیں، جارح کی خبر ان کے بارے میں خبر غریب ہے، اگر یہ خبر صحیح ہوتی تو اس کو لوگ بکثرت نقل کرتے۔ (۵)

امام ذہبی فرماتے ہیں کہ :اہل علم نے امام شافعی اور چند دیگر ثقات کے بارے میں ابن معین کا جرح قبول نہیں کیا ہے، ایسے ہی بعض لوگوں کی تعدیل پر ان کی بات أئمہ نے تسلیم نہیں کی ہے۔

جرح و تعدیل کے بارے میں ان کے اقوال اس وقت مقدم ہوتے ہیں جب

---

(۱) جامع بیان العلم ۱۵۲/۲ (۲) فتح المغیث ۲۸۵/۱

(۳) قاعدۃ فی الجرح والتعدیل ص ۹، ۲۳

(٤) یہ بات صحیح نہیں ہے خود امام سبکی نے اس کی تردید کی ہے اور کہا ہے کہ :ابن معین نے امام شافعی پر نہیں، بلکہ ان کے بھتیجے ابراہیم بن محمد شافعی پر جرح کیا ہے۔
اس لئے کہ خود امام ابن معین سے امام شافعی کے بارے میں منقول ہے کہ "ھو امام حاذق" اور فرمایا ہے کہ میں ان کے لئے چالیس سال سے دعائیں کرتا ہوں، پھر ان پر کلام کیسے کریں گے۔ قاعدۃ فی الجرح ص ۱٤، ۱۵ مع حاشیہ۔ (۵) قاعدہ فی الجرح والتعدیل ص ۲۳ - ۳۰

جمہور کے خلاف نہ ہوں، لیکن اگر یہ اس شخص کے توثیق کرنے میں منفرد ہوں جن کو جمہور نے ضعیف کہا ہے، یا اس شخص کی تضعیف کرنے میں منفرد ہوں جن کی جمہور نے ثقہ کہا ہے تو جمہور کی بات قابل قبول ہوگی۔ نہ کہ ان کی بات جو شاذ ہے۔[۱]

لہٰذا کوئی امام اگر کسی راوی کی توثیق کرنے پر منفرد ہو جس کو ائمہ نے ضعیف قرار دیا ہے تو اس کی بات بھی قابل قبول نہیں، جیسا کہ امام شافعی کی توثیق کو جو انہوں نے ابراہیم بن محمد بن ابی یحییٰ اسلمی کے بارے میں کی ہے ائمہ نے تسلیم نہیں کیا، اس لئے کہ وہ باتفاق اہل علم ضعیف ہیں۔[۲]

کچھ دیگر ضروری اصول

جرح و تعدیل کا کام بے حد مشکل اور پر پیچ ہے، اس لئے کہ اس میں جارح و مجروح دونوں انسان ہوتے ہیں، ان سے غلطی اور سہو ہو جانا ایک ضروری امر ہے۔ اسی طرح اظہارِ غضب و تنگ نظری، ہمدردی و فراخ دلی بھی انسانی فطرت ہے جس کا اثر ظہور جرح و تعدیل پر بھی نمایاں ہے اس لئے جرح و تعدیل کیلئے کچھ ضروری ضابطے بنائے گئے ہیں۔

۱- سارے صحابہ عادل ہیں:-

اس تفصیل میں داخل ہونے سے قبل یہ معلوم ہونا چاہئے کہ جرح کے جتنے بھی اصول ہیں یہ سب غیر صحابی کیلئے ہیں اسلئے کہ سارے صحابہ بلا تفصیل و تفریق عادل ہیں ان کی عدالت امرِ مسلم ہے، کتاب و سنت اور اجماعِ امت اس کی دلیل ہے۔

اسلئے جب بھی کسی راوی کے بارے میں یہ معلوم ہو جائے کہ یہ صحابی رسول ہیں چاہے ان کا نام و نسب معلوم ہو یا نہ ہو تو وہاں جرح کے سارے اصول معطل ہو جاتے ہیں اسی لئے یہ مشہور مقولہ ہے کہ: "جهالة الصحابة لا تضر"۔

صحابہ کے عدالت کی تفصیل: پہلے باب میں (طبقہ اولیٰ میں) گذر چکی ہے۔

---

(۱) أسماء من تكلم وهو موثق ص ٤٩

(۲) ميزان الاعتدال ١/٥٧، ضوابط فى الجرح والتعديل ص ٥٣

۲-جرح وتعدیل حسب ضرورت:-

چونکہ جرح وتعدیل ایک شرعی ضرورت ہے لہٰذا اسکو ضرورت کے حد تک، استعمال کرنا چاہئے، بہت زیادہ مبالغہ آرائی اور غیر ضروری باتوں سے پرہیز کرنا چاہئے۔

امام سخاوی فرماتے ہیں کہ:"لا یجوز التجریح بشیئین إذا حصل بواحد."[۱] یعنی اگر کسی ایک سبب سے جرح ثابت ہو جائے تو دوسرے اسباب کا ذکر کرنا جائز نہیں ہے۔

اسی طرح سے جو لوگ کتابوں کے واسطہ سے جرح یا تعدیل کرتے ہیں ان کے لئے بھی ضروری ہے کہ اگر کسی راوی کے بارے میں جرح نقل کر رہے ہیں اور اس کی تعدیل بھی موجود ہے تو اس کا نقل کرنا بھی ضروری ہے تاکہ قاری یہ نہ سمجھے کہ اس راوی کے بارے میں صرف جرح ہی وارد ہے تعدیل نہیں۔

اسی وجہ سے علامہ ذہبی نے ابن الجوزی کی کتاب "الموضوعات الکبریٰ" پر نقطہ چینی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:"یسرد الجرح و یسکت عن التعدیل."[۲] کہ وہ جرح کا تو بیان کرتے ہیں لیکن تعدیل کے بارے میں خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ: هذا من عیوب کتابه یذکر طعن الراوی ولا یذکر من و ثقه[۳]

(۳) متقدمین کا فیصلہ زیادہ معتبر ہے:-

اگر کسی راوی کے بارے میں متقدمین نے کوئی فیصلہ کیا ہو، یا کسی امام کا قول موجود ہو تو ان کا قول اس شخص کے بارے میں زیادہ معتبر ہوگا۔ اس لئے صاحب زمانہ نے اس کو بذات خود مشاہدہ کیا ہے اور معلومات حاصل کی ہے اور جوں جوں زمانہ گذرتا جاتا ہے غلطی کا امکان بڑھتا جاتا ہے۔

اسلئے اگر ایسے شخص پر کسی متأخر شخص نے کوئی دوسرا فیصلہ کیا ہو، یا دوسری رائے قائم کی ہو تو اس کا اعتبار نہیں ہوگا۔ یہاں تک کہ اس کے جرح کی بنیاد اور معقول

---

(۱) الرفع والتکمیل ص ۵۷ (۲) میزان الاعتدال ۱/ ۱٦
(۳) تهذیب التهذیب ۱/ ۱۰۲، ضوابط فی الجرح والتعدیل ص ۵٤

وجہ معلوم ہو جائے اور ظاہر بات ہے کہ معقول وجہ کسی متقدم ہی سے معلوم ہو سکتی ہے۔[1]

مثلاً ابان بن صالح قرشی کی ابن معین، عجلی، ابن ابی شیبہ، ابوزرعہ، ابو حاتم رازی اور نسائی نے توثیق کی ہے۔

لیکن ابن عبدالبر نے ان کو ضعیف کہا ہے اور ابن حزم نے کہا ہے کہ مشہور نہیں۔

حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ ابن عبدالبر اور ابن حزم کی یہ بہت بڑی غفلت ہے، ان سے پہلے ابان کو کسی نے ضعیف نہیں کہا ہے، اس کے بارے میں ابن معین اور متقدمین کا قول کافی ہے۔[2]

٤- قول کی نسبت کا قائل کی طرف صحیح ہونا:-

جس قول کی نسبت اسکے قائل کی جانب صحیح نہ ہو تو اس کا اعتبار نہیں ہوگا۔

ابن جوزی نے ابان بن یزید عطار کے بارے میں محمد بن یونس کدیمی کے واسطہ سے امام ابن قطان کا یہ قول نقل کیا کہ: "أنالا أروی عنه"

حافظ ابن حجر اس پر فرماتے ہیں کہ چونکہ کدیمی ضعیف ہیں لہٰذا یہ قول قابل قبول نہیں۔ ابن معین کے واسطہ سے ابن قطان کا جو قول ہے کہ "كان يروی عنه" وہی معتمد ہے۔[3]

ایسے ہی علی بن عبدالعزیز بغوی نے سلیمان بن احمد کے واسطہ سے ابن مہدی کا یہ قول فرج بن فضالۃ کے بارے میں نقل کیا ہے کہ: "ما رأيت شاميا أثبت من فرج بن فضالة."

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ: ابن مہدی کے توثیق سے دھوکہ نہیں کھانا چاہئے کیونکہ یہ سلیمان بن احمد واسطی کے واسطہ سے منقول ہے جو کذاب ہے۔[4]

ایسے ہی نعیم بن حماد خزاعی کو جن لوگوں نے متہم قرار دیا ہے اس کے اصل قائل غیر معروف ہیں، اس لئے اس کا اعتبار نہیں۔

---

(۱) دراسات فی الجرح والتعدیل ص ٦٥ نیز دیکھئے التنکیل بما فی تانیب الکوثری من الاباطیل

(۲) تهذيب التهذيب ٩٥/١، (۳) تهذيب التهذيب ١٠٢/١

(٤) تهذيب التهذيب ٤٦٢/١٠

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ: "فلا حجة فی شئ من ذلك لعدم معرفة قائله و اما نعیم فقد سبتت عدالته و صدقه لکن فی أحادیثه أوهام معروفة" (١)

دیگر ائمہ کرام کے اقوال جو بڑے بڑے ائمہ کے سلسلہ میں وارد ہیں۔ اگر ان کا تفصیلی جائزہ لیا جائے تو شاید کوئی نہ کوئی مخرج نکل آئے یا تو اس کی نسبت درست نہ ہو، یا تو کسی غلط فہمی پر مبنی ہو۔ اگر واقعی ایسا ہے تو اس کی نسبت ان ائمہ کی طرف کرنا درست نہیں ہے۔ جیسے یحییٰ بن معین کا نقد امام شافعی پر کیونکہ بقول امام سبکی: یحییٰ بن معین نے امام شافعی کو نہیں بلکہ ان کے چچیرے بھائی پر کلام کیا ہے جس کو غلط فہمی سے امام شافعی پر فٹ کر دیا گیا۔ (٢)

۵-تصدیق و تحقیق کے بعد فیصلہ کرنا:-

کسی راوی کے بارے میں آخری فیصلہ کرنے سے قبل راوی کے سلسلے میں ہر قسم کی شہادت اور اس کی زندگی کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کر لینا چاہئے، نیز اس پر کہے ہوئے اقوال پر ایک تنقیدی نظر ڈال لینا چاہئے اور جب یقین ہو جائے کہ ناقد جو کہہ رہا ہے وہی پہلو راجح ہے تب ہی اس کے اوپر کوئی حکم صادر کرنا چاہئے۔ (٣)

٦-ہم عصروں کے اقوال کی حیثیت:-

ہم عصر راویوں کے اقوال جو ایک دوسرے کے خلاف ہوں ان کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہئے، اس لئے کہ ایسا ہونا ایک فطری بات ہے کہ ایک معاصر دوسرے کی معمولی سی لغزشوں کو بھی معاف نہیں کرتا، خصوصاً جب یہ پتہ چل جائے کہ دونوں کے درمیان کسی مسئلہ پر یا کسی وجہ سے کشیدگی تھی۔ (٤)

امام ذہبی فرماتے ہیں کہ ہم عصروں کی بہت ساری باتوں کو جو ایک دوسرے کے سلسلہ میں ہیں درگذر کرنا چاہئے ان کا ذکر نہیں کرنا چاہئے اور نہ اس کو طعن کا سبب بنانا چاہئے۔ (٥)

اسی طرح سے تعدیل کا معاملہ بھی ہوتا ہے اس لئے کہ ناقد اپنے مشائخ یا ہم

---

(١) تهذيب التهذيب ٤٦٣/١٠ (٢) قاعدة فی الجرح والتعدیل ص ١١

(٣) التقريب للنووی ٣٦٨/٢ مع التدريب والجرح والتعديل ابولبابه حسين ص ٨٢

(٤) ميزان الاعتدال ١١١/١ (٥) ذكر اسماء من تكلم فيه وهو موثق ص ٤٦

خیال لوگوں کیلئے نرم گوشہ رکھ سکتا ہے۔[۱]

امام بخاریؒ فرماتے ہیں: عام طور سے لوگ دوسروں کے کلام سے محفوظ نہیں۔ مثلاً ابراہیم نے امام شعبی پر کلام کیا، شعبی نے عکرمہ پر کیا ہے، اس طرح کے مقام میں اہل علم نے مطلق ان کو قبول نہیں کیا ہے بلکہ اس کیلئے واضح دلیل اور قطعی حجت چاہئے۔[۲]

یہاں پر اس مسئلہ کی تھوڑی سی وضاحت کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اہل علم کے درمیان جو یہ بات مشہور ہے کہ "**المعاصرة أصل المنافرة**" اور اسی کو بنیاد بنا کر ہم عصر راوی کے جرح کی اہمیت کو ختم کر دیا جاتا ہے۔ تو ایسا نہیں ہونا چاہئے اور نہ ہی اس کو اطلاق پر محمول کرنا چاہئے بلکہ یہ اسی صورت میں ہے جب کہ اس کی بنیاد غصہ، تعصب و تنگ نظری، یا مذہبی و علمی عداوت پر ہو اور یہ صرف ہم عصر کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر ایک ساتھ ہے۔

اس لئے کہ ہم عصر راوی کے حالات کو جتنا بہتر اور صحیح ہم عصر محدث سمجھ سکتا اور جان سکتا ہے دوسرا نہیں جان سکتا۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ راوی کے حالات کو صرف ہم عصر راوی ہی جان سکتا ہے، اور دوسروں تک اسی کے واسطے سے معلومات پہنچتی ہے تو مبالغہ نہ ہوگا بلکہ یہی عین حقیقت ہے۔

اسی وجہ سے یہ بات کہی جاتی ہے کہ استاد کے بارے میں شاگرد کا قول اور اس کی رائے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ قوی اور بہتر ہوتی ہے اس لئے کہ شاگرد جس قدر اپنے استاد کے حالات سے واقف ہوتا ہے دوسرا نہیں ہوتا۔

پھر اگر مذکورہ قول کی بناء پر ہم عصر کی جرح کو مطلق رد کر دیا جاتا ہے تو اس کا واضح مطلب یہ ہوتا ہے کہ جرح و تعدیل کی بنیاد ہی متزلزل ہے۔ اس لئے اس قول کو اطلاق پر محمول کرنا ناممکن ہے۔[۳] (واللہ اعلم)

علامہ ابوالحسنات فرماتے ہیں کہ ہم عصر راویوں پر ایک دوسرے کے کلام کو

---

(۱) ضوابط فی الجرح والتعدیل ص ۵۲ (۲) جزء القراءة ص ۲۹
(۳) توضیح الافکار ۱۴۶/۲، دراسات فی الجرح والتعدیل ص ۶۱

غیر مقبول ہونے کی بات علی الاطلاق نہیں ہے بلکہ یہ اس صورت میں ہے جب کہ بغیر کسی دلیل کے ہو یا کسی نفرت و تعصب پر مبنی ہو۔[1]

(۷) فرط غضب و اندھی محبت میں صادر ہونے والا جرح وتعدیل:-

ہر وہ جرح و تعدیل جو فرطِ غضب یا اندھی محبت کے جذبے میں صادر ہو، یا ردعمل کے طور پر ہو، یا نفرت و عداوت پر مبنی ہو، تو غیر مقبول ہے۔

اس لئے کہ جب کوئی شخص کسی پر غضب ناک رہتا ہے تو اس کی ہر حرکت اسے بری لگتی ہے اور جب کسی سے خوش رہتا ہے تو اس کی ہر ادا اسے بھلی نظر آتی ہے، خواہ حقیقت میں وہ بری ہی کیوں نہ ہو، لہٰذا اگر کسی راوی کے بارے میں اس طرح کی جرح یا تعدیل صادر ہو گئی ہو تو وہ غیر مقبول ہے۔

علامہ عبد الرحمٰن معلمی یمانی فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ کے فرمان "**لا يقضين حكم بين اثنين وهو غضبان**"[2] یعنی حالتِ غضب میں کوئی قاضی دو آدمیوں کے درمیان فیصلہ نہ کرے، سے اندازہ ہوتا ہے کہ علماء و راویوں پر حکم لگانے کیلئے اس سے کہیں زیادہ تاکید، بحث و نظر کی ضرورت ہوتی ہے جتنا کہ خصومات میں ہوتی ہے۔[3]

نیز فرمایا کہ حالتِ غضب میں جب آدمی کسی کو کچھ کہتا ہے تو اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں:

ایک یہ کہ وہ بطور ذم کہتا ہے، حکم لگانا مقصود نہیں ہوتا۔

دوسری یہ کہ اس پر بطور حکم کچھ کہتا ہے، دوسری صورت میں غلطی کا بہت اندیشہ ہوتا ہے جس کو ائمہ فن جانتے، سمجھتے ہیں۔[4]

یہی وجہ ہے کہ جب محمد بن اسحٰق نے امام مالکؒ کے بارے میں کہا کہ:

"**أعرضوا على علم مالك فاني أنا بيطاره**" تو امام مالکؒ نے غصہ میں کہا: "**دجال من الدجاجلة**"[5]

---

(۱) الرفع والتكميل ص ۴۳۱ (۲) صحيح بخاری كتاب الاحكام ۱۳۶/۱۳ نمبر (۷۱۵۸)

(۳) التنكيل بمافی تأنيب الكوثری من الاباطيل ۵۳/۱

(٤) التنكيل بما فی تأنيب الكوثری من الأباطيل ۵۲/۱، ۵٤

(۵) ميزان الاعتدال ۳۷۹/۱

یہاں ان پر کوئی حکم لگانا مقصود نہیں تھا بلکہ ان کا ذم بیان کرنا مقصود تھا یہی معاملہ امام نسائی اور احمد بن صالح مصری کا بھی ہے لہٰذا اس حالت میں صادر ہونے والے اقوال سے ان راویوں پر کوئی حکم نہیں لگایا جائے گا۔

یہی معاملہ فرطِ محبت سے تعدیل کرنے کا بھی ہے اس لئے اس سے بھی کوئی حکم ماخوذ نہیں ہوگا۔

علامہ یمانی فرماتے ہیں کہ: جس چیز کا خوف غصہ کی حالت میں جرح کا ہوتا ہے، وہی خوف محبت کی بناء پر تعدیل کرنے کا بھی ہوتا ہے۔

نیز کبھی کوئی شخص روایت میں ضعیف ہوتا ہے، لیکن دین داری کے اعتبار سے صالح ہوتا ہے، مثلاً ابان بن اُبی عیاش۔ یا سنت کے سلسلے میں باغیرت ہوتا ہے مثلاً مؤمل بن اسماعیل، یافقیہہ ہوتا ہے جیسے محمد بن ابی لیلیٰ، جب ایسے لوگوں کی اہل علم تعریف کرتے ہیں تو روایت میں ثقاہت کا حکم لگانا مقصد نہیں ہوتا۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک آدمی کسی کے اوپر جرح میں مبالغہ آرائی سے کام لیتا ہے تو دوسرا ردِ عمل کے طور پر اس کی مدح سرائی کرتا ہے جیسا کہ حماد بن سلمہ نے جب شعبہ کا کلام اُبان کے بارے میں سنا تو انہوں نے کہا کہ "أبان خير من شعبة"

ایسے ہی کبھی کوئی شخص جب اپنے کسی شیخ یا امام یا متعلق کے بارے میں کسی سے تنقیص کرتے ہوئے سنتا ہے تو فرطِ محبت میں اس کی بڑی مدح سرائی کرتا ہے خصوصاً جب ساتھ ساتھ غصہ بھی آجائے۔ (۱)

اسی بناء پر بعض احناف نے امام ابو حنیفہؒ سے اظہارِ محبت اور ان سے دفاع کرتے ہوئے ائمہ حدیث پر تعصب و تنگ نظری کا جو حکم لگایا ہے وہ غیر مقبول ہے اور ان کی جو مدح سرائی کی ہے وہ مردود ہے، مثلاً ابن خسرو نے خلف بن ایوب سے یہ جملہ نقل کیا ہے کہ: "صار العلم من الله تعالىٰ إلى محمد صلى الله عليه وسلم، ثم إلىٰ أصحابه ثم إلىٰ التابعين، ثم صار إلىٰ أبي حنيفة و أصحابه" (۲)

---

(۱) التنكيل بما في تأنيب الكوثري من الأباطيل ۱/ ۵۶، ۵۷

(۲) قواعد في علوم الحديث ص ۳۱۰

یعنی علم کی دولت اللہ تعالیٰ سے حضرت محمد ﷺ کو ملی، پھر آپ ﷺ کے اصحاب تک پہنچی، پھر صحابہ کرام سے تابعین کو ملی پھر تابعین سے امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کو مل گئی۔ گویا کہ بقیہ لوگ محروم رہ گئے!

نیز جن فرقوں نے اپنے اپنے ائمہ کے بارے میں غلو سے کام لیا ہے اور ان کے درجوں کو اس طرح بڑھادیا کہ انبیاء ورسل بھی ان کے سامنے مات کھاگئے، ان کا قول بھی مردود ہے۔

اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھایا　　　نبی کو جو چاہا خدا کر دکھایا

۸-مذاق کے طور پر صادر جرح وتعدیل:-

اسی طرح سے ہر وہ جرح وتعدیل جو بطور مذاق صادر ہوئی ہو اس کا بھی اعتبار نہیں ہوگا جیسا کہ عفان بن مسلم، علی بن مدینی، اور ابو بکر بن ابی شیبہ بیٹھے بات کر رہے تھے، اتنے میں عفان بن مسلم نے کہا کہ: "ثلاثة يضعفون في ثلاثة: علي بن المديني في حماد بن زيد، و أحمد في إبراهيم بن سعد، و ابن أبي شيبة في شريك" تین افراد تین آدمیوں میں ضعیف ہیں، علی بن مدینی حماد بن زید میں، احمد ابراہیم بن سعد میں، ابن ابی شیبہ شریک میں، تو علی بن مدینی نے کہا کہ: "وعفان في شعبة"[1] اور عفان شعبہ میں۔

امام ذہبی فرماتے ہیں کہ: ان لوگوں نے ایک دوسرے کو بطور مذاق اس طرح کہا تھا اس لئے کہ یہ لوگ ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے مذکورین سے کم سنی میں روایت کیا ہے۔[2]

۹- نسبتی جرح و تعدیل کا حکم :-

کبھی ائمہ جرح وتعدیل ایک راوی کو ثقہ اور دوسرے کو ضعیف کہتے ہیں جس سے ان کا مقصد قطعی حکم لگانا نہیں ہوتا ہے بلکہ دوسرے کے مقابلہ میں حکم لگانا مقصد ہوتا ہے۔ مثلاً امام دارمی نے جب یحییٰ بن معین سے علاء بن عبدالرحمٰن اور سعید

---

(۱) مقدمة الكامل ۱۳۳/۱، تذكرة الحفاظ ۳۸۰/۱، دوسری مثال سیر اعلام ۸۲/۱۱ میں دیکھیں۔
(۲) میزان الاعتدال ۸۲/۳

مقبری کے بارے میں سوال کیا کہ دونوں میں کون بہتر ہے تو انھوں نے کہا کہ سعید اوثق ہیں اور علاء ضعیف۔(۱) یعنی سعید کے بہ نسبت علاء کمزور ہیں۔

۱۰- مخصوص حالات کا اعتبار:-

بعض راویوں کے ساتھ کچھ مخصوص حالتیں ہوتی ہیں، جن کا جاننا بھی جارح و معدل کیلئے ضروری ہوتا ہے تاکہ اس راوی کو مطلق ثقہ، یا مطلق ضعیف نہ سمجھا جائے۔ اس کی کئی صورتیں ہیں:

(الف) مثلاً ایک شخص ایک شہر یا ایک اقلیم میں ثقہ ہوتا ہے دوسرے میں ضعیف ہوتا ہے، جیسے اسماعیل بن عیاش شامی حمصی، جب یہ شامیوں سے روایت کرتے ہیں تو ثقہ ہوتے ہیں، اور جب غیر شامیوں، حجازیوں، عراقیوں وغیرہ سے روایت کرتے ہیں، تو ضعیف ہوتے ہیں۔ اسی طرح ولید بن مسلم دمشقی جب غیر اہل دمشق سے روایت کرتے ہیں تو ان کی روایت میں نقص رہتا ہے۔

ایسے ہی ہشام بن عروہ جب اہل عراق سے روایت کرتے ہیں تو مضطرب ہوتے ہیں، ایسے ہی یزید بن ہارون کی روایت واسط والوں سے بغداد والوں کے مقابلہ زیادہ صحیح ہوتی ہے۔

اسی طرح سے معمر بن راشد ازدی، جب بصرہ اور عراق میں روایت کرتے ہیں تو ان کی حدیثیں مضطرب ہوتی ہیں، اور جب یمن میں روایت کرتے ہیں تو ان کی روایتیں صحیح ہوتی ہیں۔(۲)

اسلئے مختلف وجوہات ہوتے ہیں کبھی راوی کیساتھ کتاب ہوتی ہے تو صحیح روایت کرتا ہے ورنہ مضطرب ہو جاتا ہے، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بعض شہروں میں روایت کو اچھی طرح ضبط نہ کر سکا۔ مثلاً عبدالرزاق صنعانی جب سفیان بن عیینہ سے مکہ میں سنا تو ضبط نہ کر سکے اور جب یمن میں سنا تو ضبط کر لیا، یا کسی شہر کے لوگوں نے اس کی روایت کو اچھی طرح سے نہ سنا، دوسرے شہر کے لوگوں نے اچھی طرح سے سنا۔(۳)

---

(۱) تاریخ عثمان بن سعید ص ۱۷۳-۱۷٤ و فتح المغیث ۲/۲۳

(۲) تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو شرح علل الترمذی ص ٤۲۳، ٤۲۵، ٤۲٦

(۳) شرح علل الترمذی ٤۲۵، ٤۳۰

(ب) اسی طرح سے ایک راوی کسی شخص سے روایت کرتا ہے تو ثقہ ہوتا ہے لیکن جب وہی اگر کسی دوسرے شیخ سے روایت کرتا ہے تو ضعیف ہوتا ہے جیسے جریر بن حازم بصری، یہ ثقہ راوی ہیں لیکن جب قتادہ سے روایت کرتے ہیں تو ضعیف ہوتے ہیں۔ ایسے ہی سلیمان تیمی ثقہ ہیں لیکن جب قتادہ سے روایت کرتے ہیں تو ضعیف ہوتے ہیں۔ ایسے ہی جعفر بن برقان ثقہ ہیں، لیکن زہری سے روایت کرتے ہیں تو ضعیف ہوتے ہیں۔ (۱)

(ج) کچھ راوی ایسے ہیں جن کی روایتیں بعض حالات میں صحیح اور بعض حالات میں ضعیف ہوتی ہیں۔ مثلاً وہ راوی جو آخری عمر میں مختلط ہو گئے تھے، یا کسی عارضہ کی بناء پر سوءِ حفظ کے شکار ہو گئے تھے، جیسے سعید بن ایاس جریری وغیرہ جو فی نفسہ ثقہ تھے لیکن اختلاط کی بناء پر ضعیف ہو گئے۔ اسی طرح سے ابن لہیعۃ کو اکثر لوگ ثقہ مانتے تھے لیکن جب ان کا کتب خانہ جل گیا تو ان کا حافظہ خراب ہو گیا اور وہ ضعفاء میں شمار کئے گئے۔ (۲)

(د) کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ راوی جب کتاب سے روایت کرتا ہے تو ثقہ ہوتا ہے اور جب حفظ سے روایت کرتا ہے تو ضعیف ہوتا ہے، مثلاً یونس بن یزید ایلی۔ ایسے ہی معمر بن راشد یمن میں اپنی کتاب سے روایت کرتے تھے تو ثقہ رہتے تھے لیکن جب حفظ سے روایت کیا تو ضعیف ہو گئے، امام احمد اور ابن ابی شیبہ فرماتے ہیں کہ یمن میں کتابیں ساتھ میں تھیں، بصرہ میں نہیں تھیں۔ (۳)

لہٰذا ان ساری چیزوں کا اعتبار جارح و معدل کیلئے ضروری ہے تاکہ غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو۔

۱۱- کمزور اسباب جرح کا حکم :-

جرح میں ایسے اسباب کا سہارا لینا جو مجروح کرنے کیلئے کافی نہ ہوں تو ان سے جرح ثابت نہیں ہوتی۔

---

(۱) تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو شرح علل الترمذی ص ۴۳۳، ۴۳۸، الثقات الذین ضعفوا فی بعض شیوخهم للدکتور صالح حامد الرفاعی.

(۲) الکواکب النیرات لمن رمی بالاختلاط اس موضوع پر سب سے جامع کتاب ہے۔

(۳) شرح علل الترمذی ۴۲۳

مثلاً بعض راویوں پر اسلئے جرح کیا گیا ہے کہ وہ بادشاہوں اور امراء کی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ علی بن عامر پر اسلئے جرح کیا گیا کہ وہ چھوٹے بڑے ہر ایک سے روایت کرتے تھے، حالانکہ اپنے سے چھوٹے آدمی سے روایت کرنا کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔ حکم بن عتیبہ سے پوچھا گیا کہ زاذان سے کیوں روایت نہیں کیا تو انہوں نے کہا کہ "کان کثیر الکلام" یعنی بہت زیادہ بولتے تھے۔

اسی طرح سے صالح المری کا ذکر حماد بن سلمہ کے سامنے اور حجاج الشاعر کا ذکر ابن معین کے سامنے آیا تو تھوکنے لگے (یعنی اظہارِ ناپسندیدگی کیا) امام شعبہ نے ابو غالب سے روایت نہیں کیا اسلئے کہ انہوں نے ایک مرتبہ ان کو دیکھا کہ وہ دھوپ میں حدیث بیان کرتے تھے۔ (۱)

اس طرح کی دیگر بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ جب محدث سے کسی کے جرح کے بارے میں سوال کیا گیا تو اس طرح کی پھسپھسی دلیل انہوں نے ذکر کیا ہے۔ ظاہر ہے اس طرح کے اسباب راوی کو مجروح کرنے کیلئے کافی نہیں ہیں۔

۱۲- رجالِ صحیحین ثقہ اور عادل ہیں:-

کتب حدیث میں صحیحین کا درجہ سب سے بڑا ہے، ائمہ کا ان کی صحت پر اجماع ہے، حتی کہ ان کو "أصح الکتب بعد کتاب اللہ" کہا گیا ہے، لہذا جن راویوں سے ان میں بطور استدلال روایت کی گئی ہے وہ سب ثقہ ہیں، اگر کسی پر کسی نے کچھ کلام کیا ہے تو وہ غیر موثر ہے۔

خطیب بغدادی فرماتے ہیں کہ: "ما احتج البخاری و مسلم فیه من جماعة علم الطعن فیهم من غیر هم محمول علی أنه لم یثبت الطعن المفسر السبب" (۲) یعنی امام بخاری و مسلم نے جن لوگوں سے اپنی کتابوں میں بطور استدلال روایتیں کی ہیں اگر ان میں سے کسی پر دوسروں نے جرح کیا ہے تو وہ جرح مبہم اور غیر موثر ہے۔

حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ: میزان الاعتدال میں میں نے بہت سے ایسے

---

(۱) الکفایة فی علم الروایة ص ۱۱۰-۱۱۳ (۲) قواعد التحدیث ص ۱۹۰

راویوں کا ذکر کیا ہے جو صحیحین کے راوی ہیں، یا دونوں میں سے کسی ایک کے راوی ہیں، لیکن ان کے ذکر کرنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ حقیقت میں مجروح ہیں، بلکہ صرف اس لئے ذکر کر دیا ہے کیونکہ بعض اصحاب کتب ضعفاء نے ان کو اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے۔[۱]

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ: "صاحب صحیحین کا اپنی کتاب میں کسی راوی سے بطور استدلال حدیث روایت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان کے یہاں عادل اور ثقہ ہیں، نیز جمہور ائمہ نے ان کتابوں کو صحیح کے نام سے موسوم کیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے راوی جمہور کے یہاں ثقہ ہیں۔[۲]

علامہ ابوالحسن مقدسی ان رجال کو جن سے صاحبِ صحیحین نے استدلال کیا ہے ان کے بارے میں کہتے ہیں کہ: "هذا جاز القنطرة" ان کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر کسی نے ان پر جرح کیا ہے تو وہ غیر مقبول ہے۔[۳]

(۱۳) فقہاء عموماً روایت میں ضعیف ہوتے ہیں:۔

جن راویوں میں فقاہت ضرورت سے زیادہ غالب ہو جاتی ہے اور وہ اپنی فقاہت میں غلو کی حد تک پہنچتے ہیں وہ عموماً حدیث میں ضعیف ہوتے ہیں اس لئے کہ ان کی توجہ معنی کی طرف زیادہ ہوتی ہے سند کی طرف نہیں ہوتی، اس لئے سند حدیث کو صحیح طرح سے ضبط نہیں کرتے اور متن حدیث کو بالمعنی روایت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس میں غلطی کر جاتے ہیں جیسے کہ شریک نے رافع بن خدیج کی مزارعت والی روایت کے ساتھ کیا ہے۔

اسی طرح سے حضرت انس کی حدیث "أنه كان يتوضا بالمد" کو انہوں نے "يتوضأ بالرطلين" روایت کی ہے، اس لئے کہ مد کوفہ والوں کے یہاں دو رطل کا ہوتا ہے، لیکن دوسروں کے یہاں مختلف ہے۔[۴]

ابن ابی حاتم نے حماد بن ابی سلیمان پر جرح کرتے ہوئے کہا کہ: "كان

---

(۱) قواعد التحديث ص ۱۹۰ (۲) هدى السارى ص ۳۸٤

(۳) هدى السارى ص ۳۸٤ (٤) شرح علل لابن رجب ص ٤٨٠، ٤٨١

الغاب عليه الفقه ولم يرزق حفظ الآثار" یعنی ان پر فقاہت غالب تھی، احادیث کے حفظ کی توفیق نہیں دی گئی تھی۔

حافظ ابن حبان کہتے ہیں: "الفقيه إذا حدث من حفظه وهو ثقة فی رواية لا يجوز عندی الاحتجاج به لأنه إذا حدث من حفظه فالغالب عليه حفظ المتون دون الأسانيد ...... الخ"(۱) یعنی فقیہ راوی اگر اپنی حفظ سے روایت کرتا ہے، اور وہ فی نفسہ ثقہ بھی ہو تب بھی میرے نزدیک قابل احتجاج نہیں الا یہ کہ وہ کتاب سے روایت کرے، یا ثقات کی موافقت کرے۔

علامہ ابن رجب فرماتے ہیں کہ: یہ اس صورت میں ہے جب فقیہ متن کا حافظ ہو، لیکن جو فقیہ متن حدیث کو بھی یاد نہیں رکھتا بلکہ روایت بالمعنی کرتا ہے تو اس کی روایتوں سے استدلال کرنا مناسب نہیں الا یہ کہ وہ کتاب سے روایت کرے یا ثقات کی موافقت کرے۔(۲)

١٤ - صالحین عموماً مغفل ہوتے ہیں:-

یہی حال بہت سے صالحین اور زاہدوں کا بھی ہوتا ہے جو عالم نہیں ہوتے، ان کی حدیثوں پر وہم وخطا غالب ہوتا ہے اور عموماً وہ مغفل ہوتے ہیں۔

حافظ ابو عبداللہ بن مندہ فرماتے ہیں کہ: "إذا رأيت في حديث حدثنا فلان الزاهد فاغسل يدك منه" (۳) جب تم کسی حدیث میں یہ دیکھو کہ فلاں زاہد نے ہم سے روایت کیا ہے تو اس سے دست بردار ہو جاؤ۔

یحییٰ بن سعید فرماتے ہیں کہ: "ما رأيت من الصالحين أكذب منهم فی الحديث" (۴) یعنی حدیثِ رسول میں بزرگوں سے زیادہ جھوٹا میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔

امام مسلم فرماتے ہیں کہ ان کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ نادانستہ طور پر جھوٹ ان کی زبان پر آجاتا ہے وہ جان بوجھ کر جھوٹ نہیں بولتے۔(۵)

امام ابو حاتم بن حبان ضعفاء کے اقسام بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

---

(۱) شرح علل الترمذی ص ٤٨٢، ٤٨٣ (۲) شرح علل الترمذی ص ٤٨٣

(۳) شرح علل الترمذی ص ٤٨٠، نیز ملاحظہ ہو تفصیل کیلئے شرح علل الترمذی ص ١١٣

(٤) مقدمه صحيح مسلم ٩٤/١ (۵) مقدمة صحيح مسلم ٩٥/١

پانچویں قسم ان لوگوں کی ہے جن پر بزرگی اور عبادت غالب ہوتی ہے، تمیز کرنے سے غافل ہوتے ہیں، یہ مرسل کو مرفوع، موقوف کو مسند، حسن کے کلام کو عن انس عن النبی ﷺ کر دیں گے۔ لہٰذا یہ لوگ قابل احتجاج نہیں۔ مثلاً ابان بن ابی عیاش اور یزید رقاشی اور ان کے طرح کے لوگ (۱)

ابن عدی فرماتے ہیں کہ: صالحین نے اپنی عادت بنالی ہے کہ فضائل اعمال میں ضعیف و موضوع روایت ہی بیان کریں گے۔ (۲)

کچھ قابلِ غور اصول

کچھ قاعدے ایسے ہیں جن کا ذکر اہل علم کی کتابوں میں ملتا ہے لیکن ان پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ بظاہر ان سے نقصان زیادہ ہے اور فائدہ کم مثلاً:

۱-اختلاف مشرب:-

ایک قاعدہ یہ ہے کہ اگر جارح اور مجروح میں مشرب اور عقائد کا اختلاف ہو تو ایک دوسرے کے خلاف جرح قابلِ قبول نہیں ہے۔ (۳)

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ: ہر ہوش مند شخص جو حافظ ابو اسحٰق جوزجانی کی توہین کو جو انہوں نے کوفہ والوں کے سلسلہ میں کیا ہے سنے گا تو عجیب و غریب باتیں پائے گا اس لئے کہ یہ متشدد ناصبی تھے۔ اور وہ لوگ شیعہ ہیں۔ لہٰذا بڑی سخت زبان میں ان پر جرح کرتے ہیں۔

ایسے ہی حافظ عبد الرحمٰن بن یوسف بن خراش جو غالی شیعہ ہیں اہل شام کے سلسلہ میں ان کی عداوت اعتقاد کی وجہ سے واضح ہے۔ (۴)

ظاہر ہے کہ اس امت میں قولِ رسول ﷺ کے مطابق ستر سے زائد فرقے ہوں گے اور واقعہ بھی یہی ہے، اور ہر فرقہ ایک دوسرے سے بعض اصول و فروع میں مخالف بھی ہے، لہٰذا اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کسی کی جرح کسی کے بارے میں قابلِ قبول نہیں، حالانکہ کتب جرح و تعدیل میں ان قسم کے عقیدوں کی وضاحت کی گئی ہے اور بطور جرح بھی ان کا استعمال ہوا ہے۔ مثلاً: رمی بالنصب، فیه ارجاء، فیه

---

(۱) المجروحین ۶۷/۱ (۲) شرح علل الترمذی ص ۱۱۵

(۳) قاعدة فی الجرح والتعدیل للسبکی ص ۲۹ (۴) لسان المیزان ۱۶/۱

تشیع، شیعی، شیعی جلد، وغیرہ۔اور ان کا اعتبار بھی کیا گیا ہے۔

اسی طرح سے بدعتی کی روایت کے قبول اور عدم قبول کے سلسلے میں بھی اصول وضع کئے گئے ہیں، اگر عقائد میں اختلاف کی وجہ سے ایک دوسرے پر جرح غیر مقبول ہے تو اس ضابطہ کو متقدمین علماء کے بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

خصوصاً بعض فرقے ایسے بھی ہیں جن کے یہاں اپنے مذہب کی تائید کے لئے دروغ گوئی و کذب بیانی بھی جائز ہے، اسی وجہ امام شافعی نے خطابیہ کی شہادت کو ناقابل قبول قرار دیا ہے۔(۱)

تو کیا امام شافعی کا یہ قول ان کے بارے میں مطلقاً غیر مقبول ہے؟

علامہ ابن سیرین فرماتے ہیں کہ: "فلما وقعت الفتنة قالوا سموا لنا رجالكم فينظر إلى أهل السنة فيؤخذ حديثهم، و ينظر إلى أهل البدع فلا يؤخذ حديثهم"(۲)

یعنی جب فتنہ (شہادت عثمانؓ) واقع ہو گیا تو محدثین نے کہا کہ جس سے حدیث بیان کر رہے ہو اس کا نام ذکر کرو، اگر وہ شخص اہل سنت میں سے ہوتا تو اس کی روایت قابلِ قبول ہوتی، اور اگر بدعتی ہوتا تھا تو غیر مقبول ہوتی تھی۔

اب سوال یہ ہوتا ہے کہ آخر اہل بدعت کی حدیثوں کو کیوں نہیں قبول کیا جاتا تھا؟ کیا ان کی حدیثوں کو قبول نہ کرنا ان پر جرح کرنے کے مترادف نہیں؟

بدعتی کی روایت کے سلسلہ میں اہل علم کا جو صحیح فیصلہ ہے وہ یہ ہے کہ اگر بدعت مکفرہ نہیں ہے بلکہ بدعت مفسقہ ہے تو اس کی روایت کچھ شرطوں کے ساتھ مقبول ہے، اگر اس کی روایت مقبول ہے تو جرح و تعدیل بھی کچھ شرطوں کے ساتھ مقبول ہونا چاہئے، مثلاً یہ شرط کہ اس نے جو کچھ کہا ہے اس کی بنیاد عداوت پر نہ ہو اور دیگر اصول جرح و تعدیل کے خلاف نہ ہو، لہٰذا عدم قبول کی اصل وجہ عداوت ہونی چاہئے نہ کہ بدعت۔

مثلاً یوں فرض کریں کہ ایک شخص بدعتی ہے اس نے کسی راوی پر جرح کیا،

---

(۱) اختصار علوم الحدیث ص ۹۹ (۲) مقدمة صحیح مسلم

جس پر اہل علم کا سکوت ہے، تو کیا اس کی جرح مقبول نہیں ہوگی اگر چہ جرح مفسر ہی کیوں نہ ہو؟ اور اگر اہل علم نے اس شخص کو ثقہ کہا ہے ایسی صورت میں تعارض جرح و تعدیل ہوگا۔ اس کا جو قاعدہ ہے اس اعتبار سے یہ جرح مردود ہوگی نہ کہ کہنے والے کی بدعت کی بنیاد پر۔

حافظ جوزجانی وغیرہ نے جو کچھ کہا اور کیا ہے بظاہر وہ عداوت ہی کی بنیاد پر ہے، وہ تو کوفی کا نام سن کر آگ بگولا ہو جاتے تھے۔ اور ایسا کوئی جرح قابل قبول نہیں جس کی بنیاد عداوت پر ہو۔

لیکن اگر ناقد کی بدعت بدعت مکفرہ ہے ایسی صورت میں اس کی روایت قابل قبول نہیں۔ لہٰذا اس کی جرح و تعدیل بھی قابل قبول نہیں ہونا چاہئے۔

۲- جارح کا مجروح ہونا:-

اسی طرح سے یہ کہا جاتا ہے کہ جارح اگر خود مجروح ہو تو اس کی جرح و تعدیل کو قبول نہیں کیا جائے گا یہاں تک کہ کوئی موافقت کرے۔

علامہ ابن حبان یحییٰ البکاء کے بارے میں کہتے ہیں، جنہوں نے حضرت ابن عمر کی جرح عکرمہ مولیٰ ابن عباس کے بارے میں نقل کیا ہے جو خود متروک ہیں:

"ومن المحال أن يجرح العدل بكلام المجروح"[1]

حالانکہ یہ جرح یحییٰ کا نہیں بلکہ وہ اس کا ناقل ہے، اور یحییٰ کے متروک ہونے کی وجہ سے اس کی نسبت ابن عمر کی طرف صحیح نہیں، لہٰذا یہ مطلوبہ قاعدہ کی مثال نہیں بن سکتی۔

اسی طرح حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری کے مقدمہ "ہدی الساری" کی نویں فصل میں صحیحین کے رجال کے بارے میں کئے گئے جرح کا جواب دیتے ہوئے بارہا کہا ہے کہ جرح کرنے والا خود مجروح ہے، اس لئے اس کی جرح قابل قبول نہیں مثلاً انہوں نے کہا کہ: "ولا عبرة بقول الأزدي لأنه هو ضعيف فكيف يعتمد في تضعيف الثقات."[2]

---

(۱) هدى السارى ص ٤٢٧

(۲) هدى السارى ص ٣٧٦

اسی طرح سے ابن خراش وغیرہ کے بارے میں بھی کہاہے، جس سے یہ اندازہ ہوتاہے کہ مجروح کی جرح قابل قبول نہیں۔

اس قاعدہ پر بھی نظر ثانی کی ضرورت ہے، اس لئے کہ بے شمار مواقع پر خود حافظ ابن حجر نیز امام ذہبی، ور دیگر مصنفین جنہوں نے صحابہ ، یا رجال پر تصنیفات کی ہیں، حافظ ازدی کے قول سے استدلال کیاہے، مثلاً ابراہیم بن مہدی بن عبدالرحمٰن ابلی اور ابراہیم بن اسماعیل بن عبدالملک وغیرہ کے بارے میں اور ان کی کتاب کی تعریف کی ہے، خود امام ذہبی ان کی کتاب "الضعفاء" کے بارے میں فرماتے ہیں کہ: "وله مصنف مفيد في الضعفاء"[1] ضعفاء رجال پر ان کی کتاب بہت مفید ہے اگر ان کی باتیں نا قابل قبول ہیں تو یہ کتاب کیونکر مفید ہوگی؟

اس قاعدہ کے تحت حافظ ازدی کو کیسے مجرم قرار دیا جاسکتاہے جبکہ وہ اس فن کے امام ہیں اور ان کی تالیفات پر اعتماد ہے، اور ائمہ فن میں جن کی بات بحثیت جرح و تعدیل قابل ہوتی ہے ان کیا ذکر کیا جاتاہے، چنانچہ امام ذہبی نے خود ان کو "من يعتمد قوله في الجرح والتعديل" میں ذکر کیاہے۔[2]

بلکہ امام سخاوی ابن ابی شیبہ کو ائمہ جرح و تعدیل میں ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ: "وهو ضعيف ولكنه من أئمة هذا الشان"[3] کہ وہ ضعیف ہیں لیکن جرح و تعدیل کے ائمہ میں ہیں۔ اس سے معلوم ہوتاہے کہ ضعیف ہونے کے باوجود بھی ان کے اقوال مقبول ہیں۔

یہ بھی قابل غور بات ہے کہ کیا قبول روایت کی جتنی شرطیں ہیں وہ نقل اقوال و اخبار و تواریخ کیلئے بھی ہیں؟ اگر کوئی شخص کسی وجہ سے حدیث رسول میں ضعیف ہے تو کیا اب اس کی کوئی بات قابل قبول نہیں؟

قابل غور امر یہ بھی ہے کہ حافظ ابن حبان و ابن حجر وغیرہ نے صحیحین کے رجال کا جواب دیتے ہوئے اس طرح کی باتیں کہی ہیں نہ کہ عام حالات میں، یہاں

---

(۱) میزان الاعتدال ۱/ ۵ (۲) من يعتمد قوله في الجرح والتعديل ص ۱۹۵
(۳) الاعلان بالتوبيخ ص ۱۶۵

حقیقت میں صاحب صحیحین کی توثیق جنہوں نے کسی ایسے راوی سے تخریج کی ہے جس پر کسی نے کلام کیا ہے جارح کی تجریح سے متعارض ہے، ایسی صورت میں یہ ایک نسبتی امر ہے کہ قوی کے مقابلہ میں اقوی کا قول راجح ہوتا ہے۔

ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جہاں جہاں حافظ ابن حجر وغیرہ نے نقد کیا ہے وہ صرف جرح کے مقامات ہیں تعدیل کے نہیں۔ اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ کسی جارح کی جرح صحیحین کے رجال کے بارے میں قابل قبول نہیں، تو زیادہ مناسب ہوگا۔ نہ کہ جارح کے ضعیف ہونے سے اس کی کوئی بات قابل قبول نہ ہوگی۔

۳- جارح کا متشدد ہونا:

تیسرا قاعدہ یہ ہے کہ ناقدین تین طرح کے ہیں- متشدد، معتدل اور متساہل- ان میں سے متشددین کی جرح غیر مقبول ہے البتہ انکی تعدیل قابلِ قبول ہے۔

یہ تو ایک بدیہی امر ہے کہ سارے انسان برابر نہیں ہوتے، حتیٰ کہ انبیاء اور رُسل میں بھی یہ چیز نمایاں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ﴾ [البقرہ ۲۵۳]

اسی طرح سے بعض صحابہ کرام کو بھی ایک دوسرے پر فضیلت دی گئی ہے۔ چونکہ انسانی ذہن و دماغ برابر نہیں ہوتے اس لئے لوگوں کی صلاحیتیں مختلف اور سوچنے کے انداز مختلف ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ بہت سے صحابہ کرام محض اس وجہ سے حدیث روایت نہیں کرتے تھے، اس لئے کہ ان کا خیال تھا کہ اگر بکثرت حدیث رسول بیان کریں گے تو "من کذب علی" کے ضمن میں آجائیں گے۔

حضرت عبداللہ بن زبیر نے اپنے والد زبیر سے سوال کیا کہ آپ فلاں و فلاں کی طرح کیوں حدیث نہیں سناتے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ: "أما أنی لم أفارقه و لکنی سمعته یقول: من کذب علی متعمدا فلیتبوأ مقعده من النار" (۱)

انہیں کے مقابلے میں دوسرے صحابہ تھے جو احتیاط ملحوظ رکھتے ہوئے حدیث سناتے تھے، دونوں کا مقصد دین کی حفاظت، اور اس میں احتیاط کرنا تھا۔

---

(۱) بخاری کتاب العلم ۱/ ۲۰۰ نمبر (۱۰۷)

اسی طرح سے محدثین کرام نے بھی ماحول و ضرورت کے پیش نظر جرح و تعدیل کے مختلف اصولوں کو اپنایا ہے، جنہوں نے زیادہ اہتمام کیا انہوں نے زیادہ محتاط رویہ اختیار کیا، لیکن مقصد ایک ہی تھا احادیث رسول کی حفاظت کرنا، تو کیا ایسے علما کی جرحیں جنہوں نے حفاظت حدیث کی خاطر زیادہ محتاط رویہ اختیار کیا مطلقاً غیر مقبول ہیں؟

افسوس تو یہ ہے کہ ان محدثین میں سرِ فہرست ان لوگوں کا نام ذکر کیا جاتا ہے جو اس علم کے معمارِ اوّل ہیں۔ مثلاً امام شعبہ، یحیٰ بن سعید قطان، یحیٰ بن معین، ابو حاتم رازی، امام نسائی اور ابن حبان وغیرہ۔

یاد رکھنا چاہئے کہ یہ وہی یحیٰ قطان ہیں جن کے بارے میں امام علی بن مدینی نے شہادت دی ہے کہ: "ما رأيت أحدا أعلم بالرجال منه"[1]

اور یہی وہ یحیٰ بن معین ہیں جنکے بارے میں امام احمد بن حنبلؒ نے فرمایا ہے کہ: "يحيى بن معين أعلم بالرجال"[2]

اور جہاں دوسری صدی ہجری کے ائمۂ جرح و تعدیل کا ذکر آتا ہے وہاں یحیٰ بن سعید قطان (متوفی ۱۹۸ھ) اور عبدالرحمٰن بن مہدی (متوفی ۱۹۸ھ) کے بارے میں یہ ذکر ملتا ہے کہ: "وقد انتدب في ذلك الزمان لنقد الرجال الحافظان الحجتان يحيىٰ بن سعيد القطان، و عبدالرحمن بن مهدى، وكان للناس وثوق بهما فصار من وثقاه مقبولا، ومن جرحاه مجروحا"[3]

یعنی اس زمانے میں ان دونوں ناقدین پر لوگوں کو اس قدر اعتماد تھا کہ جس کو یہ ثقہ کہتے تھے وہ ثقہ، اور جس کو ضعیف کہتے تھے وہ ضعیف تصور کیا جاتا تھا۔

شیخ ابو غدہ نے "قواعد التحدیث" کے حاشیہ (ص ۳۱۷) میں یحیٰ بن معین کے بارے میں ابن حجر کا یہ قول نقل کیا ہے: "هو إمام الجرح والتعديل"

اب ایسے اشخاص جن کو فن جرح و تعدیل میں امامت کا درجہ حاصل ہے، ان لوگوں کے جرح کو محض یہ کہہ کر رد کر دیا جائے کہ یہ متشدد ہیں، قرین قیاس بات نظر نہیں

---

(۱) تذكرة الحفاظ ۱/ ۲۹۸ (۲) تذكرة الحفاظ ۲/ ٤٣٠

(۳) مفتاح السنة للخولى ١٤٧، ١٤٨

آتی، خاص طور سے جبکہ متشدد اور معتدل بنانے کیلئے کوئی باضابطہ اصول بھی نہیں۔

چنانچہ خود امام ابو حنیفہؒ کے قلیل الحدیث ہونے کے بارے میں جہاں بہت سارے جوابات دیئے جاتے ہیں وہیں یہ جواب بھی دیا گیا ہے کہ: "تشديد الامام في باب الرواية معروف، حتى قال: لا ينبغي للرجل أن يحدث من الحديث إلابما حفظه من يوم سمعه إلى يوم يحدث به" (۱)

یعنی امام ابو حنیفہؒ قلیل الحدیث اس لئے ہیں کہ روایت کے سلسلے میں بہت متشدد تھے یہاں تک کہ انہوں نے فرمایا کہ کسی آدمی کیلئے حدیث بیان کرنا درست نہیں، الا یہ کہ جس دن سے سنا ہے اُسی دن سے بیان کرنے تک اس کو اچھی طرح یاد ہو۔

تو کیا اس بناء پر امام صاحب کا شمار متشددین میں ہوگا؟ امام صاحب کا یہ موقف صرف اس لئے تھا کہ حدیث کے پڑھنے و پڑھانے میں مزید احتیاط ہو سکے، ان کا مقصد لوگوں کو غیر معتمد قرار دینا نہیں تھا۔

جیسا کہ دوسری جگہ صاحب "قواعد التحدیث" نے امام صاحب کی مدح سرائی اس انداز میں کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ: "ولا يخفى ما في قول أبي حنيفة من الاحتياط والتوقي في باب الرواية" (۲) یعنی امام ابو حنیفہ کے قول میں روایت کے بارے میں جو احتیاط پایا جاتا ہے وہ مخفی نہیں ہے۔

امام صاحب کے جرح و تعدیل کے سلسلے میں جو اقوال نقل کئے جاتے ہیں تاکہ ان کا شمار ناقدین حدیث میں کیا جا سکے، وہاں یہ بات ذکر کی جاتی ہے کہ: "ان أبا حنيفة قبل رواية المستور و تبعه فيه ابن حبان" (۳)

یعنی وہ مستور کی روایت کو قابل حجت تسلیم کرتے ہیں اور امام ابن حبان نے یہ قاعدہ انہیں سے اخذ کیا ہے کہ: "العدل من لم يعرف منه الجرح فمن لم يعرف بجرح فهو عدل إذلم يكلف الناس من الناس معرفة ماغاب عنهم" (۴)

جس کے بارے میں کوئی جرح نہ معلوم ہو تو وہ عادل ہے، اس لئے کہ لوگوں

---

(۱) قواعد في علوم الحديث ص ۲۲۰-۲۲۳ (۲) قواعد في علوم الحديث ص ۲۳۵

(۲) قواعد في علوم الحديث ص ۳۳٤، ۳۳۵ (۳) الثقات لابن حبان ۱۳/۱

کو اس کا مکلّف نہیں بنایا گیا ہے کہ وہ دوسروں کے مخفی حالات معلوم کریں۔

واضح رہے کہ ائمہ نے ابن حبان کے اس اصول کو تسلیم نہیں کیا اور اسی بناء پر ان کو متساہل فی التوثیق کہا گیا ہے، تو کیا امام صاحب پر تساہل کا حکم لگایا جا سکتا ہے؟ اگر نہیں تو پھر متساہل اور متشدد کے کیا اصول ہیں؟

اسی طرح سے علامہ تھانوی نے ایک جگہ علامہ سخاوی کا قول نقل کیا ہے جو حقیقت میں امام ذہبی کا قول ہے جس میں انہوں نے امام دار قطنی، ابن عدی کو معتدلین میں شمار کیا ہے۔(۱)

لیکن شیخ ابو غدہ کو یہ بات پسند نہ آئی وہ کہتے ہیں کہ: " فی عد ابن عدی من القسم الثالث- المعتدل- نظر طویل إذ هو من المتعنتين على الحنفية وغيرهم"(۲)

اسی طرح سے صاحب " فواتح الرحموت" کو امام دار قطنی کے معتدل ہونے پر اعتراض ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: "لا اعتداد بقول المتعصب كما قدح الدارقطني في الامام أبي حنيفة بأنه ضعيف الحديث."

یہی نہیں بلکہ انہوں نے ایک قاعدہ بنا رکھا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

"والحق أن الأقوال التي صدرت عنهم في حق هذا الامام كلها صدرت من التعصب"(۳) حقیقت یہ ہے کہ محدثین کے جتنے اقوال امام ابو حنیفہ کے بارے میں صادر ہوئے ہیں سب کا دارومدار تعصب پر ہے۔

جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ سارے ائمہ، جن کی غیر معمولی تعداد ہے جنہوں نے امام ابو حنیفہؒ پر جرح کیا ہے وہ سب کے سب متعصب ہیں، اور تعصب کی بناء پر کی گئی جرح غیر موثر ہوتی ہے اس لئے ان سب کے اقوال مردود ہیں۔!!

اسی طرح سے وہ سارے مشہور ائمہ جنہوں نے ضعفاء رجال میں کتابیں تحریر کی ہیں مثلاً حافظ عقیلی، علامہ ابن عدی، ابن حبان، حافظ ذہبی وغیرہ سب کے

(۱) قواعد فی علوم الحدیث ص ۱۸۹ (۲) حاشیہ قواعد فی علوم الحدیث ص ۱۸۹
(۳) قواعد فی علوم الحدیث ص ۱۹۳

سب متشدد و متعصب ہیں۔ کیونکہ انہوں نے اپنی ان ضعفاء رجال کی کتابوں میں امام ابو حنیفہؒ کا ذکر کیا ہے، اس لئے ان کی کتابیں غیر معتبر اور ان کے اقوال غیر مقبول ہیں۔

امام بخاری جیسے عظیم محدث کو بھی اس سے محفوظ نہیں رکھا گیا جیسا کہ شیخ ابو غدہؒ کا خیال ہے وہ کہتے ہیں کہ: "ذكر غير واحد من العلماء أن للبخاري ميلا تعصبا على أبي حنيفة" (۱)

نیز نصب الرایہ کا حوالہ دیتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ: "فقد صرح فيه بشدة تعصب البخاري وفرط تحامله على أبي حنيفة" (۲)

یہ وہی امام بخاریؒ ہیں جن کو دنیا "امیر المومنین فی الحدیث" کے نام سے جانتی ہے جن کے بارے میں کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ نیز جن کی اعتدال پسندی پر سب کا اتفاق ہے، اور جس باب میں علامہ ابن عدی کے معتدل ہونے پر شیخ ابو غدہ کو اعتراض تھا، اسی باب میں معتدلین میں امام بخاریؒ کا اسم گرامی بھی موجود ہے لیکن ہاں پتہ نہیں کیوں ان پر اعتراض نہیں کیا گیا۔

یہ تعصب و تنگ نظری جس کو "أي داء أدوأ منه" کا خطاب دیا جا سکتا ہے، اور جس کے بارے میں رسول پاک ﷺ کا فرمان ہے: "دعوها فانها منتنة" محدثین کرام کو انہیں کا شکار بنایا گیا ہے۔

تعصب و تنگ نظری کا یہ الزام صرف متقدمین کے ساتھ خاص نہیں بلکہ متاخرین پر بھی اس کا الزام لگایا گیا ہے، چنانچہ خطیب بغدادی کے سلسلے میں صاحب "الرفع والتكميل" نے اس طرح اظہارِ خیال فرمایا ہے: "لا تغتر بكلام الخطيب فان عنده من العصبية الزائدة على جماعة من العلماء" (۳)

علامہ سبکی نے اپنی کتاب "قاعدة في الجرح والتعديل" میں امام ذہبی کو خاص جماعت کے سلسلے میں غیر معتبر قرار دیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: "وعنده على أهل السنة تحامل مفرط فلا يجوز أن يعتمد عليه." (۴)

---

(۱) حاشية قواعد في علوم الحديث ص ۳۸۰

(۲) حاشية قواعد في علوم الحديث ص ۳۸۰ (۳) الرفع والتكميل ص ۷۷

(۴) قاعدة في الجرح والتعديل ص ۳۶، اہل سنت سے مراد سبکی کے یہاں اشاعرہ ہیں۔

یہ وہی امام ذہبی ہیں جنکا قول جارح و معدل کے شروط کے سلسلے میں اسطرح ذکرکیا گیا ہے:"فإن آنست من نفسك فهما و صدقا و دينا و رعا و إلا فلا تتعن، و إن غلب عليك الهوى و العصبية لرائ و لمذهب فبا الله لا تتعب." (۱)

کہ اگر تم اپنے نفس کے اندر تقویٰ و پرہیز گاری، سمجھ و صداقت محسوس کرتے ہو تو ٹھیک ہے، اور اگر تمہارے اوپر نفسانیت یا مذہبی تعصب غالب ہے تو خدا(را) اس کام کیلئے -جرح و تعدیل کیلئے- پریشانی نہ اٹھاؤ۔

ایک طرف ان کا یہ قول ہے، دوسری طرف ان کو اسی مرض میں مبتلا کر دیا گیا ہے۔

لطف تو یہ ہے کہ انہیں امام ذہبی کو وقتِ ضرورت منصف بھی گردانا گیا ہے چنانچہ جرح و تعدیل میں امام ابو حنیفہ کی علمی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے علامہ تھانوی لکھتے ہیں کہ:"وقد اعترف بذلك كل منصف له قلب سليم كالذهبي وغيره" (۲)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسی کو متشدد یا متعصب کہنے کیلئے کوئی خاص اصول نہیں بلکہ حسب ضرورت اس کو استعمال کیا گیا ہے۔

معلوم ہونا چاہئے کہ امام ذہبی آٹھویں صدی ہجری میں علم رجال کے بہت بڑے ماہر محدث گذرے ہیں، جن کے بارے میں محدثِ وقت حافظ ابن حجر کا تبصرہ ہے:"وهو من أهل الاستقراء التام في نقد الرجال" (۳)

لیکن یہ جلیل القدر امام و حافظ بقول سبکی غیر معتمد ہیں، اسی طرح سے کسی کسی قانون کے تحت سارے محدثین کو داخل کر کے کسی کو متعصب کہہ کر، کسی متشدد بنا کر، ان کی جتنی جرحیں ہیں حسب ضرورت ان کو غیر موثر اور ناقابلِ اعتبار قرار دے دینا کہاں کا انصاف ہے؟

کسی پر متشدد و متعصب ہونے کا حکم اسی وقت لگانا چاہئے جب اس کے لگائے ہوئے سارے راویوں کا موازنہ و مقابلہ دوسرے لوگوں کے حکم سے کر لیا جائے اس موازنہ کے بعد جو حکم ماخوذ ہو اس کا حکم لگانا چاہئے، جو ایک بہت مشکل و صبر آزما

(۱) تذكرة الحفاظ ۱/٤ (۲) قواعد في علوم الحديث ص ۳۳٦، ۳۳۷

(۳) نزهة النظر ص ۱۳۵، طبع بنارس

کام ہے۔ خاص طور سے یحییٰ بن معین جن کو متشدد کہا جاتا ہے، انہوں نے ایسے بے شمار راویوں کو ثقہ کہا ہے جن کو دوسروں نے ضعیف قرار دیا ہے۔

اور حقیقت تو یہ ہے کہ علم جرح و تعدیل کے کچھ ایسے اصول موجود ہیں جن کی موجودگی میں کسی کو متشدد یا متعصب کہنے کی ضرورت ہی نہیں، ان کو سامنے رکھنے سے بے شمار مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں، اور اتنے سارے اصول و ضوابط کی ضرورت ہی نہیں پڑتی جو بے اصولی کا شکار ہو جائیں۔

مثلاً یہ قاعدہ موجود ہے کہ اگر کوئی ایسا راوی ہے، جسکی ثقاہت کسی نے نہیں بیان کی ہے بلکہ اس کے برخلاف ایک ناقد اس پر جرح کرتا ہے تو ایسی صورت میں یہ جرح قابل قبول ہے اگرچہ مبہم ہی کیوں نہ ہو۔ اور اگر کسی نے اس کو ثقہ کہا ہے تو ایسی صورت میں یہ جرح مفسر ہونا چاہئے اور ایسے اسباب ہوں جو قابل اعتبار ہوں ورنہ جرح و تعدیل کا تعارض ہوگا۔

اور تعارض ہونے کی صورت میں ان اصولوں پر عمل کیا جائے گا جن پر تعارض جرح و تعدیل کی صورت میں عمل کیا جاسکتا ہے۔

لہٰذا متشدد یا غیر متشدد، عقائد میں اختلاف یا عدم اختلاف، جارح کا خود مجروح ہونا یا نہ ہونا وغیرہ اصولوں کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مراتب جرح و تعدیل

ائمہ جرح و تعدیل نے راویوں کے حالات اور ان کے مراتب بیان کرنے کیلئے جرح و تعدیل کے کلمات کا استعمال کیا ہے۔ ان میں سے بعض کثیر الاستعمال ہیں اور بعض قلیل الاستعمال، اسی طرح سے کلمات کے علاوہ حرکات و اشارات کا بھی استعمال کیا ہے، انہیں کلمات و اشارات سے راویوں کی ثقاہت اور ضعف نیز ان کے مراتب کی وضاحت کی گئی ہے۔ اور انہیں مراتب کے اعتبار سے ان کی روایتوں پر اصح، صحیح، حسن اور ضعیف کا حکم لگایا جاتا ہے۔

لیکن چونکہ یہ علماء مختلف دور اور مختلف مزاج کے تھے اس لئے لازمی طور سے

ان کے زمانہ اور مزاج کا گہرا اثر ان کلمات کے انتخاب پر بھی ہوا ہے۔ ایک محدث کے یہاں ایک کلمہ کسی خاص مرتبہ پر دلالت کرتا ہے بعینہٖ وہی کلمہ دوسرے محدث کے یہاں دوسرے مرتبہ پر دلالت کرتا ہے، اسی وجہ سے علامہ ابن کثیر کہتے ہیں:

"ان کا ضبط کرنا بے حد مشکل کام ہے" (۱)

حالانکہ ہر فرد نے اپنی سمجھ کے مطابق ایسے کلمات کا انتخاب کیا ہے جو مدلول پر واضح طور سے دلالت کرتے ہیں، لیکن اس کے باوجود بھی اس پر کامل اتحاد نہ ہو سکا، خصوصاً چوتھی صدی سے قبل ان میں نمایاں فرق پایا جاتا تھا اور اس سے قبل مراتب کی تحدید بھی نہیں تھی، لیکن اسی صدی میں امام عبدالرحمٰن بن ابو حاتم الرازی (متوفی ۳۲۷ھ) نے کلماتِ تعدیل کو چار مرتبوں میں محدود کیا۔ (۲)

علامہ ابن صلاح (متوفی ۶۴۳ھ)، امام مزی (متوفی ۷۴۲ھ) وغیرہ نے بھی انہیں کے موقف کو اختیار کیا ہے۔

آٹھویں صدی میں امام ذہبی (متوفی ۷۴۸ھ) نے کچھ اور اضافہ کیا، انہوں نے تعدیل کو چار اور جرح کو پانچ مرتبوں میں تقسیم کیا ہے، حافظ عراقی (متوفی ۸۰۶ھ) نے بھی ان کی موافقت کی ہے، صرف اس الفاظ کا اضافہ کیا ہے۔ (۳)

نویں صدی میں حافظ ابن حجر (متوفی ۸۵۲ھ) نے ہر ایک کو چھ چھ مرتبوں میں تقسیم کیا ہے۔ جس میں انہوں نے صحابہ کو ایک طبقہ میں شمار کیا ہے، اگر صحابہ کو نکال دیا جائے تو انکے یہاں بھی تعدیل کے پانچ مرتبے اور تجریح کے چھ مرتبے ہوتے ہیں۔ (۴)

علامہ سخاوی (متوفی ۹۰۲ھ) جو حافظ ابن حجر کے خاص شاگردوں میں سے ہیں، انہوں نے بھی ان مراتب کو چھ مرتبوں میں تقسیم کیا ہے، لیکن دوسرے مرتبے میں انہوں نے صرف ایک کلمہ "فلان لا يسئل عنه" رکھا، اور صحابہ کو نکال دیا ہے۔ (۵)

حافظ سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ) جو ان میں سب سے زیادہ متاخر ہیں انہوں نے بھی دسویں صدی ہجری میں چھ مرتبوں میں ان کو برقرار رکھا لیکن انہوں نے بھی

---

(۱) الباعث الحثيث ص ۱۰۵ (۲) الجرح والتعديل ۲/ ۳۷

(۳) ميزان الاعتدال ۱/ ٤، التقييد والايضاح ۱/ ۱٦۲

(٤) نزهة النظر ۱۳۳-۱۳٤ (۵) فتح المغيث ۲/ ۱۰۸-۱۳۰

صحابہ کو خارج کر دیا ہے، اور "فلان لا يسئل عنه" کو درجہ اول میں رکھا ہے۔[۱]

ان سارے کلمات میں اگرچہ فرق ہے لیکن ان کو عام قاعدہ کے تحت مختلف مراتب میں تقسیم کرنے سے جرح و تعدیل میں سے ہر ایک کے چھ چھ مراتب بنتے ہیں اور ہر مرتبہ کیلئے مختلف کلمات ہوتے ہیں، جو اس مرتبہ پر دلالت کرتے ہیں جس کی تفصیل یہ ہے:

۱- مراتب تعدیل اور ان کے کلمات:-

۱-پہلا مرتبہ:- (جو سب سے اعلیٰ ہے) وہ یہ ہے: جس میں راوی کی ثقاہت بذریعہ اسم تفضیل، یا صیغہ مبالغہ، یا جو ان کے مشابہ اور ہم معنی ہوں ان سے بیان کیا گیا ہو، جیسے أوثق الناس. أحد الأحدين، إليه المنتهى في التثبت، أثبت الناس، لا أعرف له نظير، فلان لا يسئل عنه، أمير المؤمنين في الحديث وغیرہ۔

۲-دوسرا مرتبہ:- یہ ہے جس میں راوی کے ثقاہت کی تاکید تکرار لفظی یا معنوی سے کی گئی ہو جیسے: ثقة ثقة، ثقة ثبت، ثبت حجة، ثقة حافظ، ثقة مأمون وغیرہ۔

اس بنیاد پر جس کی ثقاہت بیان کرنے میں مزید تکرار آیا ہے وہ اس درجہ میں سب سے اعلیٰ ہوگا، جیسے ابن سعد کا امام شعبہ کے بارے میں کہنا: ثقة مأمون ثبت حجة صاحب حديث.[۲]

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ تکرار جو منقول ہے وہ نو بار کی ہے جو سفیان بن عیینہ کا قول عمرو بن دینار کے بارے میں ہے، جب انہوں نے لفظ "ثقہ" کا تکرار نو مرتبہ کیا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ کہتے کہتے وہاں پر سانس ٹوٹ گئی۔[۳]

۳-تیسرا مرتبہ:- یہ ہے جس میں راوی کی ثقاہت بغیر تاکید کے بیان کی گئی ہو جیسے: ثقة، ثبت، حجة، متقن، حافظ، ضابط،[۴] امام، عادل، (كأنه مصحف) کو بھی اسی کا ملحق قرار دیا گیا ہے حالانکہ یہ مبالغہ کے مشابہ ہے۔ پہلے درجہ

---

(۱) تدریب الراوی ۱/۳٤۱-۳٤٥، ألفية السيوطي ص ۱۱۳

(۲) الطبقات الكبرى ۷/۲۸۰ (۳) فتح المغيث ۲/۱۱۰،۱۱۱

(٤) حافظ اور ضابط اور اس معنی میں جو کلمات ہیں اگرچہ عدالت پر لفظاً دلالت نہیں کرتے لیکن ان کا استعمال انہیں کیلئے کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ابن الصلاح نے اشارہ فرمایا ہے۔

میں رکھنا قاعدہ کے اعتبار سے زیادہ مناسب تھا۔

٤- چوتھا مرتبہ:- یہ ہے جس میں راوی کی عدالت واضح، لیکن ضبط غیر واضح ہو جیسے: صدوق، مامون، لابأس به، لیس به بأس، محله الصدق، خیار وغیرہ۔

٥- پانچواں مرتبہ:- یہ ہے جس میں راوی کی عدالت اور ضبط واضح طور سے نہ بیان کی گئی ہو جیسے: شیخ وسط، جید الحدیث، حسن الحدیث، مقارب الحدیث، صالح الحدیث، إلى الصدق ماهو، رووا عنه وغیرہ۔

نیز جن لوگوں پر کسی قسم کی بدعت یا اختلاط وغیرہ کا الزام ہے ان کو بھی اس کے ملحق قرار دیا گیا ہے جیسے: صدوق رمی بالتشیع، صدوق سئ الحفظ، صدوق تغیر، صدوق یهم.

٦- چھٹا مرتبہ:- یہ ہے جس میں راوی پر حکم لگانے میں ناقد کے تردد و شبہ کا پتہ چلے اور اس کی دلالت عدالت کے بہ نسبت جرح سے زیادہ قریب ہو۔ جیسے: صویلح، یکتب حدیثه، صدوق إن شاء الله، مقبول، أرجوا أن لا بأس به وغیرہ۔

أصحاب مراتب تعدیل کا حکم:-

ان مراتب میں پہلے تین مراتب والوں کی روایتیں عدالت اور ضبط کے وجود کی بنیاد پر قابل قبول اور قابل حجت ہوتی ہیں، اگرچہ قوت میں بعض بعض سے قوی ہوتے ہیں، صحیحین کی روایتیں پہلے مرتبہ والوں میں شمار ہوتی۔ ہے، صحیح ابن خزیمہ اور صحیح ابن حبان کی روایتیں دوسرے مرتبہ والوں میں ہوتی ہیں، اور کتب سنن کی روایتیں تیسری مرتبہ والوں میں شمار کی جاتی ہیں۔

چوتھے مرتبہ والوں کے سلسلہ میں قدرے اختلاف ہے، لیکن راجح یہ ہے کہ یہ قابل احتجاج ہوتے ہیں، اور ان کی روایتیں درجہ حسن کو پہنچتی ہیں۔[1] عام طور سے اس طرح کی روایتیں سنن میں پائی جاتی ہیں۔

حافظ ابن صلاح فرماتے ہیں کہ: جن کلمات سے ضبط کی وضاحت نہیں ہوتی ہے تو ایسے حضرات کی حدیثوں کا مقارنہ کرنا چاہئے اور دیکھنا چاہئے کہ کس طرح کی ہیں

---

(١) ضوابط فی الجرح والتعدیل ص ١٦٧

یہاں تک کہ ضبط کا پتہ چل جائے۔[۱]

پانچویں مرتبہ والوں کی روایتیں مطلق قابل احتجاج تو نہیں ہوتی ہیں البتہ قابل اعتبار ہوتی ہیں لیکن ان کی روایتیں اگر ثقات کے موافق ہوں تو قابل احتجاج ہو جاتی ہیں۔

یہی وہ لوگ ہیں جن کی روایتوں کو امام ترمذی حسن کہتے ہیں اور امام ابو داؤد سکوت اختیار کرتے ہیں، اس طرح کی روایتیں عام طور سے کتب مسانید اور بعض سنن میں پائی جاتی ہیں۔

چھٹے مرتبہ والوں کی بھی روایت قابل قبول نہیں ہوتی بلکہ قابل اعتبار ہوتی ہے لیکن مرتبہ میں کم ہوتی ہے۔ اگر اس کی کوئی شاہد ہے تو حسن لغیرہ ہوگی ورنہ ضعیف ہوگی لیکن ضعف خفیف ہوگا۔ اس طرح کی روایتیں عام طور سے کتب ترغیب و ترہیب میں پائی جاتی ہیں۔

امام سخاوی فرماتے ہیں کہ ان مراتب تعدیل میں سے ابتدائی چار مرتبہ والوں کی روایتیں قابل احتجاج ہوتی ہیں ان کے اعتبار سے ابتدائی چار مراتب موجودہ مراتب کے تیسرے پر ختم ہو جاتا ہے۔

لیکن جو ان کے بعد یعنی پانچویں مرتبہ والے ہیں تو ان میں سے کسی کی روایت قابل احتجاج نہیں اس لئے کہ ان سے ضبط کا پتہ نہیں چلتا ان لوگوں کی روایتوں کو ان کا ضبط جانچنے اور معلوم کرنے کیلئے تحریر کیا جائے گا۔

اور چھٹے درجہ کے جو لوگ ہیں ان کا درجہ ماقبل والے سے بھی کم ہے، ان میں سے بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی روایت تابع اور شاہد کی تلاش کیلئے تحریر کی جا سکتی۔ ضبط کی جانچ کیلئے نہیں۔ اس لئے کہ ضبط کے بارے میں خلل واضح ہے۔ بہرحال یہ جرح کے مرتبہ سے اونچے اور کمال توثیق کے مرتبہ سے نیچے ہوتے ہیں۔[۲]

مراتب جرح اور ان کے کلمات:-

۱-پہلا مرتبہ:- (جو سب سے کم تر ہے) یہ ہے جو راوی کے کمزور اور ضعیف

---

(۱) مقدمۃ ابن الصلاح ص ۱۱۰ (۲) فتح المغیث ۲/۱۱۶

ہونے کی جانب اشارہ کرتا ہے جیسے: لين الحديث، فيه مقال، سئ الحفظ، تكلموا فيه، ليس بالقوى، تعرف و تنكر، غيره أوثق منه، مجهول، وغیرہ۔

۲-دوسرا مرتبہ:- یہ ہے جو راوی کے ضعیف اور مردود ہونے پر صراحت سے دلالت کرتا ہے۔ جیسے: ضعيف، لا يحتج به، له مناكير، مضطرب وغیرہ۔

۳-تیسرا مرتبہ:- یہ ہے جو راوی سے استدلال کی ممانعت اور کثرت ضعف پر دلالت کرتا ہے جیسے: ضعيف جدا، واه بمرة، لا يكتب حديثه، لا تحل الرواية عنه، تالف، رد حديثه، ليس بشئ، لا يساوى شيئا وغیرہ۔

٤-چوتھا مرتبہ:- یہ ہے جو راوی کے متهم بالكذب ہونے پر دلالت کرتا ہے جیسے: متهم بالكذب، متهم بالوضع، سارق الحديث، ساقط، متروك، ذاهب الحديث، [فيه نظر، سكتوا عنه. صرف امام بخاری کے یہاں]

٥-پانچواں مرتبہ:- یہ ہے جو راوی کے (حدیث رسول میں) دروغ گو ہونے پر دلالت کرے۔ جیسے كذاب، دجال، وضاع، يكذب، يضع وغیرہ۔

٦-چھٹا مرتبہ:- یہ ہے جو راوی کے دروغ گو ہونے پر اسم تفضیل یا صیغہ مبالغہ سے دلالت کرے، جیسے: أكذب الناس، ركن الكذب، إليه المنتهى فى الكذب وغیرہ۔

أصحاب مراتب جرح کا حکم:-

ان میں پہلے اور دوسرے مرتبہ والوں کی روایتیں ضعیف ہوتی ہیں لیکن درجات میں فرق ہوتا ہے۔ یہ روایتیں قابل احتجاج نہیں ہوتی ہیں البتہ قابل استیناس ہوتی ہیں، بوقت ضرورت ان کا ذکر کیا جا سکتا ہے، اور دوسرے ہم مرتبہ والوں سے مل کر کام چلاؤ ہو سکتی ہیں، اور دوسرے کی تائید کر سکتی ہیں، ان کے علاوہ بقیہ چار مراتب والوں کی روایتیں مردود ہوتی ہیں، ان کا تحریر کرنا بھی درست نہیں ہوتا، بلکہ آخری تین مراتب والوں کی روایتوں کا بیان کرنا بھی بغیر وضاحت کے حرام ہوتا ہے۔ اس طرح کی روایتیں کتب موضوعات میں پائی جاتی ہیں، یہ ترتیب وار ضعیف، انتہائی ضعیف، متروک اور موضوع ہوتی ہیں۔[1]

(۱) فتح المغيث ۱۱٦/۲

مراتب تعدیل اور ان کے کلمات

۱	۲	۳	۴	۵	۶
اسم تفضیل، صیغہ مبالغہ یا ان کے مشابہ اور ہم معنی ہوں	راوی کی ثقاہت کی تاکید تکرار لفظی یا معنوی سے ہو	راوی کی ثقاہت بغیر تاکید کے بیان کی گئی ہو	عدالت واضح اور ضبط غیر غیر واضح ہو	عدالت اور ضبط دونوں غیر واضح ہو	ناقد کے تردد و شبہ کا اظہار
أوثق الناس، أثبت الناس، ونحوه، إليه المنتهى في التثبت، لا أحد أثبت منه، ومن مثل فلان، فلان لا يسئل عنه، لا أعرف له نظير، أمير المؤمنين	ثقة ثقة. ثقة ثبت، ثقة حجة، ثقة حافظ، ثقة مامون، ثبت حجة، حجة حافظ. وغيره	ثقة، متقن، ثبت، حجة، حافظ، ضابط، عادل، إمام، كأنه مصحف	صدوق، محله الصدق، لا بأس به، مأمون، خيار، ليس به بأس،	شيخ، إلى الصدق ماهو، حسن الحديث، صدوق سئ الحفظ، صدوق يهم، صدوق تغير، صدوق رمي بالتشيع، أو بالإرجاء، أو بالنصب، أو بالقدر، مقارب الحديث، رووا عنه، إلى الصدق ماهو	صدوق ان شاء الله، أرجو أن لا بأس به، صويلح، مقبول، يكتب حديثه، [للاعتبار]
ان سب کی روایتیں قابل احتجاج ہوتی ہیں اگرچہ بعض بعض سے قوی ہوتی ہیں۔			راجح قول کے مطابق حسن ہوتی ہیں۔	قابل اعتبار موافقت پر قابل احتجاج	قابل اعتبار شاہد و تابع کی تلاش کیلئے
صحیحین	صحیح ابن خزیمہ ابن حبان	سنن			

مراتب جرح اور ان کے کلمات

۱	۲	۳	۴	۵	۶
جس میں ضعف کی جانب اشارہ ہو	جو راوی کے ضعف پر صراحت سے دلالت کرے	جو کثرت ضعف پر دلالت کرے	متہم بالکذب پر دلالت کرے	کذب پر دلالت کرے	دروغ گوئی میں مبالغہ یا اسم تفضیل سے دلالت کرے
لین، فیہ لین، فیہ مقال، سیئ الحفظ، لیس بالمتین، ضعفوہ، لیس بمامون وغیرہ تکلموا فیہ، تعرف و تنکر، غیرہ أوثق منہ، مجہول، لیس بذلك	ضعیف لایحتج بہ لہ مناکیر مضطرب لیس بالقوی	ضعیف جدا واہ بمرۃ لایکتب حدیثہ لا تحل الروایۃ عنہ تالف، رد حدیثہ لیس بشیئ لایساوی شیئا منکر الحدیث حدیثہ منکر	متہم بالکذب متہم بالوضع سارق الحدیث ساقط، ہالك متروك ذاہب الحدیث [فیہ نظر، سکتوا عنہ امام بخاری کے یہاں]	کذاب دجال وضاع یکذب یضع لہ بلایا	اکذب الناس رکن الکذب إلیہ المنتہی بالکذب وغیرہ
ضعیف	ضعیف				
درجات میں فرق ہوتا ہے۔ استیناس کیلئے لکھا جاسکتا ہے، تائید پر قابل ذکر ہو سکتی ہے۔		ان چاروں کی روایتیں مردود ہوتی ہیں اور بعض بعض سے اشد ہوتی ہیں۔			

مخصوص کلمات

جرح و تعدیل کے جو کلمات اور مراتب گذرے ہیں یہ عام استعمال کے اعتبار سے ہیں، اس کے برخلاف کچھ ایسے مخصوص کلمات ہیں جو عام قاعدے کے برخلاف مخصوص مرتبہ پر دلالت کرتے ہیں، اور یہ صاحب قول کے خصوصی مصطلحات ہیں، صاحب قول نے اس سے کیا مراد لیا ہے جب یہ واضح ہو جائے تب ان کلمات کے مراتب کی تعیین ہو سکتی ہے، لہٰذا ان کلمات اور اصطلاحات کا جاننا ضروری ہے۔ وہ کلمات یہ ہیں:

اکتب عنه:- (**یکتب عنه**) یہ کلمہ عام قاعدہ کے اعتبار سے تعدیل کے آخری مرتبہ کا ہے، لیکن جب امام یحییٰ بن معین اور امام مسلم کسی کے بارے میں "اکتب عنہ" کہتے ہیں تو اس سے جرح نہیں مراد لیتے بلکہ ثقہ مراد لیتے ہیں۔

امام حاکم فرماتے ہیں کہ: "**ھذا رسم مسلم فی الثقات**"[1] ثقات کے بارے میں امام مسلم کی یہی اصطلاح ہے۔

اور جب امام ابو حاتم کسی کے بارے میں کہتے ہیں کہ "یکتب عنہ" تو یہ نہ تو مطلق توثیق پر دلالت کرتا ہے اور نہ ہی ضعف پر۔ اور جب ابن معین کسی کے بارے میں یکتب عنہ کہتے ہیں تو اس سے مراد تضعیف ہے۔[2]

ثقة:- جمہور کے یہاں تعدیل کا تیسرا مرتبہ ہے لیکن امام عجلی ثقہ کہہ کر صدوق اور نیچے کا مرتبہ مراد لیتے ہیں۔[3]

سکتوا عنه:- اس کلمہ کو امام بخاریؒ اکثر و بیشتر استعمال کرتے ہیں اور اس کا جو ظاہری معنی سمجھ میں آتا ہے: وہ یہ ہے کہ لوگوں نے ان کے سلسلہ میں کچھ نہیں کہا، بلکہ جرح و تعدیل کے اعتبار سے سکوت اختیار کیا ہے ایسی صورت میں بظاہر یہ مجہول ہوتا ہے جو جرح کا ادنیٰ مرتبہ ہے۔

لیکن حقیقت میں امام بخاری کے یہاں یہ نہیں مراد ہے بلکہ جب وہ کسی کے

---

(۱) تهذيب الكمال ۱/۲۵۸ (۲) ميزان الاعتدال ٤/٣٤٥، الميزان ۱/۳۳

(۳) معرفة الثقات ۱/۱۲۵

بارے میں "سکتوا عنہ" کہتے ہیں تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ وہ متروک ہے جو جرح کا چوتھا مرتبہ ہے۔

بلکہ علامہ ابن کثیر کہتے ہیں کہ یہ امام بخاری کے نزدیک جرح کا سب سے بدترین مرتبہ ہے۔[1]

لیکن امام ذہبی فرماتے ہیں کہ استقراء سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ "ترکو" کے معنی میں ہے۔[2]

امام سخاوی فرماتے ہیں کہ اکثر و بیشتر امام بخاری نے اس سے متروک مراد لیا ہے۔[3]

صدوق:- یہ کلمہ جمہور کے یہاں چوتھے مرتبہ میں ہے، لیکن امام بخاری کے یہاں یہ معاملہ نہیں بلکہ جب وہ کسی کو صدوق کہتے ہیں تو اس سے مراد ثقہ ہوتا ہے جو تعدیل کا تیسرا مرتبہ ہے۔

فیہ نظر:- ظاہری معنی و مفہوم سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اس پر کچھ کلام ہے اور راوی مشتبہ ہے۔ حالانکہ یہ مقصد نہیں، بلکہ جب امام بخاری کسی راوی کے بارے میں فیہ نظر کہتے ہیں تو اس سے مراد ان کے نزدیک متروک ہوتا ہے جو جرح کا بدترین درجہ ہے۔

علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ: "إنه أدنیٰ المنازل عنده و أردأها"[4]

امام ذہبی فرماتے ہیں کہ: امام بخاری کسی راوی پر "فیہ نظر" کا اطلاق عموماً اس وقت کرتے ہیں جب وہ "متہم بالکذب" ہو۔[5]

امام بخاری خود فرماتے ہیں کہ: "إذا قلت فلان فی حدیثه نظر فهو متهم واه"[6]

کچھ محققین کا خیال ہے کہ یہ قاعدہ کلیہ نہیں بلکہ عموماً ایسا ہوتا ہے، کبھی اس کے برعکس ایسا بھی ہوا ہے کہ وہ راوی جرح کے اس درجے میں نہیں ہوتا ہے مثلاً تمام بن نجیح کے بارے میں امام بخاری نے کہا کہ "فیہ نظر" اور خود ان سے ایک معلق اثر روایت کیا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز رکوع کے وقت رفع یدین کرتے تھے۔[7]

---

(۱) فتح المغیث ۲/۱۲۲ (۲) الموقظة فی علم الحدیث ص ۸۳

(۳) فتح المغیث ۲/۱۲۲

(٤) فتح المغیث ۲/۱۲۲، ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس کا استعمال متوسط راوی کیلئے ہوتا ہے۔ بذل الماعون ص ۱۱۷ (۵) میزان ۱/۱٦ ٤

(٦) الرفع والتکمیل ص ٤۰۲ (۷) دراسات فی الجرح والتعدیل ص ۲٦۵

یعنی امام بخاری کے یہاں وہ متروک راوی نہیں ہیں اس لئے کہ اگر ایسا ہوتا تو وہ ان سے کبھی یہ قول نقل نہ کرتے۔

اس طرح سے حریش بن خِرّیت کے بارے میں "فیہ نظر" کہا ہے اور پھر خود ہی کہا ہے کہ "أرجو أن یکون صالحا"[1]

اس سے پتہ چلتا ہے کہ امام بخاری جب یہ کہتے ہیں کہ "فیہ نظر" تو ہر وقت اس سے مراد متروک ہی نہیں ہوتا ہے۔

محققین کا یہ خیال کسی حد تک صحیح ہو سکتا ہے لیکن اس میں مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ ویسے قاعدے اکثر کلی نہیں ہوتے، کچھ نہ کچھ شذوذ پائے جاتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہو سکتا ہے ایسا امام بخاری سے سہواً ایسا ہو گیا ہو، نیز یہ بھی ہو سکتا ہے کہ راوی کے بارے میں ان کی رائے تبدیل ہو گئی ہو، اگر حقیقت میں ایسا ہی ہے تو متاخرین محققین کی رائے غلط ہو سکتی ہے۔

البتہ کچھ راویوں کو اور بطور مثال پیش کیا گیا ہے۔[2] جس میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ بعض راویوں پر امام بخاری نے "فیہ نظر" کا حکم لگایا ہے، جبکہ وہ راوی دوسروں کے یہاں ثقہ ہے یا اس درجہ کا ضعیف نہیں جو امام بخاری کا مقصد ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ دلیل مدلول پر واضح طور سے دلالت نہیں کرتی اس لئے کہ یہاں اصل مسئلہ یہ ہے کہ امام بخاری کے یہاں اس راوی کا کیا حکم ہے، دوسرے لوگوں کا کیا خیال ہے اس سے یہاں کوئی سروکار نہیں۔ اگر ایک راوی کسی محدث کے یہاں کذاب اور کسی کے یہاں ثقہ ہو تو ایک کے اصول کو دوسرے کے اصول سے نہیں پرکھا جا سکتا۔

اور جب امام بخاری نے بذات خود یہ وضاحت کر دی کہ اس سے مراد متہم ہوتا ہے تو پھر قیاس آرائی کی کوئی ضرورت نہیں۔

منکر الحدیث:- اس کا استعمال عام طور سے جرح شدید کے لئے ہوتا ہے جس کا

---

(۱) التاریخ الکبیر ۳/۱۱۴

(۲) تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو: حاشیہ الرفع والتکمیل ص ۴۰۲، دراسات فی الجرح والتعدیل ص ۲۶۳

استعمال زیادہ تر امام بخاری نے کیا ہے اور اس سے مراد جرح شدید لیا ہے، جس کی جانب انہوں نے خود اشارہ فرمایا ہے کہ جب میں کسی راوی کو منکر حدیث کہتا ہوں تو اس سے روایت کرنا درست نہیں ہوتا ہے۔(۱)

لیکن جب یہی کلمہ امام احمد استعمال کرتے ہیں تو اس کا مطلب ان کے یہاں یہ ہوتا ہے کہ راوی کسی چیز کے روایت کرنے میں جملہ احباب سے منفرد ہے، چنانچہ وہ عبد الرحمٰن بن ابی الموالی کے بارے میں فرماتے ہیں جنہوں نے استخارہ والی حدیث روایت کیا ہے کہ: **كان يروى حديثاً منكرا عن ابن المنكدر، عن جابر في الاستخارة ليس أحد يرويه غيره** (۲)

لا أعرفه:- جب یحییٰ بن معین کسی راوی کے بارے میں کہتے ہیں کہ:" لا أعرفه" تو اس سے ان کا مقصد راوی پر جہالت کا حکم لگانا نہیں ہوتا بلکہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس شخص کی روایتیں ان کو معلوم نہیں، چنانچہ جب عبد الخالق بن منصور نے ابن معین سے حاجب بن ولید کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ: لا أعرفه و أما أحاديثه فصحيحة.(۳)

ابن عدی فرماتے ہیں کہ: ایسا لگتا ہے کہ جب امام یحییٰ کے پاس راوی کے حدیثوں کے بارے میں معلومات نہیں ہوتی تھی تو وہ فرماتے تھے "لا أعرفه" (۴)

اور جب یحییٰ بن سعید قطان کسی راوی کے بارے میں کہتے ہیں کہ "لا يعرف" یا "لم يثبت عدالته" تو اس کا مطلب انکے یہاں یہ ہوتا ہے کہ کسی معاصر امام نے اس شخص کے بارے میں کوئی ایسی بات نہیں کہی ہے جس سے اسکی عدالت ثابت ہو۔(۵)

امام ذہبی فرماتے ہیں کہ: ابن قطان ہر اس شخص کو "لا يعرف" کہتے ہیں جس کے بارے میں اس کے معاصرین میں سے کسی نے کوئی ایسی بات نہیں کہی ہے جس سے اس کی عدالت کا پتہ چلے۔(۶)

---

(۱) ميزان الاعتدال ۱/۲٦، فتح المغيث ۲/۱۲۵

(۲) تهذيب التهذيب ٦/۲۸۳

(۳) تاريخ بغداد ۸/۲۷۱

(٤) دراسات في الجرح والتعديل ص ۲۵۸

(٥) ميزان الاعتدال ۱/٥٥٦

(٦) مصدر سابق

لا بأس به:۔جب یحییٰ بن معین اور عبدالرحمٰن بن ابراہیم (دُحیم) کسی راوی کے بارے میں ''لا باس بہ'' کہتے ہیں تو اس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ وہ ثقہ ہے۔

چنانچہ ابن ابی خیثمہ نے یحییٰ بن معین سے کہا کہ آپ کسی راوی کے بارے میں کہتے ہیں کہ:''فلان ليس به بأس''اور''فلان ضعيف'' تو اس کا کیا مطلب ہوتا ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ جب میں کسی کے بارے میں کہتا ہوں کہ ''لیس بہ بأس'' تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ ثقہ ہے۔(۱)

امام ابو زرعہ دمشقی نے دُحیم سے سوال کیا کہ علی بن حوشب فزاری کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ ''لا باس به'' تو انہوں نے کہا کہ آپ ''ثقہ'' کیوں نہیں کہتے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ کہہ تو دیا کہ وہ ثقہ ہیں۔(۲)

لیکن امام عجلی جب کسی راوی کے بارے میں ''لا بأس به'' کہتے ہیں تو اس سے ضعیف مراد لیتے ہیں۔(۳)

ليس بشيءٍ:۔یہ کلمہ جرح کے تیسرے مرتبہ کا ہے لیکن جب امام شافعی اور ان کے شاگرد امام مزنی کسی راوی کے بارے میں ''ليس بشيء'' کہتے ہیں تو اس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ راوی ''کذاب'' ہے، ایسی صورت میں یہ پانچویں مرتبہ کا ہوتا ہے۔

امام مزنی فرماتے ہیں کہ: ایک دن امام شافعی نے مجھ سے ''فلان کذاب'' کہتے ہوئے سنا انہوں نے کہا کہ اچھے الفاظ استعمال کرو ''فلان کذاب'' نہ کہو بلکہ یہ کہو کہ ''حديثه ليس بشيء''۔(۴)

اور جب امام ابن معین کسی راوی کے بارے میں ''ليس بشيء'' کہتے ہیں تو انکا مقصد اس سے جرح کرنا نہیں بلکہ یہ ہوتا ہے کہ راوی قلیل الحدیث ہے۔(۵)

عام طور سے یہی مقصد ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی جرح شدید بھی مراد لیا ہے، لہٰذا اسطرح کے کلمات کا تتبع کرنا پڑے گا اور دیگر اہل علم کے اقوال سے مقارنہ کرنا پڑے گا۔

---

(۱) الكفاية في علم الرواية ص۲۲، فتح المغيث ۲/۱۱۷

(۲) فتح المغيث ۲/۱۱۷- ۱۱۸

(۳) معرفة الثقات ۱/۵

(٤) فتح المغيث ۲/۱۳۲

(۵) مصدر سابق

احمد نور سیف نے دراسہ کرنے کے بعد بتایا ہے کہ عموماً اس سے وہی مراد ہوتا ہے جو جمہور کے یہاں ہے، لیکن کبھی کبھی انہوں نے اس سے مجہول بھی مراد لیا ہے۔[۱]

لیس بالقوی:- یہ کلمہ جرح کا پہلا مرتبہ ہے۔ لیکن جب ابو حاتم کسی کے بارے میں "لیس بالقوی" کہتے ہیں تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ راوی قوت اور تثبت کے اعلیٰ درجہ پر نہیں ہے۔

اور جب امام نسائی کسی راوی کے بارے میں "لیس بالقوی" کہتے ہیں تو جرح مفسد نہیں مراد لیتے ہیں، کیونکہ اسطرح کے راویوں کی حدیث اپنی کتاب میں ذکر کرتے ہیں۔[۲]

"لیس بالقوی" اور "لیس بقوی" کے استعمال میں فرق ہے۔ علامہ معلمی فرماتے ہیں کہ "لیس بقوی" مطلق قوت کی نفی کرتا ہے اگرچہ مطلق ضعف نہ ثابت ہو اور "لیس بالقوی" قوت کے کامل درجہ کی نفی کرتا ہے۔[۳]

مجہول:- جب محدثین کسی راوی پر مجہول کا اطلاق کرتے ہیں تو اس سے مراد مجہول عین لیتے ہیں۔ لیکن جب ابن ابی حاتم کسی راوی پر جہالت یا مجہول کا حکم لگاتے ہیں تو ان کا مقصد اس سے جہالت حال ہوتی ہے۔

چنانچہ امام سخاوی فرماتے ہیں کہ انہوں نے داؤد بن یزید ثقفی کو مجہول کہا ہے جبکہ ان سے روایت کرنے والے بہت سے لوگ ہیں[۴] (جن کا ذکر خود انہوں نے کیا ہے)

علامہ لکھنوی فرماتے ہیں کہ: امام ذہبی نے اپنی کتاب "میزان الاعتدال" میں جہاں بھی لفظ مجہول کہا ہے اور اس کی نسبت کسی قائل کی طرف نہیں کی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ امام ابن ابی حاتم کا قول ہے۔[۵]

---

(۱) التاریخ ۱/۱۱۶- ۱۱۷، الموقظة فی علم الحدیث ص ۸۲-۸۳

(۲) الموقظة فی علم الحدیث ص ۸۲-۸۳

(۳) التنکیل بما فی تانیب الکوثری من الأباطیل ۱/۲۳۲

(٤) الجرح والتعدیل ۳/٤۳۸، الرفع والتکمیل ص ۲۲۹

(٥) الرفع والتکمیل ص ۲۲۵

نادر کلمات

اب تک جن کلمات کے بارے میں بات ہو رہی تھی وہ ایسے کلمات ہیں جو بکثرت مستعمل ہوتے ہیں، لیکن کچھ ایسے کلمات بھی ہیں جو بہت کم مستعمل ہوتے ہیں۔ ندرت کے ساتھ ساتھ ان کا مفہوم بھی قدرے غامض ہوتا ہے اس لئے مدلول کے سمجھنے میں دقت ہوتی ہے، اور یہ بھی نہیں پتہ چلتا کہ کہنے کا مقصد کیا ہے اور اس راوی کا شمار کس طبقہ میں کیا جائے اور اس کلمہ کو کس درجہ میں رکھا جائے، اس سلسلے میں کچھ کلمات بطور مثال پیش کئے جاتے ہیں۔[۱]

۱- اتق حیات سَلَمَ لا تلسعک[۲] سلم کے سانپوں سے بچتے رہنا کہیں تم کو ڈس نہ لیں۔

یہ تعبیر صرف عبد اللہ بن مبارک نے سلم بن سالم ابو محمد بلخی کے بارے میں بطور جرح استعمال کیا ہے۔[۳] اس سے ان کا مقصد یہ ہے کہ یہ راوی کذاب ہیں۔ ان کے مرویات کی مثال سانپوں سے دی گئی ہے گویا کہ سانپ جس طرح ضرر رساں اور ناقابلِ اعتماد ہوتے ہیں یہی کیفیت ان کی حدیثوں کی ہوتی ہے۔ چنانچہ خود خطیب بغدادی نے انکے بارے میں کہا ہے کہ یہ بلا سر و پیر کی حدیثیں روایت کرتے ہیں۔[۴]

۲-أعور بین العمیان: - (اندھوں میں کانا راجہ) یہ تعبیر امام دار قطنی کی ہے جس کو انہوں نے ابو یوسف کے بارے میں عرض کیا ہے جنہوں نے "غورک" سے روایت کیا ہے اور جن سے لیث بن حماد نے روایت کیا ہے۔ امام دار قطنی کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ابو یوسف اگرچہ ضعیف ہیں لیکن غورک اور لیث بن حماد سے بہتر ہیں۔[۵]

۳-جمازات المحامل

٤-جمال المحامل

۵-الجمال التی تحمل المحامل۔[۶]

---

(۱) ہمارے محترم استاذ / سعدی الہاشمی نے اس بارے میں ایک کتابچہ تحریر فرمایا ہے جس کا نام ہے: شرح ألفاظ التجریح النادرة أو قلیلة الاستعمال. ان کلمات کے انتخاب کیلئے اسی کتاب کو بنیاد بنایا گیا ہے۔

(۲) شرح ألفاظ التجریح النادرة ص ٥٦ (۳) الجرح والتعدیل ٤/ ٢٦٦

(٤) تاریخ بغداد ٩/ ٢٤٢ (۵) التنکیل بما فی تانیب الکوثری من الاباطیل ١/ ٣٦١

(٦) شرح ألفاظ التجریح النادرة ص ١٢

جمال و جمازات اونٹ کو کہتے ہیں۔ محامل بوجھ اٹھانے والے یا ہودج اٹھانے والے کو کہتے ہیں، یعنی ایسے اونٹوں میں سے ہیں جن پر بوجھ لادا جاسکتا ہے۔ عربی میں اونٹوں کو بطور تشبیہ و استعارہ بکثرت استعمال کیا گیا ہے، اس سے اشارہ ایسے شخص کی طرف کیا جاتا ہے جو مشقتوں کو برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور پیچیدہ مقامات میں بھی نہ گھبراتا ہو بلکہ ان کو حل کرنے کی جرأت رکھتا ہو۔

محدثین نے یہ کلمہ جرح و تعدیل دونوں کیلئے استعمال کیا ہے تعدیل کیلئے "فلان من جمال المحامل" اور جرح کیلئے "ليس من جمال المحامل" کہا ہے۔

مطلب یہ ہوا کہ جس طرح سے ہودج اور ساز و سامان کو اٹھا کر دور دراز مقامات پر پہنچانا باہمت، طاقتور اور مضبوط اونٹ کا کام ہے۔ اسی طرح سے حدیثوں کیلئے رختِ سفر باندھنا اور ان کو محفوظ رکھنا باہمت، قوی حافظہ اور صبر آزما لوگوں کا کام ہے۔

سب سے پہلے یہ تعبیر امام مالک نے عطاف بن خالد مدنی کیلئے استعمال کیا ہے، انہوں نے ان کے بارے میں کہا کہ: "ليس هو من جمال المحامل"[1]

اسی طرح سے یحییٰ بن سعید قطان نے مسلم بن قتیبہ خراسانی کے بارے میں اور یحییٰ بن معین نے رشدین بن سعد کے بارے میں استعمال کیا ہے۔[2]

اسی معنی میں جمازات الہ حامل اور ليس من أهل القباب بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ :ليس من أهل القباب، يا ليس من جمال المحامل. کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انکی روایت بیان کی جاسکتی ہے لیکن اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔[3]

٦-سد ـ من عيش:-

٧- سداد من عوز:-[4]

ابو بکر بن اعین نے سوید بن سعید کے بارے میں یہ کلمہ استعمال کیا ہے اور کہا کہ هو سداد من عيش[5]

---

(١) تهذيب سنن ابى دائود لابن القيم ٣٦٣/١ (٢) تهذيب التهذيب ٢٧٨/٣،
(٣) فتح المغيث ١٢٥/٢ (٤) شرح الفاظ التجريح النادرة أو قليلة الاستعمال ص ٨
(٥) تهذيب التهذيب ٢٧٤/٤

سداد اس چیز کو کہتے ہیں جس سے کسی خلل کی اصلاح کی جائے، سداد من عیش کا مطلب یہ ہوا کہ تھوڑی سی ضرورت پوری ہو سکتی ہے، یا بلفظ دیگر جیسے اردو زبان کا محاورہ ہے کہ "نہ ہونے سے ہونا بہتر" وہی معنی سداد من عیش کا ہے یعنی متابعت و شواہد میں قابل اعتبار ہو سکتے ہیں۔

۸-عصا موسیٰ تلقف مایأفکون[۱] "موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی ہے جو ہر گھڑی ہوئی چیز کو نگل لیتی ہے" یہ جملہ محمد بن عبداللہ مطین نے حافظ محمد بن عثمان بن ابی شیبہ کے بارے میں استعمال کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ **ھو عصا موسی یلقف ما یأفکون**[۲] اور اس سے ان پر جرح کیا ہے۔

یہ جملہ انہوں نے قرآن کریم کی آیت سے لیا ہے، جو موسیٰ علیہ السلام اور جادوگروں کے مقابلے میں وارد ہوئی ہے، جس میں بحکم الٰہی عصاء موسیٰ اژدہے کی شکل میں نمودار ہوا، اور جادوگروں کے خیالی سانپوں کو نگل گیا۔ مطین کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح سے عصائے موسیٰ نے جادوگروں کے وضع کردہ باطل چیزوں کو نگل لیا تھا اس طرح سے ابن ابی شیبہ باطل اور کذب روایتوں کو جمع کرتے ہیں اور ان کو بیان کرتے ہیں۔[۳]

گویا کہ یہ جملہ جرح کے بدترین درجہ کیلئے انہوں نے استعمال کیا ہے۔ ان کے اس قول کو محدثین نے کلام الأقران بعضھم فی بعض پر محمول کیا ہے۔[۴]

۹-علی یدَی عدل[۵] عدل کے ہاتھ میں ہے۔

اس تعبیر کو سب سے پہلے ابو حاتم رازی نے بطور جرح استعمال کیا ہے، جبارہ بن مغلس حمانی کے بارے میں انہوں نے کہا کہ ھو علی یدی عدل اس کلمہ کے مدلول کے بارے میں بعض محدثین کو غلط فہمی ہو گئی ہے۔ اس سے وہ راوی کی ثقاہت و عدالت سمجھتے تھے اور اس کو اس طرح پڑھتے تھے: "ھو علی یدَیَّ عدلٌ" یعنی وہ میرے نزدیک عادل ہے۔

---

(۱) شرح ألفاظ التجریح النادرة ص ۸۳ (۲) سیر اعلام النبلاء ۲۲/۱۴
(۳) شرح ألفاظ التجریح النادرة ص ۸٤ (٤) سیر أعلام النبلاء ۲۲/۱٤
(۵) شرح ألفاظ التجریح النادرة ص ۳۷، ٤۲

حالانکہ صحیح عبارت جیسا کہ حافظ ابن حجر نے اشارہ کیا ہے اس طرح سے ہے "هو علي يدَيْ عدلٍ" یعنی ہالک۔

اس کلمہ کا پس منظر جیسا کہ ابن سکیت نے ابن کلبی سے "اصلاح منطق" میں ذکر کیا ہے وہ یہ ہے کہ جزء بن سعد کی اولاد میں ایک شخص کا نام عدل تھا جو تُبّع کا پولس انسپکٹر تھا، جب تُبّع کسی کو قتل کرنا چاہتا تو عدل کے ہاتھ میں اس کو دے دیتا، یہیں سے یہ مقولہ لوگوں کے درمیان مشہور ہو گیا کہ "وضع علي يدي عدلٍ" یعنی عدل کے ہاتھ میں چلا گیا، پھر اس جملے کو ہر اس شخص کے بارے میں استعمال کیا جانے لگا جو ہلاک ہونے والا ہوتا۔[1]

امام ابو حاتم نے اس کلمہ کو اس معنی میں استعمال کر کے اس سے "ہالک" مراد لیا ہے جو جرح کے صیغوں میں سے ایک صیغہ ہے اور بدترین درجہ کا صیغہ ہے۔[2]

۱۰ - كان ممن أخرجت له الأرض أفلا ذ أكبادها:[3]

ایسے لوگوں میں سے تھے جن کیلئے زمین نے اپنا خزانہ اگل دیا، علامہ ابن حبان نے یہ تعبیر محمد بن عبد الرحمٰن بیلمانی پر جرح کیلئے استعمال کیا ہے۔[4]

أفلاذ من الأرض زمینی خزانوں کیلئے بطور مجاز استعمال کیا جاتا ہے، جملہ کا مطلب یہ ہوا کہ یہ ایسے لوگوں میں سے تھے جن کیلئے زمین نے اپنا خزانہ اگل دیا تھا، ان کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ محمد بن عبد الرحمٰن بیلمانی نے مشائخ سے حدیثوں کو روایت نہیں کیا ہے بلکہ موضوع اور ضعیف روایتوں کو روایت کیا ہے جس کی کوئی بنیاد نہیں ہے، گویا کہ زمین ان کیلئے پھٹ گئی تھی اور اپنا خزانہ اگل دیا تھا اور انہوں نے بغیر کسی مشقت کے اس کو حاصل کر لیا۔ یعنی یہ ضعیف اور موضوع روایت نقل کرتے ہیں۔[5]

۱۱ - كذا و كذا :- یہ کلمہ امام احمد بن حنبل نے متعدد راویوں پر جرح کیلئے استعمال

---

(۱) الصحاح ۱۷۶۱/۵

(۲) فتح المغيث ۳٤۹/۱، و شرح الفاظ التجريح النادرة أوقليلة الاستعمال ص ۳۷

(۳) شرح الفاظ التجريح النادرة ص ۵۰ (٤) المجروحين ۲٦٤/۲

(۵) شرح الفاظ التجريح النادرة ص ۵۱

کیا ہے۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ استقراء سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس سے لین کی جانب اشارہ کیا ہے۔(۱)

۱۲- لیس من أهل قباب: -یہ تعبیر امام مالک کی عطاف بن خالد کے بارے میں ہے اور اس سے اشارہ ضعف کی جانب ہے۔ جسے کہ جمازات المحال میں گذر چکا۔

۱۳- ما أشبه حديثه بثياب نيسابور (۲)

"نیساپوری کپڑوں سے ان کی حدیث زیادہ مشابہ ہے"

علامہ ابراہیم بن یعقوب جوزجانی نے محدث شام اسماعیل بن عیاش حمصی کے بارے میں یہ کلمہ بطور جرح یہ کلمہ استعمال کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ "ما أشبه إسماعيل بثياب نيسابور يرقم بايعه علي الثوب مأة ولعله اشتراه بعشرة أو بدونها" (۳) یعنی اسماعیل بن عیاش نیساپوری کپڑوں سے بہت مشابہ ہیں کہ ان کا بائع اس کپڑے پر جس کو دس درہم یا اس سے بھی کم قیمت میں خریدا، سو درہم کا لیبل لگا دیتا ہے تاکہ مشتری دھوکہ میں پڑ جائے۔

پھر اس جملہ کو محدثین نے بطور جرح استعمال کیا ہے اور ایسے لوگوں کیلئے استعمال کیا ہے جو کذب بیانی اور حدیث میں کمی و زیادتی سے کام لیتے تھے، حالانکہ اسماعیل بن عیاش راوی ایسے نہیں ہیں ان کی روایتیں اہل شام سے صحیح ہوتی ہیں اور غیر اہلِ شام سے مختلط ہوتی ہیں۔

١٤- ميزان: (ترازو) یہ تعبیر امام سفیان ثوری نے عبدالملک بن ابی سلیمان کیلئے استعمال کیا ہے اور اس انہوں نے ان کے قوت حفظ اور ضبط کی جانب اشارہ کیا ہے۔(۴)

۱۵- يثبج الحديث:-

١٦- يزرف الحديث:-

یہ دونوں کلمات وضع حدیث اور دروغ گوئی کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔(۵)

---

(۱) میزان ٤٨٣/٤، شرح الفاظ ص ١١٨ (۲) شرح ألفاظ ص ٢٨
(۳) شرح ألفاظ ص ٢٨، ٢٩ (٤) تهذيب التهذيب ٣٩٧/٦
(٥) الجرح والتعديل ٢٨١/٧، فتح المغيث ٣٧٨/١

۱۷-یکتب عنہ زحفا:- یہ تعبیر امام ابو حاتم نے بعض راویوں کے ضعف بیان کرنے کیلئے استعمال کیا ہے، مثلاً خالد بن ایاس، وعبدالحکیم بن عبداللہ قسملی، عبدالخالق بن زید۔ جب ان کے بیٹے عبدالرحمٰن نے ان سے سوال کیا ان کی حدیث تحریر کی جا سکتی ہے تو انہوں نے فرمایا: "زحفا"

علامہ معلمی فرماتے ہیں کہ یعنی جو شخص بہ تکلف ان سے حدیث تحریر کرنا چاہتا ہے تو کوئی حرج نہیں ہے جیسے بچہ بہ تکلف سُرین کے بل چلتا ہے۔ (۱)

ایسا لگتا ہے کہ امام ابو حاتم کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کی روایت قابل طرح نہیں بلکہ قابل اعتبار ہے۔ (۲)

حرکات

البتہ حرکات واشارات، مثلاً ہاتھ ہلانا، سر ہلانا، منہ بسورنا، چہرہ بگاڑنا وغیرہ تو یہ بھی بہت کم مستعمل ہے۔

ان کی حرکات کا معنی ومفہوم سمجھنا مشکل ہوتا ہے جب تک ان کے تلامذہ جنہوں نے ان حرکات کو دیکھا اور سمجھا ہے اگر وہ اس کا مفہوم نہ بتائیں، تو مفہوم سمجھنا آسان نہیں ہوتا۔

ویسے تتبع اور جستجو سے یہ پتہ چلتا ہے کہ عموماً یہ اشارات راویوں کے ضعف بیان کرنے کے لئے استعمال کیے گئے ہیں۔ (۳)

---

(۱)
(۲) الجرح والتعدیل ۲۱۷/۳، ہامش
(۳) شرح ألفاظ التجریح النادرة ص ۴۲، ۴۶
(۴) شرح ألفاظ التجریح النادرة ص ۹۹، ۱۱۷

تیسرا باب

ائمہ جرح و تعدیل کے بارے میں

اللہ تعالیٰ نے اس امت کو جو شریعت دی ہے وہ دائمی اور ابدی شریعت ہے، لہٰذا تا قیامت اس کو صحیح شکل میں باقی رکھنا تھا، اس لئے اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اس کے نازل کرنے والے نے اٹھائی اور فرمایا کہ ﴿ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ﴾ [حجر:۹]

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کرنے کیلئے ایسے افراد کو پیدا کیا جنہوں نے اس کو محفوظ رکھنے کیلئے ہر ممکن کوشش کی، اور اس میں رخنہ ڈالنے کی جتنی ناپاک کوششیں کی گئیں سب کی گرفت کی، انہوں نے اس کیلئے ہر ضروری تدبیر اختیار کیا، حالات و ضرورت کے مطابق سب سے پہلے تحقیق و جستجو اور روایت میں احتیاط کو ملحوظ رکھا، پھر آہستہ آہستہ حسب ضرورت طلب اسناد، معرفت رجال، اصول و ضوابط کا ایجاد کیا۔

تاریخ ائمہ جرح و تعدیل

دور صحابہ:- تحقیق و تثبت کا یہ کام دور صحابہ سے شروع ہو چکا تھا۔ چنانچہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کو قبیصہ بن ذویب نے یہ اطلاع دی کہ جدۃ (دادی) کا حصہ اللہ کے رسول نے میراث میں ایک سدس (چھٹا حصہ) مقرر فرمایا ہے، تو آپ نے اس کو نافذ کرنے سے پہلے اس کی مزید تحقیق کی، اس لئے کہ معاملہ حقوق و اموال کا تھا، جب اس کی تصدیق محمد بن مسلمہ نے کیا تب آپ نے اس کو نافذ کیا۔ (۱)

بقول امام ذہبی تحقیق و احتیاط کی یہ پہلی کوشش تھی جس کی بنیاد حضرت ابو بکر صدیقؓ نے رکھی۔ (۲)

(۱) موطاء امام مالك ۵۱۳/۲، معرفة علوم الحديث ص ۱۰۵

(۲) تذكرة الحفاظ ۳/۱

آپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے دیگر صحابہ نے تحقیق واحتیاط کو ملحوظ رکھا، کسی نے صرف ایک حدیث کی تصدیق اوراس کی معرفت کیلئے دو دو ماہ کا سفر کیا، تو کسی نے راوی حدیث سے قسم طلب کی، تو کسی نے تقلیل روایت کو اپنا اصول بنایا۔ اور اس طرح سے حدیث رسول کی حفاظت کا کام جاری رہا، پھر بات طلب اسناد تک پہنچی۔ (۱) اور راویوں کی تفتیش کا کام بھی شروع ہوا۔

علامہ ابن حبان حضرت عمر اور ابو موسیٰ اشعریؓ کے درمیان "حدیث استئذان"(۲) کے بارے میں جو واقعہ پیش آیا تھا اس کے ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ:

"وهذا ن أول من فتشا عن الرجال في الرواية و بحثا عن النقل في الأخبار"(۳)

سب سے پہلے راویوں کی تفتیش اور احادیث کے روایت کی تصدیق کا کام [بنیادی طور سے] ان دونوں نے شروع کیا۔

دور تابعین و تبع تابعین:-

پھر ان کے بعد دیگر حضرات نے ان کی اقتدا کی جن میں فقہاء سبعہ اور خاص طور سے سعید بن مسیّب قابل ذکر ہیں، پھر ان کے نقش قدم پر ان کے تلامذہ میں سے علماء مدینہ کی ایک جماعت نے عمل کیا، جن میں یحییٰ بن سعید انصاری، ہشام بن عروۃ، عروۃ بن زبیر وغیرہ شامل ہیں، ان میں سب سے زیادہ وسیع علم، قدر و منزلت، بلند ہمت و بلند پایہ شخصیت امام زہری کی ہے جنہوں نے سارے لوگوں کے علم کو جمع کر لیا تھا۔ (۴)

اور بقول امام مکحول: "ما رأيت أحدا أعلم بسنة ماضية من الزهري"(۵) کا مصداق بنے۔ یہی وہ دور تھا جس میں امام شعبیؒ کو بحیثیت مفتش اسناد شہرت ملی، اور بقول یحییٰ بن سعید قطان "أول من فتش عن الاسناد"(۶) قرار پائے، اور بقول امام ذہبی دور صحابہ کے خاتمہ کے بعد جن لوگوں نے جرح و تعدیل میں پہل کیا وہ امام شعبی کوفی، ابن سیرین بصری وغیرہ ہیں، انھوں نے کچھ لوگوں کی توثیق کی اور کچھ کی تضعیف کی۔ (۷)

---

(۱) طلب اسناد کی تفصیل ص ۲۳ پر گذر چکی ہے۔
(۲) یہ حدیث ص ۲۶ پر گذر چکی ہے۔
(۳) المجروحین ۱/ ۳۸
(۴) المجروحین ۱/ ۳۹
(۵) مصدر سابق
(۶) المحدث الفاصل ص ۲۰۸
(۷) ذکر من يعتمد قوله في الجرح والتعديل ص ۱۵۹

علامہ ابن حبان فرماتے ہیں: پھر رجال کی تحقیق، احادیث کی تفتیش، رجال کی معرفت، حفاظت سنت، ضعفاو کذابین کی نشاندہی اور ان سے روایت ترک کرنے کا کام، ان کے بعد کے ائمہ محدثین اور فقہائے دین نے کیا، جن میں امام اوزاعی، لیث بن سعد، حمادان، سفیان بن عیینہ کی جماعت تھی، لیکن ان میں سب سے زیادہ شہرت یافتہ تین افراد ہیں جنہوں نے اس کام کو اپنا پیشہ بنایا، وہ امام مالک، سفیان ثوری اور امام شعبہ ہیں۔ (۱)

ان میں امام شعبہ رحمتہ اللہ علیہ انتہائی جری وبیباک تھے، کسی سے بھڑ گئے، کسی کو تھپڑ رسید کیا، توکسی کو پولس کے حوالہ کیا، اس طرح اپنے زمانہ میں معرفت رجال اور نقدرجال کے قائداور امام بن کر بعد کے لوگوں کے لیے نمونہ بنے۔ (۲)

یہ وہ زمانہ تھا جب راویان حدیث کے صفوں میں ضعف وکمزوری، ضبط وتحمل میں نقص کے علاوہ دیگر اسباب کی وجہ ہونے لگی تھی۔ قبل ازیں خال خال ضعفاء پائے جاتے تھے لیکن اب ان میں کثرت ہونے لگی۔ لہذا سابقہ دور کے مقابلہ میں ان کے دور میں نقدرجال میں اور گرمی پیدا ہوگئی۔ پھر رفتہ رفتہ جوں جوں وقت گذرتا گیا، ضعفاء کی تعداد میں اضافہ، اسباب ضعف میں تنوع ہونے لگا تو پاسبان سنت نبوی نے وقت اور ضرورت کے مطابق اپنے عمل میں وسعت پیدا کیا۔

دور تابع اتباع التابعین اور ان کے تلامذہ :-

پھر ان مذکورہ حضرات کے بعد ان کے شاگردوں کا دور آیا، جنہوں نے ضعفاء کی تفتیش، اسباب ضعف کی معلومات، راویوں کی نقاب کشائی میں انتہائی دقت اور مہارت دکھائی۔ ان میں جو برگزیدہ شخصیات ہیں ان میں امام شافعی، وکیع بن جراح، عبداللہ بن المبارک، عبدالرحمٰن بن مہدی قابل ذکر ہیں، لیکن ان لوگوں میں سے جنہوں نے دین داری تقویٰ اور پرہیز گاری، تفقہ فی الدین کے ساتھ ساتھ نقدرجال کو اپنا اوڑھنا اور بچھونا بنایا وہ یحییٰ بن سعید قطان اور عبدالرحمٰن بن مہدی کی شخصیت ہے جو اس فن میں مشہور زمانہ اور مرجع خلائق بنے۔ (۳)

---

(۱) المجروحین ۱/۴۰ (۲) امام شعبہ کا تذکرہ کیلئے دیکھئے ص ۲۵۸

(۳) المجروحین ۱/۵۲

اور بقول امام ذہبی ان دونوں پر اہل علم کے اعتماد کا یہ عالم تھا کہ : "فمن جرحاه كان مجروحا لايكاد يندمل جرحه، ومن و ثقاه كان مقبولا"[1]
جن پر انہوں نے جرح کر دیا، ان کا جرح ختم ہونا ناممکن ہو گیا اور جس کی توثیق کر دی وہ قابل قبول ہوا۔

پھر ان کے بعد جو حضرات آئے وہ ان کے تلامذہ تھے، انہوں نے اپنی ذمہ داری ادا کرنے کے لیے ہر قربانی کو پیش کیا، راویوں کی معرفت کے لیے صحرا نوردی کی، بلاد اسلامیہ کی خاک چھانی، راویوں کے نقد میں مزید وسعت دی، ان کی مکمل معرفت کا بیڑا اٹھایا [کہاں پیدا ہوئے، کس ماحول میں پلے بڑھے، کہاں کہاں سفر کیا، کس سے کس جگہ اور کس سن میں علم حاصل کیا، ان کے تلامذہ کون تھے؟ سیرت و سلوک کیسا تھا، زہد و تقویٰ کا کیا عالم تھا، باعتبار جرح و تعدیل ان کی حیثیت کیا تھی، کس نے ان کے بارے میں کیا کہا، وفات کہاں ہوئی وغیرہ وغیرہ] یہی حضرات اس فن کے رہنما اور پیشوا بنے، ان میں وہ روشن ستارے ہیں جنہوں نے پوری ملت اسلامیہ کو اپنے علم سے منور کیا، ان میں امام احمد بن حنبل، علی بن مدینی اور یحییٰ بن معین کو خاص شہرت حاصل تھی، جب کہ دیگر حضرات نے اپنی اپنی بساط کے مطابق اپنے اپنے علاقہ میں اس فن کو جلا بخشا، جن میں ابن ابی شیبہ، اسحاق بن راھویہ، عبید اللہ بن عمر القواریری، زھیر بن حرب اور ان کے ہم عصر شامل ہیں۔[2]

دور اصحاب کتب ستہ:۔

یہ سنہرا سلسلہ اس طرح سے منتقل ہوتا ہوا مولفین کتب ستہ کے دور میں داخل ہو گیا۔ یہ وہ دور تھا جس میں امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ کا جلوہ تھا، آپ اور آپ کے تلامذہ و ہم طبقہ حضرات نے نقد رجال اور جمع رجال میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیا جس کی مثال نہیں ملتی۔ اس دور کے دیگر ماہرین نقد میں امام دارمی، امام یحییٰ ذھلی، امام مسلم، امام ابوداؤد وغیرہ شامل ہیں۔[3]

لیکن ان حضرات میں جنہوں نے اس فن کو اپنا شعار بنایا، جن کو مہارت تامہ

---

(۱) ذكر من يعتمد قوله فى الجرح و التعديل ص ١٦٧
(۲) المجروحين ١/٥٤
(۳) المجروحين ١/٥٧

حاصل ہوئی اور امامت گا منصب ملا وہ أمیر المؤمنین فی الحدیث محمد بن اسماعیل بخاری، امام ابوزرعہ عبدالکریم رازی، امام ابوحاتم رازی ہیں، جنہوں نے "التاریخ الکبیر" اور "الجرح و التعدیل" کا بے مثال تحفہ امت کو دیا، ان کتابوں کی تصنیف نے اس فن کو ایسا مضبوط کر دیا کہ اس میں رخنہ اندازی کی گنجائش باقی نہیں رہی۔

یہی وہ دور ہے جو متقدین اور متاخرین کے درمیان حد فاصل ہے۔(۱) نیز یہی وہ دور ہے جس میں کتب ستہ کا وجود عمل میں آیا۔ ان میں جس دقت نظر، تحقیق بالغ، حسن تنظیم و ترتیب اور حسن انتخاب سے مسائل کا احاطہ کیا گیا کہ ان کے بعد دیگر کتابوں کے تصنیف کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی اور تدوین حدیث کا کام قریب قریب اسی دور میں مکمل ہو گیا جو تیسری صدی کا خاتمہ تھا، اور سلسلہ اسناد میں کمی آنے لگی، کچھ ہی کتابیں ایسی ہیں جو چوتھی اور پانچویں دور میں تحریر ہوئیں۔

جس کی ذمہ داری ان کے بعد آنے والوں نے سنبھالی، نئے راویوں پر نقد، ان کے بارے میں معلومات یکجا کرنے کے علاوہ جملہ راویوں کو جمع اور تدوین کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا، ان کا تنقیہ اور تصفیہ کیا، ثقات اور ضعفاء کو الگ الگ کتابوں میں جمع کر دیا، اس دور میں جن ائمہ نقد کے کام بہت ہی نمایاں ہے ان میں امام عقیلی، ابن ابی حاتم رازی، ابن حبان، ابن عدی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

اس چوتھی صدی کے خاتمہ کیساتھ ساتھ راویان حدیث پر نئے اقوال اور جدید نقد کا دروازہ بند ہو گیا۔ اب ان کی جمع و ترتیب، ان میں مقابلہ آرائی استنباط نتائج، بحث و مباحثہ، تہذیب و تدوین وغیرہ ہی کا کام رہ گیا جو ہر دور میں کسی نہ کسی حد تک ہوتا رہا اور انشاء اللہ ہوتا رہے گا۔

اس طرح ان ائمہ ھدی و مصابیح الدجی، خدام سنت نبوی، اور پاسبان ملت بیضاء نے سنت رسول کو قیامت تک کیلئے محفوظ کرنے کا ایسا انتظام کر دیا کہ اسمیں نفوذ کی ہر کوشش ناکام و نامراد ہو گئی، اور اس طریقہ سے اللہ تعالیٰ کا کیا ہوا وعدہ ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ إِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ﴾ [حجر:۹] پورا ہوا۔

(۱) میزان الاعتدال ۱/ ٤

شہادت امہ بر صداقت أئمہ:-

یہ وہ ائمہ ہیں جن کی صداقت وامانت، پاکیزگی ودیانتداری مسلم ہے، حق گوئی وبے باکی ان کا شیوہ، تقویٰ وپرہیز گاری ان کا شعار تھا، ان کی زندگی قابل رشک، ان کا اسوہ قابل نمونہ تھا، ان کی زندگی پر نظر رکھنے والوں، ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والوں نے ان کے علم وفضل کو پہچانا، ان کی قدر وقیمت کو سمجھا، ان کی امانت وصداقت کو پرکھا، انہوں نے ان کی عدالت وثقافت، امانت وصداقت کی شہادت دی۔ جو جس کا مستحق تھا، اس کا حق اسے دیا۔

امام مکحول فرماتے ہیں کہ: سابقہ سنتوں کو امام زھری سے زیادہ جاننے والا میں کسی کو نہیں جانتا۔(۱)

نیز عراک بن مالک فرماتے ہیں کہ: سب سے زیادہ صاحب علم امام زھری ہیں، اس لیے کہ انہوں نے سارے اہل علم کے علم کو اکٹھا کرلیا۔(۲)

امام شافعی فرماتے ہیں کہ: جب محدثین کا ذکر ہوگا تو امام مالک ان میں روشن ستارہ ہوں گے۔(۳)

امام یحیٰ بن سعید فرماتے ہیں کہ: سفیان ثوری سے بڑھ کر حافظ میں نے کسی کو نہیں پایا۔(۴)

سفیان ثوری کہتے ہیں کہ: شعبہ آپ أمیر المؤمنین فی الحدیث ہیں۔(۵)

سلیمان بن مغیرہ فرماتے ہیں کہ: آپ سید المحدثین ہیں۔(۶)

سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں کہ: تین افراد اپنے اپنے زمانہ میں مرد میدان تھے حضرت ابن عباس، امام شعبی اور سفیان ثوری۔(۷)

ابن وھب فرماتے ہیں کہ: ہم نے چار آدمیوں سے علم حاصل کیا اگر یہ نہ ہوتے تو ہم سب گمراہ رہتے۔ ان میں دو مصری ہیں لیث بن سعد اور عمرو بن الحارث،

---

(۱) المجروحین ۳۹/۱
(۲) المجروحین ۱ /۳۹
(۳) مصدر سابق ۴۱/۱
(۴) مصدر سابق ۱ /۵۰
(۵) المجروحین ۴۶/۱
(۶) مصدر سابق
(۷) مصدر سابق ۵۰/۱

اور دو مدنی ہیں مالک بن انس اور ماجشون۔ (۱)

امام ابو داؤد طیالسی فرماتے ہیں کہ: ہم نے حدیث چار آدمیوں کے پاس پائی زھری، قتادہ، اعمش، ابو اسحاق [سبیعی] اور ان میں اسناد کے سب سے زیادہ جانکار زھری تھے۔ (۲)

امام علی بن مدینی، شعبہ، سفیان، ابن مھدی اور یحییٰ قطان کا ذکر خیر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ: ان میں یحییٰ بن سعید قطان اسناد کے مخارج اور اس میں جرح کے مقامات کو سب سے زیادہ جانتے تھے۔ (۳)

فرھبانی نے یحییٰ بن معین، علی بن مدینی، احمد بن حنبل اور ابو خیثمہ کے ذکر کے بعد فرمایا ہے کہ ان میں یحییٰ رجال کے سب سے زیادہ ماہر تھے۔ (۴)

امام عبدالرحمٰن بن مھدی فرماتے ہیں کہ چار افراد ایسے تھے جن کو اپنے دور میں امامت کا درجہ حاصل تھا حماد بن زید کو بصرہ میں، سفیان ثوری کو کوفہ میں، امام مالک کو مدینہ میں اور امام اوزاعی کو شام میں۔ (۵)

امام ابو داؤد طیالسی فرماتے ہیں کہ: حدیث اور رجال حدیث کو یحییٰ بن سعید قطان سے زیادہ جاننے والا میں نے کسی کو نہیں پایا۔ (۶)

امام احمد فرماتے ہیں کہ: رجال کے معاملہ میں یحییٰ بن سعید سے بڑا محقق میں کسی کو نہیں جانتا۔ (۷)

امام علی بن مدینی فرماتے ہیں کہ: اگر مجھ کو حجر اسود اور مقام ابراہیم کے درمیان قسم کھانا پڑے تو میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ میں نے عبدالرحمٰن بن مہدی سے بڑھ کر حافظ کسی کو نہیں دیکھا۔ (۸)

فرھبانی سے امام یحییٰ بن معین، علی بن مدینی، احمد بن حنبل اور ابو بکر بن ابی شیبہ کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ: علی بن مدینی حدیث اور علل

---

(۱) مصدر سابق ۱/ ۵۰ — (۲) تدریب الراوی ۲/ ۴۰۱

(۳) تدریب الراوی ۲/ ۴۰۱ — (۴) تدریب الراوی ۲/ ۴۰۱

(۵) المجروحین ۱/ ۴۴ — (۶) مصدر سابق ۱/ ۵۲

(۷) تدریب الراوی ۲/ ۴۰۳ — (۸) المجروحین ۱/ ۵۲

حدیث کو سب سے زیادہ جانتے تھے اور رجال حدیث کی سب سے زیادہ معرفت یحییٰ بن معین کو تھی، فقہ حدیث کا علم سب سے زیادہ احمد بن حنبل کو تھا اور ابو خیثمہ بڑے ذہین و فطین تھے۔[۱]

نیز امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ: اہل خراسان کے چار افراد پر حفظ کا خاتمہ ہے۔ ابوزرعہ رازی، محمد بن اسماعیل بخاری، عبداللہ بن عبدالرحمٰن دارمی، حسن بن شجاع بلخی[۲]

یہ اور اس طرح کی بے شمار شہادتیں ہیں جو ائمہ کرام و محدثین عظام کے سلسلہ میں دی گئی ہیں۔ یہ حضرات ہر دور اور زمانہ میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کی عدالت، صداقت اور امانت پر کوئی انگشت نمائی نہیں کر سکتا تھا۔

ائمہ جرح و تعدیل کا اظہار حق :-

یہ وہ ائمہ ہیں جن کی تحقیق بڑی معیاری، جن کا فیصلہ مبنی بر انصاف اور جن کی باتیں سراپا صداقت ہوا کرتی تھیں، یہ حق گوئی و بے باکی میں بے مثال تھے، بلا خوف و خطر برملا حق کا اظہار کرتے تھے۔ قرابت داروں کی قرابت داری، دوست و احباب کا گلہ شکوہ، پڑوس و محلہ اور معاشرہ کے کسی دباؤ کا خیال کئے بغیر فیصلہ سناتے تھے۔

امام شعبۃ فرماتے ہیں کہ: حسان بن حسان کا مجھے بڑا خوف ہے، وہ میرے داماد ہیں لیکن حافظ حدیث نہیں ہے۔[۳]

وکیع بن جراح اپنے والد سے محض بیت المال کا ذمہ دار ہونے کی وجہ سے روایت بیان کرنے میں احتیاط برتتے تھے اور اگر ان کے واسطہ سے بیان بھی کرتے تھے تو ساتھ میں کسی اور راوی سے موافقت ملاتے تھے۔[۴]

علی بن مدینی سے جب ان کے والد کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے سر جھکا لیا اور فرمایا: یہ معاملہ دین کا ہے، وہ ضعیف ہیں۔[۵]

یحییٰ بن معین نے علی بن قرین کے بارے میں فرمایا کہ: وہ کذاب ہے، جب

---

(۱) تدریب الراوی ۲/ ٤٠١ (۲) تدریب الراوی ۲/ ٤٠٤
(۳) الکامل فی ضعفاء الرجال ۱/ ۸۱ (٤) أسباب اختلاف المحدثين ۱/ ٥٠
(٥) تهذيب التهذيب ٥/ ١٧٦، الاعلان بالتوبيخ ص ٦٦

ان سے یہ کہا گیا کہ یہ تو آپ کی خدمت میں بہت رہتے تھے، (آپ سے دوستی تھی) تو فرمایا بات صحیح ہے، مگر حق بات نہ کہوں تو اللہ تعالیٰ سے شرم آتی ہے۔[1]

زید بن انیسہ نے اپنے بھائی کے بارے میں فرمایا کہ میرے بھائی سے روایت مت قبول کرنا۔[2] ان کا ذکر کذابین میں ہوتا ہے۔[3]

امام ابوداؤد صاحب سنن اپنے بیٹے عبداللہ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ وہ کذاب ہے۔[4]

ائمہ جرح و تعدیل کا خوف الٰہی :-

خشیت الٰہی اور احتساب نفس اور جواب دہی کے خوف کا یہ عالم تھا کہ ہاتھ پیر کانپ اٹھتے تھے جس کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

ایک مرتبہ یحییٰ بن معین نے اپنے شاگردوں سے کہا کہ ہم ایسے لوگوں کے بارے میں زبان طعن دراز کرتے ہیں جو دو سو سال پہلے ہی جنت میں پڑاؤ ڈال چکے ہوں گے۔ جب اس واقعہ کی اطلاع ابن ابی حاتم کو ملی وہ اس وقت کتاب "الجرح و التعدیل" پڑھا رہے تھے، تو خوف کے مارے ان کے ہاتھ کانپنے لگے، یہاں تک کہ کتاب ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی۔[5]

لیکن اس کے باوجود ہم ان ائمہ کو معصوم عن الخطاء نہیں قرار دیتے جیسا کہ دوسروں کا اپنے ائمہ کے بارے میں خیال ہے۔ غلطی اور بھول چوک کا سرزد ہونا فطری امر ہے، لہٰذا ہر ایک کے قول اور اس کے مخرج، اسباب جرح و تعدیل، حکم لگانے کا ماحول وغیرہ پر نظر ثانی کرنا، ان کے اقوال کی تکمیل اور مقصد کے حصول کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔

ائمہ کا عطائی ملکہ:-

اللہ تعالیٰ نے ان کو جو شوق وذوق، جو تجربہ اور مہارت عطا کیا تھا اس کی بنیاد پر وہ ماہر سنار کی طرح کھرے کھوٹے کو پرکھ لیتے تھے، حدیث رسول میں نور نبوت کی

---

(۱) التاریخ ۷۷/۱ — (۲) صحیح مسلم ۱۲۱/۱

(۳) الاعلان بالتوبیخ ص ٦٦ — (٤) میزان الاعتدال ٤۳۳/٤

(۵) سیر اعلام النبلاء ۸۲/۱۱

جھلک، آپ کے کلمات کی کی لطافت و صداقت، رسول کی معیار گفتگو، ان لوگوں کے دل ودماغ میں پیوست ہو چکا تھا، جس کو سنتے ہی ان کو ایک طرح کا لطیف احساس ہو جاتا تھا کہ یہ حدیث رسول ہے کہ نہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو جو فطری ملکہ عطا کیا تھا حدیث پاک کو سنتے ہی ان کو اس کی صحت اور عدم صحت کا احساس ہو جاتا تھا۔

ربیع بن خثیم فرماتے ہیں کہ: إن للحديث ضوء كضوء النهار تُعرّفه، و ظلمة كظلمة الليل تنكره.(۱) دن کی روشنی کی طرح حدیث پاک پر چمک ہوتی ہے جو خود اپنی پہچان کراتی ہے اور رات کی تاریکی کی طرح ظلمت ہوتی ہے۔[اگر حقیقت میں حدیث رسول نہ ہو تب]جو اس سے نفرت دلاتی ہے۔

امام عبد الرحمٰن بن مهدی سے کسی نے پوچھا کہ آپ جھوٹوں کو کیسے پہچان جاتے ہیں، انہوں نے جواب دیا جیسے ڈاکٹر مجنوں و پاگل کو پہچان لیتا ہے۔(۲)

علامہ ابن الجوزی فرماتے ہیں کہ: منکر حدیث کو سن کر طالب علم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس کے دل میں نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔(۳)

علامہ بلقینی فرماتے ہیں کہ اس کی مثال ایسے ہے جیسے اگر کوئی شخص کسی کی خدمت ایک دو سال کرتا ہے تو وہ اس کے مزاج، پسند اور ناپسند سے واقف ہو جاتا ہے، اب اگر کوئی تیسرا شخص اس آدمی کے بارے میں اس کے برخلاف کہتا ہے تو خدمت کرنے والا فوراً اس کی غلطی پکڑ لے گا۔ یہی معاملہ حدیث رسول کا بھی ہے، اس کی خدمت کرنے والا مجرد اس کو سن کر اس کی صحت اور عدم صحت کا پتہ لگا سکتا ہے۔(۴)

ان ائمہ کی مثال اس ماہر صراف کی طرح ہے جو کھرے اور کھوٹے کو دیکھتے ہی بتا دیتا ہے اور بہت ممکن ہے کہ جب اس سے اس کا سبب پوچھا جائے تو وہ نہ بتا سکے۔

امام ابو حاتم فرماتے ہیں کہ: میرے پاس ایک شخص حدیثوں کا دفتر لے کر آیا میں نے ان حدیثوں کو دیکھ کر عرض کیا کہ: بعض میں غلطی ہے، بعض میں تداخل ہے بعض میں دروغ گوئی ہے، بعض میں نکارت ہے، بقیہ حدیثیں صحیح ہیں۔

---

(۱) تدريب الراوی ۱/۲۷۵ (۲) الجرح و التعديل ۲/۲۰
(۳) تدريب الراوی ۱/۲۷۵ (٤) مصدر سابق ۱/۲۷٦

اس نے کہا کہ یہ آپ کو کیسے پتہ چلا، کیا اس کتاب کے راوی نے آپ کو یہ خبر دی ہے؟ میں نے کہا کہ نہیں۔ نہ میں کتاب کو جانتا ہوں نہ اس کے راوی کو، اس نے کہا تو کیا غیب دانی کا دعویٰ ہے؟ میں نے کہا نہیں۔ اس نے کہا پھر آپ کی باتوں پر دلیل کیا ہے؟ میں نے کہا کہ ایسے اہل علم سے جاکر پوچھ لو جس کو میری طرح معلومات ہے۔ اس نے کہا کہ کس کے پاس ہے؟ جواب دیا ابوزرعہ کے پاس، وہ شخص ابوزرعہ کے پاس وہ نسخہ لے کر آیا انہوں نے بھی ٹھیک اسی طرح کا حکم ان حدیثون پر لگایا جس طرح میں نے لگایا تھا، اس نے کہا کہ یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ دونوں کی رائے بالکل ایک جیسی ہے جب کہ دونوں نے آپس میں کوئی رائے نہیں کی۔ میں نے کہا کہ معاملہ ایسے ہی ہے یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ علم ہے، جس طرح ماہر سنار کھرے کھوٹے کو عطائی علم سے بتا دیتا ہے اس طرح سے ہم کو اس کی معرفت عطا کی گئی ہے۔[1]

اقسام ائمہ:-

ان ائمہ میں سے کچھ حضرات ایسے ہیں جنہوں نے اکثر و بیشتر راویوں پر کلام کیا ہے۔ جیسے یحییٰ بن معین اور ابو حاتم رازی۔

کچھ ایسے ہیں جنہوں نے ایک بڑی تعداد پر کلام کیا ہے جیسے امام مالک و شعبہ بن حجاج۔ اور کچھ ایسے ہیں جنہوں نے چند افراد پر گفتگو کیا ہے جیسے امام ابو حنیفہ، ابن عیینۃ اور امام شافعی[2]

یقیناً یہ اپنے اپنے دور کی ضرورت اور امام کے مزاج کی بات تھی، ظاہر بات ہے کہ جو ضرورت ابو حاتم اور یحییٰ بن معین کو پڑی وہ ابن عینیہ اور شافعی کو نہیں تھی۔

پھر بقول امام ذھبی ان میں سے ہر ایک کی تین قسمیں ہیں۔

متشدد: جیسے ابن معین، ابو حاتم، جوزجانی

متوسط: جیسے احمد بن حنبل، بخاری، ابوزرعہ، ابن عدی

---

(۱) الجرح والتعدیل ۳٤۹/۱، ۳٥۰

(۲) ذکر من یعتمد قوله فی الجرح و التعدیل ص ۱٥۸

متساهل: ابو عیسی ترمذی، ابو عبد اللہ حاکم، ابو بکر بیہقی (۱)

امام ذہبی کی یہ تقسیم بظاہر محل نظر ہے، جس سے مختلف چور دروازے نکلتے ہیں، اس تقسیم کا کچھ فائدہ تعارض اقوال کیوقت ضرور ہو سکتا ہے، ترجیح اقوال میں مدد مل سکتی ہے، لیکن اس کا ضرر اسکے نفع سے زیادہ ہے۔ تعارض اقوال کب ہوتا اس میں توفیق کی، کیا صورت ہو سکتی ہے، سب کا ضابطہ موجود ہے۔ لہٰذا اس جانبی قاعدے کی کوئی خاص ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ اس نقطہ پر تفصیلی گفتگو قواعد کے باب میں گذر چکی ہے۔ (۲)

ائمہ کے بارے میں معلومات کی جگہیں:-

ان ائمہ کرام کی بہت بڑی تعداد ہے جنہوں نے اپنے اپنے دور میں جرح و تعدیل کی ذمہ داری سنبھالی تھی، ان سب کا یہاں پر تذکرہ کرنا ممکن نہیں، ان سب حضرات کا تفصیلی اور اجمالی ذکر اسلاف کی کتابوں میں موجود ہے، خاص طور سے "تذكرة الحفاظ" اور "سير أعلام النبلاء" میں۔

ان میں سے بڑے بڑے چند ماہرین فن اور اکابر نقاد کا تفصیلی ذکر ابن ابی حاتم رازی نے "الجرح و التعديل" کے مقدمہ میں کیا ہے جن کی تعداد (۱۷) ہے۔ (۳)

اسی طرح سے کچھ اہم اکابرین کا ذکر خیر ابو حاتم ابن حبان نے "المجروحين من المحدثين" کے مقدمہ میں کیا ہے۔ (۴)

جب کہ حافظ ابن عدی نے "مقدمة الكامل في ضعفاء الرجال" میں دور صحابہ سے لے کر اپنے دور تک کے علماء نقاد کا تذکرہ کیا ہے جو معلومات کا خزانہ ہے، اس میں (۷۵) افراد کا ذکر موجود ہے۔ (۵)

امام ذہبی نے "ذكر من يعتمد قوله في الجرح و التعديل" کے نام سے ایک کتاب تحریر کی ہے جس میں آپ نے اپنے دور تک ان ائمہ کی فہرست پیش کی ہے جن کے اقوال جرح و تعدیل کے سلسلہ میں مقبول ہیں، ان کی جملہ تعداد اس کتاب

---

(۱) ذكر من يعتمد قوله في الجرح و التعديل ص ۱۵۹ (۲) دیکھئے صفحہ ۲۱۵
(۳) دیکھئے ۱/۱۰ سے آخری جلد تک (۴) ملاحظہ ہو ۱/۳۸-۶۰
(۵) ملاحظہ ہو ۱/۶۱-۱۴۷

میں (۷۱۵) ہے۔[1]

امام سخاوی نے: "المتکلمون فی الرجال" اور" الاعلان بالتوبیخ" میں کچھ منتخب افراد کے ناموں کاذکر اسی ترتیب سے کیا ہے جن کی تعداد اس کتاب میں (۲۰۹) ہے۔[2]

استاذ گرامی جناب جناب ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی نے اپنی کتاب "دراسات فی الجرح و التعدیل" کے آخری باب میں چوتھی صدی تک، صاحب "تحفۃ الاحوذی" نے مقدمہ تحفہ کی ستائیسویں فصل میں اہم اہم ائمہ کا ترجمہ حافظ ابن حجر تک کیا ہے۔ [3] تفصیل کے لیے اس کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

زیر نظر کتاب میں انہیں ائمہ کرام کی زندگی کا مختصر خاکہ پیش کیا گیا ہے، جن کی کتابوں کا تعارف اس کتاب میں موجود ہے، صرف تین ائمہ ایسے ہیں جن کی کتابوں کا ذکر اس میں نہیں ہے لیکن اہمیت کے پیش نظر ان کا بھی ترجمہ کر دیا گیا ہے، وہ یہ ہیں:

امام شبعه : جن کی خدمات رجال حدیث کے سلسلہ میں نہایت اہم اور متنوع ہیں، جن کے بارے میں صالح جزرہ کا فرمان ہے کہ "أول من تكلم فى الرجال شعبة، ثم تبعه القطان ، ثم أحمد و يحيىٰ." [4]

یحییٰ بن سعید القطان اور عبدالرحمن بن مهدی: جن کے بارے میں امام ذھبی فرماتے ہیں کہ "قد انتدب فى هذا الزمان عبدالرحمن بن مهدى و ابن القطان ، فمن جرحاه لا يكاد يندمل جرحه، و من وثقاه فهو الحجة." [5] ان کا ذکر نہ کرنے سے ایک عجیب سی تشنگی محسوس ہو رہی تھی۔

مشهور ائمۂ نقد:

جب کہ کچھ مشہور ائمہ کرام کے ناموں کی فہرست بھی بترتیب زمانہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں، ملاحظہ فرمائیں۔

---

(۱) دیکھئے ص ۲۱۳ ختم کتاب (۲) المتکلمون فی الرجال ص ۱۲۹

(۳) دیکھئے ص ۹۶-۱۰۴ (٤) تهذيب التهذيب ٣٤٥/٤

(۵) ذکر من یعتمد قوله فی الجرح والتعدیل ص ۱٦٧

صحابہ میں

نام	پیدائش	وفات
عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ	۴۰ قبل ہجرت	۲۳ھ
علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ	۲۳ قبل ہجرت	۴۰ھ
عبادۃ بن صامت رضی اللہ عنہ	۳۸ قبل ہجرت	۳۴ھ
عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ	۳ قبل ہجرت	۶۸ھ
عائشہ ام المومنین رضی اللہ عنہا	۹ قبل ہجرت	۵۸ھ
انس بن مالک رضی اللہ عنہ	۱۰ قبل ہجرت	۹۴ھ

تابعین میں

نام	پیدائش	وفات
سعید بن میبّب	۱۳ھ	۹۴ھ
عامر بن شرحبیل شعبی	۱۷ھ	۱۰۳ھ
محمد بن سیرین	۳۳ھ	۱۱۰ھ
حسن بصری	۲۲ھ	۱۱۰ھ
ابن شہاب زہری	۵۰ھ	۱۲۴ھ

دوسری صدی میں

نام	پیدائش	وفات
اوزاعی عبدالرحمٰن بن عمرو	۸۸ھ	۱۵۷ھ
شعبہ بن حجاج	۹۲ھ	۱۶۰ھ
سفیان ثوری	۹۷ھ	۱۶۱ھ
مالک بن انس	۹۳ھ	۱۷۹ھ
عبداللہ بن مبارک	۱۱۸ھ	۱۸۱ھ
وکیع بن جراح	۱۲۹ھ	۱۹۷ھ
سفیان بن عیینہ	۱۰۷ھ	۱۹۸ھ
یحیٰ بن سعید قطان	۱۲۰ھ	۱۹۸ھ
عبدالرحمٰن بن مہدی	۱۳۵ھ	۱۹۸ھ

تیسری صدی میں

جس میں جرح و تعدیل کی کتابیں تحریر ہونا شروع ہوئیں، اس صدی کا خاتمہ متقدین اور متاخرین کے درمیان حد فاصل ہے۔

نام	پیدائش	وفات
محمد بن سعد	......	۲۳۰ھ
یحیٰ بن معین	۱۵۸ھ	۲۳۳ھ
علی بن مدینی	۱۶۱ھ	۲۳۴ھ
احمد بن حنبل	۱۶۴ھ	۲۴۱ھ
عبدالرحمٰن بن دُحیم	۱۷۰ھ	۲۴۵ھ
امام دارمی ابو محمد	۱۸۰ھ	۲۵۵ھ
امام بخاری ابو عبداللہ	۱۹۴ھ	۲۵۶ھ
احمد بن عبداللہ عجلی	۱۸۲ھ	۲۶۱ھ
مسلم بن حجاج قشیری	۲۰۴ھ	۲۶۱ھ
ابوزرعہ عبدالکریم رازی	۲۰۰ھ	۲۶۴ھ
ابو حاتم محمد بن ادریس رازی	۱۹۵ھ	۲۷۷ھ

چوتھی صدی

نام	پیدائش	وفات
ابو عبدالرحمٰن نسائی	۲۱۵ھ	۳۰۳ھ
محمد بن خزیمۃ	۲۳۲ھ	۳۱۱ھ
ابو جعفر عقیلی	-	۳۲۲ھ
ابن ابی حاتم رازی	۲۴۰ھ	۳۲۷ھ
ابو حاتم ابن حبان بستی	۲۷۰ھ	۳۵۴ھ
ابواحمد بن عدی	۲۷۷ھ	۳۶۵ھ
ابوالفتح ازدی	-	۳۷۴ھ

نام	پیدائش	وفات
ابوالحسن دار قطنی	۲۸۵ھ	۳۸۵ھ
ابن شاہین	۲۹۷ھ	۳۸۴ھ

اس چوتھی صدی کے خاتمہ کیساتھ ساتھ راویان حدیث کے بارے میں کوئی جدید کدو کاوش باقی نہیں بچی، اب جو کام باقی بچا جمع، ترتیب، تدوین، تہذیب، استدراک استخراج کا کام رہ گیا۔[1]

پانچویں صدی

نام	پیدائش	وفات
ابو عبداللہ حاکم	۳۲۰ھ	۴۰۵ھ
ابو نعیم اصبہانی	۳۳۱ھ	۴۳۰ھ
ابوذر ھروی	۳۵۵ھ	۴۳۴ھ
ابو محمد بن حزم	۳۸۴ھ	۴۵۶ھ
ابو بکر بیہقی	۳۸۴ھ	۴۵۸ھ
خطیب بغدادی	۳۹۲ھ	۴۶۳ھ
ابن عبدالبر	۳۶۸ھ	۴۶۳ھ
ابوالولید باجی	۴۰۳ھ	۴۷۴ھ
ابن ماکولا	۴۲۲ھ	۴۷۵ اور ۴۸۶ھ

چھٹی صدی

نام	پیدائش	وفات
ابوالقاسم ابن عساکر	۴۹۹ھ	۵۷۱ھ
ابو موسیٰ مدینی	۵۰۱ھ	۵۸۱ھ
عبدالحق اشبیلی	۵۱۰ھ	۵۸۱ھ
ابو بکر حازمی	۵۴۸ھ	۵۸۴ھ
ابن جوزی	۵۱۰ھ	۵۹۷ھ
عبدالغنی مقدسی	۵۴۱ھ	۶۰۰ھ

(۱) دراسات فی الجرح والتعدیل ص ٤٣٤

ساتویں صدی

نام	پیدائش	وفات
ابوالحسن بن قطان فاسی	۵۶۲ھ	۶۲۸ھ
ابن نقطہ	۵۷۹ھ	۶۲۹ھ
صریفینی	۵۸۱ھ	۶۴۱ھ
ابن نجار بغدادی	۵۷۸ھ	۶۴۳ھ
ابوعمرو بن الصلاح	۵۷۷ھ	۶۴۳ھ
زکی الدین منذری	۵۸۱ھ	۶۵۶ھ

آٹھویں صدی

نام	پیدائش	وفات
ابن دقیق العید	۶۲۵ھ	۷۰۲ھ
ابن تیمیہ	۶۶۱ھ	۷۲۸ھ
ابن سید الناس	۶۷۱ھ	۷۳۴ھ
ابوالحجاج مزی	۶۵۴ھ	۷۴۲ھ
ابوعبداللہ ذہبی	۶۷۳ھ	۷۴۸ھ
ابوسعید علائی	۶۹۴ھ	۷۶۱ھ
ابوعبداللہ مغلطائی	۶۸۹ھ	۷۶۲ھ
صفدی	۶۹۶ھ	۷۷۴ھ
حسینی	۶۶۵ھ	۷۶۵ھ

نویں صدی

نام	پیدائش	وفات
زین الدین ابوالفضل عراقی	۷۲۵ھ	۸۰۶ھ
ولی الدین ابوزرعہ عراقی	۷۶۲ھ	۸۲۶ھ
برہان الدین حلبی	۷۵۳ھ	۸۴۱ھ
ابن حجر عسقلانی	۷۷۳ھ	۸۵۲ھ
بدرالدین عینی	۷۶۲ھ	۸۵۵ھ
نجم بن فہد	۸۱۲ھ	۸۸۵ھ

اس طرح ہر زمانہ اور ہر دور میں جرح و تعدیل اور نقد رجال کا کام ہو تا رہا ہے اور ہو تا رہے گا، البتہ متقدین کا فیصلہ متاخرین کے مقابلہ میں اقرب الی الصواب ہو تا ہے۔[۱] اب بعض ائمہ جرح کا تعارف ملاحظہ فرمائیں۔

امیر نقاد امام شعبہ بن حجاج ازدی

(۸۳-۱۶۰ھ)

دوسری صدی ہجری میں جب تابعین کا دور ختم ہو رہا تھا اور تبع تابعین کا دور شروع ہو چکا تھا، اس وقت اسباب جرح میں اضافہ ہونے لگا ضعفاء کی تعداد بڑھنے لگی، امت کو ائمہ نقاد کی شدید ضرورت تھی ایسے وقت میں اللہ تعالیٰ نے اس امت کو شعبہ بن حجاج جیسی شخصیت عطا کی جنہوں نے حدیث رسول کی حفاظت کے لیے ہر ممکن کوشش کیا، ضعفاء کی نشاندہی، ان کے خلاف کارروائی، حدیث کی تحقیق، سندوں کی جستجو، علل و مراسیل اور منقطع کی معرفت حاصل کی، امت کو نقد حدیث و رجال کے پرکھنے کا اصول دیا، تدلیس اور مدلسین کے خلاف نفرت اور حقارت کا اظہار کیا۔ بلکہ بعض جگہ آپ کی سختی ضرورت سے زیادہ محسوس کی گئی، حالانکہ اس وقت جو ابتدائی مرحلہ تھا وہاں اس طرح کی سختی اور احتیاط کی ضرورت تھی تاکہ آئندہ کے لیے ان کا سدباب کیا جاسکے۔ آپ کی زندگی کا خاکہ پیش خدمت ہے۔

نام و نسب : آپ کا اسم گرامی شعبہ بن حجاج بن ورد ابو بسطام واسطی، عتکی، ازدی ہے۔[۲]

آپ کا خاندان عتیک یا ابن عتیک کا آزاد کردہ تھا، جو قبیلہ ازد کا ذیلی قبیلہ ہے۔ اس لیے آپ کو عتکی اور ازدی کہا جاتا ہے۔[۳]

کچھ لوگوں نے آپ کو مولی الأشاقر کہا ہے۔[۴]

ولادت : آپ کی ولادت عبد الملک بن مروان کے زمانہ میں حسب اختلاف

---

(۱) دیکھیے المتکلمون فی الرجال ص ۸۵-۱۲۹

(۲) تاریخ کبیر ۴/ ۲۴۴، سیر اعلام ۷/ ۲۰۲ - ۲۰۳

(۳) تاریخ کبیر ۴/ ۲۴۴، اللباب فی تهذیب الأنساب ۲/ ۳۲۲

(۴) طبقات خلیفة ص ۲۲۲

روایت ۸۰، ۸۲، یا ۸۳ھ میں ہوئی۔[1]

بقول ابن حبان آپ کی ولادت واسط کے ایک گاؤں نہریان میں ۸۳ھ میں ہوئی، آپ کی پرورش بھی یہیں ہوئی، لیکن اس کے بعد آپ کا قیام بصرہ میں رہا۔ امام ذھبی فرماتے ہیں کہ آپ کی ولادت ونشو ونما واسط میں ہوئی، سکونت بصرہ میں اختیار کیا جب کہ آپ کا علم کوفی ہے۔[2]

طلب حدیث کی ابتدا: -ابتدا میں آپ کو شعر وشاعری سے بڑی دلچسپی تھی، طِرِمّاح بن حکیم طائی جو بڑا مشہور شاعر تھا آپ اس کے ہمراہ رہنے لگے۔ ایک دن حکم بن عتیبہ کے پاس سے آپ کا گذر ہوا جو درس حدیث دے رہے، قسمت نے یہیں سے پلٹا کھایا، حدیث اور درس حدیث کی محبت دل میں اتر گئی اور اسی دن سے طلب حدیث میں لگ گئے۔[3] اور ایسی مہارت حاصل کی کہ ہم عصروں پر فائق ہوئے اور "أمیر المحدثین" جیسے اہم خطاب سے نوازے گئے۔

طلب علم کے لیے سفر : آپ نے علم حدیث کے حصول اس میں تحقیق و تدقیق کے لیے مختلف مقامات کا سفر کیا جس میں کوفہ، شام، حجاز، مصر وغیرہ شامل ہیں۔ آپ نے بغداد کا سفر دو مرتبہ کیا ہے، ایک مرتبہ طلب حدیث کے لیے اور ایک مرتبہ اپنے بھائی کو رہا کرانے کے لیے جو قرض کی وجہ سے قید تھے۔ اس سفر میں آپ سے لوگوں نے علم حاصل کیا جب کہ خلیفہ مھدی نے آپ کو دیکھتے ہی ان کے بھائی کو رہا کر دیا اور قرض کو معاف کر دیا۔[4]

خطیب بغدادی فرماتے ہیں کہ: آپ نے کوفہ، بصرہ اور مصر کا علم جمع کیا تھا۔[5]

ابن حبان فرماتے ہیں کہ: امام شعبہ، امام مالک سے زیادہ سفر کرنے والے اور طلب سنن میں زیادہ تیز تھے۔[6]

اساتذہ : آپ کے اساتذہ کی بہت بڑی تعداد ہے جن میں تابعین کی ایک بڑی جماعت ہے۔ امام حاکم کے کہنے کے مطابق آپ نے چار سو مشائخ تابعین سے روایت

---

(۱) الثقات لابن حبان ٦/٤٤٦
(۲) سیر أعلام النبلاء ٧/٢٠٣، ٢٠٧
(۳) تاریخ بغداد ٩/٢٥٧، سیر أعلام ٨/٢١٢
(٤) تاریخ بغداد ٩/٢٥٦
(٥) تاریخ بغداد ٩/٢٥٩
(٦) المجروحین ١/٤٦

کیاہے، جبکہ انس میں مالک اور عمرو بن سلمہ رضی اللہ عنہما کو آپ نے دیکھاہے۔ (۱)

آپ کے مشائخ میں حسن بصری، قتادۃ بن دعامہ، انس بن سیرین، عمرو بن دینار، یحییٰ بن ابی کثیر، ابواسحاق سبیعی، حکم بن عتیبہ اور آپ کے ہم عمروں میں امام مالک، سفیان ثوری، ابن المبارک، ہشام دستوائی وغیرہ ہیں۔ (۲)

تلامذہ : آپ کی شہرت علم نے اس وقت کے طالبان علوم نبوت کو آپ کی جانب متوجہ کیا اور بہت بڑی تعداد نے آپ سے علم حاصل کیا، جن میں آپ کے بعض مشائخ و اُقران شامل ہیں۔ ان میں ایوب سختیانی، سعید الجریری، امام اعمش، منصور بن معتمر، سفیان ثوری، عبداللہ بن مبارک کے علاوہ سفیان بن عیینہ، ابواسحاق فزاری، حماد بن زید، حماد بن سلمہ، یحییٰ القطان، عبدالرحمٰن بن مہدی، ابوداؤد طیالسی، قاضی ابو یوسف جیسے نامور اہل علم و فضل شامل ہیں۔ حافظ ابو عبداللہ بن مندہ نے آپ کے شاگردوں کو ایک خاص کتاب "الرواۃ عن شعبۃ" میں جمع کردیاہے۔ (۳)

حافظہ : آپ کا قوت حافظہ بہت اچھا تھا اسی لیے آپ زیادہ تر اعتماد حافظہ پر کرتے تھے، حدیث تحریر کرنے کی عادت آپ کو نہیں تھی، بہت سے اہل علم اپنی یادداشت کو آپ کے مقابلہ میں ترک کردیتے تھے۔

قراد ابونوح فرماتے ہیں کہ میں امام شعبہ کے شاگرد عبداللہ بن عثمان کے پاس آتا تھا اور آپ کی پڑھائی ہوئی روایت کو ان کے پاس تحریر کرلیتا پھر امام شعبہ کے پاس جاتا اور ان حدیثوں کے بارے میں سوال کرتا، جب آپ ان کو پڑھتے تو اس میں اور میرے پاس تحریر شدہ روایت میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ (۴)

جو کچھ آپ نے تحریر کیا تھا اس پر اعتماد کم کرتے تھے، اس کے بارے میں اپنے بیٹے سعد کو یہ وصیت کردی تھی کہ میرے وفات کے بعد اس کو دھو دینا، چنانچہ انہوں نے ایساہی کیا۔ غالباً وہ یہ سوچتے تھے کہ کبھی یہ تحریر کسی غیر معتبر کے ہاتھ میں

---

(۱) تهذيب التهذيب ٣٤٦/٤

(۲) سير أعلام النبلاء ٢٠٣/٧ ، تهذيب التهذيب ٣٣٩/٤

(۳) سير اعلام النبلاء ٢٠٥/٧، تهذيب التهذيب ٣٤٣/٤

(٤) تاريخ بغداد ٢٥٩/٩، ٢٦٤، ٢٦٥

بھی پہنچ سکتی ہے جو اس میں کمی و زیادتی کر سکتا ہے۔ حالانکہ تحریر کو اعتماد نہ کرنے اور قوت حافظہ پر زیادہ اعتماد کی وجہ سے کہیں کہیں آپ کو وہم بھی ہو گیا ہے۔[١]

عبادت : تقویٰ و پرہیز گاری کے ساتھ ساتھ خوف خدا کا یہ عالم تھا کہ آپ کے دن حالت صیام اور راتیں حالت قیام میں گذرتی تھیں، عبادت و ریاضت کا یہ عالم تھا کہ آپ کا جسم خشک ہو گیا تھا، چمڑے اور ہڈی کے درمیان کا گوشت گل گیا تھا اور جسم کے چمڑے پھٹنے لگے تھے۔[٢]

ابو قطن فرماتے ہیں کہ: آپ کے رکوع و سجود اس قدر طویل ہوتے تھے کہ جب آپ رکوع کرتے یا دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھتے تو میں سمجھتا کہ شاید آپ بھول گئے۔[٣]

آپ اپنے دور کے طلبہ اور علماء پر علم میں مشغول رہنے اور عبادت نہ کرنے پر تنقید بھی کرتے تھے، آپ فرماتے تھے کہ یہ طلب حدیث آپ حضرات کو اللہ کے ذکر، نماز و روزہ اور صلہ رحمی سے روک رہی ہے۔ کیا تم اپنے اس عمل سے باز نہیں آؤ گے۔[٤]

زھد : -آپ کی زندگی انتہائی سادا اور زاہدانہ تھی، دنیاوی عیش و آرام کی چیزیں تو درکنار ضروری ساز و سامان سے بھی آپ کو کوئی دلچسپی نہیں تھی، ایک عدد سواری کے لیے معمولی قسم کا گدھا، بدن ڈھکنے کے لیے ایک جوڑا لباس، کھانے کے لیے معمولی چیزیں آپ کی زندگی کے ساز و سامان تھے۔ آپ فرماتے ہیں کہ اگر میرے پاس کھانے کے لیے آٹا اور معمولی سالن [آنت] موجود ہو تو پھر دنیا سے کسی چیز کی ضرورت مجھ کو نہیں رہتی۔[٥]

آپ کے لباس بھی انتہائی معمولی ہوا کرتے تھے اور قلت کی وجہ سے عموماً میلے اور گرد و غبار سے اٹے رہتے تھے اور ایک اندازہ کے مطابق آپ کے جملہ لباس کرتا، چادر اور لنگی کی کل قیمت دس درہم سے زیادہ نہیں تھی۔[٦]

---

(١) سیر اعلام ٢١٣/٧، تاریخ بغداد ٢٥٩/٩ (٢) حلیة الأولیاء و طبقات الأصفیاء ١٤٤/٧
(٣) حلیه الأولیاء ١٤٥/٧، سیر أعلام ٢٠٩،٢٠٧/٧ (٤) سیر أعلام ٢١٣/٧، الکامل ٨٨/١
(٥) تاریخ بغداد ٢٦١/٩ (٦) تاریخ بغداد ٢٦١/٩

قراد ابو نوح فرماتے ہیں کہ: میں ایک مرتبہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے میری قمیص کو دیکھ کر پوچھا کہ کتنے میں خریدا؟ میں نے کہا کہ آٹھ درہم میں۔ آپ نے فرمایا کیا اللہ کا خوف نہیں آٹھ درہم والی قمیص پہنتے ہو، چار درہم والی کیوں نہیں خریدا؟ باقی چار درہم اللہ کے راستے میں خرچ کردیتے۔(۱)

جود و سخا : امام شعبہ خود فقر و فاقہ سے دوچار تھے، طلب حدیث کے لیے آپ کو بہت سا گھریلو سامان بھی بیچنا پڑا تھا۔ آپ کا خیال تھا کہ حدیث طلب کرنے والا محتاج ہی رہتا ہے، اور اس کیلئے یہی بہتر ہے۔(۲) لیکن اس کے باوجود بھی پیکر جود و سخا تھے، فقراء و مساکین کے ساتھ تعاون ہمدردی اپنی ضرورت سمجھتے تھے۔ آپ ان کے لیے ماں باپ کی حیثیت رکھتے تھے۔ کسی مسکین پر نظر پڑتی تو اس کو اس وقت تک دیکھتے رہتے جب تک کہ وہ نگاہوں سے اوجھل نہ ہوجاتا۔(۳) محلّہ کے بچے اور مسکین آپ کو کثرت عطا کی بناء پر بابا، بابا کہہ کر پکارتے تھے۔(۴)

ایک مرتبہ خلیفہ مہدی نے آپ کو تیس ہزار درہم دیا جس کو آپ نے وہیں تقسیم کردیا۔(۵)

ایک مرتبہ آپ اپنے گدھے پر کہیں جارہے تھے۔ سلیمان بن مغیرہ سے ملاقات ہوئی، انہوں نے اپنی پریشانی کا ذکر کیا، آپ نے فرمایا کہ خدا کی قسم آج میرے پاس اس گدھے کے علاوہ اور کچھ نہیں، چنانچہ آپ نے یہ گدھا بھی ان کو دے دیا اور اپنا پیدل چلے گئے۔(۶)

یحییٰ بن سعید قطان آپ کے شاگرد فرماتے ہیں کہ: کبھی کبھی آپ کے پاس سائل آتا اور کچھ موجود نہیں رہتا تو وہ مجھ سے پوچھتے یحییٰ کچھ رکھے ہو، پھر مجھ سے لے کر سائل کو دے دیتے، سائل اس پر انتہائی حیرت و تعجب سے کہتا ابو بسطام آپ یہ کیا کررہے ہیں! وہ فرماتے کوئی بات نہیں لے جاؤ، لے جاؤ۔(۷) آپ نے اپنے کھانے

---

(۱) تاریخ بغداد ۲۶۲/۹ (۲) تذکرۃ الحفاظ ۱۹۵/۱
(۳) حلیۃ الأولیاء ۱۴۷/۷ ، تاریخ بغداد ۲۶۱/۹ (٤) المجروحین ۴۸/۱
(۵) حلیۃ الأولیاء ۱۴۷/۷ (٦) مصدر سابق ۱۴۶/۷
(۷) مصدر سابق ۱۴۶/۷

کمانے کا انتظام کبھی نہیں کیا، آپ کے بھائی بھتیجے اور داماد آپ کی کفالت کرتے تھے۔

خدمات حدیث:- آپ کی زندگی کا سب سے اہم اور نمایاں گوشہ آپ کی خدمات حدیث اور دفاع عن السنۃ ہے، جس میں آپ کی خدمات مختلف النوع ہیں، تحقیق حدیث، تفتیش رجال، نقد رجال، ضعفاء سے اجتناب، ان کی نشاندہی، ان کی سرزنش وغیرہ شامل ہے۔

تحقیق حدیث : حدیث رسول کی تحقیق و جستجو آپ کی خاص عادت تھی، اس سلسلہ میں ہر طرح کی مشقت اور قربانی آپ برداشت کرتے تھے، جب تک ایک حدیث کو بار بار نہیں سنتے تھے تب تک اس پر اعتماد نہیں کرتے تھے اور نہ اس کو بیان کرتے تھے۔[1]

ابوالولید فرماتے ہیں کہ ایک حدیث کے بارے میں میں نے آپ سے سوال کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ ابھی یہ حدیث نہیں بتاؤں گا اس لیے کہ ابھی میں نے اپنے استاد سے صرف ایک مرتبہ سنا ہے۔[2]

اس سلسلے میں آپ اپنے استاد کے حفظ واتقان کا امتحان بھی لے لیا کرتے تھے، چنانچہ ابن عیینہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میری ملاقات امام شعبہ سے ہوئی، بارش ہو رہی تھی، لیکن وہ ایک دم بریدہ گدھے پر سوار چلے آرہے تھے، میں نے کہا ابو بسطام اس وقت کہاں تشریف لے جارہے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ اسود بن قیس کے پاس جارہا ہوں۔ فلاں سنہ میں انہوں نے کچھ حدیثیں بیان کی تھیں آج یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ ان کو یہ حدیثیں اب تک یاد ہیں کہ نہیں۔[3]

آپ کی زندگی میں تحقیق حدیث کا ایک ایسا نادر واقعہ ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔ نصر بن حماد بجلی فرماتے ہیں کہ مجھ کو شعبہ نے اس سند سے حدیث بیان کرتے ہوئے سنا: **عن اسرائیل ، عن أبی اسحاق ، عن عبداللہ بن عطاء ، عن عقبة بن عامر** ...... تو انہوں نے مجھ کو ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ میں کنارے جا کر بیٹھا رو رہا

---

(۱) تاریخ بغداد ۹/۲٦۵ (۲) سیر أعلام النبلا ۷/۲۲۱

(۳) حلیۃ الأولیاء ۷/۱٤۸

تھا، کچھ دیر کے بعد ان کی نظر مجھ پر پڑی تو فرمایا رو کیوں رہے ہو؟ ابن ادریس وہاں موجود تھے انہوں نے کہا کہ آپ کی زیادتی کی وجہ سے، امام شعبہ نے کہا کہ آخر میں کیا کروں، آپ خود دیکھئے کہ یہ کس طرح کی سند بیان کر رہے ہیں! اس سند میں عبداللہ بن عطاء کی ملاقات عقبہ بن عامر سے نہیں ہے، لہٰذا روایت منقطع ہے تو وہ اس کو کیوں بیان کرتے ہیں، پھر آپ نے اپنا قصہ اس طرح سے سنایا کہ:

میں نے خود ابواسحاق سے پوچھا کہ یہ حدیث آپ نے کس سے سنی ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ عبداللہ بن عطاء سے انہوں نے عقبہ بن عامر سے۔ میں نے کہا کہ کیا عبداللہ بن عطاء کی ملاقات عقبۃ بن عامر سے ہے؟ اس مجلس میں مسعر (بن کدام) موجود تھے، انہوں نے کہا کہ عبداللہ بن عطاء مکہ میں موجود ہیں [ان سے معلوم کرسکتے ہیں] چنانچہ میں بصرہ سے مکہ ان سے تحقیق کے لیے روانہ ہوا، جب ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ سعد بن ابراہیم سے میں نے سنا ہے۔ اس مجلس میں امام مالک موجود تھے۔ انہوں نے کہا کہ سعد بن ابراہیم مدینہ میں رہتے ہیں، چنانچہ میں مکہ سے مدینہ روانہ ہوا۔ جب ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ یہ روایت تو آپ ہی کے یہاں (بصرہ) کی ہے، اس لیے کہ مجھ سے زیاد بن مخراق نے بیان کیا ہے۔ پھر میں بصرہ آیا اور زیاد بن مخراق سے معلوم کیا تو انہوں نے کہا کہ آپ کے لائق نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ آپ ضرور بتایئے۔ انہوں نے کہا کہ مجھ سے شھر بن حوشب نے عن ابی ریحانہ، عن عقبہ بن عامر کے واسطے سے روایت کیا ہے۔ جب شہر بن حوشب کا نام سنا تو بے حد افسوس ہوا اور فرمایا کہ: "دمر علی هذا الحدیث" اس حدیث نے تو مجھ کو تباہ کر ڈالا۔ [یا اس حدیث کو برباد کر دو]

اسلئے کہ شہر بن حوشب ضعیف تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر یہ حدیث صحیح ہوتی تو میرے لیے اہل و عیال، مال و دولت اور ساری چیزوں کے مقابلے میں محبوب ہوتی۔ (1)

ضعفاء کے خلاف محاذ آرائی: - امام شعبہ کا دور چونکہ اسباب ضعف کے ظہور کا ابتدائی دور تھا، اس لیے اس کی نگرانی اور اس کا سد باب اسی شد و مد سے ہونا

(۱) حلية الأولياء ۱۴۸/۷، ۱۴۹

چاہئے جس پر آپ نے عمل کیا، یہی وجہ ہے کہ معمولی معمولی اسباب کی بناء پر سد ذریعہ کے لیے آپ نے بہت سارے لوگوں سے روایت ترک کردیا تھا تاکہ ان اسباب سے راویان حدیث اپنے آپ کو محفوظ رکھیں جن سے ان کی روایت پر اثر پڑ سکتا ہے، اس طرح سے آپ کا یہ عمل وقت کی اہم ضرورت تھی جس کو آپ نے پورا کیا، چنانچہ راویان حدیث کے ساتھ محاذ آرائی کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔

خضر بن یسع فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ سخت گرمی میں چہرے پر کپڑا ڈالے کہیں جارہے تھے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ اس سخت دھوپ اور گرمی میں آپ کہاں جارہے ہیں؟ فرمایا کہ جعفر بن زبیر اور ابان بن ابی عیاش حدیث رسول میں جھوٹ گھڑتے ہیں، ان کے خلاف مقدمہ کرنے جارہا ہوں۔ (۱)

حماد بن زید فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ شعبہ کو دیکھا ابان بن ابی عیاش کی گردن میں کپڑا ڈالے ان کو گھسیٹ رہے ہیں اور یہ دھمکی دے رہے ہیں کہ چلو سلطان کے یہاں تمہارے خلاف کارروائی کروں گا، اس لیے کہ تم حدیث رسول میں دروغ گوئی کرتے ہو، انہوں نے مجھ کو آواز دیا، میں نے بڑی منت و سماجت کرکے ان کو نجات دلائی۔ (۲)

نصر بن حماد کو ایک منقطع روایت کے بیان کرنے پر تھپڑ رسید کردیا۔ (۳)

ضعفاء کی روایت سے پرہیز : ضعیف راویوں اور غیر معتمد لوگوں سے آپ کو بڑی نفرت تھی، اس لیے آپ اپنے اساتذہ کے انتخاب میں بڑے محتاط تھے، ضعفاء سے خود پرہیز کرتے تھے اور دوسروں کو اس پر ابھارتے تھے، چنانچہ آپ نے ابن المبارک سے فرمایا کہ عباد بن کثیر سے بچ کر رہنا، نیز معاذ عنبری کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ ابوشیبۃ قاضی واسط سے حدیث نہیں لکھنا، جریر بن حازم کو یہ اطلاع دی کہ حسن بن عمارہ دروغ گو ہے، اس سے روایت جائز نہیں۔ (۴)

نیز معمولی معمولی اسباب جو غیر مقبول ہیں ان کی بنا پر روایت ترک کردیا

---

(۱) حلیۃ الأولیاء ۷/ ۱۵۰، سیر أعلام ۷/ ۲۲۲ (۲) سیر أعلام ۷/ ۲۲۲
(۳) المجروحین ۱/ ۲۹
(٤) مقدمۃ صحیح مسلم ۱/ ۹٤، ۱/ ۱۱۰، مقدمۃ الجرح و التعدیل ۱/ ۱۳۷

کرتے تھے۔ مثلاً منہال بن عمرو کے گھر سے لحن دار آواز سن لیا لھذا روایت ترک کردیا۔ یہ سوچ کر کہ ان کے گھر گانا گایا جاتا ہے۔[1]

کسی سے روایت اس بنیاد پر ترک کردیا کہ وہ اپنے جانور کو ایڑ لگا رہے تھے۔ کسی کو دیکھا کہ صحیح ڈھنگ سے نماز نہیں ادا کیا تو ان سے روایت ترک کردیا۔ اس کے لیے بڑا شدید لب و لہجہ بھی استعمال کرتے تھے، مثلاً یہ کہتے تھے کہ "اگر میں ستر گناہ کر ڈالوں تو فلاں سے روایت کے مقابلہ میں آسان ہے۔" وغیرہ[2]

بلکہ جن لوگوں کو غیر معتبر سمجھتے تھے ان کے سامنے روایت بھی نہیں کرتے تھے، چنانچہ یحیٰ بن سعید قطان فرماتے ہیں کہ میں امام شعبہ کے پاس تھا ایک شخص ان سے حدیث پوچھ رہا تھا، وہ بتانے سے انکار کررہے تھے، جب میں نے ان سے کہا کہ آپ ایسا کیوں کررہے ہیں تو جواب دیا کہ یہ خطباء میں سے ہے جو احادیث رسول میں کمی بیشی کرتے رہتے ہیں۔[3]

جرح و تعدیل میں آپ کا مقام : جرح و تعدیل میں آپ کو معمار اوّل اور امامت کا درجہ حاصل ہے۔ آپ اس فن کے اولین شہ سواروں میں سے ہیں۔

صالح بن جزرہ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے رجال پر جنہوں نے کلام کیا وہ امام شعبہ ہیں، انکے بعد انکی اقتدا یحیٰ بن سعید قطان، پھر احمد بن حنبل اور یحیٰ بن معین نے کی۔[4]

علامہ ابن حبان فرماتے ہیں کہ آپ نے عراق میں سب سے پہلے محدثین کے معاملات کی تحقیق کی، ضعفاء اور متروکین سے دوری اختیار کیا، یہاں تک کہ آپ اس فن میں اہل علم کے نشان راہ بن گئے، پھر اہل عراق نے آپ کی اتباع کی۔[5]

اور یقیناً یہ ایک حقیقت ہے کہ آپ نے جس قدر رجال پر گفتگو کیا ہے اور جس بھاری تعداد پر اظہار خیال کیا ہے اس سے قبل کسی نے نہیں کیا، امام ابن ابی حاتم نے ایسے بہت سارے راویوں کا ذکر مقدمہ "جرح و تعدیل" میں حروف معجم پر کیا ہے جن پر امام شعبہ نے بحیثیت جرح و تعدیل حکم لگایا ہے۔[6]

---

(۱) الجرح و التعديل ۱۷۲/۱ (۲) دراسات فی الجرح و التعدیل ص ۳۰۵، ۳۰۶
(۳) حلية الأولياء ۱۵۳/۷ (۴) تهذيب التهذيب ۳۴۵/۴
(۵) الثقات ۴۴٦/٦ (٦) دیکھیے ۱۳۲/۱، ۱۵۷/۱

اس طرح سے آپ اس فن کے ماہر اور قائد بن گئے۔ آپ کے حکم پر اہل علم کا اتنا اعتماد تھا کہ آپ جس کو ترک کردیتے وہ بھی ان سے روایت نہیں کرتے۔ اس طرح آپ کی شخصیت قابل اتباع ہو گئی تھی۔ (۱)

آپ راویوں پر کلام کو بہت بڑی ذمہ داری اور دین کی خدمت سمجھتے تھے اور بلا رعایت ان پر اظہار خیال کرتے تھے، وہ فرماتے ہیں کہ اگر میں کسی سے ڈرتا تو اپنے داماد حسان بن حسان سے ڈرتا [اس لیے کہ وہ ان کی کفالت کرتے تھے] لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا وہ حافظ نہیں۔ (۲)

امام ذہبی فرماتے ہیں کہ آپ سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے جرح و تعدیل پر [بھرپور] کام کیا ہے۔ آپ ہی سے اس فن کو یحییٰ بن سعید قطان، ابن مھدی اور دوسروں نے حاصل کیا ہے۔ (۳)

راویوں کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کبھی کبھی دلچسپ اور غیر مالوف جملہ استعمال کرتے تھے۔ مثلاً جب ان سے ابن عون کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا کہ "سمن و عسل" (گھی اور شہد ہیں) اور جب ہشام بن حسان کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا کہ: "خل و زیت" (سرکہ اور تیل ہیں) اور ابو بکر ھذلی کے بارے میں پوچھا گیا تو کہا کہ "دعنی لا اقیئ به" (جانے دو کہیں مجھ کو قی نہ ہو جائے) (۴)

علماء کی شہادت:- اہل علم نے آپ کے بارے مں جو اظہار خیال فرمایا ہے وہ آپ کی شخصیت پر واضح شہادت ہے۔ سفیان ثوری فرماتے ہیں کہ آپ امیر المومنین فی الحدیث ہیں۔ سفیان بن عیینۃ کا بھی یہی کہنا ہے۔ ابن ابی حاتم فرماتے ہیں یعنی اپنے زمانہ میں سارے اہل علم پر فائق تھے۔ (۵)

امام شافعی فرماتے ہیں کہ: "لو لا شعبة لما عرف الحديث بالعراق" (۶)

امام احمد فرماتے ہیں کہ آپ معرفت حدیث و رجال، اس میں تحقیق و طلب

---

(۱) الکامل فی ضعفاء الرجال ۸۶/۱ — (۲) الکامل فی ضعفاء الرجال ۸۱/۱
(۳) سیر أعلام ۲۰۶/۷ — (۴) مصدر سابق، ۲۲۰/۷
(۵) الجرح و التعدیل ۱۲۶/۱، تاریخ بغداد ۲۵۹/۹، تاریخ کبیر ۲۴۵/۴
(۶) تاریخ بغداد ۲۶۳/۹، تهذیب التهذیب ۳۴۴/۴

کے اعتبار سے تنہا ایک امت تھے۔[1]

علل و مراسیل، منقطع اور اس طرح کی روایت کرنے والوں کے بارے میں آپ کو بڑی اچھی معرفت تھی۔

ابوزید انصاری فرماتے ہیں کہ: ”هل العلماء إلا شعبة من شعبة.“[2]

حماد بن زید جب آپ سے روایت کرتے تو فرماتے:

حدثني الضخم عن الصخام
شعبة الخير أبوبسطام[3]

امام ذہبی فرماتے ہیں کہ امام ابوبسطام امام وقت، ثقہ اور حجت، ماہر ناقد حدیث ورجال، تقویٰ و پرہیزگاری اور علم و عمل میں سردار تھے۔[4]

وفات:- بقول ابن سعد آپ کی وفات بصرہ میں ۱۶۰ھ کے ابتداء میں ہوئی جب کہ آپ کی عمر ۷۵ سال کی تھی۔ خلیفہ بن خیاط فرماتے ہیں کہ آپ کی وفات رجب کے مہینہ میں ۱۶۰ھ میں ہوئی۔ آپ کی تاریخ وفات پر سب کا اتفاق ہے کہ ۱۶۰ھ میں ہوئی ہے۔ البتہ پیدائش میں اختلاف ہے۔ اس وجہ سے جملہ عمر میں بھی اختلاف ہے۔ آپ سفیان ثوری سے دس سال کے بڑے تھے جب کہ سفیان بن عیینہ سفیان ثوری سے دس سال کے چھوٹے تھے۔[5]

ناقد اعظم امام یحییٰ بن سعید القطان

(۱۲۰-۱۹۸ھ)

دوسری صدی کے نامور محدثین میں جن کو ”أمير المؤمنين في الحديث“ کا خطاب ملا اور جن کو فن جرح و تعدیل کے معمار اول میں شمار کیا جا سکتا ہے انہیں میں امام یحیٰ بن سعید قطان ہیں، جو اس فن کے مرجع خلائق اور یکتائے زمانہ تھے۔ آپ کی زندگی کی ایک جھلک پیش خدمت ہے۔

---

(۱) مصدر سابق
(۲) تذكرة الحفاظ ۱/۱۹۷
(۳) تذكرة الحفاظ ۱/۱۹٤
(٤) سير اعلام النبلاء ۷/۲۰٦
(٥) الطبقات الكبرىٰ ۷/۲۸۱، طبقات خليفة ص ۲۲۲، تاريخ بغداد ۹/۲٥۸

نام و نسب : آپ کا نام یحییٰ بن سعید بن فروخ ابو سعید القطان الاحول، مولیٰ بن تمیم بصری ہے۔(۱)

ولادت : آپ کی ولادت ۱۲۰ھ کی ابتداء میں ہوئی۔(۲)

طلب علم : جب آپ حصول علم کے لائق ہوئے تو اس میں پوری دلچسپی کیساتھ منہمک ہوگئے، طلب علم میں لگن اور دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ اس میں شہرت یافتہ ہوگئے، یہاں تک کہ مسند درس پر پہنچ گئے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں صبح کو گھر سے نکلتا تھا تو پھر عشاء کے بعد ہی واپس آتا تھا۔(۳) یعنی دن بھر علم کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے۔

اساتذہ : یہ دور علم و فضل کا بڑا سنہرا دور تھا، اسی زمانہ میں امام مالک، امام شعبہ، سفیان ثوری، امام اعمش کا دور دورہ تھا، ہر طرف بلاد اسلامیہ میں علم و عمل کا دھوم مچا ہوا تھا، آپ نے اس دور کے ان اہم علماء سے بھرپور استفادہ کیا اور تقریباً بیس سال تک امام شعبہ کے ساتھ لگے رہے۔ مذکور حضرات آپ کے نامور مشائخ میں سے ہیں، ان کے علاوہ ھشام بن عروہ، یحییٰ بن سعید انصاری، حمید الطویل، حسین المعلم، ابن جریج وغیرہ سے آپ نے علم حاصل کیا۔(۴)

عام حالات : علم کے حصول کے لیے دور دراز مقامات کا سفر کیا، اور طلب علم میں کافی مشہور ہوگئے، آپ کی محنت و لگن بار آور ثابت ہوئی، یہاں تک کہ آپ ایک عظیم محدث، ماہر عللِ حدیث و نقدِ رجال، حافظ وقت اور امام فن کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئے، جس میں تقویٰ اور پرہیزگاری عبادت و ریاضت نے چار چاند لگا دیا تھا، قرآن کریم کی تلاوت آپ کا بڑا مشغلہ تھا دن کے اکثر اوقات اسی میں گذرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ بیس سال تک روزانہ آپ ایک بار قرآن ختم کرتے تھے، اور درس حدیث صرف عصر کے بعد دیتے تھے۔(۵)

حافظ بندار فرماتے ہیں کہ بیس سال سے زائد عرصہ تک میں آپ کے پاس آتا جاتا رہا، میرا خیال ہے کہ آپ نے کبھی اللہ کی نافرمانی نہیں کی، دنیا سے کوئی مطلب

---

(۱) سیر اعلام النبلاء ۹/۱۷۵ (۲) تاریخ بغداد ۱۴/۱۳۵

(۳) الجرح و التعدیل ۱/۲۴۹ (۴) تاریخ بغداد ۱۴/۱۳۵، تذکرة الحفاظ ۱/۲۹۸

(۵) الثقات لابن حبان ۷/۶۱۱

بھی نہ تھا۔[۱] آپ کی زمین سے جو بھی غلہ آتا تھا بس وہی کھاتے تھے۔[۲]

بظاہر دیکھنے میں ایک عام آدمی نظر آتے تھے لیکن جب زبان کھولتے تو فقہاء اور محدثین خاموش ہو جاتے۔[۳]

تلامذہ:- آپ کی سیرت و کردار اور علمی شہرت نے آپ کو مرجع خلائق بنادیا، تشنگان علوم نبوت جوق در جوق آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اپنی علمی پیاس بجھاتے، بسا اوقات آپ کے اساتذہ بھی آپ کے درس میں شریک ہوتے تھے۔ چنانچہ آپ کے اساتذہ میں: امام شعبہ، سفیان ثوری، ساتھیوں میں سے ابن مہدی، معمر بن سلیمان کے علاوہ جن حضرات کو آپ نے علم کی روشنی سے منور کیا ان میں ایک سے بڑھ کر ایک یکتائے زمانہ علمی افق کے آفتاب و ماہتاب ہیں، جی ہاں! عمر بن علی الفلاس، ابو خیثمہ زہیر بن حرب وغیرہ آپ کے شاگرد ہیں۔[۴]

ابن حبان فرماتے ہیں کہ: انہیں سے احمد بن حنبل، یحیٰ بن معین، علی بن المدینی اور ہمارے سارے مشائخ نے علم حاصل کیا۔[۵]

آپ کے مشائخ و تلامذہ سب کے سب آپ کی عزت واحترام کرتے تھے اور آپ کے علم کا لوہا مانتے تھے۔

ابن مہدی فرماتے ہیں کہ: ایک دن امام شعبہ سے کسی حدیث کے سلسلہ میں ہم لوگوں سے اختلاف ہو گیا، بات یہاں تک پہنچی کہ اس کیلئے کسی کو فیصل مقرر کیا جائے، پھر خود انہوں نے اس کام کیلئے ابن قطان کو منتخب کیا، جب وہ آئے مقدمہ پیش کیا گیا انہوں نے اپنے استاذ امام شعبہ کے خلاف فیصلہ دیا، تب انہوں نے فرمایا کہ: اس احول سے کون بحث و مباحثہ میں پنجہ لے سکتا ہے۔[۶]

ابن ابی حاتم فرماتے ہیں کہ: یہ بڑا اونچا مقام ہے، امام شعبہ نے سارے اہل علم میں فیصلہ کیلئے آپ کو حکم بنایا، اور یہاں آپ کی دیانت داری علمی پختگی کا بھی پتہ

---

(۱) سير أعلام النبلاء ۱۷۸/۹ (۲) سير أعلام النبلا ۱۸۱/۹
(۳) تاريخ بغداد ۱٤٠/۱٤
(٤) سير أعلام النبلاء ۱۷٦/۹-۱۷۷، تهذيب التهذيب ۲۱٦/۱۱
(٥) الثقات ٦۱۱/۷ (٦) الجرح والتعليل ۲۳۲/۱

چلتا ہے کہ انہوں نے فیصلہ استاد کے خلاف کیا۔[۱]

جب آپ عصر کی نماز سے فارغ ہو کر مسجد میں ٹیک لگا کر بیٹھتے تھے تو علی بن المدینی، احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، شاذ کونی، عمرو بن علی وغیرہ آپکے سامنے کھڑے آپ سے علمی معلومات حاصل کرتے تھے، ہیبت واجلال کی وجہ سے بیٹھتے نہیں تھے۔[۲]

علماء کی شہادت:- آپ کے اساتذہ و تلامذہ و دیگر اہل علم نے آپ کی بڑی تعریف اور آپ کے مقام کی وضاحت کی ہے، چنانچہ امام احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین فرماتے ہیں کہ: یحییٰ بن سعید جیسی شخصیت تو ہم نے دیکھی ہی نہیں۔[۳]

نیز امام احمد فرماتے ہیں: "إليه المنتهى في التثبت" [۴] نیز فرمایا کہ یحییٰ بن سعید کے زمانہ میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا، انہوں نے تو امام شعبہ سے علم حاصل کیا تھا۔[۵]

حافظ بندار فرماتے ہیں: آپ اپنے زمانہ کے امام تھے۔[۶]

فن جرح و تعدیل میں آپ کا مقام:-- فن جرح و تعدیل مین آپ کا جو مقام تھا اس کا کیا کہنا! اس دور کی ضرورت کو آپ نے پوری کیا، یہی وہ دور تھا جب راویان حدیث میں ضعف کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا، اسباب ضعف بکثرت نمودار ہونے لگے تھے۔ لہٰذا بحیثیت جرح و تعدیل ان پر کلام کی ضرورت تھی، ان کے بارے میں معلومات اکٹھا کرنے کا وقت تھا، بقول امام ذہبی آپ نے سب سے پہلے یہ خدمت انجام دی، اور جرح و تعدیل میں اپنے کلام کو اکٹھا کیا۔[۷]

نیز امام ذہبی فرماتے ہیں کہ آپ کی ایک کتاب "الضعفاء" ہے جس کو میں نے تو دیکھا نہیں، البتہ ابن حزم اس سے بکثرت نقل کرتے ہیں۔

آپ کے کلام، علی بن مدینی، ابو حفص صیرفی، ابن معین وغیرہ کے سوالات میں پائے جاتے ہیں۔[۸]

اس طرح سے فن جرح و تعدیل کے تحریر کی بنیاد آپ ہی نے ڈالی، یہی وہ

---

(۱) مصدر سابق
(۲) تهذيب التهذيب ۲۱۹/۱۱
(۳) سير أعلام النبلاء ۱۷۷/۹
(۴) تذكرة الحفاظ ۳۰۰/۱
(۵) الجرح والتعديل ۲۴۹/۱
(۶) سير أعلام النبلاء ۱۷۷/۹
(۷) ميزان الاعتدال ۱۰/۱ (مقدمه)
(۸) سير أعلام النبلاء ۱۸۳/۹

دور تھا جس میں ائمہ جرح و تعدیل کے طبقہ اولی امام مالک، شعبہ، ثوری، اعمش جیسے حضرات نے راویوں کی چھان بین کی بنیاد رکھی، آپ نے ان سب کے علم کو جمع کیا اور معرفت رجال میں یکتائے زمانہ بن گئے اور لگ بھگ اس دور کے سارے راویوں پر بحثیت جرح و تعدیل کلام کیا۔

امام ابن مدینی اور ابراہیم تیمی فرماتے ہیں کہ: "ما رأيت أعلم بالرجال من يحيىٰ القطان" (۱)

علامہ ابن حبان فرماتے ہیں کہ: آپ اپنے زمانہ میں حفظ و علم، زہد و تقویٰ، فہم و فضل، میں سردار تھے، آپ ہی نے اہل عراق کو حدیث پڑھنے کا طریقہ دیا، آپ ہی نے ثقات اور ضعفاء کا پتہ لگایا، اور ضعفاء سے روایت ترک کیا۔ (۲)

امام ذہبی فرماتے ہیں کہ: یہی وہ دور تھا جس میں دو یکتائے زمانہ حافظ و حجت تیار ہوئے، یہ ابن مہدی اور ابن قطان تھے۔ جس پر انہوں نے جرح کیا، اس کا زخم مندمل ہونا مشکل ہو گیا، اور جس کی توثیق کر دی وہ مقبول ہوا، اور جس میں اختلاف ہو گیا۔ جن کی تعداد معمولی ہے۔ تو اس پر نظر ثانی کی ضرورت ہے، لیکن ان کا رتبہ صحیح سے حسن کے درجہ میں آگیا۔ (۳)

وفات:- علی بن عبداللہ مدینی فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم مسجد سے آپ کے ساتھ آپ کے گھر گئے، کسی کو آپ نے تلاوت کا حکم دیا وہ تلاوت کرتے جاتے تھے، ادھر ان کے چہرے کا رنگ بدلتا جاتا تھا جب وہ اس آیت پر پہنچے ﴿إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيْقَاتُهُمْ أَجْمَعِيْنَ﴾ [الدخان: ۴۰] تو ان کے منہ سے ایک چیخ نکلی، اور آپ بیہوش ہو کر گرے، اور دروازہ سے ٹکرا گئے جس سے پیٹھ کی ہڈی میں چوٹ لگ گئی اور خون بہنے لگا، بچوں نے چلانا شروع کیا، ہم گھر سے باہر نکل آئے اور دروازے پر ٹھہرے رہے، جب کچھ افاقہ ہوا تو اندر گئے وہ بستر پر پڑے تھے اور زبان سے یہی آیت ﴿إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيْقَاتُهُمْ أَجْمَعِيْنَ﴾ [الدخان: ۴۰] جاری تھی۔ اس کے بعد ہم نے آپ کو نہیں بلکہ

---

(۱) تاريخ بغداد ١٤/١٣٨ (۲) الثقات لابن حبان ٧/٦١١

(۳) ذكر من يعتمد قوله في الجرح والتعديل ص ١٦٧، الاعلان بالتوبيخ ص ١٦٤

آپ کے جنازے کو دیکھا۔ اسی میں آپ کا انتقال ہو گیا۔[1]

آپ کی وفات صفر ۱۹۸ھ میں ابن مہدی اور ابن عیینہ کے انتقال کے چار ماہ قبل ہوئی، نماز جنازہ امیر بصرہ اسماعیل بن جعفر نے پڑھائی۔[2]

سید الحفاظ عبدالرحمن بن مهدی

(۱۳۵-۱۹۸ھ)

دوسری صدی ہجری کی دوسری اہم شخصیت جو یحییٰ بن سعید القطان کی متوازی شخصیت تھی، جن کی خدمات روز روشن کی طرح عیاں ہیں وہ محدث عظیم حافظ وقت عبدالرحمٰن بن مہدی کی شخصیت ہے، یہ دونوں حضرات قریب قریب مساوی اور اساتذہ و تلامذہ میں مشترک ہیں۔ آپ کی زندگی کا مختصر خاکہ اس طرح ہے:

نام و نسب:- آپ کا اسم گرامی عبدالرحمٰن بن مہدی بن حسان بن عبدالرحمٰن ابو سعید عنبری بصری ہے۔[3]

ولادت:- آپ کی پیدائش ۱۳۵ھ میں بصرہ میں ہوئی۔[4]

طلب علم:- تقریباً تیرہ سال کی عمر میں علم حاصل کرنا شروع کیا۔[5]

ابتداء میں آپ قصاص کی مجلسوں میں بیٹھتے تھے۔ ابو عامر عقدی نے ان سے کہا کہ یہاں تم کو کچھ حاصل نہیں ہوگا، علم کی مجلس میں جا کر علم حدیث حاصل کرو۔ چنانچہ انہوں نے علم حدیث حاصل کرنا شروع کر دیا، یہاں تک کہ ایک عالی مقام امام، بلند پایہ محدث، فقیہ وقت اور مرجع خلائق بن گئے۔[6]

اساتذہ:- جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے یہ دور علم و فضل کا بڑا سنہرا دور تھا، ایک سے بڑھ کر ایک نامور ہستیاں موجود تھیں، آپ نے جن باکمال ہستیوں سے علم حاصل کیا ان میں امام مالک، شعبہ، سفیانان، حمادان، عبدالعزیز ماجشون وغیرہ جیسے افراد شامل ہیں۔[7]

تلامذہ:- آپ کے تلامذہ میں تقریباً وہی ماہتاب و آفتاب ہیں جو یحییٰ القطان کے

---

(۱) سیر أعلام النبلاء ۱۸٤/۹ — (۲) الثقات ٦۱۱/۷، سیر أعلام النبلاء ۱۸۷/۹
(۳) تاریخ بغداد ۲٤۰/۱۰ — (٤) مصدر سابق
(٥) سیر أعلام النبلاء ۱۹۳/۹ — (٦) تاریخ بغداد ۲٤۰/۱۰
(۷) سیر أعلام النبلاء ۱۹۳/۹، تهذیب التهذیب ۲۷۹/٦

تلامذہ میں ہیں۔ آپ کے مشائخ میں سے عبداللہ بن مبارک اور عبداللہ بن وہب نے آپ سے روایت کیا ہے ان کے علاوہ، علی بن مدینی، یحییٰ بن معین، احمد بن حنبل، اسحٰق بن راہویہ، ابن ابی شیبہ، بندار، ابوخیثمہ، عمروالفلاس وغیرہ آپ کے شاگردوں میں شامل ہیں۔[۱]

حافظہ:- آپ کا حافظہ انتہائی قوی اور مضبوط تھا، اختلاف محدثین کے وقت عموماً آپ ہی کی بات درست ہوتی تھی، آپ کو اپنے حافظہ پر اتنا اعتماد تھا کہ آپ بغیر کتاب کے حافظہ سے حدیث بیان کرتے تھے۔[۲]

قواریری فرماتے ہیں کہ آپ نے مجھ کو بیس ہزار حدیثیں زبانی تحریر کرائی ہیں۔[۳]

عبادت:- آپ انتہائی متقی و پرہیزگار اور عبادت گذار تھے، آپ کو قیام اللیل اور شب بیداری کی عادت تھی، آپ ہر رات نصف قرآن کی تلاوت کرتے تھے، ایک رات آپ نے طلوع فجر تک قیام کیا، پھر بستر پر لیٹ گئے تو نیند آگئی، یہاں تک کہ سورج طلوع ہو گیا اور فجر کی نماز فوت ہو گئی، اس سے آپ کو اتنا افسوس ہوا کہ آپ نے دو ماہ تک کیلئے بستر کا استعمال چھوڑ دیا جس کی وجہ سے آپ کے دونوں ران زخم آلود ہو گئے۔[۴]

مجلس کا وقار:- آپ کی مجلس بڑی باوقار ہوا کرتی تھی، کسی کو بات کرنے، مسکرانے، قلم بنانے کی جرأت نہیں ہوتی تھی، طلبہ ایسے رہتے تھے جیسے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں یا نماز ادا کر رہے ہوں، اگر کسی کو کوئی حرکت کرتے ہوئے درمیان درس دیکھ لیتے تو فوراً جوتی اٹھاتے اور درس چھوڑ کر چلے جاتے۔[۵]

علماء کی نگاہ میں:- اہل علم آپ کی بڑی عزت و قدر کرتے تھے۔ آپ کے استاذ حماد بن زید جب آپ کو اپنی مجلس میں دیکھتے تو ان کا چہرا خوشی سے چمکنے لگتا۔[۶]

آپ سفیان ثوری کے یہاں دس دس، پندرہ پندرہ دن رہ جاتے، جیسے وہاں سے واپس آتے کوئی نہ کوئی بلانے والا آجاتا کہ شیخ نے آپکو بلایا ہے، وہ فوراً چلے جاتے۔[۷]

---

(۱) مصدر سابق (۲) سیر اعلام النبلاء ۱۹۴/۹، تہذیب التہذیب ۲۸۰/۶

(۳) سیر أعلام النبلاء ۱۹۵/۹ (۴) سیر أعلام النبلاء ۱۹۶/۹، ۲۰۲

(۵) الجرح والتعدیل ۲۵۷/۱ (۶) الجرح والتعدیل ۲۵۶/۱

(۷) مصدر سابق

ابن مهدي و ابن القطان:- یہ دونوں حضرات چکی کے دوپاٹ کی طرح تھے، بڑی حد تک دونوں کے علم وفضل، زہد و تقویٰ میں یگانگت پائی جاتی ہے، یہ دونوں اکثر اساتذہ و تلامذہ میں بھی مشترک ہیں، اہل علم جب ان میں سے کسی کا نام لیتے تو دوسرا ضرور ذہن میں آجاتا۔

ابن مدینی فرماتے ہیں کہ: جب یحییٰ اور عبدالرحمٰن کسی راوی کے ترک پر متفق ہوں تو میں اس شخص سے روایت نہیں لیتا۔[۱]

نیز ان سے کسی نے پوچھا کہ: سفیان کے شاگردوں میں سب سے زیادہ ثقہ کون ہے تو انہوں نے فرمایا کہ: یحییٰ قطان اور عبدالرحمٰن بن مہدی۔[۲]

امام احمد فرماتے ہیں کہ میں نے یحییٰ کی طرح کسی کو نہیں دیکھا اور عبدالرحمٰن بن مہدی امام وقت تھے۔[۳]

ابن مدینی فرماتے ہیں کہ: یحییٰ بن سعید اور عبدالرحمٰن بن مہدی کی طرح کسی کو دیکھا نہیں گیا۔[۴]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کی شخصیت اہل علم کی نگاہ میں قریب قریب برابر تھی۔ البتہ یحییٰ قطان کو علم رجال اور جرح و تعدیل کی معرفت میں سبقت حاصل تھی۔ تو عبدالرحمٰن بن مہدی، معرفت حدیث اور فقہ حدیث میں ان پر مقدم تھے، جس کا اعتراف خود ان کے ساتھی نے کیا ہے۔

صدقہ بن الفضل فرماتے ہیں کہ میں یحییٰ القطان کے پاس حدیث کے سلسلہ میں کچھ معلومات حاصل کرنے گیا تو انہوں نے فرمایا کہ: "الزم عبدالرحمن بن مهدی"[۵]

امام احمد فرماتے ہیں کہ: "كان عبدالرحمن بن مهدی أفقه من سعيد"[۶]

ابن مدینی فرماتے ہیں کہ: "كان يحيىٰ بن سعيد أعلم بالرجال، وكان عبدالرحمن أعلم بالحديث"[۷]

---

(۱) تاريخ بغداد ۱۰/۲۴۳ (۲) الجرح والتعديل ۱/۲۵۳
(۳) سير أعلام النبلاء ۹/۱۹۸ (۴) تاريخ بغداد ۱۰/۲۴۴
(۵) تاريخ بغداد ۱۰/۲۴۱ (۶) تاريخ بغداد ۱۰/۲۴۲، تهذيب التهذيب ۶/۲۷۹
(۷) تاريخ بغداد ۱۰/۲۴۶

علماء کی شہادت:- آپ کے علم و فضل کی اہل علم نے بڑی تعریف کی ہے اور آپ کے مقام کی وضاحت فرمائی ہے۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ :ان کا کوئی نظیر نہیں۔ (۱)

جریر رازی آپ کی مہارت حدیث اور حفظ کی پختگی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میں نے عبدالرحمٰن بن مہدی کی طرح کسی کو نہیں دیکھا۔ (۲)

ابن مدینی فرماتے ہیں کہ :اگر مجھ کو مقام ابراہیم اور رکن کے درمیان قسم کھا کر کہنا پڑے تو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ عبدالرحمٰن بن مہدی سے زیادہ علم حدیث کا جاننے والا میں کسی کو نہیں جانتا۔ (۳)

حافظ ذہبی کہتے ہیں: آپ علم و عمل میں قدوہ، امام اور حجت تھے۔ (۴)

فن جرح و تعدیل میں آپ کا مقام:- جرح و تعدیل اور معرفت رجال میں آپ کا بڑا اونچا مقام تھا، راویوں کے سلسلہ میں آپ کو پیشہ وارانہ مہارت حاصل تھی، اس کی گفتگو ہی سے آپ اس کی شخصیت کا پتہ لگا لیتے تھے، کسی نے اظہار تعجب کرتے ہوئے آپ سے پوچھا کہ جھوٹے راویوں کو آپ کیسے جان جاتے ہیں؟ فرمایا جیسے ڈاکٹر مجنون کو دیکھ کر پہچان جاتا ہے۔ (۵)

علامہ ابن حبان فرماتے ہیں کہ: دو آدمیوں نے دین داری، تقویٰ اور پرہیز گاری، تفقہ فی الدین کے ساتھ ساتھ، راویان حدیث کی تحقیق، ضعفاء کی معرفت کو اپنا پیشہ بنا رکھا تھا، جنہوں نے اس فن میں سب سے زیادہ کام کیا ہے، اور بڑا عظیم کارنامہ انجام دیا ہے، وہ یحییٰ بن سعید قطان، اور عبدالرحمٰن بن مہدی ہیں۔ (۶)

حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ اس دور میں دو حافظ اور حجت نقد رجال کیلئے تیار ہوئے لوگوں کو ان پر بڑا اعتماد تھا، جسکی انہوں نے توثیق کر دی وہ مقبول اور جس پر جرح کر دیا وہ متروک قرار پایا۔ وہ یحییٰ بن سعید قطان اور عبدالرحمٰن بن مہدی کی شخصیت تھی۔ (۷)

---

(۱) سیر أعلام النبلاء ۹/۱۹٤، تهذيب ٦/۲۸۱ (۲) الجرح و التعديل ۱/۲۵۱

(۳) الجرح و التعديل ۱/۲۵۲ (٤) سير أعلام النبلاء ۹/۱۹٤

(۵) الجرح و التعديل ۱/۲۵۲، مقدمة المجروحين ۱/۳۲ (٦) مقدمة المجروحين ۱/۵۲

(۷) ذكر من يعتمد قوله في الجرح و التعديل ص ۱٦۷، الإعلان بالتوبيخ لمن ذم التاريخ ص ۱٦٤

وفات:- بالآخر اس دنیا کو علم کی روشنی سے منور کر کے سنت رسول کی خدمت انجام دیتے ہوئے جمادی الآخر ۱۹۸ھ کو ترسٹھ سال کی عمر (عمر نبوی میں) بصرہ میں وفات پائی۔[1]

مورخ بے مثال محمد بن سعد کاتب واقدی

(۱۶۸-۲۳۰ھ)

دوسری صدی کی انتہا اور تیسری صدی کی ابتداء میں جن خدام سنت نبوی نے کارہائے نمایاں انجام دیا ہے ان میں، حافظ ابن سعد کا نام نامی بہت مشہور ہے۔ جنہوں نے "الطبقات الکبریٰ" جیسی عظیم کتاب امت کو عطا کیا جو کتب رجال کی بالکل بنیادی کتاب ہے۔ آپ کی زندگی کا مختصر خاکہ یہ ہے۔

نام و نسب:- آپ کا نام محمد بن سعد بن منیع ابو عبداللہ بصری مولی بن ہاشم ہے، آپ ابن سعد کاتب الواقدی کے نام سے مشہور ہیں۔[2]

ولادت:- آپ کی ولادت اس دور کے مشہور علمی مقام بصرہ میں ۱۶۸ھ میں ہوئی، وہیں پر پرورش و پرداخت بھی ہوئی، طلب علم کا کام کم سنی ہی میں یہیں سے شروع کیا اور بڑے بڑے اہل علم کے سامنے زانوئے تلمذتہ کیا۔[3]

علمی سفر:- یہاں سے علمی تشنگی بجھانے کے بعد دیگر مقامات کا سفر کیا جن میں بغداد خاص طور سے قابل ذکر ہے، یہاں پر طویل وقفے تک آپ کا قیام رہا، اس کے علاوہ جو دیگر گنے چنے علمی مراکز تھے ان میں مکہ، مدینہ، کوفہ کو کافی شہرت حاصل تھی لہٰذا وہاں کیلئے رخت سفر باندھا اور وہاں کے اہل علم سے استفادہ کیا، یہاں تک کہ ایک عظیم محدث، بے مثال مورخ، ماہر نسابہ اور امام جرح و تعدیل بن کر ابھرے۔

آپ کے بعد بغداد میں قیام کا وہی دور تھا جب فتنۂ خلق قرآن بڑے آب و تاب کے ساتھ ننگی تلوار بن کر علماء سنت کے سر پر لٹک رہی تھی۔ جن مشہور زمانہ سات اہل علم نے اس کو قبول نہ کیا تھا ان میں محمد بن سعد، یحییٰ بن معین، علی بن مدینی

---

(۱) الطبقات الکبری لابن سعد ۲۹۷/۷، سیر اعلام النبلاء ۲۰۶/۹

(۲) تاریخ بغداد ۳۲۱/۵

(۳) سیر أعلام النبلاء ۶۶۴/۱۰، الطبقات الکبریٰ (القسم المتمم) مقدمہ [illegible] ص ۱۹

جیسے لوگ تھے، لیکن جب ان سات افراد کی طلبی ہوئی تو مشکلات و پریشانی اور موت کے خوف سے بادلِ نخواستہ بظاہر اس کا اقرار کر لیا۔ اب صرف امام احمد بن حنبل تنہا اس میدان میں باقی بچے۔

چونکہ یہ حضرات ائمہ اور اس وقت کے قدوہ تھے، لہٰذا امام احمد بن حنبل ان سب سے اس بنا پر کافی ناراض رہتے تھے۔ (۱)

ابن معین فرماتے ہیں کہ: "أجبناه خوفا من السيف." (۲)

اساتذہ:- آپ کے مشہور اساتذہ میں امام مغازی محمد بن عمر الواقدی ہیں، جن کے ساتھ آپ نے بغداد میں طویل وقفہ گذارا تھا یہاں تک کہ کاتب الواقدی کے نام سے مشہور ہو گئے۔ ان کے علاوہ سفیان بن عیینہ، اسماعیل بن علیہ، ولید بن مسلم، ہشیم بن بشیر، ابن ابی فدیک، ابو الولید طیالسی، مصعب بن عبد اللہ زبیری، وکیع بن جراح، یحییٰ بن سعید قطان، یزید بن ہارون وغیرہ ہیں۔ (۳)

تلامذہ:- چونکہ آپ ایک عظیم مورخ، ماہر نسابہ، محدث اور امام کی حیثیت سے ابھرے تھے اس لئے اہل کی ایک بڑی جماعت نے آپ سے استفادہ کیا جن میں مشہور مورخ احمد بن یحییٰ بلاذری، مشہور محدث ابن ابی الدنیا، صاحب مسند حارث بن ابی اُسامۃ، امام ابو القاسم بغوی، حسین بن فہم کے علاوہ دیگر اہل علم ہیں۔ (۴)

امام احمد بن حنبل آپ کے پاس حنبل بن اسحٰق کو ہر جمعہ کو بھیجتے تھے اور واقدی کے حدیثوں کے دو اجزاء منگا کر دیکھتے اور اگلے ہفتہ اس کو واپس کر کے دوسرے اجزاء منگاتے تھے اور اس کا مطالعہ کرتے تھے۔ (۵)

علمی خدمات و فن جرح و تعدیل:- آپ کی علمی خدمات میں تدریسی، تبلیغی خدمات کے علاوہ اہم تصنیفی خدمات بھی ہیں، آپکی تالیفات میں "الطبقات الکبریٰ" انتہائی معروف اور اپنے فن کی موجودہ کتابوں میں پہلی اور بنیادی کتاب ہے، جس سے

---

(۱) مناقب الامام أحمد بن حنبل ص ٤٧٣-٤٧٥، الطبقات الكبرىٰ (القسم المتمم) ص ٣٦-٣٧

(۲) البداية و النهاية ٢٧٣/١٠

(۳) تذكرة الحفاظ ٤٢٥/٢، تهذيب التهذيب ١٨٢/٩، الطبقات القسم المتمم مقدمه محقق ص ٥٢-٥٣

(٤) سير أعلام النبلاء ٦٦٥/١٠، تهذيب التهذيب ١٨٢/٩ (٥) تاريخ بغداد ٣٢٢/٥

آپ کے علم کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے، اس کے علاوہ "الطبقات الصغیر" جو "الطبقات الکبریٰ" کی مختصر ہے اور "التاریخ" آپ کی تالیفات میں سے ہیں۔[1]

شیخ زیاد محمد منصور نے "الطبقات الکبریٰ" کے قسم متمم میں آپ کی پانچ تالیفات کا ذکر کیا ہے۔[2]

فن جرح و تعدیل میں آپ کو امامت کا مقام حاصل ہے، آپ نے راویان حدیث پر بحیثیت جرح و تعدیل کلام کیا ہے، جس میں مختلف مراتب کے کلمات کا استعمال کیا ہے، آپ کی کتاب الطبقات، فن جرح و تعدیل اور اسماء رجال میں آپ کی امامت کی شہادت دیتی ہے، جس کے بارے میں امام ذہبی فرماتے ہیں کہ: "من نظر فی الطبقات خضع له"[3] اور حاجی خلیفہ فرماتے ہیں کہ: أعظم ما صنف فی طبقات الرواۃ،[4]

اس کے علاوہ آپ کی سابقہ دونوں کتابیں بھی اسی فن سے متعلق ہیں راویوں پر آپ کے کلام کو اہل علم نے قبول کیا ہے اور آپ کی کتابوں پر بھرپور اعتماد اور اس سے استفادہ کیا ہے۔

آپ کی ثقاہت وعدالت اور علمی تبحر پر اہل علم کا تقریباً اتفاق ہے، آپ کے شاگرد حسین بن فہم نے آپ کی بڑی تعریف کی ہے، جس کو خطیب نے نقل کیا ہے، نیز وہ خود فرماتے ہیں کہ: کان من أهل العلم والفضل، والفهم والعدالة، صنف کتاباً فی طبقات الصحابة والتابعین إلی وقته فأجاد فیه و أحسن.[5]

ابن خلکان فرماتے ہیں کہ: کان أحد الفضلاء النبلاء الأجلاء و کان صدوقا ثقة.[6]

حافظ ذہبی نے علامہ، حجۃ اور حافظ کا خطاب دے کر فرمایا کہ: کان من أوعیة العلم من نظر فی الطبقات خضع لعلمه.[7]

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ۴۲۵/۲، تاریخ التراث العربی ۸۱/۱، طبقات صغیر کا نسخہ متحف الآثار استنبول میں ۴۳۵ نمبر پر موجود ہے۔

(۲) الطبقات، قسم متمم ص ۵۵-۵۸

(۳) سیر أعلام النبلاء ۶۶۵/۱۰

(۴) کشف الظنون ۱۰۹۹/۲

(۵) تاریخ بغداد ۳۲۱/۵

(۶) وفیات الأعیان ۳۵۱/۴

(۷) سیر أعلام النبلاء ۶۶۵/۱۰

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ: آپ بڑے بڑے حفاظ ثقات جو علم کی تلاش و جستجو کرتے تھے ان میں سے ایک ہیں۔(۱)

البتہ یحییٰ بن معین نے آپ پر کلام کیا ہے، حسین بن فہم کہتے ہیں کہ ہم مصعب زبیری کے پاس بیٹھے تھے، وہاں سے ابن معین کا گذر ہوا، انہوں (مصعب) نے کہا کہ ابن سعد نے ایک روایت اس طرح سے ذکر کیا ہے، ابن معین نے فرمایا کہ: کذب۔(۲)

اس سے بعض علماء نے یہ مفہوم لیا ہے کہ ابن معین نے ابن سعد کی تکذیب کی ہے، لیکن امام ذہبی فرماتے ہیں کہ یہ لفظ بظاہر محکی عنہ پر حکم لگاتا ہے۔ (یعنی وہ روایت غلط ہے) نہ کہ حکایت کرنے والے (ابن سعد پر) اگر اس سے ابن سعد مراد ہوں جسکا احتمال ہو سکتا ہے۔ تو (قابل قبول نہیں اسلئے کہ) ان کی صداقت ثابت شدہ ہے۔(۳)

نیز قواعد کے باب میں یہ گذر چکا ہے کہ لفظ کذب کا اطلاق خطاء پر بکثرت استعمال کیا جاتا تھا، بظاہر یہاں پر یہی مراد ہے۔

خطیب بغدادی، سمعانی، ابن تغری بردی وغیرہ نے ان کا دفاع کیا ہے اور دیگر اہل علم نے اس کلام کو (اگر اس سے ابن سعد مراد لیا جائے) تو قبول نہیں کیا ہے۔(۴)

خطیب بغدادی فرماتے ہیں کہ: شاید مصعب نے واقدی کی منکر روایتوں میں سے کسی کا ذکر کیا ہو تو ابن معین نے یہ جواب دیا، ورنہ وہ تو ہمارے نزدیک عادل، صادق اور حدیثوں کی جانچ پڑتال کرنے والے ہیں۔(۵)

اور جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے کہ حسین بن فہم نے ان کی بڑی تعریف کی ہے حالانکہ یہ واقعہ انہیں کی روایت کردہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بھی اس جرح کا اعتبار نہیں کیا ہے۔

وفات: - آپ کی وفات بغداد میں ۲۳۰ھ میں باسٹھ سال کی عمر میں ہوئی، اور مقبرہ "باب الشام" میں آپ کو دفن کیا گیا۔(۶)

---

(۱) تهذيب التهذيب ۱۸۲/۹ (۳) تاريخ بغداد ۳۲۱/۵
(٤) ميزان الاعتدال ۵۰۸/۳
(٥) الطبقات الكبرىٰ مقدمه محقق القسم المتمم ص(٦) تاريخ بغداد ۳۲۱/۵
(٦) تاريخ بغداد ۳۲۲/۵

شیخ المحدثین امام یحییٰ بن معین

(متوفی ۲۳۳ھ)

امام یحییٰ بن معین تیسری صدی ہجری کے ان درخشاں ستاروں میں سے ہیں جن کو ڈوبے ہوئے ایک زمانہ گزر گیا لیکن ان کی روشنی آج تک موجود ہے اور یوں لگتا ہے کہ ابھی ماضی قریب کی کوئی شخصیت ہے۔ آپ کا دور علم حدیث کا معیاری دور تھا، معرفت رجال، جرح و تعدیل اور علل حدیث کا سنہرا دور تھا۔ اسی عصر میں امام اہل السنۃ والجماعۃ امام احمد بن حنبل، علی بن مدینی، اسحٰق راہویہ رحمہم اللہ جیسے اصحاب عزم و حوصلہ اور اہل بصیرت علماء موجود تھے۔

نام و نسب:- آپ کا نام و نسب یحییٰ بن معین بن عون بن زیاد بن بسطام بن عبدالرحمٰن مری ہے۔(۱)

کچھ بزرگوں کا خیال ہے کہ آپ کا نام و نسب یوں ہے۔ یحییٰ بن معین بن غیاث بن زیاد بن عون بن بسطام(۲)

علامہ ابن خلکان فرماتے ہیں کہ: پہلی بات زیادہ صحیح اور مشہور ہے۔(۳)

آپ کی کنیت ابو زکریا اور نسبت ولاء غطفانی ہے، اصلاً آپ انبار کے رہنے والے تھے۔ پرورش و پرداخت بغداد میں ہوئی ہے۔(۴)

سفر علم:- فن حدیث سے آپ کے شغف کا یہ عالم تھا کہ آپ نے بغداد جیسے مرکز علم و فن پر اکتفانہ کیا بلکہ مختلف مقامات کا سفر کیا جس میں عراق، حجاز، جزیرہ، شام، مصر، یمن قابل ذکر ہیں۔(۵)

اقتصادی حالت:- آپ کے والد محترم معین بن عون سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے کافی مالدار تھے اس لئے وراثت میں زر کثیر چھوڑ کر گئے، امام یحییٰ ابن معین نے

---

(۱) تاریخ بغداد ۱۴/۱۷۷

(۲) تاریخ بغداد ۱۴/۱۷۷، و تہذیب الأسماء واللغات ۲/۱۵۶

(۳) وفیات الاعیان ۶/۱۶

(۴) سیر أعلام النبلاء ۱۱/۷۸، علامہ ابن حبان کا خیال ہے کہ آپ اصلاً سرخس کے تھے۔ الثقات ۹/۲۶۲

(۵) مقدمہ تاریخ یحییٰ بن معین ۱/۵۲

وہ ساری دولت علم حدیث کے حاصل کرنے میں صرف کردی اور ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ پیر میں جوتی تک میسر نہ تھی۔(۱)

اساتذہ:- آپ کے مشائخ میں بڑے بڑے ماہرین فن، نقاد وقت، عارف باللہ شخصیتیں ہیں۔ جن میں عبد اللہ بن مبارک، سفیان بن عیینہ، سفیان ثوری، یحییٰ بن سعید قطان، عبد الرحمٰن بن مہدی قابل ذکر ہیں۔(۲)

ان اساتذہ کا آپ کے ناقدانہ مزاج، علمی بصیرت، ذوق طلب، صحیح و سقیم کی معرفت اور جمع حدیث پر بہت گہرا اثر پڑا یہاں تک کہ آپ کو أمیر المؤمنین فی الحدیث، امام جرح و تعدیل اور شیخ المحدثین کے خطاب سے نوازا گیا۔

تلامذہ:- آپ کی علمی شخصیت کا اثر آپ کے تلامذہ اور معاصرین پر بہت گہرا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے شاگردوں میں نادر زمانہ اور قابل فخر شخصیات تھیں، جن میں امام احمد بن حنبلؒ، امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام دارمیؒ، امام ابو داوٗدؒ، امام ابو زرعہؒ اور امام ابو حاتمؒ رازی قابل ذکر ہیں۔(۳)

علمی مقام:- آپ کے علم کا اندازہ امام ابن مدینی کے اس بیان سے کیا جاسکتا ہے جس میں انہوں نے فرمایا کہ حجاز، کوفہ اور بصرہ کا علم چھ افراد پر ختم ہوا، ان چھ افراد کا علم حجاز، شام، کوفہ، بصرہ کے بارہ آدمیوں میں منتشر ہوا، جن کو محمد بن اسحٰق، ہشام، یحییٰ بن سعید، ابن ابی زائدہ، وکیع، ابن مبارک، ابن مہدی، ابن آدم نے جمع کیا، پھر ان سارے لوگوں کا علم سمٹ کر یحییٰ بن معین کے پاس جمع ہوگیا۔(۴)

یہی وجہ ہے کہ آپ مرجع خلائق بن گئے۔

علمی وقار کا یہ عالم تھا کہ امام احمد بن حنبل جیسے صاحب بصیرت آپ سے اُحادیث کی تصحیح کراتے تھے۔(۵)

---

(۱) تاریخ بغداد ۱۴/۱۷۸، سیر أعلام النبلاء ۱۱/۷۷، تذکرة الحفاظ ۱/۴۳۰

(۲) سیر أعلام النبلاء ۱۱/۷۲. تهذيب التهذيب ۱۱/۲۸۳

(۳) سیر أعلام النبلاء ۱۱/۷۲، تهذيب التهذيب ۱۱/۲۸۳

(۴) تاریخ بغداد ۱۴/ ۱۷۸، طبقات حنابله ۱/۴۰۵، تذکرة الحفاظ ۱/۴۳۰

(۵) تهذيب التهذيب ۱۱/۲۸۰

آپ جس مجلس میں پہنچ جاتے تھے وہاں ہیبت طاری ہو جاتی تھ، اور بڑے بڑے مشایخ پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا، حتی کہ بعض کے ہاتھ سے کتابیں گر گئیں۔[۱]

جرح و تعدیل میں آپ کا مقام:- جرح و تعدیل اور اسماء رجال کی معرفت میں آپ کو خاص ملکہ حاصل تھا آپ اس فن کے امام وقت عظیم محدث اور سب سے بڑے ناقد سمجھے جاتے تھے۔

آج کوئی بھی فن جرح و تعدیل کی کتاب نہیں جو آپکے اقوال سے خالی ہو، امام ابن ابی حاتم فرماتے ہیں: "كان من العلماء الجهابذة النقاد فى الطبقة الثالثة ببغداد."[۲]

امام احمد بن حنبل، یحیٰ بن معین کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہاں ایک ایسی شخصیت ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے افترا پردازوں کے افترا کو ظاہر کرنے کیلئے پیدا کیا ہے۔[۳] آپ کسی کی پرواہ کئے بغیر راویوں کے عیوب کو بیان کرتے تھے۔[۴]

ابو علی صالح بن محمد سے کسی نے سوال کیا کہ فن حدیث میں سب سے زیادہ ماہر کون ہے؟ امام احمد بن حنبل یا یحیٰ بن معین؟ تو انہوں نے کہا کہ فقہ اور اختلافی مسائل کی معرفت میں امام احمد ہیں، لیکن رجال حدیث، ان کی کنیت و نام کے بارے میں یحیٰ بن معین کو سب سے زیادہ معلومات ہے۔[۵]

ابو سعید الحداد فرماتے ہیں کہ (اسماء رجال کے بارے میں) سارے لوگ یحیٰ بن معین کے محتاج ہیں۔

امام نسائی فرماتے ہیں کہ آپ ثقہ اور معتمد ائمہ حدیث میں سے ہیں۔[۶]

امام ابو داؤد سے سوال کیا گیا کہ رجال کے بارے میں زیادہ معلومات یحیٰ بن معین کو ہے یا علی بن مدینی کو؟ تو انہوں نے فرمایا کہ یحیٰ بن معین کو، علی بن مدینی کے پاس شامیوں کے بارے میں معلومات نہیں ہیں۔[۷]

عمرو بن ناقد فرماتے ہیں یحیٰ بن معین سے زیادہ اسناد کے بارے میں معلومات

---

(۱) تاریخ بغداد ۱۸۱/۱۴ — (۲) مقدمه الجرح والتعديل ۳۱٤/۱

(۳) تاریخ بغداد ۱۸۰/۱٤ — (٤) شرح علل الترمذى ص ۱۸۸

(۵) تاریخ بغداد ۱۸۲/۱٤ — (٦) مصدر سابق

(۷) سير أعلام النبلاء ۸۰/۱۱

والا کوئی نہیں تھا۔[1]

علامہ خلیلی فرماتے ہیں کہ :آپ قدیم و جدید ہر قسم کے راویوں کا حال جانتے تھے۔[2]

علامہ ابن رجب فرماتے ہیں کہ :آپ جرح و تعدیل کے امام مطلق ہیں۔[3]

امام احمد بن حنبلؒ کا بیان ہے کہ :ہم میں ابن معین سب سے زیادہ رجال حدیث کے بارے میں معلومات رکھتے تھے۔[4]

انہیں ساری خوبیوں کی بنیاد پر آپ کو"أمیر المؤمنین فی الحدیث" کے خطاب سے بھی نوازا گیا ہے۔[5]

وفات:- ۲۳۳ھ میں پچھتر ۷۵ سال کی عمر میں مدینہ منورہ میں انتقال ہوا اور اس تخت پر جس پر رسول پاک کے جنازہ کو غسل دیا گیا تھا اس خادم سنت کو بھی غسل دیا گیا تشییع جنازہ میں ایک عالم شریک تھا اور یہ اعلان ہو رہا تھا کہ یہ رسول پاک سے دروغ کو دفاع کرنے والے کا جنازہ ہے۔[6]

سوگواروں کے اس ہجوم نے "جنت بقیع" میں آپ کو سپرد خاک کیا۔[7]

امام ربانی احمد بن حنبل شیبانی

(۱۶۴-۲۴۱ھ)

تیسری صدی جہاں اسلام علم و عمل کی روشنی سے جگمگا رہا تھا، وہیں باطل قوتیں، بدعتی فرقے، بے بنیاد عقیدوں کے حاملین بھی بڑے سرگرم تھے، ان کی عتاب کا بڑی بڑی عظیم ہستیاں شکار تھیں، جو حضرات کتاب و سنت کی بالادستی کے خواہاں تھے ظلم و ستم کا نشانہ بنائے گئے، اہل سنت والجماعت کی کشتی بھنور میں ہچکولے کھانے لگی، خوف و ہراس نے کشتی بانوں کو روپوش ہونے پر مجبور کر دیا، قدرت نے اس وقت ایک ایسے امام ربانی کا انتظام فرمایا جنھوں نے اس بیڑے کو تباہی سے بچالیا، امت کی ڈوبتی ہوئی

---

(۱) تهذیب التهذیب ۲۸۳/۱۱ (۲) بحوث فی الجرح والتعدیل ص ۳۲۷
(۳) شرح علل الترمذی ص ۱۸۸ (٤) تهذیب التهذیب ۲۸٤/۱۱
(٥) سیر أعلام النبلاء ۹۰/۱۱، تهذیب التهذیب ۲۸۰/۱۱
(٦) الجرح والتعدیل ۳۱۷/۱، سیر أعلام النبلاء ۸٤/۱۱، الثقات ۲۶۳/۹
(۷) تاریخ بغداد ۱۸۲/۱٤

کشتی کو ساحل تک پہنچایا، صبر واستقامت کے اس پہاڑ سے ٹکرا کر باطل قوتیں پاش پاش ہو گئیں، یہ شخصیت امام أهل السنة والجماعة امام احمد بن حنبل کی شخصیت تھی۔

آپ کی زندگی کا مکمل نقشہ پیش کرنا یہاں پر بہت مشکل ہے، لہٰذا زندگی کی ایک مختصر جھلک پیش خدمت ہے۔

نام و نسب:- آپ ابو عبداللہ احمد بن محمد بن حنبل بن ہلال بن أسد شیبانی بغدادی ہیں۔ آپکا نسب رسول پاک ﷺ کیساتھ نزار بن عدنان پر مل جاتا ہے، قاضی ابو یعلی وغیرہ نے آپ کے نسب کو حضرت ابراہیم علیہ السلام تک ذکر کیا ہے۔[۱]

آپ اصلاً "مرو" کے رہنے والے تھے، آپ کے والد اسلامی لشکر میں فوجی تھے، عین شباب میں تیس سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔[۲]

ولادت:-آپ کی والدہ وہاں سے بغداد منتقل ہو گئیں، یہیں پر آپ کی پیدائش حالت یتیمی میں ۱۶۴ھ میں ہوئی۔[۳] کچھ مورخین کا کہنا ہے کہ آپ کی ولادت مرو میں ہوئی، والد کے انتقال کے بعد بغداد لائے گئے۔[۴]

پرورش:-والدہ نے پرورش وپرداخت کا انتظام سنبھالا، اور اُسی شہر علم میں پرورش ملی۔[۵] قدرت کو آپ سے جو کام لینا تھا اس کیلئے بچپن سے تیاری شروع ہو گئی، یتیمی نے محنت ومشقت اور صبر کا عادی بنادیا۔ بچپن ہی سے سنت رسول کے طالب کتاب اللہ کے گرویدہ بن گئے، انتہائی مختصر سی عمر میں کتاب اللہ کے حافظ ہو گئے اور درس حدیث میں دلچسپی لینے لگے، پندرہ سال کی عمر میں باقاعدہ درس حدیث کا سماع شروع کر دیا، جبکہ اس سے پہلے مجلس درس میں شرکت ہوا کرتی تھی۔ مکتب ہی سے آپ کی ہونہاری، صلاحیت اور فضل کی شہرت ہونے لگی تھی۔

طلب علم:-۱۷۹ھ جس سال امام مالک کا انتقال ہوا تھا اس سال سے ہشیم بن بشیر سے باقاعدہ درس حدیث شروع کیا۔[۶]

---

(۱) طبقات الحنابلة ۱/٤ (۲) شذرات الذهب ۲/۹٦

(۳) تاريخ بغداد ٤/٤١٥، سير أعلام النبلاء ١١/١٧٩

(٤) دراسات في الجرح ص ٣٤٦ (٥) شذرات الذهب ۲/۹٦

(٦) تاريخ بغداد ٤/٤١٦

بغداد جیسے علم و فن کے شہر میں جہاں ماہرین فن کی کوئی کمی نہ تھی، ہر چہار جانب سے اہل علم یہاں کارخ کرتے تھے۔ لیکن آپ نے اس پر اکتفانہ کرتے ہوئے دیگر مقامات کا سفر کیا، جس میں کوفہ، بصرہ، مکہ، مدینہ، شام، جزیرہ وغیرہ شامل ہیں۔ (۱)

بعض مقامات کا سفر آپ محض اخراجات نہ ہونے کی وجہ سے نہ کر سکے، بلکہ حج بیت اللہ بھی پیدل جا کر ادا کیا، آپ نے کل پانچ حج کیا تھا جس میں سے تین حج پیدل چل کر کیا تھا، ان میں سے ایک کا خرچ تیس درہم تھا۔ (۲)

اس طرح فقر و فاقہ کی زندگی گذارتے ہوئے علم و فضل کی دولت سے مالامال ہوتے گئے۔

اساتذہ:- آپ کے اساتذہ کی بہت بڑی تعداد ہے جن میں بڑے بڑے علم و فن کے غازی تھے۔ مثلاً: سفیان بن عیینہ، یزید بن ہارون، وکیع بن جراح، ابو عبداللہ امام شافعی، یحییٰ بن سعید قطان، عبدالرحمٰن بن مہدی، عبدالرزاق صنعانی علی بن مدینی، ابو بکر بن ابی شیبہ جیسے ماہرین اور صاحب فضل و کمال تھے۔ (۳)

تلامذہ:- شاگردوں کی تعداد کا کوئی شمار نہیں، اس لئے کہ کبھی کبھی آپ کی مجلس میں پانچ پانچ ہزار افراد شامل ہوتے تھے، آپ کے شاگردوں میں امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداؤد جیسے شیدائی سنت ہیں، جو محتاج تعارف نہیں، خود آپ کے اساتذہ میں سے امام شافعی، ابن مدینی، یحییٰ بن معین عبدالرزاق صنعانی وغیرہ نے آپ سے روایت کیا ہے۔ آپ کے مشہور شاگردوں میں آپ کی اولاد بھی ہے جن میں آپ کے صاحبزادے امام عبداللہ بن احمد خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ (۴)

دیگر حالات:- زہد و تقویٰ، تواضع و خاکساری، دنیا سے بے رغبتی آپ کا شیوہ تھا، اساتذہ طلبہ اور اہل علم کی تکریم کے خوگر تھے، آپ کی شرافت، تواضع، علم و فضل، تقویٰ و خودداری کے ثناخواں آپ کے اساتذہ تھے جو آپ کے سامنے اپنے آپ کو کمزور محسوس کرتے تھے، اور آپ کی بڑی تکریم و تعریف کرتے تھے، آپ کے وجود

---

(۱) تاریخ بغداد ٤/٤١٢

(۲) الجرح والتعديل ١/٣٠٤، مناقب الامام أحمد لابن الجوزی ص ٢٦

(۳) سير أعلام النبلاء ١١/١٨٠-١٨١ (٤) سير أعلام النبلاء ١١/١٨١-١٨٢

سے ان کی مجلسیں پر رونق اور بڑی باوقار ہو جاتی تھیں۔[1]

ابتلاء و آزمائش:- آپ کی شخصیت جامع العلوم تھی، فقر و فاقہ کے باجود امراء و خلفاء، دوست واحباب کے ہدایا کو قبول نہ کرتے تھے، ابتلاء اور آزمائش کی گھڑی میں کبھی بھی آپ پر ملال نہ آیا، اسلامی تاریخ میں ۲۲۰ھ کو جو منظر پیش آیا زمین و آسمان اس کو دیکھ کر لرز اٹھے، رمضان کا مبارک مہینہ، آخری عشرہ کے بابرکت ایام، امام اہل سنت والجماعت کہ پشت پر کوڑوں کی برسات!! وہ بھی اپنے آپ کو مسلمان کہنے والوں کے ہاتھ سے اور ایسے کوڑے جس کے بارے میں جلاد کا کہنا ہے کہ اگر میں اس طرح کی مار ہاتھی کو مار دیتا تو وہ بھی ڈھیر ہو جاتا۔[2]

لیکن عزیمت و استقامت کا یہ پہاڑ صرف اتنا کہتا کہ: **اعطونی شیئا من کتاب الله، أو حدیثاً من رسول الله حتی أقول به.**[3]

امام علی بن مدینی فرماتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ نے دین کی مدد دو افراد کے ذریعہ کی، حضرت ابو بکر صدیق سے دور ردت میں، اور امام احمد بن حنبل سے دور فتنہ خلق قرآن میں، نیز فرمایا کہ: حضرت ابو بکر کا تو ساتھ دینے والے بھی تھے، لیکن ان کا کوئی ساتھی نہ تھا۔[4]

علمی مقام:- آپ کے علم کا یہ عالم تھا کہ ہر سوال کا جواب حدثنا و أخبرنا سے دیتے تھے، جہاں بڑے بڑے اہل علم جواب دینے سے کتراتے تھے وہاں احمد بن حنبل جواب دیتے تھے۔[5]

ابراہیم حربی فرماتے ہیں کہ ایسا لگتا تھا جیسے اللہ تعالیٰ نے آپ کو اولین و آخرین کے علم سے نواز دیا ہے۔[6] آپ کی کتاب "المسند" موجودہ مسانید میں سب سے عظیم کتاب ہے۔ آپ کی دیگر تالیفات سے آپ کے علم کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

فن جرح و تعدیل میں آپ کا مقام:- فن جرح و تعدیل میں آپ کو

---

(۱) الجرح والتعدیل ۱/۲۹۷، تاریخ بغداد ٤/٤١٦

(۲) تاریخ بغداد ٤/٤٢١-٤٢٢، سیر أعلام النبلاء ۱۱/۲۹۵

(۳) سیر أعلام النبلاء ۱۱/۲۵۱

(٤) تاریخ بغداد ٤/٤١٨، طبقات الحنابلة ۱/۱۷

(۵) سیر أعلام النبلاء ۱۱/۱۸۸

(٦) طبقات الحنابلة ۱/٦، شذرات ۲/۹۷

امامت کا درجہ حاصل تھا، صحیح وضعیف کی معرفت، علل حدیث کا جو علم آپ کے پاس تھا، اس کی وجہ سے طلباء کی جماعت آپ کے گرد جمع رہتی تھی اور آپ سے راویان حدیث اور علل کے بارے میں سوال کرتے تھے اور تشفی بخش جواب سنتے تھے۔

ابو یعلی خلیلی فرماتے ہیں کہ: "هو إمام في الجرح والتعديل، والمعرفة والتعليل والبيان والتاويل" طلباء کا جمگھٹ، اس فن میں آپ کی نادر تالیفات، آپ کے مہارت تامہ پر بین ثبوت ہیں، اس فن سے متعلق آپ کی تالیفات میں:

العلل و معرفة الرجال روایت عبداللہ

العلل و معرفة الرجال روایت مروزی، وصالح وغیرہ

كتاب الأسماء والكنى روایت صالح

أسئلة لأحمد بن حنبل عن الرواة الثقات والضعفاء

كتاب التاريخ وغیرہ اہم کتابیں ہیں۔

آپ کی مختلف فنون میں جملہ تالیفات کا ذکر برادرِ محترم ڈاکٹر وصی اللہ عباس صاحب نے مقدمہ فضائل صحابہ میں کیا ہے جن کی تعداد ۳۹ بتائی ہے۔ ان میں سے موجود اور مطبوع کی جانب اشارہ بھی کر دیا ہے۔[۱]

آپ کے استاذ امام شافعی کی یہ شہادت ہے: "أنتم أعلم بالحديث والرجال منا فاذا كان الحديث صحيحا فاعلمو نى حتى أذهب إليه." [۲]

کہ آپ حدیث و رجال کے بارے میں ہم سے زیادہ علم رکھتے ہیں لہٰذا اگر کوئی صحیح حدیث ہو تو مجھ کو بھی بتاؤ تاکہ اس کو اپنا مذہب بناؤں۔

اهل علم کی شہادت:۔ آپ کی سیرت و سوانح رجال و تاریخ کی تقریباً تمام کتابوں میں موجود ہے، بہت سارے حضرات نے آپ کی سیرت پر مخصوص کتابیں تحریر کی ہیں مثلاً حافظ ابن الجوزی کی کتاب "مناقب الامام احمد" وغیرہ جس میں اہل علم کے اقوال کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں سے بطور مثال چند اقوال پیش خدمت ہیں:

امام شافعی فرماتے ہیں کہ: آپ آٹھ چیزوں میں امام تھے، حدیث میں، فقہ

(۱) فضائل الصحابة للامام أحمد بن حنبل مقدمه محقق (۲) طبقات الحنابلة ۱/ ۶

میں، لغت میں، قرآن میں، فقر و فاقہ میں، زہد و تقویٰ میں، سنت میں[1]

ابو عاصم نبیل فرماتے ہیں کہ: میں نے یحییٰ بن معین، احمد بن حنبل، علی بن مدینی، ابن شاذ کونی، ابن ابی شیبہ وغیرہ سے ملاقات کی لیکن آہ! احمد بن حنبل کی طرح کسی کو نہیں پایا۔[2]

اگر سفیان ثوری، امام مالک اور لیث کے زمانہ میں ہوتے تو سب پر مقدم سمجھے جاتے۔[3]

ابن معین فرماتے ہیں کہ: لوگوں کی یہ خواہش ہے کہ میں احمد بن حنبل کی طرح ہو جاؤں میں انکی طرح کیسے ہو سکتا، میں نے ان سے بہتر تو کبھی کسی کو دیکھا بھی نہیں۔[4]

ابو زرعہ سے سوال کیا گیا کہ سب سے بڑا حافظ کون ہے انہوں نے کہا کہ احمد بن حنبل، ان کو دس لاکھ حدیثیں یاد تھیں، نیز فرمایا کہ: انتقال کے بعد ایک اندازہ کے مطابق انؒ کی کتابیں بارہ اونٹوں کا بوجھ تھیں، یہ سب کے سب ان کو برزبان یاد تھیں۔[5]

یحییٰ بن معین فرماتے ہیں: ماتحت أديم السماء أفقه من أحمد[6]

قتیبہ بن سعید اور محمد بن ہارون فلاس فرماتے ہیں کہ: اگر کوئی شخص امام احمد سے محبت کرتا ہے تو سمجھ لو کہ وہ صاحب سنت ہے۔ اور جو آپ کی توہین کرتا ہے تو وہ بدعتی اور گمراہ ہے۔[7]

وفات: - بالآخر وقت موعود آپہنچا اور ۱۲ ربیع الاول جمعہ کی صبح ۲۴۱ھ میں اس دار فانی سے رخصت ہو گئے۔ اس وقت آپ کی عمر تقریباً ۷۷ سال کی تھی۔ جنازہ میں ایک اندازے کے مطابق آٹھ لاکھ افراد اور ساٹھ ہزار عورتوں نے شرکت کی، دفن کے بعد بھی نماز جنازہ کا سلسلہ کئی دن تک جاری رہا، اس امت میں اتنی بڑی تعداد کسی جنازہ میں دیکھی نہیں گئی۔[8]

آپکے انتقال کا افسوس مسلمانوں کے علاوہ یہود و نصاریٰ و مجوس کو بھی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس دن یہود و نصاریٰ اور مجوس میں سے بیس ہزار لوگوں نے اسلام قبول کیا۔[9]

---

(۱) طبقات الحنابلة ۱/۵ (۲) مصدر سابق
(۳) الجرح والتعديل ۱/۲۹۳ (٤) مصدر سابق ۱/۲۹۸، تاريخ بغداد ٤/٤١٤
(۵) تذكرة الحفاظ ۲/٤۳۱، شذرات الذهب ۲/۹۷ (٦) طبقات الحنابلة ۱/٦
(۷) الجرح والتعديل ۱/۳۰۸-۳۰۹ (۸) تاريخ بغداد ٤/٤۲۲، شذرات ۲/۹۸
(۹) تاريخ بغداد ٤/٤۲۲، شذرات ۲/۹۸

امام المحدثین سید الفقهاء

محمد بن اسماعیل بخاریؒ

(متوفی ۲۵۶ھ)

سنت رسول ﷺ کے شیدائیوں، حدیث پاک کے بے لوث خادموں میں امام بخاری کا نام نامی اسم گرامی سر فہرست ہے، امت اسلامیہ کا یہی وہ عظیم محسن ہے جس نے ملت اسلامیہ کے ہر گھر کو سنت رسول کی روشنی سے منور کیا، آپ ہی کے دست مبارک کی تحریر کردہ "صحیح" سنت رسول کا وہ پہلا مجموعہ ہے جس کو "اصح الکتب بعد کتاب اللہ" ہونے کا شرف ملا، جس کو علماء امت نے باتفاق رائے قبول کیا، آپ کی یہ وہ مایہ ناز تالیف ہے جس کا کوئی ثانی نہیں، اس کا نام زبان پر آتے ہی سر تسلیم خم ہو جاتا ہے۔

آپ کا دور: - تیسری صدی ہجری کا دور فن حدیث کا ترقی یافتہ دور تھا صدائے قال اللہ اور قال الرسول کے مسحور کن نغموں کا غلغلہ مچا ہوا تھا، علمی مجلسیں بڑے آب و تاب سے جاری تھیں، ولولہ انگیز نگارشات، بصیرت افروز دروس کا دور دورہ تھا، نقد و تحقیق کا بازار گرم تھا، طالبان علوم نبوت درس حدیث کی مجلسوں میں اٹدے چلے آ رہے تھے۔ (خود امام بخاری کی بعض علمی مجلسوں میں بیس بیس ہزار افراد جمع ہو جاتے تھے۔)

امام علی بن مدینی، عبدالرحمٰن بن مہدی جیسے ماہرین علل حدیث، یحیٰی بن سعید قطان اور یحیٰی بن معین جیسے صاحب نقد و بصیرت، فن رجال کے علم بردار احمد بن حنبل اور اسحٰق راہویہ جیسے فقیہ عصر و دیگر قدوسی نفوس کا زمانہ تھا۔

ولادت: - اسی پر بہار دور میں فارسی نسل گھرانے میں ایک ہونہار بچہ ماوراءالنہر کے مشہور اور قدیم شہر بخارا میں پیدا ہوتا ہے، جس کی ولادت باسعادت ۱۳ر شوال ۱۹۴ھ بعد نماز جمعہ ہوتی ہے اور نام محمد رکھا جاتا ہے۔[1]

یہی وہ ہم نام رسول ہیں جو آئندہ چل کر امام بخاری، امام المحدثین، سید الفقہاء

(۱) مقدمة فتح الباری ص ٤٧٧، سيرة البخاری ص ٤٤

اور لا مثیل لہ، جیسے القاب سے سر فراز کیے گئے جن کا نام و نسب اس طرح ہے۔

نام و نسب:- محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ بن بردزبہ جعفی بخاری (۱)

آپ کے جد اعلیٰ مغیرہ نے حاکم بخارا یمان جعفی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا اس لئے آپ کو جعفی کہا جاتا ہے جو نسبت ولاء ہے۔ (۲)

آپ کی کنیت ابو عبداللہ اور لقب امیر المومنین فی الحدیث ہے۔ آپ کی تعلیم و تربیت خالص علمی گھرانے اور دینی ماحول میں ہوئی، آپ کے والد اسماعیل بن ابراہیم خود مشہور محدث تھے جنہوں نے امام مالک، حماد بن زید اور دیگر اعیان زمانہ سے حدیثیں حاصل کیں اور عبداللہ بن مبارک جیسے یکتائے دھر کی صحبت و تربیت میں رہے (۳)

ذریعہ معاش:- ذریعہ معاش تجارت کا پیشہ تھا جس کے بابت خود آپ کے والد کا بیان ہے کہ میں اپنے حاصل کردہ مال میں ایک درہم بھی مشتبہ نہیں جانتا۔ (۴)

اسی پیشے کو امام بخاری نے بھی اپنایا لیکن قدرت نے انہیں تجارت کے لئے نہیں بلکہ خدمت حدیث رسول کیلئے انتخاب کیا تھا اس لئے کاروبار سے دستبردار ہو کر اپنے مال کو شراکت میں ڈال دیا اور حاصل شدہ آمدنی کو حدیث رسول کے حصول، طلباء اور علماء کی ضروریات کیلئے وقف کر دیا۔

آپ کی والدہ ایک خدا ترس خاتون تھیں، جن کی دعاؤں سے بچپن میں ضائع شدہ بینائی دوبارہ واپس ہو گئی۔ (۵) اور قادر مطلق نے ایسی بینائی عطا کی، جس سے آئندہ چل کر چاند کی روشنی میں بیٹھ کر کتابیں تصنیف کیں۔

آپ ابھی طفل مکتب ہی تھے کہ طلب حدیث کی محبت میں سرشار تھے، حفظ حدیث کے جذبے سے دل و دماغ معمور ہو چکے تھے، مختلف کتب حدیث کا حفظ کر چکے تھے۔ (۶)

گیارہواں سال جاری تھا کہ آپ نے شہرت یافتہ محدث وقت امام داخلی کو

---

(۱) کچھ لوگوں نے بردزبہ کی بجائے آپ کے جد اعلیٰ کا نام احنف لکھا ہے۔ طبقات الشافعیة ۲/۲، احنف ایک عقل مند آدمی گزرا ہے۔ جب کسی کی بڑائی کا اظہار کرنا ہوتا تو لوگ اس کو احنف کہہ دیتے۔ لگتا ہے کہ بردزبہ بھی بڑے ہوشیار اور سخی آدمی تھے اس لئے ان کو احنف کہہ دیا گیا۔ سیرة بخاری ص ٤١ (مع حاشیه)

(۲) تاریخ بغداد ٦/٢ (۳) سیرة البخاری ص ٤١

(٤) طبقات الشافعية ٣/٢ (٥) طبقات الحنابلة ٢٧٤/١، سير أعلام النبلاء ٣٩٣/١٢

(٦) تاريخ بغداد ٦/٢، سير أعلام النبلاء ٣٩٣/١٢

بھری مجلس میں ایک سند میں غلطی کرنے پر ٹوک دیا۔ [۱]

گیارہ سالہ طالب علم محدث وقت کی غلطی پکڑے اور اس کو اصلاح کرنے پر مجبور کر دے کوئی معمولی واقعہ نہیں، یہ امام بخاری کی علمی پختگی، خود اعتادی اور ہونہاری پر غماز ہے۔

سولہ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے آپ نے امام ابن مبارک، امام وکیع اور اہل رائے کی کتابوں کو حفظ کر لیا۔ [۲]

سفر حج و سفر علم:- اٹھارہ سال کی عمر میں آپ نے اپنی والدہ اور بڑے بھائی احمد بن اسماعیل کے ساتھ حج کیلئے رخت سفر باندھا، جو حقیقت میں طالب علم حدیث کا سفر تھا، اس لئے کہ آپ وہاں سے واپس نہیں آئے اور اپنے بھائی کے ساتھ والدہ کو واپس کر دیا۔ یہ ۲۱۲ھ کا واقعہ تھا۔ حج سے فارغ ہونے کے بعد مدینہ منورہ میں قیام کیا، اسی سفر میں آپ نے روضہ اطہر کے پاس بیٹھ کر علمی شاہکار "تاریخ کبیر" کی تصنیف چاند کی روشنی میں کی۔ [۳]

طلب حدیث کے لئے آپ نے بلاد مقدسہ، کوفہ و بصرہ کے علاوہ شام و عراق کے دیگر مشہور مقامات نیز خراسان، بلخ، جزیرہ، ری، مرو وغیرہ کا سفر کیا۔ [۴]

معجزانہ قوت حافظہ:- علم و فن کا مرکز شہر بغداد کا آپ نے بار بار دورہ کیا یہیں پر آپ کے امتحان کا ایک عجیب و غریب واقعہ بھی پیش آیا جو آپ کی خداداد صلاحیت، قوت حافظہ کا معجزانہ نمونہ ہے، جس کے بارے میں حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ: "هنا يخضع للبخاری فما العجب من رده الخطا إلى الصواب فإنه كان حافظا، بل العجب من حفظه للخطاء على ترتيب ما القوه عليه من مرة واحدة. [۵] یہاں امام بخاری کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے، تعجب اس بات پر نہیں کہ انہوں نے غلطی کو درست کر دیا وہ تو حافظ زمانہ تھے ہی، تعجب اس حافظہ پر ہے

---

(۱) مصدر سابق (۲) تاریخ بغداد ۲/۷، مقدمة فتح الباری ص ۴۷۹

(۳) تاریخ بغداد ۲/۷، سیر أعلام النبلاء ۱۲/۴۰۰

(٤) ملاحظہ ہو تاریخ بغداد ۲/٤، سیر أعلام النبلاء ۱۲/۳۹٤، طبقات الشافعية ۲/۳

(٥) هدى السارى مقدمة فتح البارى ص ٤٨٦ نیز ملاحظہ کریں تاریخ بغداد ۲/۲۰

کہ انہوں نے ایک ہی مرتبہ میں غلط اسناد و حدیث کو اسی ترتیب پر دہرادیا جس ترتیب سے ان لوگوں نے پڑھا تھا۔

مشائخ:- ان علمی رحلات کے دوران آپ نے ماہرین فن اور نامور شخصیات سے استفادہ کیا جن کی تعداد ایک ہزار سے زائد ہے۔ خود آپ نے فرمایا کہ "كتبت عن ألف و ثمانين نفسا ليس فيهم إلا صاحب حديث" (۱) جس میں سے بعض اساتذہ امام مالک اور امام ابو حنیفہ کے شیوخ کے ہم طبقہ ہیں۔ (۲)

آپ کے مشہور اساتذہ میں علی بن مدینی، عبدالرحمٰن بن مہدی، امام احمد بن حنبل، اسحٰق بن راہویہ وغیرہ ہیں، جن کی علمی اور فنی مہارت کا آپ کی شخصیت پر بڑا گہرا اثر پڑا۔ ہر صاحب فن کا فن آپ نے جمع کیا اور ایک وقت ایسا بھی آگیا کہ آپ کے بڑے بڑے اساتذہ آپ کے سامنے درس دیتے ہوئے گھبراتے تھے اور آپ سے اپنی کتابوں کی اصلاح کراتے تھے، اور آپ کی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ (۳)

تلامذہ:- شاگردوں کی ایک ایسی باکمال جماعت ہے جس پر ملت اسلامیہ جتنا بھی فخر کرے کم ہے، امت کا ہر ہر فرد آپ کا اور آپ کے شاگردوں کا مرہون منت ہے، آپ ہی کے شاگردوں کا یہ سنہرا سلسلہ ہے جس میں اکثر صحاح ستہ کے مولف یا کسی بڑے کارنامے کے اہل ہیں۔

امام مسلم صاحب صحیح، امام ترمذی صاحب جامع، امام دارمی صاحب سنن، امام نسائی صاحب سنن، امام ابن خزیمہ صاحب صحیح، امام ابو حاتم رازی صاحب علل و جرح و تعدیل کو کون نہیں جانتا؟ یہ آپ کے شاگردوں میں وہ روشن ستارے ہیں جن کی روشنی سے پوری امت مستفید ہو رہی ہے اور تاقیامت انشاء اللہ یہ روشنی یوں ہی جگمگ کرتی رہے گی اور آپ کے لئے صدقۂ جاریہ برقرار رہے گی۔

ویسے آپ کے شاگردوں کا سلسلہ کافی طویل ہے، امام فربری کا بیان ہے کہ صرف صحیح بخاری کو آپ سے تقریباً نوے ہزار لوگوں نے سنا ہے۔ (۴)

---

(۱) مقدمة فتح الباری ص ٤٧٩ (۲) سیرة البخاری ص ٥٣

(۳) سیر أعلام النبلاء ١٢/٤١٩، ٤٣٠، مقدمة فتح الباری ص ٤٨٣

(٤) تاریخ بغداد ٢/٩

علمی مقام:- معرفت علل حدیث، استنباط مسائل اور فقہ فی الدین میں بڑے اونچے مقام پر فائز تھے، اسی وجہ سے آپ کو سید الفقہاء، فقیہ مطلق، جیسے اُلقاب سے آپ کے ہم عصروں نے نوازا ہے جس کا کچھ ذکر آگے آرہا ہے۔

جسمانی اعتبار سے آپ بہت نحیف اور درمیانہ قد کے تھے۔ (۱) لیکن فہم و فراست میں یکتائے زمانہ تھے، آپ کا ہوش ربا حافظہ، تقویٰ اور دیانت داری قابل رشک ہے۔ خشک روٹی آپ کی خوراک، فرش خاکی آپ کا بستر تھا۔

آپ کی شخصیت کا تعارف چند سطور میں ممکن نہیں اور نہ ہی اس کی چنداں ضرورت ہے بلکہ آپ : آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہاداری کے مصداق ہیں۔

یہاں پر فن جرح و تعدیل کے تعلق سے کچھ اظہار خیال مقصد ہے۔

فن جرح و تعدیل میں آپ کا مقام:- حقیقت تو یہ ہے کہ فن جرح و تعدیل اور اسماء رجال میں آپ بحر ناپیدا کنار ہیں، سائل کے سوال کا جملہ پورا بھی نہیں ہونے پاتا کہ آپ کا جواب حاضر رہتا تھا، آپ کے اس فن سے وابستگی کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے:

سلیم بن مجاہد، علامہ بیکندی کی مجلس میں حاضر ہوئے تو انہوں نے فرمایا کہ اگر تھوڑی دیر قبل آئے ہوتے تو ایک ایسے بچے سے ملاقات ہو جاتی جو ستر ہزار حدیثوں کا حافظ ہے۔

ان کو اس نو عمر محدث سے ملاقات کا شوق پیدا ہوا، جب ان سے ملاقات ہوئی جو امام بخاری تھے تو انہوں نے سوال کیا کہ آپ کو ستر ہزار حدیثیں یاد ہیں؟ نو عمر محدث نے کہا بلاشبہ بلکہ اس سے زائد، یہی نہیں بلکہ جس حدیث کے بارے میں آپ مرفوع یا موقوف کا سوال کریں گے اس کا بھی جواب دوں گا، مزید برآں اس میں جتنے بھی راویان حدیث سندوں میں موجود ہیں اکثر کی وفات، سکونت اور دیگر حالات کا بھی پتہ دے سکتا ہوں۔ (۲)

فن رجال اور جرح و تعدیل میں آپ کو جو ملکہ حاصل تھا وہ آپ کی معرکۃ

---

(۱) طبقات الحنابلة ۱/ ۲۷۸، طبقات الشافعية ۲/ ٤ (۲) ملاحظہ ہو سیرۃ البخاری ص ٤٨

الآراء تصنیف "تاریخ کبیر" اور دیگر تالیفات سے بآسانی لگائی جا سکتی ہے، جس میں تقریباً سوا تیرہ ہزار افراد کے حالات قلم بند ہیں۔ (۱)

آپ کے بعد آنے والا ہر فرد آپ کے علمی خزانے کا محتاج ہے، امام ابو العباس بن سعید نے فرمایا کہ: اگر کوئی شخص تیس ہزار حدیثیں بھی لکھ ڈالے تو وہ آپ کی اس کتاب "تاریخ کبیر" کا محتاج رہے گا۔

علل حدیث میں آپ کو بڑی مہارت حاصل تھی۔ ابراہیم خواص فرماتے ہیں کہ امام ابوزرعہ کو امام بخاری کے سامنے طفل مکتب کی طرح بیٹھے ہوئے دیکھا جو آپ سے علل حدیث کے بارے میں سوالات کر رہے تھے۔ (۲)

اس علم کا تعلق فن جرح و تعدیل سے اتنا گہرا ہے کہ راویوں کے حالات، وفات، پیدائش اور دیگر امور کی معرفت کے بغیر اس کا جاننا ناممکن ہے۔

سنن ترمذی میں علل حدیث، نیز جرح و تعدیل کے متعلق آپ کے اقوال بھرے پڑے ہیں جو آپ کے امام فن ہونے پر شاہد ہیں، خود آپ کے اساتذہ اور ہم عصروں نے آپ کی بڑی تعریف کی ہے۔

علماء کی شہادت:- امام احمد بن حنبل نے فرمایا کہ: "ما اخرجت خراسان مثل محمد بن إسماعيل" (۳)

امام ابو حاتم رازی اور عمرو بن علی الفلاس کا بھی یہی خیال ہے کہ محمد بن اسماعیل جیسی شخصیت خراسان میں پیدا نہیں ہوئی۔

ابراہیم دورقی اور نعیم بن حماد کا فرمان ہے کہ: وہ امت کے فقیہ ہیں۔

محمد بن بشار نے فرمایا کہ: "هو أفقه خلق الله في زماننا" اسی طرح انہوں نے آپ کو سید الفقہاء کا بھی خطاب دیا ہے۔

آپ کے استاد محمد بن سلام بیکندی فرماتے ہیں کہ: وہ ایسا نوجوان ہے جس کا

---

(۱) تاریخ کبیر پر محقق کا مقدمہ ملاحظہ ہو ص ٦

(۲) سیر اعلام النبلاء ۴۰۷/۱۲

(۳) امام بخاری کے سلسلہ میں مختلف اقوال کا ملاحظہ کریں۔ تاریخ بغداد ۱٦/۲، ۳۰، سیر اعلام النبلاء ۴۱٦/۱۲-۴۳۸، مقدمة فتح الباری ص ۴۸۲-۴۸۵، سیرة البخاری ص ۱۰۴-۱۱۸

کوئی ثانی نہیں۔

رجاء بن حیوہ نے آپ کو" آية من آية الله "اللہ کی نشانی ہیں کا خطاب دیا ہے۔

امام دارمی فرماتے ہیں کہ میں نے حجاز، شام، عراق میں بڑے بڑے علماء سے ملاقات کی لیکن امام بخاری جیسا جامع شخص کسی کو نہیں دیکھا۔

امام ترمذی فرماتے ہیں کہ: میں نے علل حدیث اور اسناد کی معرفت کے سلسلہ میں امام بخاری سے زیادہ معرفت رکھنے والا کسی کو نہیں دیکھا۔

امام ابن خزیمہ کا خیال ہے کہ: "ماتحت أديم السماء أعلم بالحديث من محمد بن إسماعيل" اس روئے زمین پر امام بخاری سے زیادہ حدیث کی معلومات رکھنے والا کوئی نہیں۔

امام مسلم فرماتے ہیں کہ:" أشهد ليس في الدنيا مثلك "

امام عجلی فرماتے ہیں کہ:"هو أمة من الأمم"

امام علی بن مدینی کا فرمان ہے کہ: انھوں نے آپ کے مثل کسی کو دیکھا ہی نہیں۔

یہ چند اقوال ہیں جو بطور نمونہ ذکر کئے گئے ہیں ورنہ بقول حافظ ابن حجر آپ کے بارے میں اقوال جمع کرنا اس سمندر کی طرح ہے جس کا کوئی ساحل نہیں۔(۱)

علمی سرمایہ:- چونکہ آپ کی پوری زندگی درس و تدریس تصنیف و تالیف میں گذری ہے اس لئے آپ کے علمی آثار مختلف فنون میں پائے جاتے ہیں جس میں آپ کی یکتائے دہر تصنیف " الجامع الصحيح" ہے جو جملہ تالیفات پر بھاری ہے اسی طرح سے التاريخ الكبير،التاريخ الأوسط،التاريخ الصغير،الأدب المفرد، قرأة الفاتحة خلف الامام، جزء رفع اليدين، خلق أفعال العباد آپ کی مطبوعہ تالیفات میں ہیں۔ دیگر تالیفات میں کچھ مفقود ہو چکی ہیں اور کچھ غیر مطبوع ہیں۔

آزمائش، وفات:- لیکن ان جملہ خوبیوں کے باوجود آپ کی زندگی کا آخری دور ابتلاء و آزمائش کا دور رہا ہے، تعصب و تنگ نظری، گروہ بندی اور فرقہ پرستی کے سم قاتل نے آپ کو اپنے پنجے میں جکڑ لیا۔

---

(۱) مقدمة فتح الباري ص ٤٨٥

متملقین (خوشامدی) اور مقربین امراء و سلاطین نے ریشہ دوانی اور بے بنیاد الزام لگا کر آپ کیلئے پروانہ اخراج لکھایا اور اپنا وطن عزیز چھوڑنے پر مجبور کر دیا اور یہ عالم ربانی کسمپرسی بے بسی، مسافرت اور غربت کے عالم میں سمرقند کے ایک دیہات مقام "خرتنک" میں اپنے ایک عزیز کے یہاں یہ کہتے ہوئے کہ "اے اللہ یہ سرزمین وسعت کے باوجود میرے لئے تنگ ہو گئی ہے اب تو فیصلہ فرما" داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ اللھم اغفرله وارحمه و عافه واعف عنه.

قدرت کا یہ فیصلہ عین عیدالفطر کی رات ۲۵۶ھ میں اس وقت آیا جب آپ حساد کی نظروں سے بچنے کیلئے اس گاؤں کو بھی خیرباد کہہ کر آگے کی منزل پر جانے کیلئے قدم بڑھایا تھا، لیکن قدرت کو یہی منظور تھا کہ سنت رسول کا یہ عظیم خادم اسی دیہات میں ابدی نیند سوئے گا اور قبر سے اٹھتی ہوئی بھینی بھینی خوشبو سے یہی گاؤں معطر ہوگا۔ (۱)

حافظ ابو الحسن عجلی

(متوفی ۲۶۱ھ)

ولادت:- آپ کا دور اہل علم اور محدثین کا سنہرا دور تھا جس میں امام بخاریؒ، امام مسلمؒ جیسی صاحب کمال ہستیاں موجود تھیں علم و عمل کا غلغلہ تھا، بلاد اسلامیہ میں فن حدیث کا بول بالا تھا۔ اسی دور میں امام عجلیؒ کی پیدائش کوفہ میں ۱۸۲ھ میں ہوئی۔ (۲) آپ کا تعلق ایک علمی خانوادہ سے تھا آپ کے والد اور دادا سب کا شمار اہل علم و فضل میں ہوتا تھا۔

سلسلہ نسب:- آپ کا سلسلہ نسب اس طرح سے ہے: ابو الحسن احمد بن عبداللہ بن صالح بن مسلم عجلی کوفی (۳) "عجلی" آپ کی خاندانی نسبت ہے جو عجل بن الجیم کی جانب منسوب ہے۔ (۴) آپ اصلاً کوفہ کے باشندے تھے لیکن آپ کی پرورش و پرداخت بغداد میں ہوئی جہاں آپ کے والد اپنے آخری ایام میں سکونت پذیر ہوئے تھے۔ (۵) لیکن جب یہاں پر معتزلہ کا غلبہ ہوا، علماء اہل سنت پر ظلم و استبداد کا دور دورہ

---

(۱) ملاحظه هو سير أعلام النبلاء ۱۲/۴٦۷، طبقات الشافعية ۲/۱۵، تاريخ بغداد ۲/۳۴

(۲) تاريخ بغداد، ۴/۲۱۵ (۳) سير أعلام النبلاء ۱۲/۵۰٦، تاريخ بغداد ۴/۲۱۴

(۴) المغنى فى ضبط الأسماء ص ۵۷ (۵) تاريخ بغداد ۴/۲۱۴

ہوااور فتنہ خلق قرآن اپنے عروج پر پہنچا توامام عجلی یہاں سے مغرب کی جانب ہجرت کر گئے اور مقام اطرابلس میں سکونت اختیار کی۔[۱]

طلب علم:-پندرہ سال کی عمر میں ۱۹۷ھ میں آپ اہل کوفہ کی عادت کے برخلاف علم حدیث کی حصول کی طرف متوجہ ہوئے، جہاں پر عموماً بیس سال کے بعد علم حدیث کے حصول کی جانب توجہ دی جاتی تھی۔[۲] اس سے آپ اور آپ کے خاندان کی علمی حرص کا پتہ چلتا ہے اگرچہ بغداد اس دور میں اہل علم کا مرکز تھا پھر بھی آپ نے طلب علم کیلئے مشرق و مغرب کے مختلف شہروں کا سفر کیا جس میں کوفہ، بصرہ، حجاز، مصر، شام، یمن وغیرہ شامل ہیں۔

اساتذہ:- آپ کے اساتذہ میں جو مشہور شخصیات ہیں ان میں یحییٰ بن معین، احمد بن حنبل، یزید بن ہارون، مسدد بن مسرہد، اسد بن موسیٰ، نعیم بن حماد وغیرہ شامل ہیں۔

تلامذہ:- آپ کے شاگردوں میں آپ کے فرزند صالح بن احمد، سعید بن عثمان اندلسی، عثمان بن کالی وغیرہ ہیں۔[۳]

عام حالات:- آپ انتہائی متقی، پرہیز گار اور کم سخن شخص تھے جدل و مناظرہ، بحث و مباحثہ سے بے رغبتی، امراء سلاطین سے دوری پسند کرتے تھے۔

فن جرح وتعدیل میں آپ کا مقام:-امام عجلی کو فن جرح و تعدیل میں امامت کا درجہ حاصل ہے آپ ثقات و ضعفاء کی معرفت، علل حدیث کا علم اور نقد رجال پر مکمل دسترس رکھتے تھے، علماء عصر نے اس کی شہادت دی ہے۔

علماء کی نگاہ میں:-عباس دوری فرماتے ہیں کہ: ہم لوگ آپ کو احمد بن حنبلؒ اور یحییٰ بن معینؒ جیسے علماء میں شمار کرتے تھے۔[۴]

حافظ ابو العرب تمیمیؒ نے مالک بن عیسیٰؒ سے سوال کیا کہ "من أعلم من رأیت فی الحدیث" علم حدیث میں سب سے زیادہ بہتر صاحب علم آپ نے کسی کو

---

(۱) سیر أعلام النبلاء ۵۰۶/۱۲

(۲) مقدمة معرفة الثقات ڈاکٹر عبدالعلیم مکی ۳۶/۱

(۳) تاریخ بغداد ۲۱۴/۴، سیر أعلام النبلاء ۵۰۵/۱۲، نیز تفصیل کیلئے دیکھئے مقدمہ برمعرفة الثقات ۳۷/۱-۵۰

(۴) تذکرة الحفاظ ۵۶۱/۲

پایا؟ تو انہوں نے کہا کہ:"وأما من الشیوخ فأبوالحسن أحمد بن عبدالله بن صالح الکوفی ساکنی طرابلس"[1] مشائخ میں اس صفت سے متصف امام ابوالحسن عجلی ہیں۔ آپ کی علمی شخصیت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ امام یحییٰ بن معینؒ اور احمد بن حنبلؒ جیسے صاحب علم و بصیرت آپ سے استفادہ کرتے تھے[2] حتیٰ کہ بعض اہل مغرب آپ کو امام بخاریؒ پر فوقیت دیتے تھے[3]

حافظ لؤلؤی فرماتے ہیں کہ: بلاد مغرب میں تقویٰ و پرہیزگاری اور معرفت حدیث میں آپ کا کوئی ہمسر نہ تھا[4]

امام ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ آپ کی تالیف جو فن جرح و تعدیل میں ہے آپ کی علمی مہارت اور حفظ پر غماز ہے۔[5]

علماء جرح و تعدیل نے آپ کے اقوال سے استفادہ کیا ہے اور اپنی تالیفات میں ان پر اعتماد کیا ہے۔

وفات:- بالآخر مقام طرابلس میں ۲۶۱ھ میں آپکا انتقال ہوا اور وہیں سپرد خاک کئے گئے[6]

ریّ کی تین اہم شخصیتیں

۱- سید الحفاظ امام ابو زرعہ رازی

(متوفی ۲۶۴ھ)

تعارف رَی: "ری" زمانہ قدیم سے ایک مشہور علمی و ثقافتی مرکز رہا ہے، یہ شہر مجوسیوں کے یہاں بڑا مقدس سمجھا جاتا تھا، اسلامی فتوحات کے بعد بھی اس کو دفاعی اعتبار سے مرکزی حیثیت حاصل تھی اور دعوت و تبلیغ کا بھی مرکز تھا۔

چونکہ یہ شہر خراسان و ماوراء النہر سے بلاد عربیہ کی طرف آنے والوں کی منزل تھی اور عام شاہراہ پر واقع تھا اس لئے ہمیشہ علماء کا مرکز بھی رہا ہے۔[7]

امام رامہرمزی فرماتے ہیں کہ:"ھی من المراکز العلمیة التی کان

---

(۱) تاریخ بغداد ۴/۲۱۴
(۲) تاریخ بغداد ۴/۲۱۵
(۳) معرفة الثقات مقدمہ محقق
(۴) تاریخ بغداد ۴/۲۱۴
(۵) سیر أعلام النبلاء ۱۲/۵۰۶
(۶) دیکھئے مصادر ترجمہ
(۷) سیر أعلام النبلاء ۱۳/۶۵

المحدثون يشدون الرحال إليها طلبا لتدوين الحديث عن علماء ها"[1] یہ ان علمی مراکز میں سے ہے جس کی طرف محدثین وہاں کے علماء سے کتابت علم کیلئے سفر کرتے تھے۔

اس مردم خیز علاقے میں ایسے ایسے نامور علماء پیدا ہوئے جن کی مثال بہت کم ملتی ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ ری و خراسان اور اس کے قرب و جوار میں تقریباً ایک ہی وقت ایسے ممتاز علماء حق اور ناقدین وقت موجود تھے جن میں ایک سے بڑھ کر ایک تھے اور "ایں خانہ ہمہ آفتاب است" کے مصداق تھے، امام بخاری، امام مسلم، امام دارمی، امام ترمذی اور امام ابوزرعہ، ابو حاتم اور امام اسحٰق بن راہویہ وغیرہ اسی علاقے کے رہنے والے تھے۔

جو شخصیات اس شہر کی جانب منسوب ہیں ان کو رازی کہا جاتا ہے نسبت کے وقت بطور تخفیف حرف "ز" کا اضافہ کردیا گیا ہے۔[2]

امام ذہبی فرماتے ہیں کہ: "دخول الزاي في نسبته غير مقيس كالمروزي"[3] نسبت کے وقت حرف "ز" کا اضافہ غیر قیاسی ہے جیسے مرو کی نسبت مروزی ہے۔

ولادت:- ری کے اس مردم خیز علاقے میں ایک قدیم علمی گھرانے میں امام ابوزرعہ نے آنکھیں کھولیں۔

تاریخ ولادت کے سلسلہ میں مختلف اقوال ہیں لیکن غالب گمان یہ ہے کہ آپ کی تاریخ پیدائش ۱۹۴ھ ہے۔[4]

نام ونسب:- آپ سید الحفاظ امام وقت عبید اللہ بن عبد الکریم بن یزید بن فروخ بن داؤد مولی عیاش بن مطرف مخزومی رازی ہیں، آپ کی کنیت ابوزرعہ ہے جو ابوزرعہ دمشقی کی کنیت پر رکھی گئی تھی۔

ری کے کچھ لوگوں نے دمشق کا سفر کیا وہاں پر وہ ابوزرعہ دمشقی کے علم و فضل کو دیکھ کر جب واپس آئے تو آپ کی فہم و فراست سے متاثر ہو کر ان لوگوں نے

---

(۱) ابو زرعة الرازي و جهوده في السنة ۱/۳۸،۳۹

(۲) ابو زرعة و جهوده ۱/۵۹ (۳) معجم البلدان ۲/۶، اللباب ۲/۶

(٤) دیکھئے تفصیل کیلئے ابو زرعة الرازي وجهوده. ۱/۴۹، ۵۱

ابوزرعہ دمشقی کی کنیت پر آپ کی کنیت ابوزرعہ رکھ دیا۔[1]

تربیت:- چونکہ آپ کا گھرانہ اصحاب حدیث اور اہل علم کا گھرانہ تھا آپ کے چچا اسماعیل بن یزید[2] اور محمد بن یزید[3] عالم وقت تھے۔ نیز آپ کے والد عبدالکریم بن یزید[4] صاحب علم و فضل ہونے کے ساتھ ساتھ اہل علم اور علماء کے قدرداں تھے اور ان کی مجلسوں میں شریک رہتے تھے، اسی لئے انہوں نے ابو زرعہ کی پرورش محدثین کے طریقہ پر کی اور ان کو علماء کی علمی مجالس کا عادی بنادیا جس کا نتیجہ آئندہ چل کر ایک عظیم محدث اور امام وقت کی شکل میں نمودار ہوا۔

ایک مرتبہ آپ کے والد آپ کو عبدالرحمٰن الدشتکی کی مجلس میں لےگئے تو انہوں نے آپ کی فراست کو دیکھ کر فرمایا: "إن ابنك هذا سيكون له شان"[5] تمہارے اس بیٹے کی ایک شان ہو گی۔

طلب علم:- محدثین کے طریقہ کے مطابق سب سے پہلے آپ نے "ری" اور اسکے قرب وجوار کے علماء اور وہاں سے گزرنے والے محدثین سے استفادہ کیا۔ خود آپکا بیان ہے کہ "كتبت بالرى قبل أن اخرج إلى العراق نحو ثلاثين شيخا"[6] ری سے عراق کی جانب سفر کرنے سے پہلے میں نے وہاں کے تقریباً تیس مشائخ سے حدیثیں لکھیں۔

جس وقت آپ کی عمر تیرہ سال کی تھی، آپ نے وطن عزیز کو طلب علم کی خاطر خیر باد کہا، یہ آپ کا پہلا علمی سفر تھا جس کی منزل کوفہ تھی۔[7]

دوسرا سفر آپ نے ۲۲۷ھ میں کیا اور ۲۳۲ھ میں واپس آئے۔[8]

پھر تیسرا سفر آپ نے کیا جو تقریباً ساڑھے چار سال کا تھا، آپ فرماتے ہیں کہ:

"أقمت فى خرجتى الثالثة بالشام والعراق و مصر أربع سنين و ستة أشهر فما أعلم أنى طبخت فيها قدرا بيد نفسى"[9] تیسرے سفر میں جب

---

(۱) سیر أعلام النبلاء ۶۷/۱۳ (۲) ملاحظہ ہو الجرح والتعدیل ۵۱/۶
(۳) الجرح والتعديل ۱۹۶/۵ (٤) الجرح والتعديل ٦١/٦
(٥) مقدمة الجرح والتعديل ص ۳۳۹ (٦) مقدمة الجرح والتعديل ص ۳۳۵
(۷) سیر أعلام النبلاء ۷۸/۱۳ (۸) مقدمة الجرح والتعديل ص ۳٤٠
(۹) مقدمة الجرح والتعديل ص ۳٤٠

شام عراق اور مصر کی جانب میں نکلا تو ساڑھے چار سال تک قیام کیا اس وقفہ میں (طلب علم کی خاطر) میں نے اپنے ہاتھ سے کبھی چولہا نہیں جلایا۔

امام ابوزرعہ اور ابو حاتم کو یہ فخر حاصل ہے کہ رَی کے علماء میں یہ حضرات کثرت رحلات میں مشہور تھے۔ [۱]

ان علمی رحلات میں آپ نے علم اور علماء کے جن دیار کا رخ کیا ان میں بلاد خراسان و نیساپور کے علاوہ حجاز، شام، عراق اور مصر کے علمی مراکز شامل ہیں۔ خصوصاً بغداد، کوفہ، بصرہ اور حرمین کا آپ نے بار بار رخ کیا۔ [۲]

اساتذہ:- جن قدوسی نفوس کی پوری زندگی طلب علم، درس و تدریس، افادہ اور استفادہ میں گذری ہو انکے اساتذہ کی فہرست بتانا بے حد مشکل کام ہے، یہی معاملہ امام ابوزرعہ کا بھی ہے۔ استاذ گرامی د/ سعدی ہاشمی نے آپکے اساتذہ کی ایک طویل فہرست تیار کی ہے۔ [۳] جس میں سے کچھ مشہور ہستیاں یہ ہیں: امام احمد بن حنبل، ابو نعیم فضل بن دکین، ابوالولید طیالسی، عبداللہ بن صالح عجلی، امام قعنبی، امام بخاری وغیرہ۔ [۴]

تلامذہ:- آپ کے علم و فضل کا اعتراف کرتے ہوئے آپ کے اساتذہ اور ہم طبقہ شخصیات نے بھی آپ سے استفادہ کیا ہے، آپ خود امام احمد کے بارے میں فرماتے ہیں کہ: "كنت أكثر الاختلاف إليه و كنت أساله و أذاكره ويذا كرني" [۵] کہ میں امام احمد بن حنبل کے پاس بکثرت آیا کرتا تھا میں آپ سے سوالات اور مذاکرہ کرتا اور وہ مجھ سے مذاکرہ کرتے۔

شاگردوں کی فہرست بھی کافی طویل ہے۔ [۶] جن میں کچھ اہم شخصیات یہ ہیں۔ امام مسلم، امام ترمذی، امام نسائی، امام ابو یعلی موصلی، عبداللہ بن احمد، ابن ابی حاتم وغیرہ۔ [۳]

---

(۱) المحدث الفاصل ص ۲۳۰

(۲) ملاحظہ ہو برائے تفصیل ابوزرعة الرازی وجهوده فی السنة ۱/۵۸-۸۱

(۳) أبوزرعة و جهوده فی السنة ۱/۸۵-۱۵٤

(٤) تهذيب التهذيب ۷/۳۰، سير أعلام النبلاء ۱۳/٦٥

(٥) مقدمة الجرح والتعديل ص ۳۳۰

(٦) أبی زرعة الرازی وجهوده فی السنة ۱/۱٦۳-۱۷۲

(۷) تهذيب التهذيب ۷/۳۱، سير أعلام النبلاء ۱۳/٦٦

تقویٰ و تواضع:- تقوی وپرہیزگاری نیز تواضع وخاکساری میں آپ یکتائے زمانہ تھے۔ یوسف بن عبدالاعلیٰ فرماتے ہیں کہ "ما رأیت أکثر تواضعا من أبی زرعة"(۱) ابوزرعہ سے زیادہ متواضع شخص کو میں نے نہیں دیکھا۔

امام ابوحاتم کہتے ہیں کہ: "أز هد من رأیت أربعة" اور اس میں انہوں نے امام ابوزرعہ کا ذکر کیا ہے۔(۲)

ایک مرتبہ ایک شخص نے آپ کے بارے میں عرض کیا کہ: ان سے بڑھ کر حافظ دنیا میں کوئی نہیں، تو امام ابوزرعہ نے ناپسندیدگی سے یہ فرمایا کہ کیا ان کو ساری دنیا کے حفاظ کی خبر ہے جو اس طرح کی شہادت دیتے ہیں، لوگوں کی بس یہ عادت ہے جب کچھ سن لیتے ہیں تو اس کو کہتے رہتے ہیں۔(۳)

حافظه اور علمی ملکه:- آپ کی علمی غزارت کی شہادت امام احمدؒ نے دی ہے جو آپ کے قریبی اساتذہ میں سے ہیں، آپ کے تبحر علمی اور امامت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ جب امام مسلمؒ نے اپنی کتاب صحیح مسلم تحریر فرمائی تو امام ابوزرعہ کے سامنے پیش کیا، انہوں نے جس حدیث پر نقد کیا اس کو اس کتاب سے خارج کردیا۔(۴)

امام احمد فرماتے ہیں کہ: اس نوجوان کو چھ لاکھ حدیثیں یاد ہیں، آپ اپنے بارے میں فرماتے ہیں کہ مجھ کو دو لاکھ حدیثیں ایسے ہی یاد ہیں جیسے ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾[اخلاص:۱] یاد ہے۔(۵)

حفظ کی پختگی کا یہ عالم تھا کہ بغداد کے بازار میں جب نکلتے تو کان میں انگلیاں ڈال لیتے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مغنیات کے نازیبا کلمات کان میں پڑ جائیں اور وہ ہمیشہ کیلئے محفوظ ہو جائیں۔(۶)

آپ فرماتے ہیں کہ میرے گھر میں ایسی حدیثیں ہیں جس کو میں نے پچاس سال قبل تحریر کیا تھا جب سے اس کے مطالعہ کی نوبت نہیں آئی، لیکن مجھ کو معلوم

---

(۱) سیر أعلام النبلاء ۷٤/۱۳ (۲) سیر أعلام النبلاء ۷٥/۱۲
(۳) مقدمة الجرح والتعدیل ص ۳۳٤ (٤) صحیح مسلم مع النووی ۱٥/۱
(٥) تاریخ بغداد ۳۳۲/۱، ۳۳٥/۱۰ (٦) تاریخ بغداد ۳۳۰/۱۰

ہے کہ کون حدیث کس کتاب کے کس صفحہ اور کس سطر میں ہے۔[1]

آپ کی معرفت علم حدیث وحفظ کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ جب امام قتیبہ بن سعید کا گزر "رَی" سے ہوا تو وہاں کے لوگوں نے ان سے مجلس سماع کی درخواست کی، انہوں نے کہا جس مجلس میں احمد بن حنبل، علی بن مدینی، یحییٰ بن معین موجود ہوں وہاں مجلس درس کی ضرورت نہیں، ری والوں نے کہا:"إن عندنا غلاما يسرد كل ما حدثت به مجلساً مجلساً قم يا أبازرعة فقام أبوزرعة فسرد كل ما حدث به"[2] ہمارے یہاں ایک نوخیز بچہ ہے جو آپ کی ساری حدیثوں کو ایک ایک مجلس کے اعتبار سے بیان کر سکتا ہے، پھر انہوں نے کہا ابوزرعہ ذرا اٹھو تو۔ وہ کھڑے ہوئے اور ساری حدیثوں کو سنا دیا۔

جرح و تعدیل میں آپ کا مقام:- فن جرح و تعدیل و اسماء رجال میں آپ کو جو ملکہ حاصل تھا اس کا اندازہ لگانا کوئی مشکل کام نہیں، آپ کے اقوالِ جرح و تعدیل کے سلسلے میں بڑے اہم سمجھے جاتے ہیں۔

حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ "يعجبني كثيرا كلام أبي زرعة في الجرح والتعديل، بيّن عليه الورع و الخبرة بخلاف رفيقه أبي حاتم فانه جراح"[3]

یعنی امام ابوزرعہ کا کلام جو جرح و تعدیل کے سلسلے میں ہے مجھ کو بہت پسند ہے۔ ان کے کلام پر تقویٰ و تجربہ واضح ہے بخلاف ان کے دوست ابو حاتم کے وہ بڑے جراح ہیں۔

اسی ملکہ کی بنا پر آپ نے امام بخاریؒ کی کتاب "تاریخ کبیر" پر نقد اور اس کی تکمیل کا بیڑا اٹھایا اور امام ابو حاتم کیساتھ اس کام کو مکمل کیا، فن رجال میں آپ کی تصنیفات اور علمی سوالات گراں قدر علمی تحفہ ہیں۔ آپ کی کتاب "الضعفاء" اور امام برزعی کے سوالات کا جواب اسی فن جرح و تعدیل سے متعلق ہیں جو آپ کے علم کی عکاسی کرتے ہیں۔[4]

---

(۱) تاریخ بغداد ۱۰/۳۳۲ (۲) تاریخ بغداد ۱۰/۳۳۲

(۳) سير أعلام النبلاء ۱۳/۸۱

(٤) یہ دونوں کتابیں د/ سعدی ہاشمی کی تحقیق سے مطبوع ہیں آپ نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ امام ابوزرعہ نے الجرح والتعدیل کے نام سے ایک کتاب تحریر کی تھی جس کو ابن حاتم نے اپنی کتاب میں شامل کر لیا ہے۔ ملاحظہ ہو أبوزرعة الرازي و جهوده في السنة النبوية ۱/۱۸۹

علماء کی شہادت:- آپ کی امامت، حفظ، جلالت شان اور تبحر علمی کی شہادت آپ کے اساتذہ، ہم عصر علماء اور دیگر لوگوں نے دی ہے۔

امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ: "ماجاوز الجسر أفقه من إسحق بن راهويه ولا أحفظ من أبي زرعة." [۱] امام اسحٰق بن راہویہ نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ: "كل حديث لا يعرفه أبوزرعة ليس له أصل" [۲] یعنی ہر وہ حدیث جس کو ابوزرعہ نہیں جانتے وہ حدیث ہی نہیں۔

ابن ابی شیبہ فرماتے ہیں کہ: "مارأيت أحفظ من أبي زرعة الرازي." [۳]

امام محمد بن یحیٰ نیساپوری فرماتے ہیں کہ: جب تک ابوزرعہ جیسے لوگ مسلمانوں میں باقی رہیں گے تب تک مسلمان بڑی خیر وخوبی میں رہیں گے۔ [۴]

امام خطیب بغدادی نے فرمایا کہ: "كان إماما ربانيا متقنا حافظا مكثراً" [۵]

علامہ ابن عدی کہتے ہیں کہ: "ولا أعلم في المشرق والمغرب من كان يفهم هذا الشان بمثله" [۶]

یہ چند اقوال ہیں جو بطور مثال پیش کئے گئے ہیں ورنہ علماء کے اقوال بے شمار ہیں جو آپ کے متعلق وارد ہوئے ہیں۔

وفات:- اللہ کی یہ نشانی اور امام ربانی گران قدر علمی سرمایہ چھوڑ کر نظام عالم کے مطابق اپنے مالک حقیقی سے جا ملے، اور اس دار فانی سے ذی الحجہ کی آخری تاریخ کو ۲۶۴ھ بروز پیر کوچ کر گئے، جن کو منگل کے دن ری میں سپرد خاک کیا گیا۔ [۷]

آخری کلمہ:- جب آپ نزاع کے عالم میں تھے تو ابو حاتم اور ابن وارہ نے سوچا کہ کلمہ شہادت کی تلقین کریں لیکن ہمت نہیں ہوتی تھی، تو ابو حاتم نے ابن وارہ سے کہا کہ تلقین موتیٰ کے سلسلہ میں کیا روایت ہے؟ انہوں نے روایت شروع کی، اتنے میں امام ابوزرعہ نے حالت نزع میں اس روایت کی سند کو مکمل کرتے ہوئے کہا کہ

---

(۱) تاريخ بغداد ۱۰/۳۲۸
(۲) مقدمة الكامل ۱/۱۴۱
(۳) مقدمة الكامل ۱/۱۴۱
(۴) مقدمة الجرح والتعديل ص ۳۲۹
(۵) تاريخ بغداد ۱۰/۳۲۶
(۶) مقدمة الكامل ۱/۱۴۱
(۷) تاريخ بغداد ۱۰/۳۳۵-۳۳۶

"من كان آخر كلامه لا إله إلا الله دخل الجنة" اور اسی کے ساتھ آپ کی روح پرواز کر گئی۔[1]

ایک شخص نے آپ کے انتقال کے بعد خواب دیکھا تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا؟ انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے پاس جب کوئی بچہ آتا ہے تو اس کو جنت میں لیجانے کا حکم دیتا ہوں، تو ہمارے وہ بندے جو سنت رسول کی حفاظت کرتے ہیں ان کا کیا پوچھنا، جاؤ جنت میں جو بھی مقام پسند ہو رہو۔[2]

۲- شیخ المحدثین امام ابو حاتم رازی

ولادت: ری کے اسی مردم خیز علاقے میں امام وقت محدث کبیر امام ابو حاتم رازی پیدا ہوئے، دوسری صدی ہجری کے اختتام کا وہ سنہرا ماحول تھا جس میں خراسان اور قرب وجوار کے علاقے علم حدیث کی روشنی سے جگمگا رہے تھے۔ اسی ماحول میں ۱۹۵ھ میں آپ کی پیدائش ہوئی، اس طرح سے آپ امام بخاریؒ کے ہم طبقہ ہیں۔

آپ اصلاً اصبہان کے ایک گاؤں "جروکان" کے رہنے والے تھے، آپ کا خاندان ری آکر آباد ہو گیا تھا، امام ابو حاتم فرماتے ہیں کہ: میرے خاندان کے لوگ والد محترم کی زندگی میں ہمارے یہاں آیا کرتے تھے لیکن پھر ان کی آمد کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔[3]

نام و نسب:- آپ کا اسم گرامی اور نام و نسب اس طرح سے ہے: محمد بن ادریس بن منذر بن داؤد بن مہران حنظلی رازی اور کنیت ابو حاتم ہے۔ تیم بن حنظلہ بن یربوع کی جانب منسوب ہیں، ایک رائے یہ بھی ہے کہ ری میں آپ حنظلہ کے محلہ میں رہتے تھے اس لئے حنظلی کہا گیا۔[4]

تعلیم و تربیت:- چونکہ آپ کا ماحول بھی علمی تھا، امام ابوزرعہؒ کے خاندان سے آپ کا گہرا تعلق تھا، جو آپ کا ننہالی رشتہ پڑتا تھا، وہ اہل علم کا خاندان تھا۔ امام ابوزرعہ آپ کے ماموں زاد بھائی اور ہم عمر تھے۔[5] اس لئے آپ کی پرورش ایک علمی

---

(۱) الجرح والتعديل ص ٣٤٦، سير أعلام النبلاء ١٣/ ٧٦
(٢) تاريخ بغداد ١٠/ ٣٣٦، ٣٣٧
(٣) سير اعلام النبلاء ١٣/ ٢٥٠
(٤) سير أعلام النبلاء ١٣/ ٢٤٧
(٥) ابو زرعة و جهوده في السنة النبوية ١/ ٥٣

گھرانے میں ہوئی۔ اور جب آپ کی عمر چودہ سال کی تھی اس وقت آپ نے حدیث کا سماع شروع کر دیا، یہ ۲۰۹ھ کا زمانہ تھا۔ (۱)

مختلف محدثین سے آپ نے علم حاصل کیا لیکن مقام ری جو علماء کی آماجگاہ بن چکا تھا آپ کی تشنگی کو نہ بجھا سکا اس لئے آپ نے طلب علم کیلئے آگے قدم بڑھایا۔

سفر علم:- ذوق طلب نے محنت و مشقت کا عادی بنا دیا تھا، آپ کا سفر علم طلباء علوم نبوت کیلئے قابل رشک اور قابل نمونہ ہے۔ بیس سال کی عمر میں آپ نے پہلا سفر کیا جو سات سال تک مسلسل جاری رہا جس میں آپ نے ایک ہزار فرسخ (تقریباً پانچ ہزار میل) کا سفر پیدل طے کیا، اس کے بعد آپ نے شمار کرنا ترک کر دیا۔

آپ اپنی داستان سفر یوں بیان فرماتے ہیں۔ "أول سنة خرجت في طلب الحديث أقمت سبع سنين أحصيت ما مشيت على قدمي زيادة على ألف فرسخ لم أزل احصى حتى لما زاد على ألف فرسخ تركته". (۲)

ان سفروں کے درمیان آپ کو کئی بار اضطراری کیفیت سے دوچار ہونا پڑا حتیٰ کہ جسم کے کپڑے تک فروخت کرنے پر مجبور ہو گئے اور مسلسل کئی کئی دن فاقہ کشی کرنی پڑی۔ (۳)

آپکے سفر کا ایک واقعہ ایسا بھی ہے جس میں آپ موت کے منہ سے نکالے گئے تھے؟ (۴)

طلبِ حدیث کا یہ ولولہ و جذبہ اور یہ اخلاص تھا جس کا نتیجہ امام وقت کی شکل میں نمودار ہوا، جن مقامات کا آپ نے سفر کیا ہے اس میں تقریباً اس دور کے سارے علمی مراکز شامل ہیں۔ کوفہ، بغداد اور حرمین کا آپ نے بار بار سفر کیا ہے۔ اسی طرح سے مصر، رملہ، بیت المقدس، بحرین، طبریہ، انطاکیہ، طرسوس، رقہ، واسط وغیرہ، ان سارے مقامات کو آپ نے پیدل چل کر طے کیا۔ (۵) اور اہل علم کی ایک بڑی جماعت سے آپ نے استفادہ کیا، جن کی تعداد تقریباً تین ہزار ہے۔ (۶)

اساتذہ:- آپ کے اساتذہ امام بخاری کے مشائخ کے ہم طبقہ ہیں جن میں کچھ مشہور اساتذہ یہ ہیں۔ محمد بن عبد اللہ انصاری، ابو نعیم فضل بن دکین، عبید اللہ بن

---

(۱) مقدمة الجرح والتعديل ص ٣٦٦ (۲) مقدمة الجرح والتعديل ص ٣٥٩
(۳) الجرح والتعديل ص ٣٦٤، سير أعلام النبلاء ٢٥٦/١٣ (٤) مصادر سابقه
(٥) مقدمة الجرح والتعديل ص ٣٦٠ (٦) سير أعلام النبلاء ٢٤٨/١٣

موسیٰ، عبداللہ بن صالح کاتب اللیث، یحییٰ بن صالح وحاظی، عبداللہ بن صالح عجلی، عمر بن غیاث اوراس طبقہ کے دیگرافراد ہیں۔[1]

تلامذہ:- آپکے شاگردوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں، جس میں علم کے بڑے بڑے درخشاں ستارے ہیں، آپ کے خصوصی شاگردوں میں آپ کے بیٹے ابن ابی حاتم ہیں، جنہوں نے آپ کے علمی سرمایہ کو اس امت کے لئے محفوظ کر رکھا ہے، اسی طرح سے امت کے اہم رہنما امام ابوداؤد، امام نسائی، امام ابن ماجہ نیز آپ کے رفیق خاص امام ابوزرعہ رازی، ابوزرعہ دمشقی وغیرہ نامور شخصیات ہیں۔[2]

علمی انہماک:- آپ کے علمی شغف کا یہ عالم تھا کہ آپ اپنا وقت کبھی نہیں ضائع کرتے۔ چلتے پھرتے، کھاتے پیتے بھی علم میں مشغول رہتے تھے، آپ کے بیٹے ابن ابی حاتم کا بیان ہے کہ: "ربما كان يأكل و أقرأ عليه، و يمشي و أقرأ عليه، و يدخل الخلاء و أقرأ عليه، و يدخل البيت في طلب شئ و أقرأ عليه"[3]

آپ کھاتے تھے میں آپ پر پڑھتا تھا، چلتے تھے میں سناتا تھا، خلوت میں، گھر میں داخل ہوتے، کسی مصروفیت میں رہتے، میں آپ کو پڑھ کر سناتا تھا۔

معرفت حدیث:- آپ کی معرفت حدیث کا جو عالم تھا وہ اس واقعہ سے بخوبی معلوم کیا جا سکتا ہے۔ ایک مرتبہ محمد بن یحییٰ نیساپوری ری تشریف لائے۔ جو امام زہری کی روایتوں کی معرفت میں یکتائے زمانہ سمجھے جاتے تھے۔ امام ابوحاتم نے تیرہ حدیثیں جو امام زہری کے واسطہ سے تھیں ان پر پیش کیا تو انہوں نے صرف تین حدیثوں کی معرفت کا اقرار کیا۔[4]

ایک مرتبہ آپ نے ابوولید طیالسی سے کہا کہ جو شخص مجھ کو ایک صحیح حدیث سنادے جو مجھ کو معلوم نہیں تو اس کو ایک حدیث پر ایک درہم انعام دوں گا، اس مجلس میں امام ابوزرعہ کے علاوہ اور دیگر علماء بھی موجود تھے جس کا مقصد علم میں اضافہ کرنا تھا لیکن کسی کو جرأت نہیں ہوئی کہ کوئی ایسی حدیث سنادیں جو آپ کیلئے غریب ہو۔[5]

---

(۱) تاريخ بغداد ۲/۷۳، سير أعلام النبلاء ۱۳/۲۴۷، تهذيب التهذيب ۹/۳۱

(۲) تهذيب التهذيب ۹/۳۲، سير أعلام النبلاء ۱۳/۲۴۸

(۳) سير أعلام النبلاء ۱۳/۲۵۱ (٤) طبقات الشافعية للسبكي ۱/۳۰۰

(۵) مصدر سابق ۱/۲۹۹

علماء کی شہادت:- آپ کے اس تبحر علمی اور امامت و جلالت کی وجہ سے علماء نے آپ کی بڑی تعریف کی ہے۔ ربیع بن سلیمان فرماتے ہیں کہ: "لم نلق مثل أبی حاتم و أبی زرعة ممن ورد علینا من العلماء"[1] جو علماء ہمارے پاس آئے ان میں ابو حاتم اور ابوزرعہ کی طرح ہم نے نہیں دیکھا۔

موسیٰ بن ابراہیم نے ابن ابی حاتم سے فرمایا کہ: "ما رأیت أحفظ من أبیك" حالانکہ انہوں نے امام احمد، یحییٰ بن معین، ابن ابی شیبہ وغیرہ کو دیکھا تھا۔[2]

یونس بن عبد الاعلیٰ فرماتے ہیں کہ: ابو حاتم اور ابوزرعہ خراسان کے امام ہیں اور ان کی بقاء میں مسلمانوں کی بھلائی ہے۔[3]

هبة الله بن حسن طبرانی کہتے ہیں کہ "كان أبو حاتم إماماً عالما بالحديث حافظا له متقنا ثبتاً"[4]

ابو نعیم حافظ فرماتے ہیں: "أبو حاتم الرازی إمام فی الحفظ"[5] امام ذہبی نے آپ کو امام، حافظ، ناقد وقت اور شیخ المحدثین کا خطاب دیا ہے۔[6]

جرح و تعدیل میں آپ کا مقام:- معرفت حدیث میں آپ بحر ناپیدا کنار تھے ہی، اس کے ساتھ ساتھ فن جرح و تعدیل اور معرفت اسماء رجال کے مرد میدان، معرفت علل حدیث کے عظیم شہسوار اور ناقد وقت تھے۔

فن جرح و تعدیل میں آپ کا جو مقام تھا وہ اہل علم سے مخفی نہیں۔ آپ کا علمی خزانہ جو کتاب "الجرح و التعدیل" اور "علل حدیث" میں موجود ہے وہ آپ کی امامت و جلالت شان اور تبحر علمی پر واضح دلیل ہیں۔

آپ کی علمی پختگی و خود اعتمادی کا ہی کرشمہ تھا کہ امام بخاری جیسے ماہر فن کی کتاب (تاریخ کبیر) پر نقد کیا۔ رجال کے بارے میں علماء امت نے آپ کے اقوال کو قابل اعتماد تسلیم کیا ہے، آپ کی رائے قابل قبول اور آپ کا فیصلہ قابل حجت ہے۔ آپ کا شمار مشہور علماء جرح و تعدیل میں ہوتا ہے۔

---

(۱) أبی زرعة الرازی وجهوده فی السنة ۱/۸۱ (۲) مقدمة جرح و تعدیل، ص ۳۵۷
(۳) تاریخ بغداد ۲/۷۷ (٤) تاریخ بغداد ۲/۷۷
(۵) تاریخ بغداد ۲/۷۷ (٦) سیر أعلام النبلاء ۱۳/۲٤۷

وفات:- آخر کار قضاء الٰہی کا وقت موعود آپہنچا اور شعبان ۲۷۷ھ میں مقام ''ری'' میں آپ کا انتقال ہوا، اور وہیں سپرد خاک کیا گیا۔(۱)

۳- شیخ الاسلام ابن ابی حاتم رازیؒ

(۲۴۰-۳۲۷ھ)

شہر ''ری'' کی ممتاز شخصیات میں سے جن ائمہ کی جرح و تعدیل میں نمایاں کار کردگی ہے ان میں امام ابن ابی حاتمؒ کافی مشہور و معروف ہیں۔

ولادت:- آپ حافظ وقت امام ابو حاتم کے علمی گھرانے کے چشم و چراغ ہیں آپ کی ولادت خالص علمی اور دینی ماحول میں ۲۴۰ھ میں مقام ''ری'' میں ہوئی۔ اسی شہر کی جانب نسبت کرتے ہوئے آپ کو رازی کہا جاتا ہے۔

نام و نسب:- آپ کا نام و نسب اس طرح ہے: امام ابو محمد عبد الرحمٰن بن محمد بن ادریس بن منذر تمیمی حنظلی۔

آپ کی کنیت بغیر صاحب اولاد کے ابو محمد ہے اور ابن ابی حاتم سے مشہور ہیں چونکہ آپ کی پیدائش خالص دینی و علمی ماحول میں ہوئی تھی، حافظ وقت امام ابو حاتم رازی آپ کے والد محترم ہیں اس لئے آپ کی پرورش و پرداخت بھی خالص دینی اور علمی ماحول میں ہوئی۔

تعلیم و تربیت:- سب سے پہلے آپ نے حسب معمول قرآن کریم کی تعلیم حاصل کی پھر بتدریج دیگر علوم کو حاصل کیا، اس کے بعد علم حدیث کی طرف متوجہ ہوئے۔(۲)

چونکہ امام ابو حاتم کو آپ کی تعلیم و تربیت کا بڑا خیال تھا۔ اس لئے بچپن ہی سے تعلیم کا سلسلہ شروع ہو گیا، ابھی آپ حد بلوغ کو بھی نہیں پہنچے تھے کہ طلب علم کیلئے سفر کا وقت آ گیا، یہی وجہ ہے کہ آپ کے پاس جو عالی اسناد موجود ہے وہ آپ کے ہم عصروں کے پاس نہیں ہے۔(۳)

سفر علم:- سب سے پہلا سفر آپ نے اپنے والد محترم کے ہمراہ ۲۵۵ھ میں کیا،

---

(۱) تاریخ بغداد ۲/۷۷ (۲) سیر أعلام النبلاء ۱۳/۲۶۵
(۳) تذکرة الحفاظ ۳/۸۲۹

اس سفر میں آپ کی منزل حرمین شریفین تھی، جب آپ ذو الحلیفہ پہنچے اور احرام باندنے کے لئے وہاں قیام کیا وہیں پر آپ نے آثار بلوغت دیکھا۔[1]

پھر آپ نے ۲۶۲ھ میں تنہا سفر کیا اس کے بعد ۲۶۴ھ میں تیسرا سفر کیا۔[2]

مقامات سفر:- ان علمی رحلات میں آپ نے جن مقامات کا سفر کیا ان میں حجاز، شام، عراق، مصر، اصبہان، جزیرہ، سواحل اور بلاد جبال شامل ہیں البتہ آپ نے خراسان کا سفر نہیں کیا۔[3]

اساتذہ:- اس طرح سفر و حضر میں آپ نے بڑے بڑے اہل علم سے استفادہ کیا جس میں آپ کے والد امام ابو حاتم، اور آپ کے رشتہ دار امام ابو زرعہ قابل ذکر ہیں ان دونوں کے علمی خزانہ کو آپ نے جمع کر لیا، اور اس کے بعد دیگر بڑے بڑے محدثین سے بھی استفادہ کیا، جن میں ابو سعید الاشج، حسن بن عرفہ، یونس بن عبد الاعلی، حجاج الشاعر، محمد بن وارہ اور اس طبقہ کے دیگر محدثین شامل ہیں۔[4]

تلامذہ:- آپ کے شاگردوں میں بڑی بڑی ممتاز ہستیاں اور ماہرین فن شخصیات شامل ہیں جن میں علامہ ابن عدی، ابو الشیخ بن حیان، ابن حبان بستی، ابو احمد حاکم قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ علی بن محمد القصار، حسن بن علی تمیمی اور دیگر ممتاز محدثین وائمہ ہیں جن کی ایک بڑی تعداد ہے۔[5]

شوق طلب کا نادر نمونہ:- اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو علمی شغف اور شوق طلب عطاء کی تھی وہ طلباء علوم نبوی کیلئے قابل فخر اور باعث نمونہ ہے، آپ اپنے اوقات کا جس قدر خیال کرتے تھے اس کی مثال تاریخ میں بہت کم ملتی ہے آپ اپنے والد محترم سے چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے علم حاصل کرتے تھے حتیٰ کہ جب وہ بیت الخلاء میں جاتے تو بھی یہ ان کو درس سناتے رہتے۔[6]

آپ کے علمی ذوق اور وقت کی قدر کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے، جس کا انہوں نے خود ذکر کیا ہے۔

---

(۱) سیر أعلام النبلاء ۲۶٦/۱۳ (۲) تذکرة الحفاظ ۸۳۱/۳

(۳) سیر أعلام النبلاء ۲٦٤/۱۳، تذکرة الحفاظ ۸۲۹/۳ (٤) سیر أعلام ۲٦٤/۱۳

(٥) سیر أعلام النبلا ۲٥۱/۱۳ (٦) سیر أعلام النبلاء ۲٥۱/۱۳، تذکرة الحفاظ ۸۳۰/۳

آپ فرماتے ہیں کہ ''مصر میں قیام کئے ہوئے سات مہینے گزر چکے تھے اس درمیان کوئی شوربہ دار سالن نہیں استعمال کیا تھا دن بھر مشائخ کے درس میں حاضر رہتے تھے اور رات بھر اس کو نسخ کرتے تھے اور ترتیب دیتے، ایک دن کسی شیخ کے یہاں گئے وہ علیل تھے اس لئے واپس آئے راستہ میں ایک اچھی مچھلی فروخت ہو رہی تھی اس کو خرید لیا لیکن جب رہائش گاہ پر پہنچے تو دوسرے شیخ کی مجلس کا وقت آگیا، لہٰذا مچھلی کو وہیں رکھ کر درس کیلئے روانہ ہو گئے پھر تین دن تک اسی طرح آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہا اور اس کو پکانے و اصلاح کرنے کا موقع نہ مل سکا جب اس کے خراب ہونے کا اندیشہ ہوا تو بلا پکائے ہوئے اس کو کھا گئے اور فرمایا کہ: ''لا یستطاع العلم براحة الجسد'' جسم کو آرام پہنچا کر علم حاصل نہیں کیا جا سکتا۔[1]

زهد و تقویٰ:- زہد و پرہیز گاری میں آپ کا کوئی ثانی نہیں تھا، آپ کی عبادت ضرب المثل تھی آپ کے والد ابو حاتم کو ان کی عبادت دیکھ کر حیرت ہوتی تھی وہ فرماتے ہیں کہ: ''ومن یتقوی علی عبادة عبدالرحمن لا أعرف له ذنبا.''[2]

عبدالرحمٰن کی طرح عبادت کرنے کی طاقت اور ہمت کس کو ہے، میں نہیں جانتا کہ اس نے کوئی گناہ کا کام کیا ہے۔

امام ابو عبداللہ الواعظ فرماتے ہیں کہ: ''إذا صلیت مع عبدالرحمن فسلم نفسك إلیه یعمل بها ما یشاء.''[3] جب تم عبدالرحمٰن کے ساتھ نماز ادا کرو تو اپنے آپ کو ان کے حوالے کر دو جس طرح ان کی مرضی ہو وہ کریں۔

ایک مرتبہ آپ جرح و تعدیل کا درس دے رہے تھے ابن مہرویہ نے ابن معین کا یہ قول ذکر کیا ہے کہ: ہم ایسے لوگوں پر طعن کرتے ہیں جو شاید دو سو سال سے جنت میں اپنی جگہ بنا چکے ہیں یہ سنتے ہی ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے ہاتھ کانپنے لگا اور کتاب چھوٹ کر گر گئی۔[4]

علمی ثقافت:- ظاہر ہے جو شخص مناسب ماحول پا کر زہد و تقویٰ کے ساتھ ذوق

---

(۱) تذکرة الحفاظ ۳/۸۳۰، سیر أعلام النبلاء ۱۳/۲۶۶
(۲) طبقات الشافعیة ۲/۲۳۸ — (۳) طبقات الشافعیة ۲/۲۳۸
(٤) حواله سابق ۲/۲۳۸

و شوق بھی رکھتا ہے اس کے علمی سرمایہ کا مقام بھی بہت اعلیٰ و ارفع ہوگا۔ امام ابن ابی حاتم کا بھی یہی حال تھا۔

آپ نے "ری" کی دو عظیم شخصیتوں ابو حاتم اور ابو زرعہ کا علم جمع کر رکھا تھا جبکہ اگر آپ کے پاس صرف ایک ہی کا علم ہوتا تو آپ کی امامت اور جلالت شان کیلئے کافی تھا، پھر اس محترم شخصیت کا کیا کہنا جس کے پاس دونوں کا علم جمع ہو جائے، مزید برآں دیگر محدثین کا علمی خزانہ بھی موجود ہو، یہی وجہ ہے کہ علماء وقت نے آپ کی بڑی تعریف کی ہے۔

علماء کے اقوال:- امام ابو یعلی خلیلی فرماتے ہیں کہ: "أخذ علم أبيه و أبي زرعة و كان بحرافي العلوم و معرفة الرجال."[۱] یعنی آپ نے امام ابو حاتم اور ابو زرعہ کا علم جمع کر رکھا تھا اور آپ علوم اور معرفتِ رجال میں بحر ناپیدا کنار تھے۔

نیز انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ: "السنة بالری ختمت بابن أبی حاتم."[۲] ری میں سنت (کی معرفت) ابن ابی حاتم پر ختم ہوگئی۔

ابو الولید باجی نے آپ کو ثقہ اور حافظ قرار دیا ہے۔ امام ذہبی فرماتے ہیں کہ: "هو الامام الحافظ شيخ الاسلام"[۳] آپ حافظ وقت امام اور شیخ الاسلام ہیں۔

فن جرح و تعدیل میں آپ کا مقام:- فن جرح و تعدیل میں آپ کو بڑا ملکہ حاصل تھا آپ نے اس فن کی جو گتھیاں سلجھائی ہیں اور جرح و تعدیل کے جو مراتب متعین کئے ہیں اس سے اس فن سے آپ کو وابستگی اور امامت کا پتہ چلتا ہے آپ فرماتے ہیں کہ جرح و تعدیل کے الفاظ کو میں نے پایا کہ اس کے چند مراتب ہیں۔

۱- اگر کسی کو ثقہ یا متقن کہا جائے تو وہ قابل احتجاج ہوتا ہے۔

۲- اگر صدوق، یا محله الصدق، یا لا بأس به، کہا جائے تو ایسے لوگوں کی حدیثیں قابل تحریر و نظر ہوتی ہیں اور یہ دوسرا مرتبہ ہے۔

۳- اور اگر "شیخ" کہا جائے تو اس کی روایت قابل تحریر ہوتی ہے لیکن ماقبل سے کمتر ہوتی ہے۔

---

(۱) تذكرة الحفاظ ۸٤٠/۳، شذرات الذهب ۳۰۸/۲ (۲) سير أعلام النبلاء ۲٦٥/۱۳
(۳) تذكرة الحفاظ ۸۲۹/۳

٤- اور اگر "صالح الحدیث" کہا گیا تو اس کی روایت قابل احتجاج نہیں بلکہ قابل اعتبار ہوگی۔

٥- اور اگر "لین" کہا جاتا ہے تو اس کا درجہ ماقبل سے بھی کمتر ہوتا ہے۔

٦- اگر "ضعیف الحدیث" کہا جائے تو اس کی روایت مطلق قابل طرح (پھینکنے چھوڑنے کے لائق) نہیں ہوتی بلکہ قابل اعتبار ہوتی ہے۔

٧- لیکن اگر "متروك الحدیث ،یا کذاب، یا ذاهب الحدیث" کہا گیا ہو تو ایسے لوگوں کی روایت قابل طرح ہوتی ہے اس کا تحریر کرنا ناجائز ہوتا ہے۔[1]

اس فن میں آپ کی مایہ ناز تالیف "کتاب الجرح و التعدیل" ہے جو آپ کے صاحب نقد و بصیرت اور امام فن ہونے پر واضح دلیل ہے۔

امام ذہبی فرماتے ہیں کہ: "و کتابه بالجرح و التعدیل یقضی له بالمرتبة المنیفة فی الحفظ." [2] یعنی آپ کی کتاب جرح و تعدیل حفظ میں آپ کے عالی مقام ہونے کا ثبوت دیتی ہے۔

تالیفات:- جرح و تعدیل کے علاوہ آپ کی مشہور تصانیف میں علل حدیث، المسند، التفسیر، الرد علی الجهمیة، کتاب الزهد، الفوائد وغیرہ ہیں۔[3]

وفات:- بالآخر ماہ محرم الحرام میں ۳۲۷ھ کو مقام "ری" میں تقریباً نوے سال کی عمر میں آپ کا انتقال ہوا، اور اس امت پر احسان عظیم فرما کر بڑا علمی خزانہ چھوڑ کر اس دار فانی سے رخصت ہوئے۔[4]

حافظ ابو جعفر عقیلی

(متوفی ۳۲۲ھ)

علماء متقدمین کا دور ختم ہونے اور متأخرین کا دور شروع ہونے والا تھا اسی دور میں امام ابو جعفر عقیلی کی پیدائش حجاز میں ہوئی۔

---

(۱) الجرح و التعدیل ۳۷/۲ (۲) تذکرة الحفاظ ۸۳۰/۳

(۳) سیر أعلام النبلاء ۲٦٤/۱۳، ۲٦٥، طبقات الشافعیة ۲۳۸/۲

(٤) سیر اعلام النبلاء ۲٦۹/۱۳، شذرات الذهب ۳۰۸/۲

نام و نسب:- محمد بن عمرو بن موسیٰ بن حماد عقیلی[1] حجازی اور کنیت ابو جعفر ہے۔[2]

آپ حجاز کے رہنے والے تھے، حرمین میں آپ کا قیام رہتا تھا[3] اس وجہ سے گھر بیٹھے بیٹھے آپ کی ملاقات بڑے بڑے محدثین اور علماء سے ہوتی رہتی تھی جو حج بیت اللہ اور حرمین شریفین کی زیارت کیلئے یہاں آتے رہتے تھے۔

سفر علم:- لیکن اسکے باوجود آپنے بلاد عرب وعجم کا سفر کیا چنانچہ محمد بن فضیل قسطلانی سے ''رے'' میں اور احمد بن داؤد مکی سے ''مصر'' میں ملاقات کی اور ان سے علم حاصل کیا۔[4]

اساتذہ:- ان نامور شخصیات میں جن سے آپ نے علم حاصل کیا ہے امام الائمہ علامہ ابن خزیمہ، عبد اللہ بن اُحمد بن ابراہیم دبری، اور آپ کے نانا یزید بن محمد عقیلی قابل ذکر ہیں۔[5]

تلامذہ:- ان حضرات کی تعلیم وتربیت کا اثر تھا کہ آپ شہرہ آفاق محدث بن گئے اور بلاد اسلامیہ میں آپ کے علم کا چرچا ہونے لگا۔ تشنگان علوم نبوت آپ کی خدمت میں حاضری دینے لگے اور طلبہ کی ایک جم غفیر نے آپ سے استفادہ کیا۔ آپ کے مشہور شاگردوں میں ابو بکر محمد بن ابراہیم مقری، یوسف بن احمد دخیل، ابو الحسن بن نافع خزاعی قابل ذکر ہیں۔[6]

قوت حافظہ:- آپ عظیم قوت حافظہ کے مالک تھے جس کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے جس کا ذکر مسلمہ بن قاسم نے کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ جب بھی کوئی محدث آپ کی خدمت میں حصول علم کیلئے آتا تو آپ اس سے کہتے کہ اپنی کتاب سے پڑھو، وہ پڑھتے اور یہ سنتے رہتے اور اپنی کتاب کھولے بغیر قوت حافظہ پر اعتماد کر کے اس کی تصحیح فرماتے رہتے، لوگوں میں اس طریقہ درس پر چہ می گوئیاں شروع ہو گئیں اور ان کو شبہ کی نگاہ سے دیکھنے لگے، چنانچہ ایک دن بغرض امتحان لوگوں نے ان کی کچھ روایتوں کو خلط ملط اور کمی وزیادتی کر کے ان کو سنانا شروع کر دیا جہاں کمی یا زیادتی کی گئی

---

(۱) عین کے ضمہ اور ق کے فتحہ کے ساتھ عُقَیل بن کعب بن ربیع کی جانب نسبت ہے اللباب ۳۵۰/۲،

(۲) طبقات الحفاظ ص ۳٤۸ (۳) تذکرۃ الحفاظ ۸۳۳/۳

(٤) سیر أعلام النبلاء ۲۳۷/۱۵

(٥) سیر أعلام النبلاء ۲۳۷/۱۵، مقدمہ ''الضعفاء الکبیر'' للمحقق ٤۷/۱

(٦) سیر أعلام النبلاء ۲۳۷/۱۵

تھی انہوں نے فوراً اس کی گرفت کرلی اور ہمارے ہاتھ سے وہ کتاب لے کر ان غلطیوں کی اصطلاح فرمادی۔ اس واقعہ کے بعد ہم لوگ خوشی خوشی اپنی قیام گاہ پر اس یقین کے ساتھ واپس ہوئے کہ آپ "أحفظ الناس" یعنی سب سے زیادہ قوی حافظہ کے مالک ہیں۔(۱)

جرح و تعدیل میں مقام:- فن جرح و تعدیل میں آپ کو امامت کا درجہ حاصل ہے، حافظ ذہبی نے آپ کو اپنی کتاب "ذکر من یعتمد قوله فی الجرح والتعدیل" میں ذکر کیا ہے۔(۲) نیز اس فن میں آپ کی کتابیں اور رجال حدیث پر آپ کا کلام اسکا واضح ثبوت ہیں۔

امام ذہبیؒ نے آپ کا تعارف "صاحب نقد" اور علامہ ابن عماد حنبلی نے "صاحب جرح وتعدیل" سے کیا ہے۔(۳)

مسلمہ ابن قاسم نے آپ کو "أحفظ الناس" اور "ما رأیت مثله" کے خطاب سے نوازا ہے۔(۴)

علامہ ابوالحسن بن قطان نے آپ کو "ثقه جلیل القدر عالم بالحدیث متقدم فی الحفظ" کہا ہے۔(۵)

علوم حدیث میں آپ کی مختلف تالیفات ہیں، مسلمہ بن قاسم نے فرمایا کہ "کان کثیر التصانیف"،(۶) ان میں سے کچھ تالیفات کا تذکرہ عمر رضا کحالہ نے کیا ہے۔(۷) انہیں کتابوں میں سے آپ کی ایک کتاب "الضعفاء الکبیر" ہے۔

وفات:- حدیث اور علوم کی خدمت کرتے ہوئے علم و فن کا یہ ستارہ مکہ معظمہ میں ربیع الاول ۳۲۲ھ میں غروب ہو گیا۔(۸)

فقیہ خراسان امام ابو حاتم بن حبان

(متوفی ۳۵۴ھ)

خراسان کے پر بہار اور بارونق شہروں میں سے ایک شہر "بُست" ہے جو غزنہ، ہرات و سجستان کے درمیان واقع ہے یہ علاقہ نہروں اور باغات کی کثرت کی وجہ

(۱) سیر أعلام النبلاء ۲۳۷/۱۵، تذکرة الحفاظ ۸۳۳/۳ (۲) ص ۱۹۱
(۳) سیر اعلام النبلاء ۲۳۶/۱۵، وشذرات الذهب ۲۹۵/۲ (۴) تذکرة الحفاظ ۳/۷۳۳-۸۳۴
(۵) سیر أعلام النبلاء ۲۳۸/۱۵، شذرات ۲۹۵/۲ (۶) تذکرة الحفاظ ۸۳۳/۳
(۷) معجم المؤلفین ۹۸/۱۱ (۸) شذرات الذهب ۲۹۶/۲

سے انتہائی سر سبز و شاداب علاقہ ہے، غالبًا اسی وجہ سے اس کو ''بُست'' کہا جاتا ہے جو ''بستان'' سے ماخوذ ہے۔[1]

اس شہر کا شمار بلاد کابل میں ہوتا تھا، اسمیں بڑے بڑے اہل علم وفضل پیدا ہوئے ہیں۔[2]

اسی مردم خیز شہر میں نابغہ زمان حافظ ابن حبان کی ولادت ۲۷۰ھ کی دہائی میں ہوئی ہے۔

نام و نسب:- آپ کا نسب اس طرح سے ہے: ابو حاتم محمد بن حبان بن احمد بن حبان بن معاذ بن معبد تمیمی، دارمی، بُستی۔

آپ اصلاً عدنانی اور وطناً افغانی ہیں۔ کیونکہ آپ کا تعلق قبیلہ دارم سے ہے جو قبیلہ تمیم کی فرع ہے اور آگے چل کر یہ نسب نامہ عدنان میں مل جاتا ہے۔[3]

غالب گمان یہ ہے کہ آپ کے آباؤ اجداد میں سے کوئی محمد بن قاسم کی فوج میں شریک تھے، جو ملتان کی فتح کے بعد اس علاقہ میں آباد ہو گئے۔[4]

اقتصادی حالت:- آپ کے اوقاف، طلباء و علماء پر مصارف اور کثرت سفر سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کا تعلق غنی خاندان سے تھا۔

طلب علم:- اللہ تعالیٰ نے آپ کو ذوق طلب، قوت حافظہ، غزارت عقل و خرد سے نوازا تھا، آپ نے اپنی ان ساری قوتوں کو حصول علم کیلئے استعمال کیا، سب سے پہلے آپ نے ''بست'' کے علماء سے علم حاصل کیا اسکے بعد ماوراء نہر کے مشرقی شہروں بخارا وغیرہ کا رخ کیا، اسکے بعد مغربی شہر ری، نسا، بصرہ، بغداد وغیرہ کا سفر کیا اور پھر بلاد عربیہ میں قدم رکھا۔[5]

سفر علم:- طلب علم کیلئے آپ کا سفر تقریباً ۳۰۰ھ میں شروع ہوا[6] اور تقریباً سارے بلاد اسلامیہ کی خاک چھان ڈالی بعض بعض مقامات کا آپ نے دو دو تین تین بار سفر کیا ہے۔ جن مقامات کا سفر آپ نے کیا ہے یاقوت حموی نے اس میں سے ۴۳ مشہور مقامات کا تذکرہ کیا ہے۔[7]

ابو عبداللہ غنجار فرماتے ہیں کہ آپ نے ''شاش'' سے ''اسکندریہ'' تک کا سفر کیا ہے۔[8] ان علمی رحلات کی وجہ سے آپ کی ملاقات بڑے بڑے ائمہ فن اور عالی

---

(۱) معجم البلدان ۱/۱۴۴-۱۴۵ (۲) اللباب فی تهذيب الأنساب ۱/۱۵۱
(۳) معجم البلدان ۱/۴۱۵ (۴) مقدمة موارد الظمآن ص ۵
(۵) مقدمة موارد الظمآن ص ۷ (۶) ميزان الاعتدال ۲/۵۰۶
(۷) معجم البلدان ۱/۴۱۵ (۸) معجم البلدان ۱/۴۱۵، اللباب ۱/۱۵۱

مقام محدثین سے ہوئی جن کے واسطے سے عالی اسناد کا حصول بھی ممکن ہوا۔[1]

اساتذہ: - ان ائمۂ فن میں امام نسائی، امام ابن خزیمہ، امام ابو یعلی موصلی، زکریا الساجی، حسن بن سفیان، احمد بن حسن صوفی، ابو عروبہ حرانی، امام ابن منذر، ابو القاسم بغوی رحمہم اللہ قابل ذکر ہیں۔[2]

اپنے مشائخ کی تعداد کے بارے میں آپ نے خود ذکر کیا ہے کہ ہم نے اسبیجاب سے اسکندریہ تک غالباً دو ہزار سے زائد شیوخ سے حدیثیں لکھی ہیں۔[3]

آپ کے یہ وہ مشائخ ہیں جن سے علم حدیث حاصل کیا تھا۔ دیگر علوم و فنون کے جو مشائخ تھے ان کی بھی ایک اچھی خاصی تعداد ہوگی۔

تلامذہ: - ان علمی رحلات اور ائمہ فن کا اثر تھا کہ آپ نوجوانی ہی میں شہرۂ آفاق محدث اور مرجع خلائق بن گئے اور طالبان علوم نبوت آپ کی خدمت میں جوق درجوق حاضری دینے لگے۔ آپ کی شہرت کا ذکر کرتے ہوئے علامہ استر آبازی فرماتے ہیں کہ "کان من المشهورين في الآفاق و الأمصار"[4] مختلف علاقوں اور شہروں میں آپ کی شہرت تھی۔

چنانچہ آپ سے طلبہ کی جم غفیر نے استفادہ کیا جن میں ایک سے بڑھ کر ایک امام فن تھے، آپ ہی کے شاگردوں میں امام ابو عبد اللہ حاکمؒ، امام دار قطنیؒ، ابو عبد اللہ بن مندہؒ تھے، ان کے علاوہ منصور بن عبد اللہؒ، ابو معاذ عبد الرحمنؒ بن محمد سجستانیؒ، ابو عبد اللہ غنجار بخاریؒ جیسے اہل علم و فضل ہیں جن کی تعداد بے شمار ہے۔[5]

علمی ذوق و شوق: - علمی ذوق کا یہ عالم تھا کہ آپ اپنا وقت کبھی نہیں ضائع ہونے دیتے، سفر میں ہوں یا حضر میں یکساں طور سے آپ اپنے مقصد میں لگے رہتے تھے۔ مشائخ کی قدر اور ذوق طلب کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے۔

ابو حامد نیساپوری فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم لوگ امام ابن خزیمۃ کے ساتھ نیساپور سے کہیں جارہے تھے، ہمارے ساتھ ابو حاتم بستی بھی تھے، یہ بار بار راستہ میں

---

(۱) معجم البلدان ۱/۴۱۵ (۲) معجم البلدان ۱، سیر اعلام النبلاء ۱۶/۹۴
(۳) الاحسان بترتیب صحیح ابن حبان ۱/۸٤ (٤) معجم البلدان ۱/٤۱۷
(٥) معجم البلدان ۱/٤۱٦ سیر أعلام النبلاء ۱٦/۹٤

ان سے سوالات کرتے رہتے تھے حتی کہ وہ تنگ ہو گئے اور فرمایا کہ ”دور رہو تنگ مت کرو“ انہوں نے پھٹکار کا یہ جملہ بھی لکھ لیا، جب ان سے کہا گیا کہ اس جملہ کو بھی لکھ ڈالا؟ تو آپ نے فرمایا کہ آنجناب کی ہر بات قابل تحریر ہے۔[۱] امام ابن خزیمہؒ آپ کے ان مشائخ میں سے ہیں جن کی تعلیم و تربیت کا اثر آپ پر سب سے زیادہ پڑا ہے۔

علمی مقام:- آپ مختلف علوم و فنون کے جامع تھے، علمی میدان میں اس زمانہ میں آپ کا کوئی مد مقابل نہ تھا۔ علم حدیث، فقہ، طب، علم کلام، علم نجوم اور دیگر علوم میں آپ ماہر سمجھے جاتے تھے۔ ابن عماد فرماتے ہیں کہ آپ حدیث، فقہ، لغت، وعظ حتی کہ علم طب، علم نجوم و کلام میں علم کا خزانہ تھے۔[۲] فن حدیث میں آپ کو خصوصی ملکہ حاصل تھا آپ سند و متن کے حافظ تو تھے ہی اس کے ساتھ ساتھ فن حدیث میں ایسے ایسے گوہر آبدار کا پتہ لگایا جس سے دوسرے لوگ قاصر رہے۔

ابوعبداللہ غنجار فرماتے ہیں ”أخرج فی علوم الحدیث ما عجز عنه غیره“[۳]

امام ذہبی فرماتے ہیں کہ: کان رأسا فی معرفة الحدیث[۴]

صحیح مجرد میں آپ کی نادر الترتیب تصنیف ”التقاسیم والأنواع“ جو صحیح ابن حبان کے نام سے مشہور ہے آپ کی فنی مہارت، فقہی بصیرت، قوت استنباط پر بین ثبوت ہے، متعارض حدیثوں میں تطبیق کے نرالے اصول، جرح و تعدیل میں آپ کے اقوال علل حدیث میں آپ کی تصنیفات، آپکی علمی ثقاہت پر شاہد عدل ہیں۔

ابو عبداللہ بخاری فرماتے ہیں کہ جو آپ کی تصانیف پر انصاف سے غور کرے گا اس کو خود بخود اندازہ ہو جائے گا کہ آپ علم کے بحر بیکراں تھے۔[۵]

تالیفات:- آپ کی تصانیف کی تعداد یاقوت حموی نے چالیس بتائی ہے جب کہ مقدمہ ”موارد الظمآن“ میں (۵۹) تالیفات کا ذکر کیا گیا ہے۔ شیخ کمال یوسف نے ”الاحسان بترتیب صحیح ابن حبان“ کے مقدمہ میں آپ کی تالیفات میں (۶۳) کتابوں کا ذکر کیا ہے جن میں مطبوع، موجود اور مفقود کی تفصیل بھی ہے۔[۶]

---

(۱) مصدر سابق ۱/۴۱۹
(۲) شذرات الذهب ۳/۱۶
(۳) معجم البلدان ۱/۴۱۵
(۴) میزان الاعتدال ۲/۵۰۶
(۵) معجم البلدان ۱/۴۱۵
(۶) مقدمة الاحسان

آپ کی تالیفات غزارت علم، قوت استدلال، پختہ تحریروں کی وجہ سے انتہائی مقبول تھیں، ان کو سننے کیلئے طالبان علم جوق در جوق آپ کی خدمت میں حاضری دیتے تھے۔

امام حاکم فرماتے ہیں کہ:" كانت الرحلة بخراسان إلى تصانيفه" آپ کی تصانیف پڑھنے اور سننے کیلئے لوگ خراسان کا رخت سفر باندھتے تھے۔(۱)

ابو عبداللہ غنجار فرماتے ہیں کہ:"صارت تصانيفه عدة لاصحاب الحديث إلا أنها عزيزة الوجود" آپ کی تصانیف اصحاب حدیث کیلئے زاد راہ تھیں لیکن اب ان کا وجود بہت کم ہو گیا ہے۔(۲)

خطیب بغدادی فرماتے ہیں کہ:ابو حاتم بستی کی کتابیں انتہائی نفع بخش ہیں۔(۳)

آپ کی تالیفات مختلف علوم و فنون میں ہیں لیکن فن حدیث سے متعلق آپ کی گرانقدر تالیفات اپنی مثال آپ ہیں۔امام حاکم فرماتے ہیں کہ علم حدیث میں آپ کی ایسی ایسی تالیفات ہیں جن کی نظیر نہیں ملتی۔(۴)

آپنے اپنی تالیفات کو ایک کتب خانہ تعمیر کرا کے وقف کردیا تھا انکو وہاں سے باہر لے جانے کی اجازت نہیں تھی ضرورت مند حضرات وہیں آکر ان کو پڑھتے اور نسخ کرتے تھے۔(۵)

آپ کے چلے جانے کے بعد آپ کی ان تالیفات نادرہ کی دیکھ ریکھ صحیح ڈھنگ سے نہ ہو سکی اور عموماً یہ کتابیں ضائع ہو گئیں۔ابن ناصر کا خیال ہے کہ طول زمانہ، ضعف سلطان اور مفسدین کے غلبہ کی وجہ سے یہ کتابیں ضائع ہوئی ہیں۔(۶)

رفاهی خدمات:- تصانیف کے علاوہ آپ کی دیگر رفاہی و علمی خدمات بھی ہیں جن میں ایک کتب خانہ کی تعمیر، مدرسہ کی تاسیس ہے، جسکے مصارف آپ بذات خود برداشت کرتے تھے نیز غریب طلباء و علماء کی کفالت، عوام الناس اور مسافرین کیلئے سرائے کی تعمیر آپ کی قابل فخر یادگار ہیں۔(۷)

آپ کی ان گرانقدر خدمات اور بلند و بالا مقامات کو دیکھ کر اگر حاسدین وقت

---

(۱) معجم البلدان ۱/۱٤۷
(۲) معجم البلدان ۱/٤۱۵
(۳) مصدر سابق
(٤) لسان الميزان ٥/١١٤
(٥) معجم البلدان ۱/٤۱۸
(٦) سير أعلام النبلاء ١٦/٩٥
(۷) لسان الميزان ٥/١١٥

پیدا ہو جائیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں، خاص طور سے ایسے ماحول میں جہاں تعصب و تنگ نظری کا دور دورہ ہو۔

امام حاکمؒ فرماتے ہیں کہ: "كان يحسد بفضله و تقدمه" آپ کی فضل و برتری کی وجہ سے آپ سے حسد کیا جاتا تھا۔[1]

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی حد بندی کے مسئلہ پر اور نبوت کی تعریف میں آپ کا بعض علماء سے اختلاف تھا اسکو بنیاد بنا کر آپکو اپنے وطن سے نکال دیا گیا، مسئلہ یہیں پر بس نہیں ہوا بلکہ مقربین امراء و سلاطین نے آپ پر زندقہ کا فتویٰ صادر کر کے پروانہ قتل حاصل کر لیا۔[2]

ایک طویل مدت تک آپ سمرقند کے منصب قضاء پر فائز رہے، نیز اسکے علاوہ نساء، نیساپور اور خراسان کے دیگر شہروں میں آپ نے قضاء کا فریضہ انجام دیا۔ ۳۴۰ھ میں سمرقند سے اپنے وطن واپس آئے اور مدرسہ و کتب خانہ کا وجود عمل میں آیا۔[3]

فن جرح و تعدیل میں آپ کا مقام:- فن جرح و تعدیل میں آپ کی حد پرواز آسمان کی بلندیوں کو چھو رہی تھی، علل حدیث میں آپ کا بیش بہا علمی خزانہ، جرح و تعدیل میں گرانقدر تالیفات، رجال کے سلسلہ میں بے باک فیصلے، جرح و تعدیل کے قواعد و ضوابط، اس کا واضح ثبوت ہیں کہ آپ امام فن اور ناقد وقت تھے۔

علماء کی نگاہ میں:- آپ کی شخصیت کا اندازہ علماء کے ان اقوال سے بھی ہوتا ہے۔ متقدمین و متاخرین میں جنکی طویل فہرست ہے بطور نمونہ چند اقوال ملاحظہ ہوں۔

امام حاکمؒ فرماتے ہیں کہ: آپ فقہ، حدیث، وعظ و نصیحت اور معرفت رجال میں علم کا خزانہ تھے۔[4]

ابو عبد اللہ غنجار بخاریؒ فرماتے ہیں کہ: آپ امام وقت، علامہ زمان، فاضل و متقن، نیز سند و متن کے عالم تھے۔ علوم حدیث میں ایسی چیزوں کا استنباط کیا ہے جس سے دوسرے لوگ عاجز رہے، آپ کی تصانیف کو جو بھی عدل و انصاف کی نگاہ سے دیکھے گا اس کو ضرور اندازہ ہو جائے گا کہ آپ علم کے بحر بے کراں تھے۔[5]

---

(۱) معجم البلدان ۴۱۹/۱

(۲) ان الزامات کا جواب حافظ ذہبی، امام سبکی، حافظ ابن حجر وغیرہ نے تفصیل سے دیا ہے۔ دیکھئے طبقات الشافعية، تذكرة الحفاظ ۹۲۱/۳، ميزان الاعتدال ۵۰۷/۳، لسان الميزان ۱۱۴/۵، ۱۱۵

(۳) تذكرة الحفاظ ۹۲۱/۳، لسان الميزان ۱۱۴/۵

(۴) سير أعلام النبلاء ۹۴/۱۶

(۵) معجم البلدان ۴۱۵/۱

ابو سعید ادریسیؒ فرماتے ہیں کہ: "كان من فقهاء المدن و حفاظ الآثار و المشهورين في الأمصار والأقطار عالما بالطب والنجوم و فنون العلم"(۱) آپ کا شمار بڑے بڑے فقہاء اور حفاظ حدیث میں ہوتا تھا، شہروں ملکوں میں آپ کی شہرت تھی، آپ طب، نجوم اور مختلف فنون کے عالم تھے۔

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ: آپ مختلف علوم وفنون کے مالک، انتہائی ذہین اور عظیم تر حافظہ کے مالک تھے۔(۲)

ابن عماد حنبلی فرماتے ہیں کہ: "كان حافظاً ثبتا إماما، حجة أحد أوعية العلم"(۳)

وفات:- بالآخر علم و فضل کا یہ روشن ستارہ اپنی روشنی پھیلا کر شوال ۳۵۴ھ میں اپنے مالک حقیقی سے جاملا اور مقام بست میں ان کے مدرسہ کے پاس جمعہ کی نماز کے بعد سپرد خاک کر دیا گیا۔(۴)

حافظ عصر علامہ ابن عدی

(متوفی ۳۶۵ھ)

جُرجان(۵) طبرستان اور خراسان کے درمیان ایک مشہور شہر، جو عراق سے نکلنے کے بعد مشرق میں سب سے زیادہ حسین اور جامع شہر ہے، اس کا شمار بھی ان مردم خیز علاقوں میں سے ہوتا ہے جس میں بڑے بڑے نامور علماء اور فضلاء پیدا ہوئے۔(۶)

انہیں اہل علم میں سے ایک شہرت یافتہ یکتائے زمانہ شخصیت، حافظ ابن عدی کی شخصیت ہے، جو امام ابن حبان کے ہم عصر اور ہم طبقہ نیز بہت سے اساتذہ میں مشترک ہیں۔

نام و نسب:- آپ کا نام و نسب اس طرح ہے: ابو أحمد عبد اللہ بن عدی بن عبد اللہ بن جرجانی، اپنے علاقہ میں آپ ابن القطان سے مشہور تھے۔(۷) پھر آگے چل کر محدثین کے یہاں "ابن عدی" کے نام سے معروف ہوئے۔

---

(۱) لسان الميزان ۱۱٤/٥ (۲) لسان الميزان ۱۱٤/٥
(۳) شذرات الذهب ۱٦/۳ (٤) معجم البلدان ٤۱۹/۱
(٥) سليمان بن عبدالملک کے زمانہ میں یزید بن مہلب نے اس کو فتح کیا۔ اللباب ۲۷۰/۱
(٦) معجم البلدان ۱۱۹/۱-۱۲۰
(۷) سير أعلام النبلاء ۱٥٤/۱٦، طبقات الشافعية ۲۳۳/۲

ولادت و حصول علم:- آپ کی ولادت بروز سنیچر ذی القعدہ ۲۷۷ھ مقام جرجان میں ہوئی، یہیں پر آپ نے ابتدائی تعلیم حاصل کی، علم حدیث پڑھنے کی ابتدا ۲۹۰ھ میں یہیں سے کی، پھر قرب جوار کے علماء و مشائخ سے استفادہ کرنے کے بعد اپنی علمی تشنگی کو بجھانے کیلئے دور دراز مقامات کا سفر کیا جس کی شہادت امام سبکی نے اس طرح دی ہے۔"أحد الجهابذة الذين طافوا البلاد"[1]

علمی سفر:- سب سے پہلا سفر آپ نے ۲۹۷ھ میں اور دوسرا سفر ۳۰۵ھ میں کیا، اس سفر میں آپ نے سمرقند سے لے کر اسکندریہ تک کا دورہ کیا۔[2]

ان مقامات میں حجاز، بلاد شام و عراق، بغداد، مصر، خراسان اور بلاد جبال خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔[3]

اساتذہ:- ان رحلات علمیہ کے دوران آپ نے بڑے بڑے ماہرین فن ائمہ اور محدثین عظام سے ملاقات کی جن کی ایک بڑی تعداد ہے آپ نے اپنی کتاب "معجم الشیوخ" میں اپنے اساتذہ کی تعداد ایک ہزار سے زائد ذکر کی ہے۔[4]

آپ کے ان اساتذہ جو قابل فخر شخصیات ہیں ان میں امام ابو عبد الرحمٰن نسائی، ابو یعلی موصلی، حسن بن سفیان نسوی، امام ابن خزیمہ، امام بغوی، قابل ذکر ہیں۔[5]

ان علمی شخصیات کا اثر آپ کی زندگی پر بہت گہرا تھا انہیں کے ذریعہ سے آپ نے اسناد عالی کا حصول کیا، نیز تجریح و تعدیل، تصحیح و تعلیل میں مہارت حاصل کر کے اپنے ہم عصروں پر سبقت لے گئے۔[6]

تلامذہ:- آپ قابل قدر امام اور مشہور محدث ہونے کی وجہ سے مرجع خلائق بن گئے۔ طلبائے علوم نبوت کے ایک جم غفیر نے آپ سے استفادہ کیا جن میں ابو سعد مالینی، حمزۃ بن یوسف سہمی، حسن بن رامین، محمد بن عبد اللہ بن عبد کویہ، نیز آپ کے استاذ ابن عقدہ قابل ذکر ہیں۔[7]

---

(۱) طبقات الشافعية ۲۳۳/۲ (۲) معجم البلدان ۱۲۲/۲، اللباب ۲۷۰/۱

(۳) سير أعلام النبلاء ۱۵٤/۱٦ (٤) مصدرِ سابق ۱۵۵/۱٦

(۵) سير أعلام النبلاء ۱۵٤/۱٦، معجم البلدان ۱۲۱/۲

(٦) سير أعلام النبلاء ۱۵٤/۱٦ (۷) سير أعلام النبلاء ۱۵٤/۱٦-۱۵۵

فن جرح و تعدیل میں آپ کا مقام:- فن جرح وتعدیل میں آپ کی شخصیت انتہائی جانی پہچانی ہے، اس فن میں آپکو عالی مقام حاصل ہے، فن جرح وتعدیل میں آپ کی شہرہ آفاق کتاب "الكامل فی ضعفاء الرجال " ہے جس سے آپ کی علمی شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے اور فن جرح وتعدیل واسماء رجال میں آپ کی مہارت تامہ کا پتہ چلتا ہے۔

اسکے علاوہ حدیث اور علوم حدیث سے متعلق آپ کی دیگر تالیفات ہیں، علل حدیث میں بھی آپ کو مہارت حاصل تھی اس لئے آپ کا شمار کبار ائمہ جرح وتعدیل میں ہوتا ہے خاص طور سے ضعفاء رجال کی معرفت میں آپ مرجع کی حیثیت رکھتے ہیں۔

امام ذہبی فرماتے ہیں کہ معرفت علل حدیث اور معرفت رجال میں آپ حافظ وقت تھے جن کا کوئی مد مقابل نہ تھا۔ (۱) نیز فرمایا کہ "مصنفه فی الرجال إليه المنتهى في الجرح"(۲) یعنی رجال کے سلسلے میں آپکی تصنیف جرح میں منتہی ہے۔

علماء کی شہادت:- آپ کی علمی شخصیت کا اندازہ ان علماء کے اقوال سے بھی لگایا جا سکتا ہے جو آپ کے ہم عصر تھے۔ امام سہمی فرماتے ہیں کہ آپ صاحب حفظ و اتقان تھے آپ کے زمانہ میں آپ کا کوئی ہم عصر نہ تھا۔ (۳)

امام خلیلی فرماتے ہیں کہ آپ حفظ اور جلالت شان میں عدیم النظیر تھے، احمد بن ابی مسلم سے میں نے سناوہ فرماتے تھے کہ میں نے ابن عدی جیسی شخصیت نہیں دیکھی ہے۔ (۴)

علامہ ابن اثیر فرماتے ہیں کہ: "كان إمام عصره" آپ اپنے زمانہ کے امام تھے۔ (۵) یہ علماء نقاد کی شہادتیں ہیں جو آپکی جلالت شان، تبحر علمی کی معرفت کیلئے کافی ہے.

وفات:- بالآخر علم کا یہ روشن ستارہ ملت اسلامیہ کیلئے علمی سرمایہ چھوڑ کر مقام جرجان میں ۳۶۵ھ میں غروب ہو گیا۔ حافظ ابو بکر اسماعیلی نے آپ کا جنازہ ادا کیا اور مسجد کوزین کے بغل میں آپ کو سپرد خاک کر دیا گیا۔ (۶)

---

(۱) طبقات الشافعية ۲/۲۳۳ (۲) ذکر من يعتمد قوله فی الجرح والتعدیل ص۱۰۳

(۳) تاریخ جرجان ص ۲۲۶ (۴) سیر أعلام النبلاء ۱۶/۱۵۵

(۵) اللباب ۱/۲۷۰ (۶) معجم البلدان ۲/۱۲۲، سیر أعلام النبلاء ۱۶/۱

امام ابوالحسن دار قطنی

(متوفی ۳۸۵ھ)

پیدائش:- چوتھی صدی کا ابتدائی دور تھا، اصحاب کتب ستہ اور بڑے بڑے اہل علم دنیا سے رخصت ہو چکے تھے، امت کو ایک ایسے فرد کی ضرورت تھی جو ان کی جگہ لے سکے، قدرت نے اس کا انتظام حافظ بے مثال، سرخیل نقاد، یکتائے زمانہ، امام وقت امام دار قطنی کے ذریعے کیا اور ۳۰۶ھ میں جس سال قاضی ابو العباس احمد بن عمر بن سریج کا انتقال ہوا، امام دار قطنی کی پیدائش ہوئی۔ (۱)

نام و نسب:- آپ کا نام نامی حسب گرامی اس طرح ہے: اَبو الحسن علی بن عمر بن احمد بن مہدی بن مسعود بن النعمان بغدادی دار قطنی۔ (۲)

دار قطنی:- (دال مفتوح، سکون الف، راء مفتوح قاف مضموم، طاء مہملہ ساکنہ) دار القطن کی جانب منسوب ہے جو بغداد کا ایک عظیم محلہ تھا جو اب ویران ہو چکا ہے۔ (۳)

تعلیم:- آپ کے والد عمر بن احمد کا شمار محدثین میں ہوتا تھا، ان کی تربیت کا آپ پر بہت گہرا اثر پڑا، نتیجہ یہ ہوا کہ بچپن ہی سے جب آپ کی عمر تقریباً نو سال کی تھی درس حدیث میں شرکت شروع کر دیا۔ (۴)

یوسف قواس فرماتے ہیں کہ: جب ہم لوگ امام بغوی کی مجلس میں شرکت کرنے جاتے تھے اس وقت امام دار قطنی ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا لئے ہوئے ہمارے پیچھے پیچھے چلتے تھے۔ (۵)

نیز فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم لوگ ابن منیع کے یہاں جا رہے تھے، یہ بھی روٹی پر سالن ڈالے ہوئے پیچھے پیچھے آ رہے تھے، ہم نے ان کو اندر نہیں جانے دیا، وہ وہیں دروازے پر بیٹھے روتے رہے۔ (۶)

قدرتی طور سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو ذہانت و فطانت اور ذوق طلب سے نوازا

---

(۱) الموتلف والمختلف مقدمه محقق (۲) تاريخ بغداد ۱۲/ ۳٤
(۳) اللباب في تهذيب الأنساب ۱/ ٤٠٤، معجم البلدان ۲/ ٤۲۲
(٤) الموتلف والمختلف مقدمه محقق ۱/ ۱۰ (٥) سير أعلام النبلاء ۱٦/ ٤٥۲
(٦) تاريخ دمشق ۲۲/ ۲٤۱

تھا، تلاوت قرآن کریم بھی آپ کا بڑا اہم مشغلہ تھا، جس کے آپ حافظ تھے، تقویٰ و پرہیز گاری، ثقاہت و عدالت، علم و فضل کا یہ عالم تھا کہ آپ کے اساتذہ بھی آپ کی عزت و تکریم کرتے تھے، مجموعی اعتبار سے اس زمانے میں آپ کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

قوت حافظہ:- آپکا حافظہ ضرب المثل تھا، جسکی شہادت امام سمعانیؒ نے دی ہے۔[1]

آپ کی قوت حافظہ کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے، علامہ ازہری فرماتے ہیں کہ:

امام دار قطنی کے بچپن کے ایک واقعہ کی اطلاع ہم کو ملی ہے، اس وقت آپ اسماعیل صفار کی مجلس میں تھے، وہ درس حدیث کا املا کرا رہے تھے، امام دار قطنی کوئی کتاب نقل کرنے میں مصروف تھے جو ان کے پاس تھی، کسی ساتھی نے ان سے کہا کہ آپ کا پڑھنا درست نہیں، شیخ املاء کرا رہے ہیں اور آپ کچھ اور تحریر کر رہے ہیں، انہوں نے جواب دیا کہ میرے اور تمہارے سمجھنے میں بڑا فرق ہے، پھر خود انہوں نے اپنے ساتھی سے یہ سوال کیا کہ استاذ نے اب تک کتنی حدیثیں املا کرائیں؟ انہوں نے جواب دیا پتہ نہیں، امام دار قطنی نے فرمایا کہ اب تک اٹھارہ حدیثیں املا کرا چکے ہیں پھر انہوں نے ساری حدیثوں کو ترتیب وار مع سند و متن کے سنا دیا، اس واقعہ سے لوگوں پر سکتہ طاری ہو گیا، اور ان کو اس قوت حافظہ پر بڑا تعجب ہوا۔[2]

علمی سفر:- بغداد جو آپ کا وطن تھا وہاں علم حاصل کرنے کے بعد آپ نے دیگر مقامات کا بھی دورہ کیا جن میں کوفہ، بصرہ، شام، حجاز، مصر وغیرہ شامل ہیں۔[3]

مشائخ:- آپکے مشہور مشائخ میں: امام ابوالقاسم بغوی، ابو بکر بن ابو داؤد، یحییٰ بن صاعد، بدر بن ہیثم قاضی، احمد بن اسحٰق بھلول اور اس طبقہ کے بڑے بڑے اہل علم شامل ہیں۔

تلامذہ:- آپ کے شاگردوں کی ایک بہت بڑی جماعت ہے جن میں امام ابو عبداللہ حاکم، حافظ عبدالغنی بن سعید ازدی، ابو نعیم اصبہانی، ابو بکر برقانی، ابو عبدالرحمٰن سلمی، قاضی ابو طیب طبری، حمزہ بن یوسف سہمی، جیسے اصحاب علم و فضل ہیں۔[4]

---

(۱) الأنساب ٥/٢٤٥ (٢) تاريخ بغداد ١٢/٣٦-٣٧، تذكرة الحفاظ ٣/٩٩٢

(٣) تاريخ بغداد ٢١/٣٧، سير أعلام النبلاء ١٢/٤٥٧، تهذيب التهذيب ٤/٢٧٥

(٤) تاريخ بغداد ١٢/٣٤، سير أعلام النبلاء ١٦/٤٤٩، ٤٥٠

علمی مقام:- آپ کو مختلف علوم میں جو خداداد صلاحیت حاصل تھی وہ ایک عجوبہ ہے، فن قرأت و تفسیر، فقہ و فتاویٰ، ادب و لغت، میں بڑا اونچا مقام تھا، شعر و شاعری سے بھی گہری دلچسپی تھی، البتہ فن حدیث میں آپ کو امامت کا درجہ حاصل تھا۔

علل حدیث، معرفت رجال اور نقد رجال کیلئے جس قدر پختہ علم، گہری نظر، دقیق معلومات، وسیع اطلاع، جرأت نقد کی ضرورت ہے آپ کو سب کچھ عطا کیا گیا تھا، یہاں تک کہ آپ کو "أمیر المومنین فی الحدیث" کے خطاب سے نوازا گیا، آپ ہی کی وہ ہستی ہے جس نے صحیحین پر قلم اٹھانے کی جرأت کی اور ان پر نقد و تبصرہ کیا اور بقول ابن حجرؒ "بعض گرفت بڑی وجیہ ہے جسکے جواب میں تکلف کرنا پڑتا ہے۔"[1]

اپنے فن میں دنیا کی سب سے عظیم کتاب "العلل الواردة فی الأحادیث النبویة" آپ ہی کی تالیف ہے جس کو آپ نے اپنے حافظہ سے تحریر کرایا تھا۔

امام ذہبی فرماتے ہیں کہ: اگر امام دار قطنی نے "العلل" کو اپنے حافظہ سے تحریر کرایا ہے تو یہ بہت بڑا کارنامہ ہے، اس کو دیکھ کر امام دار قطنی کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ دنیا کے سب سے بڑے حافظ ہیں، اگر کسی کو آپ کی قوت حافظہ، مہارت علم، فہم و فراست معلوم کرنا ہو تو "العلل" کا مطالعہ کرے، حیرت و استعجاب میں پڑ جائے گا۔[2]

فن جرح و تعدیل میں آپ کی تالیفات:- فن جرح و تعدیل اور رجال حدیث میں آپ کو جو ملکہ حاصل تھا اس کا اندازہ طلبہ کے اژدہام اور سوالات نیز اس فن کی تالیفات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

محمد بن طاہر مقدسی فرماتے ہیں کہ: آپ کی مثال اپنے زمانہ میں وہی تھی جو ابن معین کی اپنے دور میں تھی، آپ کے دور کے حفاظ حدیث نے علوم حدیث کی معرفت آپ سے حاصل کی، راویوں کے بارے میں سوالات کر کے تحریر کیا، ہم کو پتہ نہیں کہ کسی نے یہ علم آپ کے علاوہ کسی اور سے لیا ہو۔[3]

آپ کی اس فن میں جو تالیفات ہیں ان میں سے: ذیل تاریخ کبیر، کتاب الضعفاء، کتاب المدلسین، أسماء صحابه، أسماء تابعین، ذیل المجروحین،

---

(۱) هدى السارى ۳۸۳ (۲) تذكرة الحفاظ ۳/۹۹۳-۹۹۴

(۳) مقدمة محقق ۳۱/۱

رجال البخاری و مسلم کے علاوہ سوالات السهمی، سوالات البرقانی، سوالات الساعی، سوالات الحاکم، سؤالات الهروی، سوالات الأصفهانی، سوالات الأزدی، وغیرہ قابل ذکر ہیں، انکے علاوہ آپکی اور کتابیں ہیں جو مختلف فنون میں ہیں، ڈاکٹر موفق بن عبداللہ نے مقدمہ "المؤ تلف والمختلف" میں (۸۲) کتابوں کاذکر کیاہے۔ (۱)

علامہ ابن صلاح فرماتے ہیں کہ: سات حفاظ ایسے ہیں جنہوں نے بڑی اچھی کتابیں تالیف کی ہیں اور ہمارے زمانہ میں ان کتابوں سے بڑا فائدہ حاصل کیا گیا، ان مولفین میں سب سے پہلا نام انہوں نے امام دارقطنی کا اور پھر انکے بعض شاگردوں کاذکر کیاہے۔ (۲)

علماء کی شهادت:- خطیب بغدادی فرماتے ہیں کہ: "انتهى إليه علم الأثر و المعرفة بعلل الحديث وأسماء الرجال وأحوال الرواة مع الصدق والأمانة والفقه والعدالة" (۳) علم حدیث کی جانکاری علل حدیث اور رجال کی معرفت، صداقت وامانت، فقہ اور عدالت کے ساتھ ساتھ آپ پر ختم ہے۔

ابو طیب طبری فرماتے ہیں کہ آپ "أمير المؤمنين في الحديث" تھے، جتنے بھی حفاظ بغداد تشریف لائے انہوں نے آپ سے ملاقات کی اور آپ کے مقام کو تسلیم کیا۔ (۴)

عبدالغنی ازدیؒ فرماتے ہیں کہ: حدیث رسول ﷺ پر اپنے اپنے دور میں گفتگو کرنے والے تین افراد سب سے بہتر تھے، علی بن مدینیؒ، موسیٰ بن ہارونؒ، امام دارقطنیؒ (۵)

امام ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ: آپ شیخ الاسلام، سرخیل نقاد، علم کے بحر بیکراں اور امام وقت تھے، آپ پر حفظ حدیث، معرفت علل ورجال کاخاتمہ ہے۔ (۶)

ابن العماد فرماتے ہیں کہ: آپ امام عظیم، شیخ الاسلام ہیں آپ پر حدیث اور علوم حدیث کی معرفت ختم ہے، آپکو "أمير المؤمنين في الحديث" کہا جاتا ہے۔ (۷)

---

(۱) الموتلف والمختلف ۱/۴۱/۵۶

(۲) مقدمة ابن الصلاح ص ۳۴۸

(۳) تاریخ بغداد ۱۲/۳۴

(۴) تاریخ بغداد ۱۲/۳۴

(۵) مصدر سابق

(۶) سیر اعلام النبلاء ۱۲/۴۵۰

(۷) شذرات الذهب ۳/۱۱۶

تشیع کا الزام:- سید حمیری جو بد باطن رافضی لیکن عظیم شاعر تھا، امام دار قطنی کو شعر و ادب سے بڑی دلچسپی تھی، اس بنا پر آپ نے اس کا دیوان حفظ کر لیا تھا، مجرد اسکی بنا پر کچھ لوگوں نے آپ پر تشیع کا الزام لگا دیا ہے جو دعویٰ بے دلیل باطل اور مردود ہے۔

اس کی تردید اس سے بھی ہوتی ہے کہ جب بغداد والوں نے حضرت عثمان اور حضرت علیؓ کی فضیلت کے سلسلہ میں اختلاف کیا تو امام دار قطنی نے فرمایا کہ: حضرت عثمانؓ باتفاق صحابہ کرام افضل ہیں، اور یہی اہل سنت کا عقیدہ ہے۔(۱)

وفات:- بالآخر سنت رسول ﷺ کا یہ محافظ جسکا یہ اعلان تھا کہ اے بغداد والے میری موجودگی میں کوئی شخص حدیث رسول میں دروغ گوئی کر کے نکل جائے ممکن نہیں۔(۲)

اور جس نے اپنے پیچھے علم کا بہت بڑا ذخیرہ امت کو ترکہ میں دیا، ماہ ذی القعدہ ۳۸۵ھ تقریباً ۸۰ سال کی عمر میں اس دار فانی سے رحلت کر گیا، اور مقبرہ دار الدیر (جسکو مقبرہ شیخ معروف الکرخی کہا جاتا ہے) امام کرخی کے بغل میں دفن کر دیئے گئے۔(۳)

حافظ ابو حفص بن شاهین

(متوفی ۳۸۵ھ)

نام و نسب:- آپ ابو حفص عمر بن احمد بن عفان بن احمد بن محمد بن ازداذ بغدادی ہیں۔(۴) اور ابن شاہین سے معروف ہیں جو آپ کے نانا احمد بن محمد بن یوسف بن شاہین شیبانی کی جانب نسبت ہے۔(۵)

آپ اصلاً خراسان کے علاقہ "مَرو َروز" کے رہنے والے تھے لیکن بغداد میں سکونت اختیار کر لی تھی۔

ولادت و حصول علم:- آپ کی ولادت صفر ۲۹۷ھ میں ہوئی اور جب گیارہ سال کی عمر کو پہنچے تو ۳۰۸ھ میں حدیث کی تعلیم شروع کی اور تیس سال کی عمر میں طلب حدیث کیلئے سفر کیا ان مقامات میں شام، فارس، بصرہ، عراق قابل ذکر ہیں اور

---

(۱) شذرات الذهب ۳/۱۱۶   (۲) المو تلف والمختلف مقدمه محقق ۱/۱۶-۱۷
(۳) تاريخ بغداد ۱۲/۴۰   (۴) سير أعلام النبلاء ۱۶/۴۳۱
(۵) اللباب ۲/۱۸۱

جب آپکی عمر ۳۵ سال کی ہوئی تو بصرہ میں ۳۴۲ھ میں درس حدیث شروع کیا۔[1]
اساتذہ:- آپنے مشائخ واساتذہ کی ایک جم غفیر سے استفادہ کیا ہے جس میں امام ابوالقاسم بغویؒ، احمد بن محمد دقاقؒ، محمد باغندیؒ، ابن مغلسؒ، ابن ابی داؤدؒ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔
تلامذہ:- آپ کے تلامذہ میں ابو بکر برقانی، ابوالقاسم تنوخی، ابو محمد خلال، ابن ابی الفوارس، محمد الجوہریؒ وغیرہ ہیں۔[2]
تالیفات:- تالیف کتب میں آپ کو خصوصی ملکہ حاصل تھا آپ کثرت تالیف میں مشہور ہیں، آپنے تقریباً (۳۳۰) اُجزاء تالیف کی ہیں جو مختلف فنون میں ہیں۔[3] ابن ابی الفوارس فرماتے ہیں کہ "کان ثقة و مامونا جمع و صنف مالم یصنف أحد"۔[4]

آپ کو اپنے اوپر اس قدر اعتماد تھا کہ کتابوں کی تصنیف میں نقول پر نظر ثانی نہیں کرتے تھے، غالباً اسی وجہ سے تصنیفات کی اتنی بڑی تعداد ہونے کے باوجود بہت کم کتابیں منظر عام پر آسکیں۔
علماء کی نگاہ میں :- امام دار قطنی فرماتے ہیں کہ: ابن شاہین ثقہ ہیں لیکن کبھی کبھی غلطی پر اصرار کرتے ہیں۔[5]

ابن ناصر فرماتے ہیں کہ: آپ امام اور حافظ وقت تھے، کثرت روایت، کثرت تصنیف والے تھے ثقہ و مامون محدث تھے۔[6]
جرح و تعدیل میں مقام:- فن جرح و تعدیل میں آپ کے مقام کا پتہ آپ کی تالیفات سے چلتا ہے، اس فن میں "تاریخ أسماء الثقات" کے علاوہ "الضعفاء والمجروحین" اور "أسماء الصحابة" آپ کی تالیفات ہیں۔[7]

ان کتابوں میں ائمہ کے جو اقوال آپ نے نقل کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے پاس معرفت رجال کا خزانہ موجود تھا۔
وفات:- بالآخر وقت موعود آپہنچا اور امام دار قطنی کے انتقال کے چند دن بعد ذی

---

(۱) تاریخ بغداد ۱۱/۲۶۲
(۲) تذکرۃ الحفاظ ۳/۹۸۷، سیر أعلام النبلاء ۱۶/۴۳۱-۴۳۲
(۳) تذکرۃ الحفاظ ۳/۹۸۸ (٤) تاریخ بغداد ۱۱/۲٦۷
(۵) تذکرۃ الحفاظ ۳/۹۸۸ (٦) تاریخ ا سماء الثقات مقدمہ محقق ص ۲۰
(۷) مصدر سابق

الحجہ ۳۸۵ھ میں آپ کا انتقال ہو گیا، اور امام احمد بن حنبلؒ کے بغل میں آپ کو سپرد خاک کر دیا گیا۔[1]

حافظ ابو نصر کلاباذی

(متوفی ۳۹۸ھ)

آپ امام ابو نصر بن احمد بن محمد بن حسین کلاباذی بخاری ہیں۔

کلاباذ بخارا کے محلوں میں سے ایک محلّہ ہے۔[2] آپ کی پیدائش ۳۲۳ھ میں اسی شہر بخارا میں ہوئی اور یہیں پر پروان چڑھے۔

اس دور کے مشہور علماء ہیثم بن کلیب شاشیؒ، عبدالمومن بن خلف نسفی، عبداللہ بن محمد حارثیؒ جیسے اہل علم سے علم حاصل کیا اور اپنے دور کے عظیم محدث، ناقد فن، اور نامور عالم بن گئے۔ آپ کے شاگردوں میں امام دار قطنیؒ، امام حاکمؒ، امام محمد بن جعفر مستغفریؒ قابل ذکر ہیں۔

علماء نے آپ کی بڑی تعریف کی ہے۔ امام حاکم فرماتے ہیں کہ آپ صاحب فہم و فراست تھے اور صحیح بخاری کی معرفت میں بڑے ماہر سمجھے جاتے تھے، ماوراء النہر کے علاقہ میں آپ جیسا کوئی نہیں تھا۔

آپ کے شاگرد مستغفری فرماتے ہیں: "هو أحفظ من كان بماوراء النهر في زمانه" خطیب بغدادی نے آپ کو ثقہ اور حافظ کہا ہے۔ اور امام دار قطنی نے آپ کی بڑی تعریف کی ہے۔

آپ کی وفات بخارا میں ۳۹۸ھ میں ہوئی اور وہیں سپرد خاک کئے گئے۔[3]

امام ابو عبداللہ حاکم نیساپوری

(متوفی ۴۰۵ھ)

امام حاکمؒ کی شخصیت کافی شہرت یافتہ ہے آپ کا نام چوتھی صدی ہجری کے

---

(۱) تاریخ بغداد ۲۶۸/۱۱، تذکرة الحفاظ ۹۸۹/۳، مصادر ترجمہ

(۲) اللباب فی تہذیب الأنساب ۱۲۲/۳

(۳) مزید معلومات کیلئے دیکھئے تاریخ بغداد ۲۳۴/٤، تذکرة الحفاظ ۲۰۷/۳، اللباب ۱۲۲

نقاد میں سر فہرست ہے فن حدیث میں آپ کی بڑی اہم خدمات ہیں، آپ کی شخصیت کا مختصر تعارف مندرجہ ذیل ہے۔

نام و نسب:- آپ شیخ المحدثین ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ بن محمد بن حمدویہ ہیں جو "ابن البیع" کے نام سے پہچانے جاتے تھے، آپکا تعلق نیساپور کے مردم خیز علاقہ سے ہے۔

ولادت و حصول علم:- ۳۲۱ھ میں نیساپور میں آپ کی ولادت ہوئی، تعلیم و تربیت کے ابتدائی مراحل بھی یہیں گزرے، سماع حدیث کی ابتدا بچپن ہی (۳۳۰ھ) سے کر دیا جو آپ کے والد اور ماموں کی عنایت کا نتیجہ تھا، اسی دور میں ان حضرات نے آپ کیلئے سند اجازت بھی حاصل کر لیا تھا لہٰذا آپکو اسی وقت اسناد عالی حاصل ہوگیا۔(۱)

سفر علم:- مقامی اور قرب و جوار کے اہل علم سے استفادہ کے بعد جب آپ کی عمر تقریباً بیس سال کی تھی اس وقت آپ نے طلب علم کیلئے رخت سفر باندھا جس کا رخ عراق کی جانب تھا جہاں پر دیگر مراکز اسلامیہ کے علاوہ ثقافتی مرکز بغداد بھی تھا، جن شہروں اور علاقوں کا آپ نے سفر کیا ان میں حجاز و خراسان اور ماوراء نہر کے علاقے بھی شامل ہیں۔(۲)

اساتذہ:- حصول علم کیلئے آپ نے تقریباً دو ہزار اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا جن میں سے ایک ہزار مشائخ صرف نیساپور کے ہیں آپ کے مشائخ میں ابو علی الحافظ، ابو احمد حاکم، ابو الحسن دار قطنی، علی بن حماد العدل، محمد بن یعقوب بن اخرم، ابو بکر صبغی، امام ابن حبان وغیرہ قابل ذکر ہیں۔(۳)

علمی مقام:- اس طرح سے آپ نے بڑے بڑے اہل فن کے علم کو جمع کیا اور اپنے ہم عصروں پر فوقیت لے گئے، فن حدیث آپ کا خصوصی فن تھا۔ حدیثوں پر حکم لگانے صحت و ضعف کی نشاندہی کرنے اور راویوں پر جرح و تعدیل کرنے میں بڑی مہارت تھی، ابو بکر صبغی، ابو الولید نیساپوری جیسے حضرات (جو آپ کے اساتذہ میں سے ہیں) جرح و تعدیل میں آپ کی جانب رجوع کرتے تھے، علل حدیث، صحیح و

(۱) ملاحظہ ہو سیر اعلام النبلاء ۱۶۳/۱۷ (۲) تذکرۃ الحفاظ ۱۰۳۹/۳
(۳) سیر اعلام النبلاء ۱۶۴/۱۷، تذکرۃ الحفاظ ۱۰۳۹/۳

ضعیف کی معرفت کے لئے آپ کی خدمت حاصل کرتے تھے۔[1]

علوم حدیث میں آپ نے بڑی اہم اہم کتابیں تصنیف کی ہیں، صحیحین پر آپ نے جو "المستدرك" تحریر کی ہے وہ آپ کی تعریف کا لازمی جزء ہو گیا ہے، معرفة علوم الحدیث، المدخل إلی الصحیحین اصول حدیث کی بنیادی کتابیں ہیں "تاریخ نیساپور" آپ کی وہ نادر تالیف ہے جو آپ کی فنی مہارت، علمی بصیرت پر دال ہے۔ علامہ سبکیؒ فرماتے ہیں: "من نظره عرف تفنن الرجل في العلوم جميعا"[2] جو اس کتاب کو دیکھ لے گا وہ سارے علوم میں آپ کی مہارت کو تسلیم کرلے گا۔

تلامذہ:- آپ کی فنی مہارت اور علمی بصیرت سے استفادہ کیلئے طلبائے علوم نبوت کا قافلہ در قافلہ آپ کی خدمت میں حاضری دیتا اور دور دراز کا سفر کر کے آپ کے علمی چشمہ سے سیراب ہوتا۔

علماء وقت کی ایک بڑی تعداد نے آپ سے روایت کیا ہے جن میں آپ کے استاذ امام دار قطنی کے علاوہ ابوالفتح بن أبي الفوارس، ابو ذر ہروی، ابو یعلی خلیلی، ابو بکر بیہقی جیسے معروف زمانہ شخصیات شامل ہیں۔[3]

علماء کی نگاہ میں:- علماء وقت آپ کی بڑی عزت و احترام کرتے تھے اور انہیں اپنے آپ پر متفوق سمجھتے تھے۔ حافظ وقت اور محدث عصر کی حیثیت سے تسلیم کرتے تھے، البتہ آپ کی شخصیت پر تشیع کا دھبہ لگا ہوا ہے جس کو بہت سے علماء نے خلاف حقیقت تصور کیا ہے۔[4]

امام ذہبی فرماتے ہیں کہ آپ علم کے سمندر تھے لیکن قدرے تشیع پایا جاتا تھا۔[5]

علامہ سبکی فرماتے ہیں کہ آپ اپنے زمانہ کی باکمال منفرد شخصیت تھے، حجاز، شام، مصر، عراق، خراسان، ماوراء نہر، رَی، بلاد جبال و طبرستان وغیرہ میں کوئی آپکا مد مقابل نہ تھا۔[6]

اگر اس کو مبالغہ پر بھی محمول کرلیا جائے پھر بھی آپ اس زمانہ کے چار ممتاز علماء میں سے ایک تھے۔ (وہ چار علماء یہ تھے، امام دار قطنی بغداد میں، ابن مندہ اصبہان

---

(۱) طبقات الشافعية ٦٥/٣ (۲) طبقات الشافعية ٦٤/٣

(۳) تذكرة الحفاظ ١٠٣٩/٣،

(٤) دیکھئے معرفة علوم الحدیث، تحریر ڈاکٹر سید معظم حسین، و طبقات الشافعية ٦٧/٣

(٥) سير أعلام النبلاء ١٦٥/١٧ (٦) طبقات الشافعية ٦٦/٣

میں، حافظ عبد الغنی مصر، میں امام حاکم نیساپور میں۔) [(۱)]

خطیب بغدادی فرماتے ہیں کہ: كان من أهل الفضل و المعرفة و العلم و الحفظ.(۲)

علامہ سبکی نے مزید فرمایا ہے کہ: آپ امام وقت اور عظیم محدث تھے آپ کی امامت، عظمت شان قدر و منزلت پر علماء کا اتفاق ہے۔ [(۳)]

وفات:- بالآخر وقت موعود آپہنچا اور قضاء الٰہی کے مطابق ۴۰۵ھ میں مقام نیساپور میں آپ کا انتقال اچانک ہو گیا، ابھی آپ غسل کر کے غسل خانہ سے باہر نکلے ہی تھے کہ آپ کی زبان سے ایک "آہ" نکلی اور اسی کے ساتھ روح پرواز کر گئی، عصر کی نماز کے بعد آپ کے وطن نیساپور میں سپرد خاک کیا گیا۔ [(۴)]

حافظ ابن منجویہ

(متوفی ۴۲۸ھ)

آپکا نام و نسب امام ابو بکر احمد بن علی بن محمد بن ابراہیم ابن منجویہ اصبہانی ہے۔

آپ اصلاً اصبہان کے رہنے والے تھے مگر نیساپور میں سکونت اختیار کرلی تھی۔

علم کے حصول کیلئے طریقہ محدثین کے مطابق آپ نے مختلف شہروں کا سفر کیا اس میں بخارا، سمرقند، ہرات، جرجان وغیرہ قابل ذکر ہیں، علماء کے ایک جم غفیر سے آپنے علم حاصل کیا جن میں امام ابو بکر اسماعیلیؒ، ابراہیم بن عبداللہ نیساپوریؒ، ابو بکر ابن مقریؒ، ابو عبداللہ ابن مندہؒ جیسی شخصیات شامل ہیں، آپ کے شاگردوں میں، امام خطیب بغدادیؒ، امام ابو بکر بیہقیؒ، علی بن اخرم جیسے نامور حضرات ہیں۔

آپ کی تالیفات سے آپ کی علمی صلاحیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، ان تالیفات میں سے آپ کی ایک تالیف "السنن" کے نام سے ہے جو "سنن ابو داؤد" کے مشابہ ہے، آپ نے صحیحین، سنن ابو داؤد، اور جامع ترمذی پر مستخرج بھی تحریر کی ہے۔

علماء زمانہ نے آپ کی صلاحیت کا اعتراف کرتے ہوئے آپ کی بڑی تعریف کی ہے اور آپ کا شمار بڑے بڑے ائمہ حفاظ میں کیا ہے۔

---

(۱) تذكرة الحفاظ ۱۰۴۵/۳ (۲) تاريخ بغداد ۴۷۳/۵

(۳) طبقات الشافعية ۶۴/۳ (۴) سير أعلام النبلاء و طبقات الشافعية و مصادر ترجمه.

ابو اسماعیل انصاری فرماتے ہیں کہ: "هو أحفظ من رأيت من البشر" جتنے لوگوں کو میں نے دیکھا ان میں آپ سب سے بہتر حفظ والے تھے۔ عبد الرحمٰن بن مندہ نے بھی آپ کی بڑی تعریف کی ہے۔ ۴۲۸ھ میں ۸۱ سال کی عمر میں آپ کا انتقال ہوا۔ (۱)

حافظ مشرق خطیب بغدادیؒ

(۳۹۲-۴۶۳ھ)

آپ کی شخصیت تاریخ ساز شخصیت تھی، آپ حافظ مشرق، محدث دوراں، اور یکتائے زمانہ تھے، فن حدیث سے تعلق رکھنے والا بچہ بچہ آپ سے واقف ہے، اور جو آپ سے واقف نہ ہو وہ فن حدیث کا طالب علم کہلانے کے لائق بھی نہیں۔

نام و نسب:- آپ کا نام نامی اسم گرامی احمد بن علی بن ثابت، کنیت ابو بکر اور لقب خطیب بغدادی ہے، آپ اپنے اسی لقب سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ آپ کے والد بغداد کے قریب ایک گاؤں "درزیجان" میں خطیب جمعہ و عیدین تھے، اس لئے وہ خطیب سے مشہور تھے۔ یہ خطاب آپ کو منتقل ہو گیا، پہلے آپ "ابن خطیب" تھے پھر جب اس مقام پر اپنے والد کے بعد آپ نے خطابت کا کام انجام دیا تو آپ بھی خطیب کے نام سے مشہور ہو گئے۔ ابن کثیرؒ نے اس مقام کو "درب ریحان" بتایا ہے۔ (۲)

ولادت:- آپ کی ولادت بروز جمعرات جمادی الآخر ۳۹۲ھ میں بغداد کے قریب ایک گاؤں میں ہوئی، البتہ آپ کی نشو و نما تعلیم و تربیت بغداد میں ہوئی۔ (۳)

تعلیم:- آپ کے والد حافظ قرآن اور متوسط تعلیم یافتہ فرد تھے لیکن علم اور اہل علم سے بڑی دلچسپی تھی اس لئے اپنے بیٹے کی تعلیم کی فکر بچپن ہی سے لاحق تھی، سب سے پہلے آپ کو حافظ قرآن بنایا، گیارہ سال کی عمر میں درس حدیث شروع کرایا۔ (۴)

---

(۱) مزید تفصیل کیلئے دیکھئے سير أعلام النبلاء ۴۳۸/۱۷، طبقات الحفاظ ۴۲۰، شذرات الذهب ۲۳۳/۳

(۲) البداية والنهاية ۱۱۰/۱۲، نیز دیکھئے الحافظ الخطيب البغدادي و أثره في علوم الحديث ڈاکٹر طحان ص ۳۰

(۳) البداية والنهاية ۱۱۰/۱۲، سير أعلام النبلاء ۲۸۴/۱۸

(۴) طبقات الشافعية ۱۲/۳

اس کے ساتھ ساتھ قاضی ابو الطیب طبری، ابو الحسن محاملی جیسے ماہرین فقہ سے فقہ شافعیہ کا درس بھی جاری رکھا، تقریباً ۱۴ سال تک فقہ کی طرف زیادہ توجہ رہی، یہاں تک کہ آپ اس میں ماہر اور شہرت یافتہ ہو گئے اس کے بعد فن حدیث کی جانب توجہ مبذول ہو گئی۔

ابن خلکان فرماتے ہیں کہ: "کان فقیها فغلب علیه الحدیث و التاریخ" آپ انتہائی تیز رفتار و بلند آواز سے پڑھتے تھے، یہاں تک کہ آپ کی آواز جامع دمشق کے آخر تک پہنچتی تھی۔ شدت طلب کا جو عالم تھا اس کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ احمد بن اسماعیل الضریر کا گذر بغداد سے ہوا جن کو واپس نیساپور جانا تھا، آپ کو ان سے صحیح بخاری پڑھنا تھا جس کو آپ نے صرف، تین مجلسوں میں پڑھ لیا۔ پہلی دو مجلس مغرب سے فجر تک چلی لیکن کتاب مکمل نہ ہوئی اور ان کی واپسی کا وقت آ گیا اور وہ بغداد سے روانہ ہو گئے، حافظ بغدادی ان کے پاس اپنے ساتھیوں کے ہمراہ گئے اور مقام جزیرہ جہاں انہوں نے منزل کی تھی چاشت سے لے کر مغرب تک اور پھر مغرب سے لے کر فجر تک صحیح بخاری پڑھتے رہے اور اس طرح سے یہ کتاب تین مجلسوں میں مکمل کر لی۔ (۱)

سفر علم:- بغداد جو اہل علم و فضل کا گہوارہ تھا وہاں سے علم حاصل کرنے کے بعد مزید طلب علم کیلئے رخت سفر باندھا اسوقت آپ کی عمر بیس سال کی تھی۔ بلاد اسلامیہ کے دور دراز مقامات اور علمی مراکز کا دورہ کیا جن میں نیساپور، اصبہان، ری، ہمدان کے علاوہ بلاد عربیہ کے مشہور مقامات مثلاً کوفہ، بصرہ، دمشق، حجاز اور بلاد مصر شامل ہیں۔

اساتذہ:- آپ نے جن ماہرین فن سے علم حاصل کیا ان میں قاضی ابو طیب طبری، ابو الحسن محاملی، ابن زرقویہ، حافظ ابو نعیم اصبہانی، ابو بکر برقانی، ابو القاسم ازہری کے علاوہ بے شمار اہل علم شامل ہیں۔ (۲)

فن جرح وتعدیل:- آپ کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی ذہانت، بے مثال قوتِ حافظہ سے نوازا تھا، اسلئے آپ اپنے سارے ہم عصروں پر فائق ہو گئے اور حافظ عصر کہلائے،

---

(۱) تاریخ بغداد ۳۱۴/۶ (۲) سیر أعلام النبلاء ۲۷۱/۱۸-۲۷۲

یہ عین حقیقت ہے کہ اس وقت مشرق میں خطیب بغدادی اور مغرب میں حافظ ابن عبد البر کا کوئی مقابل نہ تھا۔ اتفاق سے ایک ہی سن میں دونوں کا انتقال بھی ہوا۔

خاص طور سے فن جرح و تعدیل، علل حدیث کی معرفت، صحیح و ضعیف کی پہچان میں آپ کا کوئی ثانی نہیں تھا، یہاں تک کہ بغداد کے وزیر اعظم (صدر الصدور) ابن مسلمۃ نے سارے خطباء اور وعاظ کو یہ ہدایت کر دی تھی کہ کوئی حدیث جب تک خطیب بغدادی پر نہ پیش کی جائے اسکو عوام کے سامنے نہ بیان کیا جائے۔[1] علماء کے جو اقوال آگے آرہے ہیں ان سے اس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

تلامذہ:- آپ کی عالمی شہرت یافتہ شخصیت علماء اور طلباء کی توجہ کا مرکز بن گئی علمی تشنگی بجھانے والے آپ کی خدمت میں جوق در جوق حاضر ہونے لگے۔ آپ نے پوری زندگی تعلیم و تعلم، درس و تدریس، تصنیف و تالیف، میں گذار دی جس میں زیادہ تر وقت تاریخ بغداد کے حصہ میں آیا۔

حصول علم کے بعد باون سال تک آپ نے بغداد میں قیام کیا لیکن جب باطنی فرقہ فاطمیوں کا اس پر قبضہ ہو گیا تو آپ وہاں سے ہجرت پر مجبور ہو گئے اور دمشق میں پناہ لی۔ ۶۲ سال کی عمر تک وہیں رہے پھر وہاں سے بھی نکلنا پڑا اور مختلف مقامات سے گزرتے ہوئے وفات سے ایک سال قبل بغداد واپس آئے۔ (اس لئے کہ اب فتنہ ختم ہو چکا تھا) اور آخری عمر تک درس میں مصروف رہے۔[2]

آپ کی زندگی میں علم کے علاوہ کوئی مشغلہ نہ تھا آپ صاحب اہل و عیال بھی نہ تھے اس لئے آپ سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے آپ سے استفادہ کرنے والوں میں آپ کے اساتذہ بھی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ مشہور شخصیات میں ابن ماکولا، حمیدی، ابن خیرون، خطیب تبریزی، قاضی ابو بکر النصری محمد مرزوق الزعفرانی وغیرہ ہیں۔

طلبہ نوازی:- آپ اپنے شاگردوں اور دیگر اہل علم کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ آپ کے ایک شاگرد خطیب تبریزی فرماتے ہیں کہ ایک دن ہمارے استاذ خطیب بغدادی

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ۱۱۴/۳، سیر و أعلام النبلاء ۲۸۰/۱۸

(۲) سیر أعلام النبلاء، الحافظ الخطیب بغدادی و أثرہ ص ۲۹

نے مجھ سے کہا کہ آپ کی جائے رہائش دیکھنا چاہتا ہوں، چنانچہ وہ ملاقات کیلئے اپنے اپنے شاگرد کے گھر گئے مختلف گفتگو کرنے کے بعد فرمایہ کہ ہدیہ لینا مستحب ہے اور ان کو پانچ مصری دینار (اشرفی) ہدیہ میں دیا کہ قلم وغیرہ خرید لینا کچھ دن کے بعد دوبارہ گئے اور پھر مصری دینار عطا کیا۔

اس طرح سے آپ کے پاس جتنی بھی جائداد تھی آخری عمر میں سب طلبہ اور علماء میں تقسیم کردی۔[۱]

خدمات حدیث و تصنیفات:- آپ نے فن حدیث کی جو خدمت کی ہے وہ ناقابل فراموش ہے، خاص طور سے اصول حدیث کے مباحث پر جس طرح سے آپ نے کام کیا ہے کسی دوسرے نے نہیں کیا، آپ نے اس فن میں بعد میں آنے والے ہر دور کے علماء کو اپنا محتاج بنادیا ہے، حافظ ابن نقطہ جنہوں نے آپ پر تنقید بھی کی ہے، فرماتے ہیں کہ: "کل من أنصف علم أن المحدثین بعد الخطیب عیال علی کتبه"[۲] ہر منصف مزاج یہ کہنے پر مجبور ہے کہ خطیب کے بعد آنے والے محدثین ان کی کتابوں کے محتاج ہیں نیز فرمایا کہ "وله مصنفات فی علوم الحدیث لم یسبق إلی مثلها"[۳]

فن مصطلح الحدیث میں آپ کی کتاب "الکفایة فی علم الروایة" اسم با مسمی ہے "تاریخ بغداد" تصنیف کر کے آپ نے رجال حدیث اور محدثین کے بارے میں اہم معلومات جمع کردی ہے جس سے بعد میں آنے والوں نے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ دیگر فنون میں بھی آپ کی تالیفات ہیں جن کی تعداد حافظ ذہبی نے پچاس، ابن نجار نے ساٹھ بتائی ہے، آپ کی وفات کے پچاس سال بعد آپ کی تالیفات نذر آتش ہو گئی تھیں، اس لئے بہت سی کتابیں دستیاب نہ ہو سکیں۔[۴]

ابن سعد سمعانی فرماتے ہیں کہ: آپ کی تالیفات ایک سو ہیں جو اصحاب حدیث کیلئے بہت معتمد تھیں۔[۵]

---

(۱) مصادر ترجمه (۲) نخبة الفكر ص ۱
(۳) الاستدراك لابن نقطه حواله از كتاب ڈاكٹر محمود طحان ص ۱۰۹
(٤) سیر أعلام النبلاء ۱۸/ ۲۷٤، طبقات الشافعية ۳/ ۱۳
(٥) اللباب فی تهذیب الأنساب ۱/ ٤٥٤

شیخ یوسف العش نے اپنی کتاب "الخطیب البغدادی مورخ بغداد و محدثها" میں (۷۱) کتابوں کا ذکر کیا ہے، ان کے وجود نیز مطبوع وغیر مطبوع ہونے کی تفصیل بھی بتائی ہے۔ڈاکٹر اکرم ضیاء عمری نے "موارد الخطیب البغدادی" میں (۸۱) کتابوں کا اور ڈاکٹر محمود طحان نے "الحافظ الخطیب البغدادی و أثره في علوم الحدیث" میں (۸۰) کتابوں کا ذکر کیا ہے۔

آپ نے اپنی ساری کتابوں کو وقف کر دیا تھا اور ابن خیرون کو ان کا نگراں بنایا تھا۔ انکے بعد انکے بیٹے اسکے نگراں تھے، یہ کتابیں انہیں کے دور میں نذر آتش ہوگئیں۔ (۱)

علماء کی نگاہ میں:- علماء زمانہ و دیگر علماء نے آپ کی شخصیت پر کافی روشنی ڈالی ہے آپ کے علم وفن تقویٰ وپرہیز گاری نیز عبادت کا خصوصی ذکر کیا ہے۔

آپ کے ہم عصر محدث ابن ماکولا فرماتے ہیں کہ: جن لوگوں کو ہم نے دیکھا اور ملاقات کی ان میں آپ یکتائے زمانہ تھے، تثبت اور ضبط کے ساتھ حفظ حدیث اور اس کی معرفت، علل حدیث اور علم اسناد میں تفنن، صحیح اور ضعیف، غریب اور منکر کے عالم تھے۔امام دار قطنی کے بعد بغداد میں آپ جیسا عالم پیدا نہیں ہوا۔ (۲)

ابو اسحٰق شیرازیؒ فرماتے ہیں کہ: خطیب بغدادی معرفت حدیث اور حفظ حدیث میں امام دار قطنیؒ اور ان کے ہم مثلوں کی طرح تھے۔ (۳)

ابن سعد سمعانیؒ فرماتے ہیں کہ "آپ حافظ عصر بلا مدافعہ اور حافظ وقت بلا منازعہ تھے" نیز فرمایا کہ "علم حدیث کی معرفت، حفظ حدیث آپ پر ختم ہے، آپ خاتمۃ الحفاظ تھے" (۴)

ابن شافع فرماتے ہیں کہ: "انتهى إليه الحفظ والاتقان والقيام بعلوم الحديث" (۵)

خطیب بغدادی کی شخصیت پر امام ابن الجوزیؒ اور احناف نے تنقید کی ہے (خاص طور سے کوثری نے بڑا سخت سست کہا ہے) جس کی بنیاد تعصب برائے ائمہ پر

---

(۱) المنتظم ۸/۲۶۹ (۲) سیر أعلام النبلاء ۱۸/۲۷۵، شذرات الذهب ۳۱۲

(۳) سیر أعلام النبلاء ۱۸/۲۷۶، تذکرة الحفاظ ٤/۱۱۳۹

(٤) شذرات الذهب ۳/۳۱٤ (۵) تذکرة الحفاظ ٤/۱۱۳۹

ہے، ابن الجوزیؒ نے اسلئے تنقید کا نشانہ بنایا کہ انہوں نے امام احمد بن حنبل کے ترجمہ میں انکو صرف محدث لکھا ہے فقیہ کیوں نہیں لکھا۔ جبکہ امام شافعی کے ترجمہ میں انکو "تاج الفقہاء" لکھا ہے، نیز یہ کہ حنابلہ کا ترجمہ لکھتے وقت ناانصافی کی ہے۔(۱) احناف اس وجہ سے ناراض ہیں کہ انہوں نے "تاریخ بغداد"، "سیر اعلام" میں امام ابو حنیفہ کا ترجمہ بہت مفصل لکھ دیا ہے، جس میں علماء کے دونوں طرح کے اقوال سند کے ذریعہ ذکر کرنے کے بعد یہ کہہ دیا کہ امام صاحب کو مطعون کرنے والے اُقوال راجح ہیں۔(۲)

وفات:- آخری ایام میں جب آپ بغداد واپس آئے، ابھی ایک سال بھی نہ گذرا تھا کہ آپ رمضان المبارک کے مہینے میں علیل ہو گئے۔ آپ کافی مالدار تھے بیت المال کے علاوہ آپ کا کوئی وارث نہ تھا اس لئے آپ نے امیر وقت سے اجازت لے کر سارا مال و اسباب طلباء و علماء اور کارِ خیر پر خرچ کر دیا اور ساری کتابیں وقف کر دیں۔ آپ کی علالت طویل ہو گئی اور بالآخر ماہ ذی الحجہ ۴۶۳ھ کو ۷۱ سال کی عمر میں مالک حقیقی سے جا ملے۔ إنا لله وإنا إليه راجعون.(۳)

آپ نے ماء زمزم نوش کرتے وقت یہ دعا کی تھی کہ بشر الحافی کے بغل میں دفن کئے جائیں، اور اس کی وصیت بھی کر دی تھی۔ لیکن اتفاق سے بشر الحافی کے بغل میں کسی بزرگ نے اپنے لئے قبر تیار کر رکھی تھی جس میں وہ بیٹھ کر قرآن کی تلاوت کرتے تھے اور ہفتہ میں ایک رات اس میں گذارتے تھے، وہ اس قبر سے دستبردار ہونے کیلئے تیار نہ تھے۔ جب ان سے یہ کہا گیا کہ اگر بشر الحافی زندہ ہوتے اور آپ اور خطیب دونوں ان سے ملنے آتے تو ان کے قریب کون بیٹھتا؟ آخر کار وہ راضی ہو گئے اور اسی قبر میں سوگواروں کے ہجوم نے سپرد خاک کیا، آپ کے جنازہ میں علماء اُمراء کے علاوہ عوام کی ایک جم غفیر شریک تھی قاضی وقت ابو اسحٰق شیرازیؒ جیسے اہل علم آپ کو کندھا دینے کیلئے ایک دوسرے سے سبقت کر رہے تھے۔ جنازہ لے جاتے وقت یہ اعلان ہو رہا تھا۔ یہ سنت رسول ﷺ کے محافظ اور حافظ حدیث کا جنازہ ہے۔(۴)

---

(۱) سير أعلام النبلاء ۱۸/ ۲۸۹

(۲) الحافظ الخطيب البغدادى و أثره فى علوم الحديث ص ۱۰۵–۱۰۶

(۳) طبقات الشافعية ۳/ ۱۴ (٤) سير أعلام النبلاء ۱۸/ ۲۸٦، طبقات الشافعية ۳/ ۱۲

حافظ مغرب ابن عبدالبر قرطبی

(۳۶۸-۴۶۳ھ)

حافظ ابن عبدالبر قرطبیؒ کی شخصیت بڑی عظیم شخصیت ہے، ٹھیک اس وقت جب مشرق میں خطیب بغدادیؒ کا دور دورہ تھا اسی وقت ان کی متوازن شخصیت حافظ مغرب، ابن عبدالبرؒ کا دھوم مغرب میں مچا ہوا تھا، آپ نے فن حدیث کی جو خدمت کی ہے وہ قابل صد افتخار ہے، آپ کی کتاب "التمہید" فن شرح حدیث میں عظیم علمی شاہکار اور بنیادی کتاب ہے۔ آپ کی زندگی کا مختصر خاکہ یہ ہے۔

نام و نسب:- ابو عمر، جمال الدین، یوسف بن عبداللہ بن محمد بن عبدالبر بن عاصم نمری قرطبی ہے۔[۱]

نَمری: نون اور میم کے فتحہ کیساتھ، یہ نسبت تین افراد کی جانب ہوتی ہے۔ نمر بن قاسط کی جانب، جن کا تعلق قبیلہ عدنان سے ہے اور نمر بن عثمان کی جانب، جنکا تعلق قبیلہ ازد سے ہے۔ اور نمر بن وبرہ کی جانب ہے جنکا تعلق قبیلہ قضاعۃ سے ہے۔[۲]

حافظ ابن عبدالبر نمر بن قاسط کی جانب منسوب ہیں جسکا تعلق قبیلہ عدنان سے ہے۔[۳]

قُرطُبی: قاف اور طاء کے ضمہ اور راء ساکنہ کے ساتھ۔ مقام قرطبہ کی جانب نسبت ہے، جو اندلس کا مشہور شہر اور اس کا پایہ تخت تھا، یہ مغرب میں علم و فن کا گہوارہ تھا، اور وہی حیثیت رکھتا تھا جو مشرق میں بغداد کی تھی۔[۴]

ولادت:- آپ کی ولادت ۳۶۸ھ میں ایک علمی گھرانے میں ہوئی، آپ کے والد فقیہ قرطبہ، اچھے ادیب، عابد و فاضل شخص تھے، لیکن آپ کو ان سے بہت زیادہ استفادہ کا موقع نہ مل سکا اسلئے کہ ان کا انتقال طلب علم کی اصل عمر سے پہلے ۳۸۰ھ میں ہی ہو گیا تھا۔[۵]

پرورش و طلب علم:- آپ کی پرورش و پرداخت اسی شہر قرطبہ میں ہوئی جو

---

(۱) سیر أعلام النبلاء ۱۵۳/۱۸ (۲) اللباب فی تهذیب الأنساب ۳۲۶/۳

(۳) الدیباج المذهب فی معرفة أعیان علماء الذهب ۳۶۷/۲-۳۶۹

(٤) اللباب ۲۵/۳

(٥) الدیباج المذهب فی معرفة أعیان علماء المذهب ۳۶۹/۲، سیر أعلام النبلاء ۵٤/۱۸

اسلامی تہذیب کا گہوارہ اور اہل علم کا قبلہ تھا۔ ۳۹۰ھ کے بعد حصول علم میں لگ گئے اور بڑے بڑے اہل علم و فضل سے ملاقات کی۔(۱)

آپ نے زیادہ تر علم مقام قرطبہ ہی میں حاصل کیا، اس کے علاوہ اندلس کے مشرق و مغرب میں دیگر مقامات کا سفر کیا، البتہ آپ اندلس سے باہر نہیں گئے، یہیں کے علم نے آپ کو حافظ مغرب، عظیم محدث، بے مثال فقیہ، ادیب اور شاعر کے خطاب کا مستحق بنایا۔ جن شہروں میں آپ نے قیام کیا۔ ہے ان میں دانیہ، بلنسیہ، شاطبہ، اشبیون، مشترین وغیرہ شامل ہیں۔(۲)

اساتذہ:- آپ کے مشہور اساتذہ میں: ابوالولید بن فرضی ہیں جن سے آپ نے زیادہ تر علم حدیث و رجال حاصل کیا۔(۳)

ان کے علاوہ آپ کے مشہور اساتذہ میں ابو عمر بن المکوی، ابو عمر باجی، ابو عمر الطلمنکی، حافظ ابوالقاسم خلف بن القاسم ہیں، علماء مشرق میں سے آپ کو حافظ عبدالغنی بن سعید ازدی، حافظ عبیداللہ سقطی اور ابوذر ہروی وغیرہ سے سند اجازت ملی تھی۔(۴)

تلامذہ :- آپ کے علم کی شہرت، تصانیف کی افادیت کی وجہ سے، کثیر تعداد میں طلباء علوم نبوت نے آپ کا قصد کیا ان مشہور شاگردوں میں، حافظ ابن حزم بھی ہیں جنہوں نے آپ سے علم حدیث حاصل کیا، ان کے علاوہ: حافظ ابو علی غانی، ابو عبداللہ حمیدی، ابوالعباس دلانی وغیرہ کے علاوہ ایک بڑی تعداد ہے۔(۵)

علمی خدمات:- علمی خدمات میں طلباء، افتاء اور قضاء کے علاوہ آپ کی انتہائی مفید اور گراں قدر تالیفات ہیں، جن میں آپ کی علمی پختگی، اتقان اور مہارت تامہ کا اثر واضح ہے، آپ کی کتاب "التمہید" کی کوئی مثال نہیں، اس میں آپ نے شرح حدیث کا انمول طریقہ دیا ہے، اس کے علاوہ آپ کی جو دیگر تالیفات ہیں ان کی تعداد محقق کتاب "التمہید" نے اس کے پیش لفظ میں بائیس بتایا ہے۔

جرح و تعدیل میں آپ کا مقام:- فن جرح و تعدیل اور معرفت رجال و

---

(۱) سیر أعلام النبلاء ۱۸/۱۵٤ (۲) شذرات الذهب ۳/۳۱۵-۳۱٦

(۳) الدیباج المذهب ۲/۳٦۷

(٤) سیر أعلام النبلاء ۱۸/۱۵٦، شذرات الذهب ۳/۳۱۵، التمهید مقدمه محقق

(۵) الدیباج ۲/۳٦۷، سیر أعلام النبلاء ۱۸/۱۵۵-۱۵٦

علوم حدیث میں آپ امام وقت تھے، آپ کی کتاب "الاستیعاب فی معرفة الأصحاب، الاستغناء فی معرفة الکنی، جامع بیان العلم و فضله و ما ینبغی فی روایته و حمله" آپ کی امامت وجلالت شان پر دلالت کرتے ہیں۔

ابو عبداللہ حمیدی فرماتے ہیں آپ حافظ وقت، علوم حدیث و رجال کی معرفت، قرآن اور اختلافات کا علم رکھنے والے تھے۔ (۱)

مذہب:- ابتداء میں آپ ظاہری تھے، پھر مالکیہ کی جانب رجحان پیدا ہوا لیکن بغیر کسی تقلید کے دلائل واجتہاد کی بنیاد پر فتویٰ دیتے تھے، فقہ شافعی کی جانب بھی واضح میلان پایا جاتا تھا۔

علماء کی شہادت:- اہل علم نے آپ کی بڑی تعریف کی ہے، اور آپ کے علم وفضل کی شہادت دی ہے۔

ابو الولید باجی فرماتے ہیں کہ: اندلس میں فن حدیث میں آپ کی طرح کوئی نہیں تھا، آپ حافظ مغرب تھے۔ (۲)

ابن حزم فرماتے ہیں کہ: فقہ حدیث میں آپ کی طرح گفتگو کوئی نہیں کر سکتا تھا، چہ جائے کہ آپ سے بہتر کوئی ہوتا۔ (۳)

ابن خلکان فرماتے ہیں کہ: حدیث واثر اور ان سے متعلق فنون میں آپ اپنے زمانہ کے امام تھے۔ (۴)

امام ذہبی فرماتے ہیں کہ: حفظ واتقان میں آپ اس زمانہ کے سردار تھے۔ (۵)

وفات:- آخری عمر میں آپ نے شاطبہ کو اپنا مستقر بنایا، یہیں پر آپ کی وفات ربیع الآخر ۴۶۳ھ میں جمعہ کے روز ہوئی، اس وقت آپ کی عمر ۹۵ سال کی تھی۔ (۶)

علامہ ابو الولید باجی

(متوفی ۴۷۴ھ)

نام و نسب و ولادت:- آپ محدث عظیم امام ابو الولید سلیمان بن خلف باجی

---

(۱) سیر أعلام النبلاء ۱۸/۱۵۶
(۲) الدیباج ۳/۳۶۷، سیر أعلام النبلاء ۱۸/۱۵۷
(۳) سیر أعلام النبلاء ۱۸/۱۵۸
(۴) شذرات الذهب ۳/۳۱۵
(۵) تذکرة الحفاظ ۳/۱۱۲۹
(۶) الدیباج ۲/۳۷۰، تذکرة الحفاظ ۳/۱۱۳۰، شذرات الذهب ۳/۳۱۴

ہیں۔ اندلس میں ایک مشہور مقام "باجہ" ہے اسی کی جانب آپ منسوب ہیں۔ (۱)
آپ اصلاً "بطلیوس" کے رہنے والے تھے وہاں سے آپ کے دادا "باجہ" منتقل ہو گئے تھے جو اشبیلیہ کے قریب ایک قصبہ ہے آپ کی ولادت یہیں پر ۴۰۳ھ میں ہوئی۔

سفر علم و علمی مقام:- علم حدیث اور دیگر فنون کے حصول کیلئے آپ نے اندلس سے مشرق کا سفر کیا اور عراق، شام، حجاز، بغداد، موصل وغیرہ کے مشہور زمانہ علماء و محدثین سے مختلف علوم حاصل کیا اور تقریباً تیرہ سال تک مشرق میں رہنے کے بعد اپنے وطن مغرب کا رخ کیا جہاں آپ کو محدث اندلس کے خطاب سے نوازا گیا مختلف اوقات میں منصب قضاء پر بھی فائز رہے۔

اساتذہ:- آپ کے اساتذہ کی بڑی لمبی فہرست ہے ان میں ابو ذر ہروی، محمد بن علی صوری، ابو اسحٰق شیرازی، ابو القاسم ازہری، قاضی ابو الطیب طبریؒ قابل ذکر ہیں۔

تلامذہ:- آپ کے شاگردوں کی تعداد بھی کماً و کیفاً کسی بھی اعتبار سے کم نہیں ہے، آپ کے انہیں شاگردوں میں حافظ مغرب علامہ ابن عبد البر قرطبیؒ، یکتائے زمانہ علامہ ابن حزم اندلسیؒ، حافظ مشرق امام خطیب بغدادیؒ جیسی عبقری شخصیات ہیں۔

تالیفات:- آپ نے مختلف علوم میں بڑی عمدہ کتابیں تالیف کی ہیں انہیں میں سے ایک بے نظیر کتاب شرح موطا تھی جو بیس جلدوں پر مشتمل تھی۔ اس کے علاوہ آپ کی دیگر تالیفات بھی ہیں جو مختلف علوم میں ہیں۔ کثرت علم و تلامذہ کی وجہ سے آپ کو "شیخ اندلس" کا خطاب دیا گیا ہے۔

علماء کی نگاہ میں:- ابو علی بن سکرۃ فرماتے ہیں کہ: میں نے آپ جیسی شخصیت نہیں دیکھی آپ کی ہیئت بہت بارعب اور آپ کی مجلس بڑی پروقار ہوا کرتی تھی۔

علامہ ابن حزمؒ فرماتے ہیں کہ: مالکیوں میں قاضی عبد الوہاب کے بعد آپ کے جیسا شخص پیدا نہیں ہوا۔

اللہ کے رسول ﷺ لکھنا جانتے تھے کہ نہیں اس مسئلہ میں آپ کی رائے موجودہ علماء سے مختلف تھی آپ کا خیال تھا کہ اللہ کے رسول معمولی سا لکھنا پڑھنا

---

(۱) اللباب فی تهذيب الأنساب ۸۲/۱

جانتے تھے جو امیت کے خلاف نہیں۔ موجودہ علماء کا خیال تھا کہ ہمارے رسول ﷺ مطلقاً لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔

اسی اختلاف رائے کی وجہ سے آپ کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا اور بڑے سخت کلام کہے گئے۔ کسی شاعر نے آپ ہی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے یہ کہا تھا:

برئت عمن شری دنیا بآخرة　　　وقال إن رسول الله قد كتبا

وفات:- بالآخر وقت موعود آپہنچا اور ۴۷۴ھ میں مقام ''مریہ'' میں انتقال فرما گئے اور مقام ''رباط'' میں ساحل سمندر پر سپرد خاک کیا گیا۔(۱)

حافظ ابن ماکولا

(متوفی ۴۸۷ھ)

پانچویں صدی کے خدام سنت نبوی میں حافظ ابن ماکولا کی شخصیت بڑی شہرت یافتہ ہے، جو ایک ماہر نسابہ، عظیم محدث، جید حافظ، شاعر اور ادیب تھے، فن اسماء رجال کے ماہر، جرح و تعدیل کے عارف تھے، جس پر آپ کی کتاب ''الاکمال'' شاہد عدل ہے۔ آپ اصلاً اصبہانی ہیں۔ اصبہان کے قریب ایک مقام ''جرباذقان'' ہے، آپ کا تعلق یہیں سے تھا، البتہ آپ کی ولادت مقام عکبر میں ۴۲۲ھ میں ہوئی اور بغداد کو آپ نے اپنا وطن بنایا۔(۲)

علامہ یمانی نے مقدمہ ''اکمال'' میں آپ کی ولادت کو ۴۲۱ھ میں راجح قرار دیا ہے۔

نام و نسب:- آپکا حسب ونسب اسطرح ہے: ابو نصر علی بن ہبۃ اللہ بن علی بن جعفر بن علی بن محمد بن امیر دلف بن امیر جواد عجلی جرباذقانی ہے۔(۳) جو امیر کے نام سے مشہور ہیں، غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ اپنے دادا امیر دلف کے جانب منسوب ہیں۔(۴)

عجلی: عجل کی جانب نسبت ہے جو بکر بن وائل کا ایک ذیلی قبیلہ ہے، جس کا تعلق نزار بن معد بن عدنان سے ہے۔(۵)

---

(۱) مزید تفصیل کیلئے دیکھئے سیر أعلام النبلاء ۵۳۵/۱۸، الدیباج المذهب ۳۷۷/۱، شذرات الذهب ۳۴۴/۳

(۲) شذرات الذهب ۳۸۱/۳

(۳) سیر أعلام النبلاء ۵۶۹/۱۸

(۴) سیر أعلام النبلاء ۵۷۰/۱۸

(۵) البداية والنهاية ۱۳۳/۱۲

جرباذ قانی: جرباذ قان (جیم کے فتحہ، پھر راء ساکنہ اس کے بعد باء مفتوحہ) کی جانب نسبت ہے جو ایک مقام کا نام ہے جس کو اہل عجم "کرباذ قان" کہتے ہیں۔[۱]

آپ کا تعلق ایک متمول علمی گھرانے سے تھا جس کی وجہ سے آپ کا رہن سہن امراء جیسے تھا، جس پر کچھ اہل علم نے نکیر کی ہے، آپ کے والد قائم بامر اللہ کے وزیر اور آپ کے چچا حسین بن علی بغداد میں قاضی القضاۃ تھے، کبھی کبھی آپ نے بھی سفارت کا کام انجام دیا ہے۔[۲]

حصول علم:- آپ بچپن ہی سے بڑے علم دوست اور حصول علم حدیث کے پر شوق تھے، اس لئے بکثرت مشائخ اور اہل علم کے گھروں پر حاضری دیتے تھے۔

آپ نے علم کے حصول کیلئے مختلف مقامات کا سفر کیا، اور بڑے بڑے ائمہ سے ملاقات کی، ابو سعید سمعانی فرماتے ہیں کہ " طاف الدنیا و أقام بغداد"[۳]

آپ نے بغداد اور شام سے لے کر ماوراء النہر اور خراسان کا سفر کیا ہے۔

اساتذہ:- آپ نے بغداد میں قاضی ابو الطیب طبری، خطیب بغدادی، محمد بن محمد بن غیلان، عبید اللہ بن عمر بن شاہین اور اس طبقہ کے مشائخ سے روایت کیا ہے اور شام میں ابو القاسم حنائی اور انکے ہم طبقہ حضرات سے، مصر میں احمد بن قاسم بن میمون اور دیگر حضرات سے، نیز خراسان اور ماوراء النہر میں بڑے بڑے ائمہ سے ملاقات کی۔[۴]

آپ کی مجلس علم میں بڑے بڑے اہل علم جمع ہوتے تھے، شیرویہ دیلمی فرماتے ہیں کہ: "حضر مجلسه الكبار من شيوخنا و سمعوا منه."[۵]

تلامذہ:- آپ کے شاگردوں میں خود آپ کے شیخ خطیب بغدادی بھی ہیں، نیز نصر دمشقی، حسن بن احمد سمرقندی، محمد بن عبد الواحد دقاق، شجاع ابن فارس ذہلی وغیرہ آپ کے شاگردوں میں سے ہیں۔[۶]

علماء کی نگاہ میں:- امام دیلمی فرماتے ہیں کہ آپ بڑے اچھے حافظ فن حدیث

---

(۱) معجم البلدان ۲/۱۱۸

(۲) تذكرة الحفاظ : ۱۲۰۳/٤، سير أعلام النبلاء ۵۷۶/۱۸، ۵۷۳

(۳) سير أعلام النبلاء ۵۷۵/۱۸

(٤) سير أعلام النبلاء ۵۷۰/۱۸

(۵) سير أعلام النبلاء ۵۷۵/۱۸

(٦) مصدر سابق: ۵۷۰/۱۸

سے دلچسپی رکھنے والے تھے، آپ کے دور میں خطیب بغدادی کے بعد آپ ہی کا درجہ تھا، آپ کی خدمت میں بڑے بڑے اہل علم حاضر ہوئے اور علم حدیث حاصل کیا۔[۱]

ابو سعد سمعانی فرماتے ہیں: آپ بڑے سمجھدار عالم اور اچھے حافظ تھے، آپ کو خطیب ثانی کہا جاتا تھا، آپ ایک ماہر نحوی، اچھے شاعر اور انتہائی فصیح اللسان تھے، بغداد میں آپ کے زمانہ میں آپ جیسا کوئی نہ تھا، دنیا کا سفر کیا اور بغداد کو وطن بنایا۔[۲]

ابو طاہر سلفی اور شجاع ذہلی فرماتے ہیں کہ: آپ بڑے ذہین، سمجھ بوجھ رکھنے والے ثقہ حافظ تھے، علم حدیث میں کتابیں تصنیف کی ہیں۔[۳]

جرح و تعدیل میں آپ کا مقام:- فن جرح و تعدیل میں آپ کا بڑا اونچا مقام تھا، آپ نے خطیب بغدادی جیسے ماہر فن کی کتاب "المؤتلف" پر مواخذہ کیا ہے اور "مستمر الأوهام" کے نام سے ایک عظیم کتاب تحریر کی ہے۔[۴]

فن موتلف اور مختلف میں راویوں کے سلسلے میں وسیع معلومات، دقت اور مہارت کی ضرورت پڑتی ہے، آپ کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو راویوں کے بارے میں بھرپور معرفت حاصل تھی۔

علامہ ابن خلکان فرماتے ہیں کہ: امیر ابن ماکولا کو اس کتاب "الاکمال" کی موجودگی میں کسی اور فضیلت کی ضرورت نہیں، اس کا وجود آپ کی کثرت اطلاع ضبط واتقان پر دلالت کرتا ہے۔[۵]

وفات:- ایک مرتبہ آپ کرمان کی طرف جارہے تھے، آپ کے ساتھ کچھ آپ کے ترک نوجوان غلام تھے انہوں نے راستہ میں آپ کو قتل کردیا اور مال واسباب لے کر فرار ہوگئے، اس طرح سے آپ کا خون ضائع ہوگیا، یہ واقعہ، جرجان، خوزستان یا اہواز میں باختلاف روایت ۴۷۵ یا ۴۸۷ھ میں پیش آیا۔[۶]

---

(۱) مصدر سابق ۱۸/۵۷۰ (۲) مصدر سابق ۱۸/۵۷٤
(۳) تذكرة الحفاظ ٤/١٢٠٤ (٤) تذكرة الحفاظ ٤/١٢٠٤
(٥) شذرات الذهب ٣/٣٨٢
(٦) المستفاد من ذيل تاريخ بغداد ٢٠٢، سير أعلام النبلاء ١٨/٥٧٦

رحالۂ وقت علامہ ابن قیسرانی

(متوفی ۵۰۷ھ)

نام و نسب و ولادت:- آپ ابو الفضل محمد بن طاہر بن علی بن احمد مقدسی ہیں جو ابن قیسرانی کے نام سے معروف تھے، آپ کی ولادت بیت المقدس میں ۴۴۸ھ میں ہوئی، لیکن آپ نے "ہمدان" کو اپنا وطن بنایا۔

طلب علم:- ۴۶۰ھ میں علم حدیث کا سماع شروع کیا اور ۴۶۷ھ میں بغداد کیلئے رخت سفر باندھا، علم حدیث کی طلب کیلئے آپ نے بے شمار مقامات کا سفر کیا، جن میں حجاز، شام، بصرہ، کوفہ، بغداد، جزیرہ، نیساپور، ری، شیراز، قزوین، موصل وغیرہ شامل ہے۔

سفر کا نادر نمونہ:- ان سفروں میں علم کی طلب کے لئے آپ نے جو مشقتیں برداشت کی ہیں وہ قابل عبرت اور تاریخ محدثین میں نادر نمونہ ہیں، چلچلاتی دھوپ، کڑاکے کی سردی آپ کو طلب حدیث سے نہ روک سکی، سنت رسول ﷺ کا یہ متوالا طالب حدیث کیلئے سخت دھوپ اور گرمی میں، پشت پر کتب حدیث کا بنڈل، ہاتھ میں کاسۂ توکل لئے ہوئے ننگے پیر پیدل دوڑتا رہتا تھا، کبھی کسی کے سامنے دست سوال دراز نہ کیا جو کچھ خود بخود مل جاتا اسی پر زندگی کا دار و مدار تھا۔ بھوک و پیاس کی شدت اور سخت گرمی و تپش کی وجہ سے آپ کو دو مرتبہ خون کا پیشاب اتر گیا ایک مرتبہ مکہ مکرمہ جاتے ہوئے اور دوسری مرتبہ بغداد جاتے ہوئے۔ یہی وہ ہمارے اسلاف تھے جنہوں نے علم حدیث کی خاطر طرح طرح کی قربانیاں پیش کی ہیں جن کی نظیر تاریخ ادیان میں نہیں ملتی۔

آپ اپنے وقت کے عظیم محدث، ماہر انساب اور حافظ وقت تھے، علم حدیث کی طلب کیلئے آپ نے بکثرت سفر کیا جسکی وجہ سے آپکو رحالہ اور جوال کا خطاب دیا گیا۔

علماء کی شہادت:- علماء امت نے آپ کی علمی شخصیت کو سراہا ہے اور آپ کی بڑی تعریف کی ہے امام ابو الحسن کرخی نے آپ کے بارے میں یوں اظہار خیال کیا ہے:

"ماکان علی وجه الأرض له نظیر" اس سرزمین پر آپ جیسا کوئی نہیں تھا۔

صاحب تاریخ ہمدان نے آپ کو ثقہ، حافظ، صحیح و ضعیف حدیث کا عالم،

رجال حدیث کی معرفت رکھنے والا عظیم محدث اور بہترین خطاط بتایا ہے، تعصب و تنگ نظری، فضولیات سے دوری اور سنت نبوی ﷺ کی اتباع آپ کا مشغلہ تھا، سفر حدیث کیلئے سبک رفتاری میں معروف تھے۔

اگر آپ چاہتے تو چوبیس گھنٹے میں ساٹھ میل کا سفر کر لیتے۔ ابوزکریا ابن مندہ فرماتے ہیں کہ: ابن طاہر حافظ حدیث، صحیح عقیدہ اور اچھی سیرت و کردار کے حامل تھے، صحیح و ضعیف کی معرفت رکھنے والے، سنت نبوی ﷺ کے پیروکار تھے، آپ کی تصنیفات بے شمار ہیں۔

اگر جواز سماع (غناء) کے قائل نہ ہوتے تو آپ کی شخصیت متفق علیہ ہوتی۔

ابن عساکرؒ فرماتے ہیں کہ: آپ کی تصانیف بہت ہیں لیکن علم نحو میں آپ کمزور تھے اس لئے آپ کی کتابوں میں لحن اور وہم پایا جاتا ہے آپ کی تالیفات میں "رجال الصحیحین"، "أطراف کتب الستة" اور "المؤتلف والمختلف" مشہور ہیں۔

وفات:- بار بار حج و عمرہ کرنے کی عادت تھی، آخری مرتبہ حج سے واپس ہو رہے تھے کہ راستے میں (جب آپ بغداد پہنچے تو) وقت موعود آ پہنچا اور جمعہ کے دن ربیع الاول ۵۰۷ھ میں یہیں آپ کا انتقال ہو گیا۔ (۱)

علامہ زمان حافظ ابن عساکرؒ

(متوفی ۵۷۱ھ)

نام و نسب:- آپ کا نام نامی اسم گرامی ابوالقاسم علی بن حسن بن ھبۃ اللہ بن عبداللہ بن حسین دمشقی ہے۔ لیکن آپ ابن عساکر کے نام سے معروف ہیں جو غالباً آپ کے آباؤ اجداد میں سے کسی کا لقب یا نام تھا۔ (۲)

ولادت و حصول علم:- آپ کی ولادت محرم ۴۹۹ھ میں ہوئی۔ علم کے حصول کے لئے آپ نے مختلف بلاد اسلامیہ کا سفر کیا جس میں حجاز، اصبہان، نیساپور کے علاوہ شام و عراق کے مختلف مقامات شامل ہیں۔ (۳)

---

(۱) مزید معلومات کیلئے دیکھئے: تذکرۃ الحفاظ ۱۲۴۲/۴، شذرات الذھب ۱۸/۴، معجم المولفین ۹۸/۱۰

(۲) سیر أعلام النبلاء ۵۵۵/۲۰

(۳) سیر أعلام النبلاء ۵۵۵/۲۰-۵۵۶، معجم المؤلفین ۶۵/۷

اساتذہ:- زندگی کا ایک طویل حصہ علماء و مشائخ سے شرف تلمذ میں گذار دیا یہی وجہ ہے کہ آپ کے اساتذہ کی تعداد بہت ہے، آپ نے اپنے معجم میں جن شیوخ کے تراجم لکھے ہیں ان میں (۱۳۴۶) ایسے مشائخ ہیں جن سے آپ نے حدیث پڑھی ہے اور (۲۹۰) ایسے ہیں جنہوں نے آپ کو درس و تدریس کی اجازت دی ہے۔ اساتذہ کی اس طویل فہرست میں (۸۰) خواتین معلمات ہیں جن سے آپ نے علم حاصل کیا۔[۱]

تلامذہ:- سلطان نور الدین زنگی نے آپ کیلئے خصوصی طور سے ایک "دار حدیث" کی تعمیر کرائی تھی، زندگی بھر اس میں درس و تدریس دیتے رہے، جس سے آپ کے تلامذہ کی بہت بڑی تعداد تیار ہو گئی، جن میں حافظ ابو سعد سمعانی، آپ کے فرزند قاسم بن علی، حافظ عبد القادر رہاوی، امام ابو جعفر قرطبی، قاضی دمشق ابو القاسم بن حرستانی جیسے افراد شامل ہیں۔[۲]

علمی مقام:- اسطرح سے آپ علمی سرمایہ دار، عظیم الشان محدث، جلیل القدر مورخ، تقویٰ و پرہیزگاری کے پیکر اور بے مثال شخصیت بن گئے، درس و تدریس، تصنیف و تالیف آپ کی زندگی کا مشغلہ تھا، آپ اپنے وقت کے ہر ہر لمحہ کی قدر کرتے تھے کبھی ضائع نہیں ہونے دیتے، صوم و صلوٰۃ کی پابندی کا یہ عالم تھا کہ چالیس سال تک پنجوقتہ نماز میں بلا عذر کبھی صف اوّل سے پیچھے نہ رہے۔[۳]

علمی کارنامہ:- آپکی بے شمار تالیفات میں "تاریخ دمشق" ایک عظیم الشان علمی کارنامہ ہے جس پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے، یہ کتاب تقریباً ۸۰ جلدوں پر مشتمل ہے۔

حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ اس میں آٹھ سو اُجزاء ہیں جن میں سولہ ہزار ورق ہیں، اسکے علاوہ دیگر مختلف کتابیں ہیں۔ حافظ ذہبی نے "تذکرۃ الحفاظ" میں تقریباً چالیس کتابوں کا ذکر کیا ہے جس میں اکثر و بیشتر فن حدیث و تاریخ سے متعلق ہیں، فن رجال پر آپکی دو تالیف کا ذکر کیا ہے من وافقت کنیتہ کنیتہ زوجتہ اور شیوخ النبل[۴]

آپ جیسی شخصیت اسلامی تاریخ میں بہت کم پیدا ہوئی ہیں، آپ سے علم

---

(۱) سیر أعلام النبلاء ۲۰/۵۵٦

(۲) تذکرۃ الحفاظ ۱۳۲۹/٤، سیر أعلام النبلاء ۲۰/۵۵٦

(۳) تذکرۃ الحفاظ ۱۳۲/٤

(٤) سیر اعلام النبلاء ۲۰/۵۵٦

حاصل کرنا علماء اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ آپ سے ایسے بے شمار لوگوں نے علم حاصل کیا ہے جو آپ سے عمر میں بہت بڑے تھے۔

علماء کی شہادت:- علماء امت نے آپ کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے، نیز آپ کی ثقاہت امامت اور بصیرت کا اعتراف کیا ہے۔ آپ کے مختلف اساتذہ کا کہنا ہے کہ: "ابن عساکر جیسا عالم اور حافظ ہم نے نہیں دیکھا" بغداد میں آپ کی ذہانت و فطانت کی وجہ سے آپ کو "شعلہ نار" کہا جاتا تھا۔[1]

ابن نجارؒ فرماتے ہیں کہ: آپ اپنے زمانہ میں محدثین کے امام، علم و معرفت کے پیکر، حفظ واتقان کے علم بردار، ثقہ اور صاحب عقل وخرد تھے۔

امام نوویؒ کہتے ہیں آپ حافظ شام ہی نہیں بلکہ "حافظ الدنیا" تھے۔ امام سبکیؒ نے آپ کو امام "أهل الحديث في زمانه"، "ختام الجهابذة الحفاظ" اور "بحر لا ساحل له" کے خطاب سے نوازا ہے۔[2]

ابن نجار فرماتے ہیں کہ: آپ اپنے زمانہ کے محدثین کے امام تھے، حفظ و اتقان، معرفت تامہ و ثقاہت کا آپ پر خاتمہ تھا۔[3]

آپ کے بیٹے بہاء الدین فرماتے ہیں کہ: میرے والدؒ جماعت اور تلاوت کے بڑے پابند تھے، عام حالات میں ہر جمعہ کو اور رمضان میں یومیہ قرآن ختم کرتے تھے۔ شب بیداری، بکثرت ذکر و اذکار، نوافل میں مشغول رہتے، اپنے ہر گذرے ہوئے وقت کا محاسبہ کرتے۔[4]

وفات: بالآخر وقت موعود آپہنچا اور رجب ۵۷۱ھ میں دمشق میں آپ کا انتقال ہو گیا اور "باب صغیر" کے مقبرہ میں سپرد خاک کئے گئے۔[5]

نسابہ وقت حافظ ابو سعد سمعانی

(متوفی ۵۶۲ھ)

چھٹی صدی ہجری کی مشہور شخصیات میں جنہوں نے فن حدیث و رجال کی

---

(۱) طبقات الشافعية ٢٧٤/٤ (۲) مصدر سابق
(۳) تذكرة الحفاظ ١٣٣٣/٤ (٤) تذكرة الحفاظ ١٣٣١/٤
(٥) طبقات الشافعية ٢٧٧/٤

بڑی خدمت کی ہے ایک مشہور شخصیت علامہ سمعانی کی ہے۔ آپ کا خطاب تاج الاسلام تھا۔

نام و نسب:- نام ونسب اس طرح ہے: ابو سعد عبدالکریم بن محمد بن منصور بن محمد بن جعفر مروزی، سمعانی ہے، جو سمعان بن تمیم کا ایک ذیلی قبیلہ ہے آپ اسی کی جانب منسوب ہیں۔ (۱)

ولادت:- چھٹی صدی ہجری میں خراسان میں یہ ایک مشہور علمی قبیلہ تھا، جو اس زمانے میں شرعی و دینی قدوہ تصور کئے جاتے تھے۔ آپ کے والد، دادا اور چچا مشہور علماء و فقہا میں شمار کئے جاتے تھے۔ آپ اسی علمی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کی ولادت "مرو" میں ۵۰۶ھ میں ہوئی۔ (۲)

تعلیم و تربیت:- جب آپ کی عمر تقریباً ساڑھے تین سال کی ہوئی تو والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا جو آپ کو اپنے ساتھ اسی کمسنی میں علمی مجلسوں میں لے جایا کرتے تھے، اور سن رسیدہ علماء سے اجازت بھی دلواتے تھے، حتی کہ آپ کو تین ہی سال کی عمر میں لے کر نیساپور گئے تاکہ وہاں کے مشہور و قدیم علماء سے آپ کی ملاقات ہو جائے۔ (۳)

آپ کا خاندان آپ کی تربیت کے لئے کافی تھا پھر بھی آپ کے والد نے اپنے ساتھیوں میں سے ایک مشہور عالم امام ابو اسحٰق ابراہیم بن محمد مروزی (متوفی ۵۳۴ھ) کو آپ کی تعلیم و تربیت کیلئے وصیت کر گئے تھے۔ (۴)

علم کے لئے سفر:- علم حدیث حاصل کرنے کا ذوق تو آپ کو قدرتی طور سے ملا ہی تھا ماحول نے مزید سہولت بہم پہنچائی اور ہمت افزائی کی لیکن یہ طلب علم علاقے تک ہی محصور رہی اس لئے کہ آپ کے چچا سفر کیلئے اجازت نہیں دیتے تھے، جب آپ کی عمر تقریباً ۲۴ سال کی ہوئی اس وقت آپ نے ۵۳۰ھ میں نیساپور کا پہلا سفر کیا جس میں آپ کے ایک چچا ہمرکاب تھے، اور پھر اس علاقہ سے واپسی کے بعد مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک بے شمار شہروں کا سفر کیا جن میں خاص طور سے اصبہان، بغداد، دمشق، حرمین، بلاد ماوراء النہر وغیرہ شامل ہیں۔ (۵)

---

(۱) اللباب ۱۳۸/۲ (۲) سیر أعلام النبلاء ۴۵۶/۲۰
(۳) مقدمہ الإنساب از محقق ۱۵/۱ (۴) مقدمة الانساب از محقق ۲۰/۱
(۵) سیر أعلام النبلاء ۴۵۷/۲۰

اساتذہ:- امام ذہبی فرماتے ہیں کہ آپ نے جن شہروں کا سفر کیا اور جن مشائخ سے سنا ان کی کثرت نا قابل بیان ہے۔[۱]

آپ نے اپنی کتاب التحبیر، معجم الشیوخ اور معجم البلدان میں اپنے مشائخ کا ذکر کیا ہے، انکی تعداد حافظ ابن کثیر نے چار ہزار اور علامہ ابن نجار نے سات ہزار بتائی ہے۔[۲]

تلامذہ:- تلامذہ کی تعداد بھی بے شمار ہے ایک جم غفیر نے آپ سے استفادہ کیا ہے جن میں علامہ ابوالقاسم ابن عساکر، ابو محمد بن عساکر، ابوالفتوح، خفاف بغدادی، ابوالفضل ہروی آپ کے فرزند ارجمند ابو مظفر سمعانی کے علاوہ آپ کے مشائخ کی بھی ایک بڑی تعداد ہے۔

تالیفات:- سفر کے خاتمہ کے بعد آپ نے "مرو" میں قیام کیا اور تصنیف و تالیف، درس و تدریس، وعظ و نصیحت کو اپنا مشغلہ بنایا اور مختلف فنون میں کتابیں تالیف کی، حافظ ذہبی نے آپ کی (۴۷) مولفات اور علامہ یمانی (۵۳) کتابوں کا ذکر کیا ہے، جن میں التحبیر فی المعجم الکبیر، معجم البلدان، معجم الشیوخ، ذیل تاریخ بغداد، تاریخ مرو اور الأنساب خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔[۳]

علماء کی نگاہ میں:- علامہ ابن الجوزی نے آپ پر نقد کیا ہے اور تدلیس کا الزام لگایا ہے جو غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ علامہ ابن اثیر نے اس نقد کو بے بنیاد بتایا ہے اور ان کی پرزور تردید کی ہے۔[۴]

علامہ ابن عساکر نے آپ کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے اور فرمایا ہے کہ آپ بڑے بااخلاق ملنسار اور عفیف تھے آپ بلاشرکتِ غیر "فقیہ خراسان" تھے۔[۵]

حافظ ذہبی نے آپ کو محدث خراسان، علامہ زمان اور منفرد شخصیت کا خطاب دیا ہے۔[۶] علامہ سبکی نے آپ کو محدث مشرق قرار دیا ہے۔[۷]

---

(۱) سیر أعلام النبلاء ۴۵۷/۲۰ (۲) المستفاد من ذیل تاریخ بغداد ص۱۷۳

(۳) سیر أعلام النبلاء ۴۶۰/۲۰-۴۶۴، الأنساب مقدمه محقق

(۴) اللباب فی تهذیب الأنساب ۱۶/۱ (۵) سیر أعلام النبلاء ۴۶۰/۲۰

(۶) تذکرة الحفاظ ۱۳۱۶/۴، سیر أعلام النبلاء ۴۵۶/۲۰

(۷) طبقات الشافعیة ۲۵۹/۴

وفات:- بالآخر قضاء الٰہی کے مطابق ۵۷۶ھ میں مقام مرو میں آپ کی وفات ہوئی اور وہاں کے قبرستان "سنجداب" میں سپرد خاک کیے گئے۔(۱)

خطیب بے مثال علامہ ابن جوزی

(متوفی ۵۹۷ھ)

نام و نسب:- آپ کا نام و نسب جمال الدین ابو الفرج عبد الرحمٰن بن علی بن محمد بن علی بن عبید اللہ بن جمادی قرشی تمیمی ہے(۲) سلسلہ نسب خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیقؓ سے ملتا ہے جس کا تذکرہ خود علامہ ابن جوزی نے اپنی کتاب "لفتة الکبد" ص (۹۰) میں کیا ہے۔

لیکن آپ ابن الجوزی سے مشہور ہیں۔ جو آپ کے اُجداد میں جعفر بن عبداللہ تمیمی کا لقب پڑ گیا تھا۔ جسکے مختلف اسباب بتائے جاتے ہیں۔ علامہ ابن اثیرؒ فرماتے ہیں کہ یہ نسبت جوز (یعنی بادام) اور اسکی خرید و فروخت کی جانب ہے۔(۳) علامہ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ یہ بصرہ میں دریا کے دہانے کا نام ہے۔ کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ یہ بصرہ میں ایک محلّہ ہے یا بغداد میں ایک محلّہ ہے۔(۴)

ولادت:- آپ کی ولادت تقریباً ۵۱۰ھ میں بغداد میں ہوئی ہے۔

پرورش و تعلیم:- چونکہ آپ کے والد کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اٹھ گیا تھا، جب آپ کی عمر تین سال کی تھی، اس لئے آپ کی کفالت آپ کی والدہ نے کی، نیز آپ کی پرورش و پرداخت میں آپ کی چچی کا بڑا دخل رہا، فطری طور سے آپ کو کھیل کود سے نفرت، مجالس سے دوری، حصول علم سے شغف ہو گیا تھا، اسلئے بہت کم عمر میں آپ نے علم حاصل کرنا شروع کر دیا، جب آپ مکتب جانے کے لائق ہوئے تو آپ کی چچی نے آپ کو اپنے ماموں کی مسجد ابو الفضل بن ناصر بن شیخ ابو الفضل کے

---

(۱) طبقات الشافعية ٦٠/٤ (٢) البداية والنهاية ٢٧/١٣

(٣) اللباب فی تهذيب الانساب ٣٠٩/١

(٤) شذرات الذهب ٣٣/٤، البداية والنهاية ٢٧/١٣، نیز دیکھئے کتاب المنتظم لابن الجوزی دراسة فی منهجه و موارده ص ٤٢-٤٣، تالیف ڈاکٹر حسن عیسیٰ علی.

تلمذ و نگرانی میں داخل کردیا، جن کی تعلیم و تربیت کا آپ پر بہت گہرا اثر پڑا، انہوں نے آپ کی دلچسپی و شغف کو دیکھ کر آپ کی شخصیت کو بھانپ لیا، اس لئے بچپن ہی میں بڑے بڑے اساتذہ فن حدیث سے آپ نے درس حدیث کی اجازت حاصل کرلی۔

تعلیم کے سلسلہ میں آپ کی ایک خاص عادت یہ تھی کہ ہر شخص سے آپ علم حاصل کرنا پسند نہیں کرتے تھے بلکہ ہر فن میں جو مختار و معروف اشخاص ہوتے انہیں سے علم حاصل کرتے اس لئے اساتذہ کی تعداد بہت زیادہ نہیں، اپنے شیوخ کی فہرست میں آپ نے (۸۷) مشائخ کا ذکر کیا ہے۔

چونکہ آپ کی پیدائش و پرورش و جملہ تعلیم صرف بغداد میں ہوئی جو اس وقت عالم اسلام کا مرکز تھا، اس لئے آپ نے بغداد سے باہر جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی، جو اہل فن یہاں آتے تھے ان سے گھر بیٹھے علم حاصل کرلیتے تھے۔ اس لئے آپ کا علم خالص بغدادی ہے صرف آپ زیارت حرمین کیلئے بغداد سے باہر نکلے یا پھر آخری عمر میں جلاوطنی کی شکل میں واسط گئے۔

اساتذہ:- آپ کے مشہور اساتذہ میں قاضی ابو بکر انصاری، ابوالقاسم حریری، علی بن عبدالواحد دینوری، اسماعیل بن ابی صالح مؤذن وغیرہ ہیں۔

علمی مقام:- ذکاوت و فطانت کی وجہ سے آپ اپنے اساتذہ کے منظور نظر ہوا کرتے تھے، اس لئے بچپن ہی سے آپ کا ذکر خیر ہونے لگا، فن خطابت سے آپ کو بڑی دلچسپی تھی۔ آپ کے خطبے بہت بلیغ اور دل کو چھونے والے ہوا کرتے تھے جس کی وجہ سے آپ کی شہرت اور بڑھ گئی تھی۔ ابھی سترہ سال کی عمر تھی کہ "جامع منصور" میں درس دینا شروع کردیا۔

آپ مختلف فن میں مہارت رکھتے تھے اس لئے مشارک فی العلوم سمجھے جاتے ہیں، مفسر، محدث، فقیہ، ادیب، مورخ، واعظ سب کچھ تھے، ہر فن میں آپ کی تصانیف بھی ہیں۔

حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ "وله فى كل فن مشاركة لكنه كان فى التفسير من الأعيان، و فى الحديث من الحفاظ، و فى التاريخ من

المتوسعين، ولديه فقه كاف، أما السجع الوعظي فله فيه ملكة قوية"[1]

فن خطابت:- فن خطابت میں آپ کو جو ملکہ حاصل تھا وہ بہت دور دور تک نظر نہیں آتا، علامہ سیوطی فرماتے ہیں کہ وعظ و نصیحت میں آپ کو جو ملکہ ملا تھا وہ کسی کو نہیں دیا گیا۔[2] ابن جبیر فرماتے ہیں کہ آپ کی مجلس وعظ پر لوگ ایسے نچھاور ہوتے تھے جس طرح پروانے شمع پر ہوتے ہیں۔[3]

خلیفۂ وقت سے لے کر ایک عام آدمی اس میں شریک ہوتا تھا کبھی کبھی تعداد ایک ایک لاکھ تک پہنچ جاتی تھی۔ توبہ واستغفار، آہ وگریہ زاری کا سماں بندھ جاتا تھا، تقریباً ایک لاکھ افراد نے آپ کے ہاتھ پر توبہ کیا اور بیس ہزار افراد نے اسلام قبول کیا۔[4]

تلامذہ:- یہ وہ حضرات ہیں جنہوں نے مجلس درس کے علاوہ مجلس وعظ میں شرکت کیا، البتہ مجلس درس میں خصوصیت کے ساتھ شریک ہونے والے شاگردوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے ان میں کچھ نمایاں شخصیات میں آپ کے فرزند خورد محی الدین یوسف، آپ کے نواسے شمس الدین صاحب مرآۃ الزماں، حافظ عبدالغنی مقدسی، علامہ ابن قدامۃ حنبلی، ابن نجار، ابن عبدالدائم ہے۔[5]

اسلوب دعوت:- آپ کے ان داعیانہ اسلوب میں سے ایک مجلس کا نمونہ پیش خدمت ہے جس میں خلیفہ وقت موجود تھے فرماتے ہیں: يا أمير المؤمنين إن تكلمت خفت منك، وإن سكت خفت عليك، وأنا أقدم خوفي عليك على خوفي منك، فقول الناصح :"اتق الله" خير من قول القائل أنتم أهل بيت مغفور لكم[6] اے امیر المومنین اگر میں زبان کھولتا ہوں تو آپ سے خوف ہوتا

---

(۱) تذكرة الحفاظ ١٣٤٧/٤ نیز ملاحظہ ہو البداية والنهاية ٢٧/١٣

(۲) طبقات الحفاظ ص ٤٨٠

(۳) الرحلة لابن جبير ص ١٠٨ بحواله المنتظم لابن الجوزى دراسته في منهجه

(٤) مرآة الزمان سبط ابن الجوزى ٤٨٢/٨ بحواله المنتظم لابن الجوزى رزاسة منهجه

(٥) سير أعلام ٣٦٧/٢١.

(٦) سير اعلام النبلاء ٣٧٢/٢١ البداية والنهاية ٢٨/١٢

ہے، اور خاموش رہتا ہوں تو آپ پر خوف ہوتا ہے، میں آپ پر خوف کو آپ سے خوف پر مقدم کرتا ہوں، خیر خواہ کا یہ کہنا کہ اللہ سے ڈرو یہ بہتر ہے کہنے والوں کے اس قول سے کہ آپ حضرات تو بخشے بخشائے ہوئے ہیں۔

تصنیفات:- مجلس درس و وعظ کے علاوہ آپ گھر سے باہر نکلنے اور زیادہ خلط ملط ہونے کے عادی نہیں تھے، اکثر و بیشتر اوقات تالیف و تصنیف میں گذارتے تھے غالباً اس لئے بھی آپ کی تصنیفات کی تعداد زیادہ ہو گئی ہیں۔ آپ کی یہ تالیفات جن کی تعداد تین سو سے اوپر ہیں آپ کی علمی مہارت پر شاہد عدل ہیں۔

خود فن تاریخ میں "المنتظم" کے علاوہ **شذور العقود فی تاریخ العهود** اور **درة الأكليل** اور **تاريخ الضعفاء** اہم کتابیں ہیں۔

علماء کا تبصرہ:- خیال کیا جاتا ہے کہ ایک بار تحریر کرنے کے بعد دوبارہ اعادہ اور نظر ثانی کی عادت آپ کی نہیں تھی، اس وجہ سے آپ کی کتابوں میں اوہام اور غلطیاں پائی جاتی ہیں، جنکی بنیاد پر علماء کے نقد کا نشانہ بنے آپ اپنی حنبلیت میں بڑے متشدد تھے اس کے باوجود بھی صفات میں کبھی کبھی تاویل کیا ہے جس کی وجہ سے آپ کے ہم مشرب علماء بھی آپ سے کبیدہ خاطر رہتے تھے۔ خود پسندی اور ترفع کا دھبہ بھی آپ پر لگا ہوا ہے۔[1] جس کی ایک جھلک اس شعر میں نظر آتی ہے۔

لو كان هذا العلم شخصا ناطقا وسألته هل زار مثلي قال : لا [2]

اگر یہ علم بولنے والا انسان ہوتا اور تم اس سے سوال کرتے کہ مجھ جیسے شخص سے ملاقات کیا ہے تو فوراً کہتا کہ نہیں۔ اس کے باوجود بھی علماء نے آپ کی شخصیت اور کتابوں کو بڑی پسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے، آپ کو فخر عراق اور واعظ آفاق کا خطاب دیا گیا ہے۔ [3]

حافظ ذہبی فرماتے ہیں: **كان بحرا في التفسير، و علامة في السير و**

---

(۱) نواسخ القرآن مقدمہ محقق ص ۳: - ٤٤

(۲) البداية والنهاية ۲۸/۱۳ حالانکہ خود آپ نے اپنی کتاب صید الخاطر ص ۲۸۲ میں ان علماء پر تنقید کی ہے جو اپنے آپ کو دوسروں سے بالاتر و برتر سمجھتے ہیں، آپ نے فرمایا "والمؤمن الحق لا يزال يحتقر نفسه"

(۳) تذکرہ الحفاظ ۱۳٤۲/٤

التاريخ [1] آپ علم تفسیر کے سمندر، سیر اور تاریخ کی معرفت میں اللہ کی نشانی تھے۔

آپ کے شاگرد ابن دیثی فرماتے ہیں کہ: " إليه انتهت معرفة الحديث و علومه، والوقوف على صحيحه من سقيمه" [2] حدیث اور علم کی معرفت صحیح اور ضعیف پر اطلاع آپ پر ختم ہے۔

وفات:- بالآخر ۱۳ ار مضان المبارک ۵۹۷ھ کو وقت موعود آپہنچا اور آپ اپنے مالک حقیقی سے جا ملے، جس دن آپ کا انتقال ہوا اس دن بغداد کا بازار بند ہو گیا۔ [3]

آپ نے فن حدیث میں جو کتابیں تحریر کی تھیں ان میں استعمال شدہ قلموں کے تراشوں کو جمع کر کے رکھا تھا، اور یہ وصیت کی تھی کہ موت کے بعد مجھ کو غسل دینے کیلئے انہیں تراشوں سے پانی گرم کرنا چنانچہ ایسا ہی کیا گیا بلکہ وہ تراشے اس قدر تھے کہ پانی گرم ہو گیا اور کچھ تراشے بچ بھی گئے۔ [4] اسی پانی سے غسل دے کر ہمیشہ کیلئے بغداد میں آپ کے والد کے بغل میں امام احمد بن حنبل کے قریب سپرد خاک کر دیا گیا۔ جنازے میں ایک جم غفیر نے شرکت کی۔

حافظ عبدالغنی مقدسی

(متوفی ۶۰۰ھ)

نام و نسب:- آپ کا نام و نسب: ابو محمد عبدالغنی بن عبدالواحد بن سرور مقدسی جماعیلی ہے۔

ولادت:- آپ کی ولادت مقام جماعیل (جو فلسطین کے ایک گاؤں کا نام ہے) میں ہوئی، پرورش و پرداخت دمشق میں ہوئی، چونکہ جماعیل بیت المقدس سے قریب تھا اس لئے آپ کو مقدسی کہا جاتا ہے۔ [5]

علمی سفر:- علم حدیث کی تلاش کیلئے دمشق، اسکندریہ، بیت المقدس، بغداد،

---

(۱) سیر أعلام النبلاء ۳۶۷/۲۱ (۲) سابق مصدر ۳۷۳/۲۱

(۳) سابق حواله ۳۷۹/۲۱

(٤) المنتظم لابن الجوزی دراسة منهجه ص ۵۳، وفيات الأعيان . آپ کے ترجمہ کیلئے ملاحظہ ہو البداية والنهاية ۲۷/۱۳، سير اعلام النبلاء ۳۶۵/۲۱–۳۸۵، تذكرة الحفاظ ٤/ ۱۳٤۲–۱۳٤۸ شذرات الذهب ٤/۳۲۹، طبقات الحفاظ ص ٤۸۸.

(۵) معجم البلدان ۱۵۹/۲–۱۶۰، معجم المؤلفين ۲۷۵/۵

حران، مصر، موصل، ہمدان وغیرہ کا سفر کیا اور بڑے بڑے مشائخ: ابوزرعہ مقدسی، ابو طاہر سلفی، حافظ ابو موسی مدینی جیسے علماء سے علم حاصل کر کے فن حدیث میں مہارت تامہ حاصل کی۔

مبلغ علم:- آپ اپنے زمانہ کے عظیم محدث، بیباک مبلغ، صاحب جود و سخا اور عالم ربانی تھے جس کا اعتراف علماء امت نے کیا ہے، طلباء علوم نبوت آپ کی مجلس میں جوق در جوق حاضر ہوتے اور اپنی تشنگی علم کو بجھاتے تھے، آپ طلبہ کی بڑی عزت و تکریم کرتے اور ان کے اخراجات کا ہمیشہ خیال رکھتے۔(١)

علماء کی شہادت:- ضیاء الدین مقدسی فرماتے ہیں کہ: آپ سے جب کبھی کسی حدیث یا راوی کے بارے میں سوال کیا جاتا تو آپ برجستہ جواب دیتے حتی کہ روایت کی صحت اور عدم صحت، راوی کے حسب و نسب کا بھی پتہ دیتے، یقیناً آپ "أمیر المؤمنین فی الحدیث" تھے۔(٢)

صاحب "مرآۃ الجنان" کا کہنا ہے کہ: آپ علم حدیث میں یکتائے زمانہ تھے۔ آپ کی تالیفات بے شمار اور مختلف علوم میں ہیں۔

یاقوت حموی فرماتے ہیں، آپ نے علم حدیث میں بڑی اچھی اچھی اور مفید کتابیں تحریر فرمائی ہیں جن میں "الکمال فی معرفة الرجال" ہے جس کو بڑی اچھی طرح سے تحریر کیا ہے۔(٣)

امام ذہبی فرماتے ہیں کہ آپ کی بے شمار تالیفات ہیں جو مختلف علوم و فنون میں ہیں انہیں میں سے ایک کتاب "تبیین الاصابة لأوهام حصلت لأبی نعیم فی معرفة الصحابة" ہے جو آپ کی مہارت تامہ اور حفظ پر دال ہے۔(٤)

وفات:- جب کبھی آپ اصبہان کے بازار میں نکلتے تو آپ سے ملاقات کیلئے لوگ ٹوٹ پڑتے۔ ان ساری خوبیوں کے باوجود اہل بدعت اور متملقین امراء و سلاطین نے آپ کی زندگی کو مکدر کر دیا تھا۔ حتی کہ آپ کو شہر بدر ہونا پڑا اور اس بے وطنی میں ٦٠٠ھ میں مصر میں آپ کا انتقال ہو گیا۔

---

(١) سیر أعلام النبلاء ٢١/ ٤٥٠، شذرات الذهب ٤/ ٣٤٥
(٢) سیر أعلام النبلاء ٢١/ ٤٦٤ (٣) معجم البلدان ٢/ ١٦٠
(٤) سیر أعلام النبلاء ٢١/ ٤٤٨

وصیت:- آپ کے بیٹے ابو موسیٰ کہتے ہیں کہ میں نے آپ سے مرض الموت میں وصیت کرنے کیلئے کہا تو انہوں نے فرمایا کہ اللہ سے ڈرتے رہنا اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری کرتے رہنا، اتنے میں کچھ لوگ بغرض عیادت آپ کے پاس آگئے اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے تو آپ نے قدرے ناراضگی سے کہا کہ کیا بکواس کرتے ہیں۔ اللہ کو یاد کرو اور لاالٰہ الااللہ کہو جب وہ لوگ چلے گئے تو آپ کی زبان پر اللہ کا ذکر اور لاالٰہ الااللہ کا ورد جاری تھا۔ ایک شخص کو میں کتاب دینے کیلئے اٹھا واپس آیا تو آپ کی روح پرواز کر چکی تھی۔ (۱)

محدث کبیر ابن اثیر جزریؒ

(متوفی ۶۰۶ھ)

ابن اثیر کے نام سے تین شخصیتیں کافی مشہور و معروف ہیں:

۱- مبارک بن محمد مجد الدین ابو السعادات بن اثیرؒ (۵۵۴-۶۰۶)

۲- علی بن محمد عز الدین ابو الحسن ابن اثیرؒ (۵۵۵-۶۳۰)

۳- نصر بن محمد ضیاء الدین ابو الفتح ابن اثیرؒ (۵۵۸-۶۳۸)

ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی فن میں امام اور ماہر تصور کیا جاتا تھا، یہ تینوں شخصیتیں ایک غریب خاندان کے چشم و چراغ تھے اور "ایں خانہ ہمہ آفتاب است" کے مصداق تھے، یہ حضرات ایک دوسرے کے حقیقی بھائی تھے، جو افق عالم پر علمی ستارہ بن کر ابھرے۔

انہیں میں سے علامہ ابن اثیرؒ "انلباب في تهذيب الأنساب" کی شخصیت ہے جو اپنے زمانہ میں عظیم محدث، ماہر نساب اور بے مثال مؤرخ تھے، آپ کا نام نامی اسم گرامی اور زندگی کا مختصر تعارف اس طرح ہے:

نام و نسب:- عز الدین ابو الحسن علی بن محمد بن عبد الکریم بن عبد الواحد جزری شیبانی ہے۔ (۲)

نسبت:- شہر موصل کے کچھ فاصلے پر ایک مقام تھا جس کو ہلالی شکل میں تین طرف سے دریائے دجلہ گھیرے ہوئے تھی صرف ایک طرف خشکی کا حصہ تھا اسی خشکی کے حصے کو خندق بنا کر اسے جزیرہ بنالیا گیا جس کو جزیرہ ابن عمر کہا جاتا ہے، یاقوت

(۱) سير أعلام النبلاء ۲۱/۴۶۷ (۲) سير أعلام النبلاء ۲۲/۳۵۳-۳۵۴

حموی کے کہنے کے مطابق اس کو سب سے پہلے حسن بن عمر بن خطاب تغلبی نے آباد کیا تھا اسی مقام کی جانب یہ ابنائے ابن اثیر منسوب ہیں۔(۱)

علامہ ابن کثیرؒ کا خیال ہے کہ یہ جزیرہ ابن عمر یعنی امیر عبد العزیز بن عمر جو اہل برقعید کا ایک فرد تھا اس کی جانب منسوب ہے، نیز یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ ابن عمر (اوس اور کامل ابن عمر) بن اوس تغلبی کی جانب منسوب ہے۔(۲)

ولادت:- آپ کی ولادت اسی جزیرہ ابن عمر میں ۵۵۵ھ میں ہوئی۔

پرورش:- پھر آپکے والد آپکو لے کر موصل آگئے اور یہیں پر پرورش و پرداخت ہوئی۔

اساتذہ:- موصل، بغداد اور دمشق کے مشہور اہل علم سے استفادہ کیا جن میں ابو الفضل طوسی، مسلم بن علی السیحي، عبد المنعم بن کلیب، یعیش بن صدقہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

تلامذہ:- چونکہ آپ کا خانوادہ از روئے علم و فضل مشہور ہو چکا تھا اس لئے آپ کا دولت کدہ طلبہ اور اہل علم کی آماجگاہ بنا رہتا تھا۔ جن مشہور لوگوں نے آپ سے علم حاصل کیا ان میں سے حافظ ابن خلقان، ابن الدبیثی، ابو الفضل بن عساکر، مجد الدین بن العدیم، وابو سعید قضائی قابل ذکر ہیں۔

تالیفات:- آپ کی تالیفات میں اسماء صحابہ پر ایک عظیم کتاب "أسد الغابة فی معرفة الصحابة" اور فن تاریخ میں "الکامل فی التاریخ" انتہائی معروف اور مشہور کتابیں ہیں، آپ نے "موصل" کی تاریخ بھی تالیف کرنی شروع کی تھی لیکن وہ نامکمل رہ گئی، آپ کی انہیں تالیفات کی ایک نادر کڑی "اللباب فی تهذیب الأنساب" ہے جس کا تعارف آگے آرہا ہے۔(۳)

علماء کی نگاہ میں:- علامہ ابن خلکان فرماتے ہیں کہ موصل میں آپکا مکان اہل علم کا جمگھٹ تھا آپ انتہائی متواضع خوش اخلاق اور کامل فضیلت کے حامل تھے۔(۴)

وفات:- مختلف حالات سے دوچار ہونے کے بعد آپ نے آخر میں موصل کو اپنا

---

(۱) معجم البلدان ۱۳۸/۲ (۲) البدایة والنهایة ۱۳۳/۱۳

(۳) معجم المؤلفین ۲۲۸/۸-۲۲۹

(٤) سیر أعلام النبلاء ۳۵۳/۲۲، طبقات الشافعیة ۱۲۷/۵

مقام بنایا اور یہیں پر شعبان ۶۳۰ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ (۱)

آپ کے دوسرے بھائی جو آپ سے ایک سال بڑے تھے ان کا نام مبارک بن مجد الدین ابو السعادات ابن اثیر ہے۔ آپ کی ولادت جزیرہ ابن عمر میں ۵۵۴ھ میں ہوئی پھر وہاں سے موصل منتقل ہو گئے اور بغداد میں علم حاصل کیا آپ فن حدیث و فقہ اور لغت میں مہارت تامہ رکھتے تھے نیز بے مثال ادیب، ماہر انشا پرداز کی حیثیت سے بھی مشہور تھے، آپ کی علمی صلاحیت اور اسی مہارت اور انشاء پردازی کی وجہ سے موصل کے گورنر نے وزارت کی پیشکش کی تھی لیکن آپ نے اس کو علمی وقار کے خلاف سمجھا اسلئے قبول نہ کیا، قبل ازیں آپ سلطان قائماز کے میرمنشی رہ چکے تھے۔

آپکی تالیفات میں "النهاية في غريب الحديث" اور "جامع الأصول في أحاديث الرسول" کافی مشہور ہیں، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ غریب حدیث میں "النہایۃ" پر نہایہ ہے، اسطرح یہ کتاب اسم با مسمیٰ ہے تو بیجا نہ ہوگا۔ آپکی دیگر تالیفات میں "الانصاف في الجمع بين الكشف والكشاف، المختار في الأدعية والأذكار، شرح مسند الشافعيؒ" بھی ہیں۔ آپ کا انتقال شہر موصل ۶۰۶ھ میں ہوا۔ (۲)

آپ کے تیسرے بھائی جو آپ سے تین سال چھوٹے تھے ان کا نام نصر بن محمد ضیاء الدین ابو الفتح بن اثیر ہے۔ آپ کی ولادت بھی مذکورہ جزیرہ میں ۵۵۸ھ میں ہوئی، پرورش و پرداخت موصل میں ہوئی۔ آپ عظیم انشاء پرداز اور قابل فخر ادیب تھے، آپ سلطان صلاح الدین کے بیٹے افضل علی کے وزیر تھے، لیکن جب دمشق افضل کے ہاتھ سے نکل گیا تو آپ وہاں سے منتقل ہو گئے، کچھ دنوں تک ملک ظاہر حاکم حلب کے ساتھ تھے پھر وہاں سے موصل آگئے اور اس کو قیام گاہ بنایا۔

آپ کی تالیفات میں "المثل السائر في أدب الكاتب والشاعر، والمعاني المخترعة في صناعة الإنشاء و كنز البلاغة، الوشي المرقوم في حل المنظوم" وغیرہ ہیں۔ آپ کا انتقال بغداد میں ۶۳۸ھ میں ہوا۔ (۳)

---

(۱) البداية والنهاية ۱۳/۱۳۳

(۲) طبقات الشافعية ۵/۱۵۳، شذرات الذهب ۵/۲۲-۲۳، معجم المولفين ۸/۱۷٤

(۳) شذرات الذهب ۵/۱۸۷-۱۸۸، معجم المؤلفين ۱۳/۹۸

یاقوت حموی

(متوفی ۶۲۶ھ)

نام:- امام شہاب الدین ابو عبد اللہ یاقوت بن عبد اللہ (۲) حموی ہے۔ جب آپ کی شخصیت مشہور ہوئی تو آپ نے یاقوت نام بدل کر یعقوب کر لیا تھا۔

پیدائش:- تاریخ پیدائش کے بارے میں عام مورخین نے لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔ البتہ ابن خلکان فرماتے ہیں کہ آپ کی پیدائش بلاد روم میں ۵۷۴ھ میں ہوئی۔

پس منظر:- کم سنی میں ایک قیدی کی حیثیت سے بغداد لائے گئے اور وہیں فروخت ہو گئے، یہاں کے ایک تاجر عسکر حموی نے آپ کو خرید لیا، اسی وجہ سے آپ کو حموی کہا جاتا ہے۔

تعلیم:- عسکر حموی کو تجارتی کاروبار کیلئے ایک منشی کی ضرورت تھی اس لئے انہوں نے آپ کی تعلیم کا معقول انتظام کرا دیا، پھر کاروبار کے سلسلہ میں مختلف مقامات پر بھیجا جس سے آپ کو دنیا دیکھنے کا موقع ملا، پھر انہوں نے ان کو آزاد کر دیا، آزادی کے بعد آپ نے نسخ کتب کو اپنا پیشہ بنایا اس طرح سے مطالعہ کا اچھا موقع ملا، بعد میں کتابوں کی تجارت بھی شروع کر دی تھی۔

سکونت:- مقام خوارزم کو اپنا مستقر بنایا لیکن چنگیز خان نے اس کو ۶۱۶ھ میں تباہ کر دیا۔ وہاں سے بے سر و سامانی اور کسمپرسی کے عالم میں کسی صورت سے جان بچا کر موصل آئے وہاں سے دمشق پہنچے۔

عقیدہ:- خارجی مزاج کی کچھ کتابیں ان کے ہاتھ لگیں جن کے مطالعہ سے متاثر تھے بنا بریں حضرت علی کے بارے میں انحرافات پایا جاتا تھا جس کی وجہ سے عوام اور حکومت ہر جگہ مطعون تھے، زندگی کا آخری حصہ زیادہ تر بھاگنے اور چھپنے میں گذری۔

علمی مقام:- آپ بڑے اچھے انشاپرداز، ماہر جغرافی، ادیب اور شاعر تھے، آپ کی تصنیفات آپ کے علمی گہرائی پر شاہد عدل ہیں، معجم البلدان، معجم الادباء، معجم الشعراء کے علاوہ اور کتابیں بھی جو تاریخ اور ادب سے متعلق ہیں۔

---

(۱) بعض کتابوں میں کنیت ابو الدرر تحریر کی گئی ہے۔

آپ نے اپنی ساری کتابوں کو مسجد زیدی کیلئے وقف کر دیا تھا جس کا ذمہ دار علامہ ابن اثیر صاحب کامل کو بنادیا تھا۔

علامہ ابن خلکان کہتے ہیں کہ میں ان سے ملاقات تو نہیں کر سکا البتہ وفات کے بعد لوگوں سے ان کی تعریف سنی ہے۔

وفات:- آپ کا انتقال حلب میں ۶۲۶ھ میں ہوا۔[۲]

محدث شام حافظ جمال الدین مزی

(متوفی ۷۴۲ھ)

ساتویں صدی ہجری کا دمشق سقوط بغداد کے بعد سیاسی اور دینی اعتبار سے عالم اسلام کا مرکز بن چکا تھا، فتنہ تاتار کے اس سرزمین کو تار تار کرنے کے بعد دمشق علماء اور اہل علم کا مرکز بن گیا تھا، یہاں کے بڑے بڑے علمی مراکز اور دور حدیث و قرآن سے جو علمی مہک پھوٹ رہی تھی، اس نے عالم اسلام کو اپنے علم و ثقافت سے معطر کرر کھا تھا۔

اسی پر بہار دور میں جس میں عجوبہ زمانہ علامہ ابن تیمیہؒ، علامہ ابن دقیقؒ، علامہ ذہبیؒ، امام برزالیؒ وغیرہ پائے جاتے تھے آپ کی ولادت باسعادت ظاہر حلب میں ربیع الاول ۶۵۴ھ میں ہوئی۔

نام و نسب:- آپ محدث شام جمال الدین ابو حجاج یوسف بن زکی مزی، دمشقی ہیں۔[۲] آپ کی پرورش و پرداخت دمشق کے مضافاتی مقام ''مزہ'' میں ہوئی جو دمشق کے جنوبی باغات کے درمیان واقع ہے یہیں پر صحابی رسول ﷺ حضرت دحیہ کلبی کی قبر بھی ہے۔[۳] یہیں پر آپ کا خاندان عرب سے آکر آباد ہوا تھا۔

تعلیم:- سب سے پہلے آپ نے قرآن کریم کا حفظ کیا پھر فقہ شافعی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، لیکن چونکہ آپ کا گھرانہ کوئی علمی شہرت یافتہ گھرانہ نہ تھا اس لئے کوئی ایسا فرد نہیں تھا جو آپ کی رہنمائی کرتا نتیجتاً آپ نے مزید علم حاصل کرنے کیلئے کافی

---

(۱) سیر أعلام ۲۲/۳۱۳-۳۱۴، شذرات الذهب ۵/۱۲۱، معجم المولفین ۱۳/۱۷۸-۱۷۹، مقدمه کتاب المعجم البلدان.

(۲) تذکرة الحفاظ ٤/١٤٩٨، دیکھئے مقدمة تهذیب الکمال ١/١٣

(۳) تذکرة الحفاظ ٤/١٤٩٨، معجم البلدان ٥/١٢٢

عرصہ (تقریباً ۲ سال) کے بعد توجہ کی جو آپ کی فطری خواہش اور ذوق طلب پر غماز ہے۔ سب سے پہلے ۶۷۵ھ میں آپ نے درس حدیث کی ابتدا کی، آپ کے سب سے پہلے استاد حدیث مسند وقت زین الدین احمد بن سلامہ دمشقی حنبلی ہیں، جو مشہور عالم اور عظیم محدث تھے۔ پھر مزید علمی سرمایہ جمع کرنے کیلئے آپ نے رات و دن ایک کر کے تقریباً ایک ہزار مشائخ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔(۱) جس کیلئے مختلف اور مشہور شہروں میں جاکر چندہ اساتذہ سے علم حاصل کیا۔

اساتذہ:- ان اساتذہ میں ابن سلامۃ کے علاوہ ابن علان، امام نووی شرف الدین دمیاطی، ابن بلبان، ابن دقیق العید، ابن سید الناس قابل ذکر ہیں۔ اس طرح آپ نے اپنے اصحاب میں سے امام ابن تیمیہؒ، امام برزالی، ذہبیؒ وغیرہ سے بھی استفادہ کیا۔

آپ کا اپنے ہم وطن و ہم عصر علماء میں سے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ (متوفی ۷۲۸ھ)، امام برزالی (متوفی ۷۳۹ھ)، امام ذہبی (متوفی ۷۴۸ھ) سے بڑا گہرا ربط تھا۔ خصوصاً شیخ الاسلام ابن تیمیہ سے آپ بہت قریب تھے، وہ آپ کے علم پر اعتماد اور آپ کی بڑی قدر کرتے تھے۔(۲)

سلفی فکر آپ نے انہیں سے لیا تھا اور اسی سلفیت کے جرم میں قید و بند کی مشقتیں بھی برداشت کرنی پڑیں، ایک مرتبہ علامہ ابن تیمیہؒ نے ان کو زبردستی جیل سے نکال لیا تھا، یہ دونوں درس حدیث کیلئے عموماً ایک دوسرے کے ساتھ جاتے تھے۔(۳)

علمی مقام:- چند ہی سالوں میں آپ مشہور عالم اور عظیم محدث بن گئے جسکا چرچا دور دور تک ہونے لگا، علماء عصر سے مناظرات و مناقشات ہونے لگے اور جب ان کی عظیم تالیف تہذیب الکمال منظر عام پر آئی تو اس نے آپکی شہرت میں چار چاند لگادیا۔

علمی مناصب شہرت، صلاحیت اور مہارت فن کی وجہ سے آپکو دمشق کے مشہور علمی مرکز ''دار الحدیث اشرفیہ'' کا ۷۱۸ھ میں شیخ الحدیث مقرر کیا گیا۔ حالانکہ اس کی مخالفت بڑے بڑے اشاعرہ، اصحاب رسوخ و نفوذ نے کی، اس لئے کہ آپ ابن تیمیہؒ کے مؤید تھے، لیکن پھر بھی کسی کو ہٹانے کی جرأت نہ ہوئی۔ تقی الدین سبکی کو جو دمشق کے

---

(۱) الدرر الكامنة ٤/٤٥٧، مقدمة تهذيب الكمال ١/١٤

(۲) مقدمة تهذيب الكمال ١/١٨ . (۳) مقدمة تهذيب الكمال ١/٢١-٢٢

چیف جسٹس تھے، عشاء کے بعد ایک مشہور اشعری عالم نے انہیں دار الحدیث سے برطرف کرنے کا مشورہ دیا، وہ فرماتے ہیں کہ جب میں نے ان کی بات سنی تو میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے، اور میں حواس باختہ ہوگیا اور اپنے دل میں کہا کہ یہ تو امام المحدثین ہیں خدا کی قسم اگر امام دار قطنی بھی زندہ ہوتے تو ان کی مسند درس پر بیٹھنے میں شرم محسوس کرتے، کون یہ کہنے کی جرأت کرسکتا ہے کہ مزی دار الحدیث کے لائق نہیں، اور اسی دن سے انہوں نے عشاء کے بعد لوگوں سے ملنا بند کردیا۔(١)

اور جب ابن تیمیہ کو اس کی خبر ملی تو انہوں نے برجستہ کہا کہ جب سے یہ دار الحدیث قائم ہوا ہے اس کے واقف کے شرط پر آج تک اگر کوئی پورا اترا ہے تو وہ امام مزی ہیں، حالانکہ علامہ ابن الصلاح اور امام نووی جیسے لوگ اسکے شیخ رہ چکے تھے۔(٢)

اسی طرح سے دار الحدیث حمصیہ اور دار الحدیث النوریہ کے بھی آخری دم تک شیخ الحدیث رہے۔(٣)

شاگرد:- آپ نے تقریباً پچاس سال کی مدت درس و تدریس، تصنیف و تالیف، دعوت و تبلیغ میں صرف کردیا، جو آپ کو ناپسند کرتے تھے وہ بھی آپ کی علمی صلاحیت کے قائل تھے اور آپ سے علم حاصل کرنا باعث فخر سمجھتے تھے۔ اس طویل مدت میں آپ سے جن لوگوں نے علم حاصل کیا ان کا شمار ممکن نہیں اس زمانے میں دمشق اور اس کے قرب وجوار کے علماء آپ ہی کے شاگرد ہوا کرتے تھے، آپ کے ہم عمر، بڑے بوڑھے اور بچے سبھوں نے آپ سے علم حاصل کیا ان میں کچھ نامور شخصیات یہ ہیں جن میں آپ کے کچھ اساتذہ بھی شامل ہیں مثلاً ابن سید الناس، ابن تیمیہ، تقی الدین سبکی وغیرہ، نیز آپ کے نامور تلامذہ میں امام ذہبی، امام برزالی، ابن عبد الهادی، صلاح الدین علائی، علاء الدین مغلطائی، ابن رافع سلامی اور آپ کے داماد علامہ ابن کثیر جیسے اہل علم و فضل شامل ہیں۔(٤)

علماء کی شہادت:- آپکی علمی صلاحیت و معرفت فن، تقویٰ و پرہیزگاری، تواضع و خاکساری کی شہادت علماء وقت نے دی ہے، آپ کے استاد ابن سید الناس

---

(١) طبقات الشافعية السبكى ٦/٢٥٢-٢٥٣ (٢) مقدمة تهذيب الكمال ١/٢٢
(٣) مقدمة تهذيب الكمال ١/٢٨-٢٩
(٤) الدرالكامنة ٤/٤٥٩، مقدمة تهذيب الكمال ١/٢٩-٣٠

فرماتے ہیں کہ دمشق کے جن اہل علم سے میری ملاقات ہوئی ان میں امام ابو حجاج مزی قابل ذکر ہیں جو اپنے ہم عصروں میں متقدم اور متاخر سب پر فوقیت لے گئے وہ اس علم کے بحر ناپیدا کنار ہیں۔(۱)

امام ذہبی فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی پوری زندگی میں جتنے لوگوں سے ملاقات کی ان میں آپ جیسا حافظ کسی کو نہیں دیکھا، آپ انتہائی بااخلاق کم سخن صبر کرنے والے سنجیدہ اور متواضع شخص تھے۔(۲)

صلاح الدین صفدی نے آپ کو حافظ عصر شیخ اہل زمانہ، امام المحد ثین اور خاتمۃ الحفاظ کے نام سے موصوف کیا ہے۔(۳)

فن جرح و تعدیل میں آپ کا مقام :- فن جرح و تعدیل میں آپ کا جو مقام ہے وہ روز روشن کی طرح عیاں ہے آپ اس فن کے امام اور اس میدان کے شہسوار تھے۔ علامہ ابن سید الناس فرماتے ہیں کہ تراجم رجال کے سب سے بڑے حافظ، راویوں کے بارے میں عرب و عجم میں سب سے زیادہ معلومات رکھنے والے امام مزی ہیں۔(۴)

امام ذہبی جیسے اہل فن نے یہ علم آپ ہی سے حاصل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ جو کچھ میں نے سیکھا وہ اپنے معیار پر سیکھا آپ کے معیار کا علم حاصل نہ کر سکا، نیز فرماتے ہیں کہ آپ خاتمۂ حفاظ، اسانید و متون کے ناقد اور ہماری مشکلات و پریشانیوں کے حل کنندہ تھے۔(۵)

امام صفدی فرماتے ہیں کہ: ابن حبان کے بعد آپ جیسا عربی داں پیدا نہیں ہوا، محد ثین و رجال حدیث کے تراجم کی آپ کو بڑی گہری معرفت تھی۔ امراء و سلاطین کے تراجم سے دلچسپی نہیں تھی، علم حدیث کے بارے میں ایسی فائدہ مند چیزیں آپ کے پاس تھیں جو کسی کتاب میں نہیں ملتی تھیں۔(۶)

امام ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ: آپ امام وقت اور یکتائے زمانہ تھے، معرفت رجال کے بارے میں تو کیا کہنا آپ اس فن کے سپہ سالار تھے، آپ جیسی شخصیت نگاہوں

---

(۱) الدر الکامنة ٤/٤٥٩ (۲) تذکرة الحفاظ ٤/١٤٩٩، و مقدمة تهذيب الكمال ١/٢٩
(۳) مقدمة تهذيب الكمال ١/٢٩-٣٠ (٤) الدر الكامنة ٤/٤٥٩
(٥) الدر الكامنة ٤/٤٦٠ (٦) الدر الكامنة ٤/٥٩

سے دیکھا ہی نہیں۔[۱]

امام سبکی فرماتے ہیں کہ: استاذ محترم امام مزی اپنے زمانہ کے عجوبہ تھے آپکو دن بھر حدیثیں سنائی جاتیں جن میں مضطرب طریقے، مختلف اسانید مشکل اسماء، پر پیچ معانی سب کچھ ہوتے تھے لیکن آپ ان ساری چیزوں کا حل بڑے دلکش انداز میں پیش کرتے تھے جس میں کوئی غلطی اور ابہام نہیں پایا جاتا تھا، دنیا میں محدثین کی سرداری آپ پر ختم تھی۔[۲]

اور حقیقت یہ ہے کہ امام مزیؒ تنہا ایک امت تھے انہوں نے ایسا علمی کارنامہ انجام دیا ہے جس کو ایک جماعت بھی مل کر نہیں کر سکتی۔ آپ اس امت کے محسن اعظم ہیں حدیث کی کتابوں میں صحیحین اور سنن اربعہ جن پر اسلام کا دار و مدار ہے آپ نے ان کی وہ خدمت کی ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔ آپ نے ان کتب حدیث کی دو طرفہ خدمت کی ہے: از روئے متن، واز روئے سند، کتب ستہ میں موجود حدیثوں کو طرفِ حدیث پر مرتب کر کے ہر صحابی کی روایت کو یکجا کر دیا ہے نیز ان کتابوں میں ان کے وجود و مقام کا پتہ بھی بتا دیا ہے اور ان کے رجال کو بڑے نرالے ڈھنگ سے جمع کیا ہے جس کا ذکر آئندہ آئے گا۔

وفات:- علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ ۷۴۲ھ میں جمعہ کے دن نماز کے وقت تک درس حدیث دیتے رہے، پھر نماز کی تیاری کیلئے گھر میں داخل ہوئے تو پیٹ میں شدید مروڑ محسوس کیا اور اتنی شدت اختیار کر گیا کہ نماز جمعہ میں شریک نہ ہو سکے۔ یہ طاعون کی بیماری تھی جو آپ کو لاحق ہو چکی تھی۔ دوسرے دن جب ظہر کی اذان ہو رہی تھی اس وقت آپ کی ذہنی کیفیت بدلنے لگی، آپ کی بیٹی (جو ابن کثیر کی زوجہ تھیں) نے کہا ابو اذان ہو گئی ہے اس پریشانی اور تکلیف کے عالم میں تیمم کر کے نماز ادا کیا پھر آیت الکرسی تلاوت کرنے لگے یہاں تک کہ آپ کی زبان ست ہو گئی اور روح پرواز کر گئی۔

دوسرے دن جامع اُموی اور پھر باب نصر کے باہر ایک بہت بڑے مجمع نے نماز جنازہ ادا کی جس میں امراء و حکام و اہل علم سب شریک تھے نماز جنازہ تقی الدین سبکی نے پڑھائی اور مقابر صوفیہ میں اپنی اہلیہ اور امام ابن تیمیہ کی بغل میں سپرد خاک کر دیئے گئے۔[۳]

---

(۱) تذكرة الحفاظ ١٤٩٨/٤ (۲) طبقات الشافعية ٢٥٢/٦

(۳) البداية والنهاية ١٦٦/١٤-١٦٧

مؤرخ اسلام امام ابو عبداللہ ذہبی

(متوفی ۷۴۸ھ)

ساتویں صدی ہجری کا دور تھا، دمشق کو علمی مرکز کی حیثیت حاصل تھی، اسوقت یہاں پر بڑے بڑے علمی مراکز، دور حدیث اور ائمہ فن پائے جاتے تھے۔ یہ عصر، علمی شخصیات کا سنہرا عصر تھا، ابن تیمیہ، ابن قیم، امام مزی، ابن دقیق العید، ابن شہبہ سبکیؒ سب اسی دور میں موجود تھے۔ مسلکی تعصب عقائدی نزاع اور علمی سرگرمی بھی عروج پر تھی۔ امام ذہبی اسی دور کے ایک نامور فرزند ہیں جن کی مثال دور دور تک نہیں ملتی۔ (۱)

ولادت:- اسی زمانے میں آپکی ولادت باسعادت ربیع الاول ۶۷۳ھ میں دمشق میں ہوئی۔ (۲)

نام و نسب:- آپ کا نام محمد بن احمد بن عثمان بن قیماز بن عبداللہ ذہبی فارقی ہے، کنیت ابو عبداللہ اور لقب شمس الدین ہے۔ (۳) آپ اصلاً ترکمانی ہیں، نسبت ولاء بنی تیم کی طرف ہے، اس کا تذکرہ خود امام ذہبیؒ نے تاریخ اسلام کی نویں جلد کے سرورق پر کیا ہے۔ (۴) چونکہ آپ کے والد سوناری کا کام کرتے تھے اس لئے آپ ابن الذہبیؒ کے نام سے مشہور ہوئے، غالباً آپ نے بھی ابتداء میں یہی پیشہ اختیار کیا تھا اس لئے آپ کی نسبت آپ کے عصر میں ذہبی ہو گئی۔ (۵)

تعلیم و تربیت:- آپ کی پرورش دیندار علمی خانوادہ میں ہوئی اس لئے تعلیم کا سلسلہ مناسب وقت میں شروع ہوا۔ اس خانوادے کی علمی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ جس سال آپ کی پیدائش ہوئی اسی سال آپ کے رضاعی بھائی نے مختلف علماء سے آپ کیلئے سند اجازت لے لی، جو آئندہ زندگی میں بہت مفید ثابت ہوئی۔ (۶)

ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۶۹۰ھ میں جب آپ کی عمر اٹھارہ سال کی تھی اس وقت علم حدیث کے حصول کی طرف توجہ مبذول کی اور انتہائی دلجمعی اور لگن

---

(۱) تقديم سير أعلام النبلاء ۱/۱۲-۱۳، للدكتور بشار عواد معروف

(۲) ذيل تذكرة الحفاظ ص ۳٤، البدر الطالع بمحاسن من بعد القرآن السابع ۲/۱۱۰

(۳) ذيل تذكرة الحفاظ ص ۲٤ (٤) تقديم على سير أعلام النبلاء ۱/۱۵

(۵) اللباب فى تهذيب الانساب ۱/۵۳۵ و تقديم سير أعلام النبلاء ۱/۱٦

(٦) الدر الكامنة فى أعيان المئة الثامنة ۳/۳۳٦

سے اس میں لگ گئے حتی کہ اس میں مہارت تامہ حاصل کرلی۔[1] علم الدین برزالی نے جو آپ کے خصوصی اساتذہ میں ہیں، جب امام ذہبیؒ کا خط دیکھا تو بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ تمہارا خط تو محدثین کے خطوں سے ملتا جلتا ہے، ان کے اس جملہ نے محدثین سے محبت اور ان کے طریق کار کو اپنانے کا شوق پیدا کر دیا اور اس قدر طلب حدیث پر گرویدہ ہو گئے کہ ساری زندگی اس میں وقف کر دی۔[2] مسلکی تعصب کے اس دور میں فکری تبدیلی نے علامہ ابن تیمیہ، امام مزی، امام برزالی سے بہت قریب کر دیا، اور یہ چار یار ایک دوسرے کے استاذ و شاگرد بن گئے، رفاقت کا احساس اس قدر غالب تھا کہ ایک دوسرے کیلئے قید و بند اور طوق سلاسل کا بھی خوف درمیان میں حائل نہیں ہو پاتا۔ چنانچہ ایک مرتبہ امام مزی کو کسی وجہ سے جیل جانا پڑا، علامہ ابن تیمیہ کو خبر لگی انہوں نے جاکر زبردستی جیل سے ان کو نکال لیا۔[3] یہ ارتباط علمی موشگافیوں کی وجہ سے آپس میں کبھی کبھی تلخیوں کے باوجود تھا۔

علماء کی یہ جرأت رندانہ موجودہ دور کے علماء کیلئے قابل عبرت ہے جو اپنے ہی دوست واحباب اور ہم درسوں سے دست بگریباں رہتے ہیں۔

امام ذہبیؒ نے اپنی ساری زندگی علم حدیث کیلئے وقف کر دی تھی کتب حدیث کا بہت بڑا ذخیرہ زیر درس آیا حتی کہ اجزاء حدیثیہ تک کو نہیں چھوڑا۔ امام سبکیؒ فرماتے ہیں کہ: برابر اس فن کی خدمت میں لگے رہے یہاں تک کہ آپکے قدم اس میں جم گئے رات و دن مشقت کی لیکن آپ کے زبان و قلم نہیں تھکے اور آپکی شخصیت ضرب المثل ہو گئی۔[4]

علمی سفر:- مشائخ و مشیخات کی جم غفیر سے استفادہ کیا، اس کیلئے شام، مصر اور حجاز کے مختلف مقامات اور علمی مراکز کا سفر کیا۔[5]

ابتداء میں آپ کے والد سفر کیلئے اجازت نہیں دیتے تھے لیکن جب آپکی عمر تقریباً بیس سال کی ہوئی تو مختصر مدت کیلئے اجازت دینا شروع کیا جو زیادہ سے زیادہ چار ماہ کی مدت تھی اور اس میں بھی کسی کو آپ کیساتھ لگا دیتے یا خود ساتھ ہو لیتے،[6] لیکن

---

(۲) الدر رالکامنة ۳/۳۲۳ ۳/۳۲۳، و سیر أعلام النبلاء ۱/ ۳٦

(۲) البدر الطالع ۳/ ۱۱۰، ذیل تذکرة الحفاظ ص ۳٤۸

(۳) البدایة والنهایة ۱٤/ ۳۳ — (٤) طبقات الشافعیة للسبکی ٥/۲۱٦-۲۱۷

(٥) سیر أعلام النبلاء ۱/ ۲٤ — (٦) سیر أعلام النبلاء ۱/ ۲٥

عمر کی پختگی کے بعد یہ پابندی ختم ہوگئی اور والد کے انتقال کے بعد بالکل فارغ ہوگئے۔

اساتذہ:- آپ کے اساتذہ کی ایک بڑی تعداد ہے جس کا ذکر خود امام ذہبی نے اپنے مختلف معاجم شیوخ میں کیا ہے، علامہ حسینی فرماتے ہیں کہ صرف معجم کبیر میں آپ کے اساتذہ کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ ہے۔[1]

آپ کے ان اساتذہ میں امام برزالی، ابن دقیق العید، علامہ ابن تیمیہ ابن ظاہر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

علمی مناصب اور تلامذہ:- امام ذہبی کی شہرت، علو اسناد اور مختلف علوم و فنون پر کتابوں کی وجہ سے طلباء علوم نبوت آپ کی جانب متوجہ ہوئے حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ "رغب الناس في تواليفه و رحلوا إليه بسببها و تداولوها قرأة و نسخا و سماعا"[2] آپ کی کتابوں میں لوگوں کو رغبت تھی، جن کیلئے آپ کی طرف انہوں نے سفر کیا اور اس کو پڑھنے، لکھنے اور سننے کیلئے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

اور آپکو جو علمی شہرت حاصل ہوئی اسکے نتیجہ میں اپنے دور کے بڑے بڑے علمی مراکز اور دار حدیث میں منصب شیخ الحدیث پر فائز رہے دمشق میں امّ صالح کے نام کی جو عظیم درسگاہ حدیث تھی، ۷۱۸ھ میں اس کے شیخ الحدیث متعین کئے گئے اور اسی کو اپنا مسکن بنایا، اسکے ساتھ ساتھ ۷۲۹ھ میں دار الحدیث ظاہریہ ۷۳۹ھ میں دار الحدیث نفیسیہ اور دار الحدیث والقرن تنکیزیہ کے مشیخۃ الحدیث رہے، جس وقت آپ کا انتقال ہوا اس وقت آپ پانچ مراکز علمیہ کے بیک وقت مشیخۃ الحدیث تھے۔[3] اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپکے شاگردوں کا شمار ممکن نہیں بلکہ ایک پوری خلقت نے آپ سے استفادہ کیا ہے آپکے شاگرد علامہ حسینی فرماتے ہیں کہ "حمل عنه الكتاب والسنة خلائق" آپ سے کتاب و سنت کا علم ایک خلقت نے حاصل کیا ہے[4]

قاضی ابن شہبۃ فرماتے ہیں کہ بڑے بڑے حفاظ نے آپ کے یہاں سے فراغت حاصل کی علامہ سبکی، برزالی، علائی، ابن کثیر، ابن رافع، ابن رجبؒ اور آپ کے مشائخ اور ہم عصروں میں سے ایک مخلوق نے آپ سے استفادہ کیا۔[5]

---

(۱) ذیل تذکرۃ الحفاظ ص ۳۵

(۲) الدر الکامنۃ ۳/۳۳۷

(۳) ذیل تذکرۃ ص ۳۷، و سیر أعلام النبلاء ۱/۴۲

(۴) ذیل تذکرۃ الحفاظ ص ۳۶

(۵) سیر اعلام النبلاء ۱/۶۹

تالیفات:- آپ کی تالیفات کو دیکھ کر آدمی انگشت بدنداں ہو جاتا ہے، اور یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کیا یہ کسی انسان کے بس کا کام ہے؟ لیکن واقعہ یہی ہے (ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء) حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ آپ نے فن حدیث میں مہارت حاصل کی اور بہت ساری مفید کتابیں تحریر کیں یہاں تک کہ اپنے زمانہ کے سب سے زیادہ صاحب تالیف بن گئے۔[1]

اگر آپ کی صرف ایک تالیف "تاریخ اسلام" ہوتی جو ایک علمی شاہکار اور تاریخی انسائیکلوپیڈیا ہے تو وہی بس تھی چہ جائے کہ اس طرح کی دیگر بہت ساری شاہکار کتابیں ہیں۔

اسی سے ماخوذ ایک کتاب "سير أعلام النبلاء" ہے جو لائبریری کے ایک حصہ پر اپنی چمک ودمک اور ہیبت سے امام ذہبی کی شخصیت کی عکاسی کرتی ہے جو قریب قریب تاریخ اسلام کے مساوی ہے،[2] نیز العبر، دول الاسلام، طبقات القراء، تذكرة الحفاظ اسی تاریخ سے ماخوذ ہیں۔

جن مؤرخین نے امام ذہبی کی سیرت کو قلمبند کیا ہے انہوں نے آپ کی تالیفات کا تذکرہ اور ان پر تبصرہ بھی کیا ہے، ڈاکٹر بشار عواد نے اپنی تالیف الذهبي و منهجه في كتابه تاريخ الاسلام اورسير أعلام النبلاء کے تقدیم میں ان کی تعداد دو سو پندرہ بتائی ہے۔[3]

امام شوکانی فرماتے ہیں کہ: "جميع مصنفاته مقبولة مرغوب فيها، رحل الناس لأجلها" آپ کی ساری تالیفات مقبول اور پسندیدہ ہیں، ان کیلئے لوگوں نے سفر کیا۔[4]

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ: لوگ آپ کی کتابوں کی طرف مائل ہوئے ان کیلئے آپ تک سفر کیا اور ان کو پڑھنے سننے اور نسخ کرنے کیلئے ہاتھوں ہاتھ لیا۔[5]

---

(۱) الدرر الكامنة ۳/۳۳۷
(۲) اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کتاب میں انہوں نے تراجم کو مفصل کردیا ہے۔ البدر الطالع ۲/۱۱۰
(۳) دیکھئے ۱/۷۵-۹۰ (٤) البدر الطالع ۲/۱۱۱
(۵) الدرر الكامنة ۳/۳۳۷

فن جرح و تعدیل:- فن جرح و تعدیل میں آپ کا جو نمایاں کردار ہے وہ "حدّث و لا حرج" کے مصداق ہے،اس فن میں آپ کی بڑی گرانقدر تالیفات ہیں فن تاریخ میں جتنی بھی کتابیں ہیں اس میں یہی موضوع غالب ہے، اس فن سے متعلق آپ کی تقریباً پچہتر تالیفات ہیں جن میں اصول جرح و تعدیل سے متعلق کچھ اہم کتابیں بھی ہیں۔(۱)

علماء کی شہادت:- علماء فن نے آپ کے بارے میں جو اظہار خیال فرمایا ہے اس کیلئے ایک دیوان کی ضرورت ہے۔یہاں صرف فن جرح و تعدیل کے تعلق سے کچھ مختصر اقوال کا تذکرہ کیا جارہا ہے۔

آپ کے شاگرد علامہ سبکی (متوفی ۷۷۱ھ) جنہوں نے عقائد میں اختلاف کی وجہ سے آپ پر نقد بھی کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ: "إنه شيخ الجرح و التعديل و رجل الرجال في كل سبيل" آپ شیخ جرح و تعدیل اور ہر میدان کے مرد میداں ہیں (۲)

علامہ ابن کثیر (متوفی ۷۷۴ھ) فرماتے ہیں کہ: آپ شیخ المحدثین، مؤرخ اسلام ہیں شیوخ حدیث اور حفظ حدیث آپ پر ختم ہے۔ (۳)

صلاح الدین صفدی (متوفی ۷۶۴ھ) فرماتے ہیں کہ: فن حدیث و رجال میں بڑی پختگی، علل حدیث اور معرفت حدیث پر گہری نظر تھی، یقیناً آپ کیلئے ذہبیؒ "سوناوالے" کی نسبت بہت موزوں ہے۔ (۴)

ابن ناصر (متوفی ۸۴۲ھ) فرماتے ہیں کہ: آپ نقد رجال میں اللہ کی نشانی اور جرح و تعدیل میں مرجع خلائق تھے (۵)

بدر نابلسی نے فرمایا کہ: رجال اور انکے احوال کی معرفت میں آپ علامہ زمانہ تھے(۶)

امام سخاوی (متوفی ۹۰۲ھ) فرماتے ہیں: "هو من أهل الاستقراء التام في نقد الرجال" نقد رجال میں آپ مکمل صاحب جستجو ہیں۔ (۷)

---

(۱) ملاحظه هو سير أعلام النبلاء ۱/۷۸ (۲) طبقات الشافعية ۵/۲۱۶
(۳) البداية والنهاية ۱۴/۱۹۴ (۴) الوافي بالوفيات ۲/۱۶۳
(۵) الرد الوافر ص ۳۱، سير أعلام النبلاء ۱/۶۲ (۶) الدار الكامنة ص ۳/۳۳۸
(۷) الاعلان بالتوبيخ لمن ذم التاريخ ص ۱۶۸

امام ذہبی کی یہ وہ شخصیت تھی کہ حافظ ابن حجر جیسے علامہ زمانہ کی خواہش تھی کہ آپ بھی امام ذہبی کی طرح بن جائیں اور اس خواہش ودعا کیساتھ ماءِ زمزم نوش فرمایا۔

امام سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ) فرماتے ہیں کہ: فن رجال اور فنون حدیث کی معرفت میں اس دور کے علماء ومحدثین چار افراد کے محتاج ہیں: مزی، ذہبی، عراقی، ابن حجر[1]

اور حقیقت یہ ہے کہ آج کے علماء امام ذہبی کی کتابوں کے اس سے کہیں زیادہ محتاج ہیں جتنا کہ اس زمانہ کے علماء تھے۔

نقد علماء:- جی ہاں! یہ امام ذہبی کی عظیم شخصیت ہے لیکن نقد وقدح سے وہ بھی محفوظ نہ رہ سکے۔ خود آپ کے شاگرد تاج الدین سبکی (متوفی ۷۷۱ھ) نے آپ کو قدح کا نشانہ بنایا ہے۔[2] جس کی خاص وجہ عقائد ونظریات کا اختلاف ہے، چونکہ امام ذہبی کا میلان عقیدہ سلف اور طریقہ محدثین کی طرف تھا جو تقلیدی مزاج کے منافی ہے اس لئے امام ذہبی کو ہدف بنایا گیا۔

امام سبکی کی تنقیدوں کا جواب علامہ شوکانی (متوفی ۱۲۵۰ھ) نے "البدر الطالع" میں دیا ہے۔ نیز امام سخاوی نے "الاعلان بالتوبیخ" میں مختلف جگہ دیا ہے۔[3]

نماز کا وقت:- جس دن آپ کا انتقال ہوا اس دن امام سبکی کے والد تقی الدین سبکی امام ذہبی کی عیادت کیلئے گئے، یہ مغرب سے کچھ پہلے کا وقت تھا اور سیاق روح کا عالم ہو رہا تھا، انہوں نے کہا کہ کیا حال ہے؟ فرمایا بس آخری وقت محسوس کر رہا ہوں مجھے یہ بتایئے کہ کیا مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا، انہوں نے کہا کیوں عصر کی نماز ابھی ادا نہیں کر سکے؟ فرمایا کہ وہ تو ادا کر چکا لیکن مغرب کی نماز ادا نہیں کی۔ بالآخر جب نماز کا وقت ہو گیا تب مغرب اور عشاء کی بیک وقت جمع تقدیم کے ساتھ ادا کیا۔[4]

غالباً اس خوف سے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ سکرات موت طاری ہو اور عشاء کا وقت آجائے اور آخری نماز فوت ہو جائے۔ یہ اللہ کے وہ بندے تھے جو رسول پاک ﷺ کے آخری فرمان، "الصلوٰۃ، الصلوٰۃ" کی زندہ جاوید تصویر اور عملی نمونہ تھے۔

---

(۱) ذیل طبقات الحفاظ للسیوطی ص ۳۴۸ (۲) طبقات الشافعیة ۲۱۷/۵، البدر الطالع ۱۱۱/۲

(۳) البدر الطالع ۱۱۱/۲-۱۱۲، الاعلان بالتوبیخ ص ۵۶

(٤) طبقات الشافعیة ۲۱۷/۵

وفات:- بالآخر وقت موعود آپہنچا اور اسی رات ۳/ذی القعدہ ۸۴۲ھ کو اسی دار الحدیث میں جو "ام صالح" کے نام سے موسوم تھا مالک حقیقی سے جا ملے، اور اپنے بعد شاگردوں کا جم غفیر، بہت بڑا علمی سرمایہ، اور ناقابل فراموش خدمات حدیث چھوڑ گئے جو ان شاء اللہ قیامت تک آپ کیلئے صدقہ جاریہ رہیں گی۔ جامع دمشق میں نماز جنازہ ادا کی گئی اور "باب صغیر" میں ہمیشہ کیلئے سپرد خاک کردیئے گئے۔ (۱)

حافظ علاء الدین مغلطائی بن قلیج

(متوفی ۷۶۲ھ)

جن حضرات نے کتب ستہ کی خدمت کی ہے ان میں حافظ ابو عبداللہ مغلطائی بن قلیج کا نام نامی بھی شامل ہے، جو بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

آپ کی ولادت بصرہ میں ۶۸۹ھ میں ہوئی اور یہیں پر پرورش و پرداخت ہوئی، یہاں کے مشہور علماء: ابن سید الناس، احمد بن علی بن دقیق (تقی الدین بن دقیق کے بھائی) اور علامہ حسینی وغیرہ سے علم حاصل کیا، فن حدیث سے آپ کو کافی دلچسپی تھی، ابن سید الناس کے بعد آپ کو ظاہریہ میں درس حدیث کیلئے متعین کیا گیا بہت سے لوگوں کو یہ تعیین ناگوار گذری جس کی بناء پر انہوں نے ان پر کلام کیا ہے۔

آپ کی تصانیف کی تعداد ایک سو سے اوپر ہے جس میں اکثر و بیشتر فن حدیث ورجال سے متعلق ہیں۔ اہل لغت اور بعض محدثین کی کتابوں پر آپ نے تنقید کی ہے اور ان کی گرفت کی ہے جس سے آپ کی علمی ثقافت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

حافظ ابن حجر جو آپ کے شاگرد ہیں ان کی "تہذیب" کا سارا دارومدار آپ کی "اکمال" پر ہے۔

زین الدین ابن رجب فرماتے ہیں کہ: آپ أنساب کے ماہر تھے حدیث میں آپ کی معلومات متوسط تھی۔ شعبان ۷۶۲ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ (۲)

حافظ شمس الدین حسینی

---

(۱) البداية والنهاية ۱۹٤/۱٤، طبقات الشافعية ۲۱۷/۵

(۲) طبقات الحفاظ ص ۵۳۸، شذرات الذهب ۱۹۷/٦

(متوفی ۷۶۵ھ)

آپ کا اسم گرامی محمد بن حسن بن حمزہ بن اُبی المحاسن حسینی ہے، آپ کی کنیت ابو المحاسن اور لقب شمس الدین ہے، کچھ لوگوں نے آپ کی کنیت ابو عبداللہ بھی بتائی ہے، آپ کا خاندان حضرت حسین بن علی سے ملتا ہے اسلئے آپ کی نسبت حسینی ہے۔ آپ کی ولادت دمشق میں ۷۱۵ھ میں ہوئی آپ کی پرورش و پرداخت بھی وہیں ہوئی۔

آپ نے دمشق کے علاوہ حصول علم کیلئے مصر کا بھی سفر کیا اور بڑے بڑے اہل علم سے استفادہ کیا جن میں خود امام مزی اور امام ذہبی بھی ہیں نیز عبد الدائم کے شاگردوں میں سے بہت سے لوگوں سے آپ نے استفادہ کیا ان کے علاوہ اور بھی بے شمار مشائخ ہیں جن کا تذکرہ آپ نے اپنی "معجم الشیوخ" میں کیا ہے۔

آپ کی تالیفات مطولات و مختصرات سب ہی عمدہ اور بینظیر ہیں، فن رجال میں آپ کی جو تالیفات ہیں ان سے فن جرح و تعدیل سے آپ کی دلچسپی مہارت اور علمی تبحر کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ آپ نے اپنے تیز رو اور خوشخط قلم سے جو کتابیں تصنیف کی ہیں ان میں التذکرة برجال العشرة، ذيل العبر، ذيل طبقات الحفاظ، رجال مسند أحمد، الاكتفاء في الضعفاء جیسی اہم کتابیں ہیں جن کا تعلق فن رجال سے ہے۔ آپ نے امام ذہبی کی "میزان الاعتدال" پر بھی تعلیق لگائی ہے اور ان کے اوہام کی گرفت کی ہے نیز کچھ اسماء کا اضافہ بھی کیا ہے۔

علماء کے یہاں آپ کی شخصیت پسندیدہ اور قابل اعتماد تھی، امام ذہبیؒ نے آپ کو "العالم الفقيه المحدث" [1] کا خطاب دیا ہے۔

علامہ ابن فہد فرماتے ہیں "كان رضي النفس، حسن الأخلاق من الثقات الأثبات اماما مؤرخا حافظا له قدر كبير" [2]

آپ نے اپنی عمر کی ابھی پچاس ہی بہاریں دیکھیں تھی کہ سن کہولت میں مقام دمشق میں ۷۶۵ھ میں اس دار فانی سے رحلت فرما گئے۔ اور مقام قاسیون کے دامن میں ہمیشہ کیلئے سپرد خاک کر دیئے گئے۔ [3]

---

(۱) الدر الكامنة ۱/۶۱ (۲) لحظ الألحاظ ص ۱۵۰

(۳) برائے ترجمہ ملاحظہ ہو لحظ الالحاظ ۱۵۰-۱۵۱، الدر الكامنة ۴/۶۱-۶۲، معجم المولفين ۴/۳۰۷

حافظ ابن کثیر دمشقی

(متوفی ۷۷۴ھ)

آپ آٹھویں صدیِ ہجری کے چند ممتاز علماء میں سے ہیں جن کی کارکردگی روزِ روشن کی طرح عیاں ہے، آپ کا دورِ دمشق کی تاریخ میں نہایت سنہرا دور گذرا ہے۔

نام و نسب:- آپ کا نام و نسب اس طرح ہے اسماعیل بن عمر بن کثیر بن ضوء قرشی دمشقی، کنیت ابو الفداء لقب عماد الدین ہے۔(۱)

ولادت و حصول علم:- آپ کی ولادت ۷۰۱ھ میں بصریٰ کے ایک مشرقی مقام "بجدل" میں ہوئی، جہاں پر آپ کے والد خطیب تھے، ابھی زندگی کی چار بہاریں ہی دیکھی تھیں کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور یتیمی کی زندگی شروع ہوئی، آپ کے بڑے بھائی شیخ عبد الوہاب نے تعلیم و تربیت کی ذمہ داری سنبھالی اور ۷۰۶ھ میں اس زمانہ کے علمی مرکز دمشق میں آپ کو لے کر منتقل ہو گئے۔(۲)

اساتذہ:- یہی وہ زمانہ تھا جب دمشق میں علامہ ابن تیمیہ امام مزی کا بول بالا تھا، آپ علامہ ابن تیمیہ کی شخصیت سے بہت متاثر تھے اس لئے ان سے بکثرت استفادہ کیا، اس طرح سے وہ آپ کے خصوصی مشائخ میں شامل تھے جن کی وجہ سے آپ کو قید و بند کی مشقتیں برداشت کرنی پڑیں۔ خصوصاً طلاق ثلاثہ کے مسئلہ میں۔

آپ کے دیگر اساتذہ میں امام مزیؒ ہیں جو آپ کے خسر بھی ہو گئے تھے۔ ان کے علاوہ قاضی ابن شحنہ، قاسم بن عساکر، اسحٰق بن الآمدی، امام ذہبیؒ وغیرہ آپ کے مشائخ خاص میں سے ہیں۔(۳)

تالیفات:- آپ کو اللہ تعالیٰ نے قوی حافظہ عظیم ذہانت و فطانت سے نوازا تھا۔ چنانچہ آپ اپنے عہد شباب ہی میں بیک وقت محدث، مفسر، مورخ، فقیہ اور امام نقد کی حیثیت سے مشہور ہو گئے۔ ان فنون میں بڑی اہم کتابیں تالیف کیں، "تفسیر القرآن العظیم" آپ کی وہ مایہ ناز تالیف ہے جو آج بھی بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں شامل

---

(۱) مقدمة الباعث الحثيث ص ١٤، ذيل تذكرة الحفاظ ص ٥٧

(۲) شذرات الذهب ٢٣١/٦، الدر الكامنة ٣٧٤/١

(۳) ذيل تذكرة الحفاظ للحسيني ص ٥٧

نصاب ہے اور کافی معتبر سمجھی جاتی ہے، فن حدیث میں آپ کی کتاب "جامع المسانید" کافی شہرت یافتہ تالیف ہے جس میں مسند احمد، مسند بزار، مسند ابو یعلی، مسند ابن ابی شیبہ کو کتب ستہ کے ساتھ ملا کر ابواب پر مرتب کر دیا ہے۔ فن نقد اور جرح و تعدیل میں "التكميل في معرفة الثقات و الضعفاء والمجاهيل" اس فن کی اہم کتاب ہے جس میں آپ نے امام مزی کی "تہذیب الکمال" کو مختصر کر کے ان رجال کا اضافہ کیا جو "میزان الاعتدال" میں نہیں تھے۔ (۱)

فن تاریخ میں آپ کی عظیم تالیف "البداية والنهاية" آپ کے علمی خزانے کا پتہ دیتی ہے جس میں سیرت تاریخ، تفسیر، فقہ، جرح و تعدیل سب کچھ ہے، آپ کی تصانیف انتہائی مفید ہوا کرتی تھیں آپ کی زندگی ہی میں آپ کی تالیفات مشہور ہو چکی تھیں اور مختلف مقامات تک پھیل چکی تھیں اور آج تک ان سے استفادہ جاری ہے۔ (۲)

تلامذہ:- آپ سے آپ کی کتابوں کو سننے کے لئے اور آپ کے علمی چشمہ سے سیراب ہونے کیلئے طلبہ کی مختلف جماعتوں نے آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا جن میں آپ کے استاذ امام ذہبی بھی ہیں اسی طرح سے احمد بن علاء الدین سعدی، ابن حجی (متوفی ۸۱۵ھ) آپ کے خصوصی شاگردوں میں ہیں۔ امام ذہبی کے انتقال کے بعد آپ مدرسہ اُم صالح کے شیخ الحدیث مقرر کئے گئے تھے۔ نیز امام سبکیؒ کے انتقال کے بعد کچھ دنوں تک دار الحدیث الاشرفیہ کے بھی شیخ رہے۔ (۳) اس لئے شاگردوں کی ایک کثیر تعداد ہے۔

امام ذہبیؒ نے آپ کو بحیثیت استاد اپنی معجم خاص میں ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ آپ فقیہ، مفتی، محدث نیز مختلف فضائل کے حامل تھے، فن رجال حدیث اور فقہ میں آپ کو خصوصی مہارت حاصل تھی۔ (۴)

دوسرے شاگرد ابن حجی فرماتے ہیں کہ: جن سے ہم نے ملاقات کی ان میں آپ حدیث کے سب سے بڑے حافظ، جرح و تعدیل اور رجال کے بارے میں سب سے زیادہ دسترس رکھنے والے تھے، آپ کے ہم عصروں کو بھی اس کا اعتراف تھا۔ (۵)

---

(۱) شذرات الذهب ۲۳۱/۶ (۲) الدرر الكامنة في أعيان المائة الثامنة ۳۷۴/۱

(۳) طبقات المفسرين للداودي (۴) تذكرة الحفاظ ۱۵۰۸/۴

(۵) شذرات الذهب في أخبار من ذهب ۲۳۱/۶

ابن عماد حنبلی فرماتے ہیں کہ: "انتهت إليه رئاسة العلم فى التاريخ والحديث والتفسير"[۱] یعنی فن تاریخ، حدیث اور تفسیر میں آپ پر علم کی قیادت ختم تھی، امام شوکانیؒ فرماتے ہیں کہ: فن رجال اور علل میں آپ نے بڑی مہارت حاصل کی تھی۔[۲]

وفات:- بالآخر وقت موعود آپہنچا اور دمشق میں شعبان ۷۷۴ھ میں آپ کا انتقال ہو گیا جبکہ آپ بینائی سے محروم ہو چکے تھے۔[۳] اور مقبرہ صوفیہ میں اپنے خصوصی شیخ علامہ ابن تیمیہ کے بغل میں سپرد خاک کیے گئے۔[۴]

خاتمہ حفاظ حافظ ابن حجر عسقلانی

(متوفی ۸۵۲ھ)

ملک مصر اپنی قدامت، فنی اور ثقافتی، نیز تاریخی حیثیت سے کافی مشہور ہے۔ فتنہ تاتار اور سقوط بغداد کے بعد عالم اسلامی کے علمی مراکز تار تار کر دیئے گئے، اس وقت علماء نے مصر اور شام میں پناہ لی اسلئے علم و عمل کا باغ و بہار جو صدیوں سے بغداد میں خیمہ زن تھا مصر و شام کی جانب روانہ ہوا اور یہ علاقہ علماء کی آماجگاہ بنا، شام کا علاقہ بھی اس وقت مصری سلاطین کے زیرنگیں تھا لہٰذا آپس میں مصر و شام میں بہت گہرا ارتباط پایا جاتا تھا، علماء ایک دوسری جگہ بحیثیت شیخ و قاضی آتے جاتے رہتے تھے۔

ساتویں اور آٹھویں صدی میں جو علمی بیداری آئی اس نے انقلابی شکل اختیار کر لی، اس دور میں امام عراقی، بلقینی، ابن جماعۃ، ابن ملقن کے علوم و فنون سے عالم اسلامی جگمگا رہا تھا۔[۵]

اس علمی دور میں خاتمہ الحفاظ حافظ ابن حجر کی ولادت باسعادت مصر میں شعبان ۷۷۳ھ میں ہوئی۔[۶]

نام و نسب:- آپ احمد بن علی بن محمد بن محمد بن علی بن احمد عسقلانی کنانی ہیں۔ کنیت ابوالفضل، لقب شہاب الدین عرف ابن حجر ہے۔

عسقلانی:- یہ عسقلان کی جانب نسبت ہے جو شام کے ساحلی علاقہ فلسطین کے

---

(۱) مصدر سابق (۲) البدر الطالع ۱/۱۵۳

(۳) الدرر الكامنة ۱/۳۷۴ (۴) شذرات الذهب ۱/۲۳۲

(۵) ابن حجر العسقلانى و دراسة مصنفاته ص ۴۵-۵۹

(۶) لحظ الألحاظ بذيل طبقات الحفاظ ص ۳۲۶، البدر الطالع ۱/۸۸

شہروں میں سے ایک شہر ہے۔[۱]

کنانی:- یہ قبیلہ کنانہ کی جانب نسبت ہے جو عسقلان میں آکر آباد ہو گئے تھے۔[۲]

ابن حجر:- راجح بات یہ ہے کہ یہ آپ کے آباء واجداد میں سے کسی کا لقب ہے[۳] کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یہ آل حجر ایک قوم ہے اس کی جانب نسبت ہے جو جرید کے جنوبی علاقہ میں آباد تھا۔[۴] کچھ حضرات کا خیال ہے کہ کثرت ذہانت یا کثرت مال کی وجہ سے آپ کا یہ عرف عام ہوا ہے۔ لیکن اس پر بظاہر کوئی دلیل نہیں۔[۵]

آپ کی والدہ کا انتقال اس وقت ہو گیا تھا جب آپ بچے تھے، اور جب آپ کی عمر تقریباً پانچ سال کی ہوئی تو والد کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا، اس کی وجہ سے بحیثیت یتیم آپ کی پرورش و پرداخت ہوئی، پرورش کی ذمہ داری ایک تاجر نے لی جو آپ کے والد کے دوست تھے، انہیں کو وہ پرورش کیلئے وصیت کر گئے تھے۔[۶]

تعلیم و تربیت:- عمر عزیز کے پانچ مراحل گذر گئے تب بحیثیت طفل مکتب مدرسہ میں داخل ہوئے، نو سال کی عمر میں قرآن کریم اور کچھ دینی کتابوں کا حفظ کیا[۷] شعر و شاعری اور ادب سے آپ کو فطری دلچسپی تھی لہٰذا اس کی طرف پہلے متوجہ ہوئے اور اس میں کمال حاصل کر لیا۔[۸]

لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا لہٰذا آپ کے دل میں فن حدیث کی محبت پیدا ہو گئی، ۷۸۳ھ میں جب آپ مکہ معظمہ اپنے وصی کے ہمراہ گئے تو اتفاقی طور سے پہلا درس حدیث شیخ عفیف الدین النشاری سے لیا۔[۹]

لیکن باقاعدہ درس حدیث ۷۹۳ھ سے شروع کیا اور بڑے انہماک اور دلجمعی اور وفور شوق سے اس کی طلب میں لگ گئے اور اس میں رسوخ کامل حاصل کر کے نو عمری ہی میں اپنے ہم عصروں پر فوقیت لے گئے۔[۱۰]

---

(۱) اللباب فی تهذيب الأنساب ۳۳۹/۲

(۲) المجمع الموسس ق ۱۵/٤، بحواله ابن حجر العسقلانی و دراسة مصنفاته ص ٦٩

(۳) الضوء اللامع ۲٦/۲، البدر الطالع ۸۷/۱ (٤) شذرات الذهب ۲۷۰/۷

(٥) ابن حجر و دراسة مصنفاته ص۷۰-۷۱ (٦) لحظ الألحاظ ص۳۲٦ و ابن حجر العسقلانی ص۷٦

(۷) البدر الطالع ۸۸/۱ (۸) ذيل طبقات الحفاظ للسيوطی ص ۳۸۰، و شذرات ۲۷۰/۷-۲۷۱

(۹) لحظ الألحاظ ص ۳۲٦، ذيل طبقات الحفاظ للسيوطی ص ۳۸۰

(۱۰) لحظ الألحاظ ص ۳۳۰

فن حدیث میں اس مقام تک پہنچنے کیلئے امام زین الدین عراقی کا سب سے اہم کردار تھا، جن کے ساتھ آپ دس سال تک لگے رہے۔[1]

علمی حرص کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ نے امام ذہبی کے حفظ اور علم تک پہنچنے کیلئے آب زمزم نوش فرما کر اللہ سے دعا کی تھی، اللہ تعالیٰ نے آپ کی یہ تمنا پوری کر دی بلکہ ان سے آگے بڑھا دیا۔[2]

فن حدیث کے علاوہ دیگر علوم میں بھی آپ نے مہارت حاصل کی، ابن فہد فرماتے ہیں کہ "جد فی طلب العلوم فبلغ الغایة القصوی"[3]

خوش قسمتی سے آپ کی ملاقات ایسے ایسے نامور فضلاء سے ہوئی جو اپنے اپنے فن میں امامت کا درجہ رکھتے تھے، ان کی تعلیم و تربیت و فنکاری کا یہ اثر ہوا کہ آپ حافظ زمانہ، شیخ الاسلام، امیر المومنین فی الحدیث، کہے جانے کے قابل ہو گئے۔

علمی رحلات میں آپ کی ملاقات کچھ ایسے لوگوں سے ہوئی جو ابن عساکر کے شاگردوں میں سے تھے، اس لئے آپ کو اسناد عالی مل گیا۔[4]

علمی سفر:- علمی تشنگی بجھانے کیلئے آپ نے جن مقامات کا سفر کیا ان میں حجاز، شام، مصر اور یمن کے تقریباً پچاس مقامات شامل ہیں۔[5]

اساتذہ:- آپ کے شیوخ کی تعداد بے شمار ہے جن کا ذکر اصحاب سیر و تراجم نے کیا ہے خود آپ نے اپنی کتاب المعجم الفهرس، المجمع المؤسس میں اور خود نوشت سوانح میں کیا ہے جن کی تعداد بیشمار ہے۔ ابن فہد فرماتے ہیں کہ: "و مشایخه کثیرة جدالا توصف ولا تدخل تحت الحصر"[6]

آپ کے انہیں اساتذہ میں سے کچھ اہم شخصیات یہ ہیں: زین الدین عراقی، علامہ ابن الملقن، امام بلقینی، امام تنوخی، مجد الدین صاحب قاموس اور ابن جماعہ[7]

---

(۱) البدر الطالع ۸۸/۱

(۲) ذیل طبقات الحفاظ للسیوطی ص ۳۸۱، دکتور شاکر محمود عبدالمنعم نے ذکر کیا ہے کہ پہلی دعا کے بیس سال بعد جب آپ نے حج کیا تو امام ذہبی سے آگے نکلنے کی، دعا اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو بھی قبول فرمایا۔ ابن حجر العسقلانی و دراسة مصنفاته ص ۱۸۲

(۳) لحظ الألحاظ ص ۳۳۰ (٤) لحظ الألحاظ ص ۳۲٦-۳۲۷

(۵) البدر الطالع ۸۸/۱، لحظ الألحاظ ص ۳۲۷ وابن حجر العسقلانی و دراسة مصنفاته ص ۱٤۷

(٦) لحظ الألحاظ ص ۳۲۷ (۷) البدر الطالع ۸۸/۱

جو اپنے زمانہ کے عجوبہ تھے۔

تلامذہ:- دور شباب میں آپ کی شہرت اور علم کا چرچا ہونے لگا تھا لہٰذا آپ سے استفادہ کیلئے طالبان علوم نبوت جوق در جوق آپ کے پاس آنے لگے۔(۱) حتی کہ آپ کے شیوخ و ہم عصر اور نوعمر بچوں نے بھی آپ سے استفادہ کیا۔(۲)

مصر کے اکثر و بیشتر علماء آپ کے شاگرد بن گئے اور دوسرے شہروں سے آنے والے آپ کی خدمت میں حاضری دیتے رہے،(۳) ہر مذہب و مقام کے ممتاز علماء آپ ہی کے شاگرد ہوا کرتے تھے۔(۴)

آپ کی مجلس درس میں جس کثرت سے طلبہ شریک ہوتے تھے اتنا کسی کی مجلس میں نہیں حاضر ہوتے تھے۔(۵)

آپ کے شاگردوں کا تذکرہ علامہ سخاوی نے تفصیل سے الجواهر والدرر میں کیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا حصر ممکن نہیں۔

آپ کے انہیں مشہور شاگردوں میں سے امام سخاوی، ابن تغری بردی، علامہ بقاعی، ابن فہد مکی، ابن قاضی شہبہ، زکریا انصاری وغیرہ ہیں۔

علمی خدمات:- آپ نے اپنی پوری زندگی درس و تدریس، تصنیف و تالیف، افتاء۔ قضاء میں گذار دی، حدیث پاک کی نشر و اشاعت آپ کی زندگی کا نصب العین تھا۔ امام شوکانی فرماتے ہیں کہ: "تصدى لنشر الحديث و قصر نفسه عليه مطالعة وإقراء او تصنيفا و افتاءا"(۶)

آپ نے اپنے زمانے کے ایک درجن سے زائد علمی مراکز اور دور حدیث میں درس دیا ہے صرف خانقاہ بیبرسیہ میں بیس سال تک درس دیا اس کے علاوہ دار الحديث الكاملية، شيخونية، بدرية، صالحية، فخرية، نجمية، جمالية، حسينية اور جامع ابن طولون میں منصب تدریس پر فائز رہے۔(۷)

---

(۱) مصدر سابق ۹۲/۱ (۲) لحظ الألحاظ ص ۳۳۵

(۳) شذرات الذهب ۲۷۱/۷ (٤) ابن حجرالعسقلانی ودراسة مصنفاته ص ١٦٦

(۵) دراسات فی الجرح والتعدیل ص ۲۱۰ (٦) البدر الطالع ۸۸/۱

(۷) دراسات فی الجرح و التعدیل ص ۲۰۵-۲۰۹

نیز تقریباً اکیس سال تک مختلف اوقات اور مقامات میں منصب قضا پر فائز رہے۔[۱] اس کے علاوہ مجلس املاء وعظ وافتاء بھی منعقد کرتے رہے۔

تصانیف:- آپ کی تصانیف مختلف علوم وفنون میں ہیں، بالخصوص فن حدیث اور اس کے متعلق علوم میں انتہائی نفع بخش تالیفات ہیں، آپ نے اپنی تالیفات کے ذریعہ فن حدیث کی وہ خدمت کی ہے جس کی مثال دور دور تک نہیں ملتی۔ صحیح بخاری کی شرح کا قرض جو امت کے ذمہ تھا وہ قرض آپ ہی نے اتارا ہے، آپ کی تصنیفات آپ ہی کے زمانہ میں بے حد مقبول و متداول تھیں، علماء وامراء سب نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور بڑی عزت بخشی[۲]

علامہ ابن فہد فرماتے ہیں کہ: آپ کی تالیفات حسین علمی گلدستہ ہیں، انتہائی مفید، مقبول اور متداول ہیں، جسکے حصول کیلئے قافلے سورج کی طرح چلتے رہے۔[۳]

امام سیوطی فرماتے ہیں کہ: اولین و آخرین میں آپ کی طرح کسی نے تصنیف نہیں کی ہے۔[۴]

حالانکہ خود حافظ ابن حجر نے اپنی بہت ساری ابتدائی تالیفات پر اظہار افسوس بھی کیا ہے کیونکہ یہ ان کے اعتبار سے اتنی معیاری نہ ہو سکیں جتنا کہ ہونا چاہئے۔ جبکہ انہیں کتابوں کو علماء نے بے نظیر و بے مثال قرار دیا ہے۔[۵]

آپ کی تالیفات کا تذکرہ آپ کے شاگرد خاص علامہ سخاوی نے تفصیل سے کیا ہے، جس کی تعداد انہوں نے (۲۷۰) بتائی ہے۔ ڈاکٹر شاکر محمود عبدالمنعم نے آپ کی تالیفات پر تفصیلی گفتگو کی ہے ان کے وجود اور عدم وجود کا پتہ بھی دیا ہے، ان کی جملہ تعداد انہوں نے (۳۲۰) بتائی ہے۔[۶]

آپ کی صرف ایک کتاب فتح الباری شرح صحیح البخاری شروح حدیث کی ساری کتابوں پر بھاری ہے، آپ کے بعد آنے والے شارحین نے اسی کو مرجع بنایا ہے، یہ وہ سارے اسباب تھے جسکی وجہ سے آپ کی شخصیت ایک عالم گیر

---

(۱) الضوء اللامع — (۲) البدر الطالع ۱/۸۸

(۳) لحظ الألحاظ ص ۳۳۲ — (۴) ذیل طبقات الحفاظ ص ۳۸۱

(۵) البدر الطالع ۱/۸۹، ولحظ الألحاظ ص ۳۳۲، ابن حجر العسقلانی ص ۳٦٤

(٦) ابن حجر العسقلانی و دراسة مصنفاته ص ۲۸۲-۲۸۷

شخصیت بن گئی، اور امام عراقی کا دیا ہوا خطاب لفظ "حافظ" آپ کا خطاب خاص ہو گیا[1] اب جب بھی حافظ کا لفظ سننے میں آتا ہے تو آپ ہی کی شخصیت کی طرف ذہن جاتا ہے۔ آپ کے اساتذہ اور ہم عصر علماء و امراء نے آپ کو وہ مقام دیا جس کے آپ مستحق تھے۔

علماء کی شہادت:- آپ کے استاد خاص حافظ عراقی نے آپ کو اپنے شاگردوں میں حدیث کا سب سے زیادہ جاننے والا بتایا ہے نیز اکثر و بیشتر لوگوں کو علمی معلومات کیلئے آپ کے پاس بھیج دیا کرتے تھے۔[2]

ابن فہد فرماتے ہیں کہ: آپ امام علامہ زمان تھے آپ جیسی شخصیت نگاہوں نے نہیں دیکھی۔[3]

امام سیوطی نے آپکو شیخ الاسلام، امام الحفاظ اور حافظ الدنیا مطلقا کا خطاب دیا ہے[4]

ابن شحنہ جنہوں نے آپ پر تنقید بھی کی ہے وہ کہتے ہیں کہ آپ حافظ عصر حافظ مغرب و مشرق، أمیر المومنین فی الحدیث ہیں آپ کے عہد شباب ہی میں علم حدیث کی ریاست آپ پر ختم تھی۔[5]

ابن عمار فرماتے ہیں کہ: آپ حافظ عصر، شیخ الاسلام، أمیر المومنین فی الحدیث ہیں۔[6]

فن جرح و تعدیل میں آپ کا مقام:- فن جرح و تعدیل میں آپ کا بہت عالی مقام ہے، اس فن کی معرفت آپ پر ختم ہو چکی ہے، جب سے اس فن میں آپ کی کتابیں منظر عام پر آئی ہیں، دیگر کتابیں تقریباً متروک ہو گئی ہیں رجال کے بارے میں جو تتبع اور فیصلہ آپ نے کیا ہے علماء نے اسکو کلی طور پر قبول کیا ہے، اور حدیث کی تصحیح و تضعیف میں اس کو بنیاد بنایا ہے۔ آپکی ان گرانقدر تالیفات میں تہذیب التہذیب، تقریب التہذیب، تعجیل المنفعة، لسان المیزان، تحریر المنتبه وغیرہ ہیں جو

---

(۱) ابن حجر العسقلانی ص ۱۶۲، البدر الطالع ۸۸/۱
(۲) ابن حجر العسقلانی ۱۶۳، بحواله التبر المسبوك ۲۳۱
(۳) لحظ الالحاظ ص ۳۳۶
(٤) ذیل طبقات الحفاظ ص ۳۸۰
(۵) دیکھئے ابن حجر العسقلانی ص ۲۶۹
(٦) شذرات الذهب ۲۷۰/۷

انتہائی مشہور و معروف ہیں اور فن جرح و تعدیل میں آپ کی امامت کا پتہ دیتی ہیں۔
علماء نے اس فن میں آپ کی مہارت کی شہادت دی ہے۔
ابن فہد فرماتے ہیں کہ: فن حدیث کی معرفت میں آپ اپنے عہد شباب ہی سے یکتائے زمانہ تھے خاص طور سے رجال حدیث اور ان سے متعلق علوم میں آپ کو ملکہ حاصل تھا۔(۱)
ابن عماد فرماتے ہیں کہ: رجال حدیث اور علل حدیث کی معرفت آپ پر ختم ہے۔(۲)

خصوصی صفات:- آپ کے اندر دو خصوصی صفات ایسی پائی جاتی تھیں جن سے کثرت کتابت اور کثرت قرأت میں آپ کو بہت مدد ملی۔

۱- سرعت کتابت: سرعت کتابت کا یہ عالم تھا کہ درمیان میں قلم نہیں اٹھاتے تھے اسی وجہ سے آپ کی تحریروں کو سلسلۃ الذہب (سونے کی زنجیر) سے تعبیر کیا گیا ہے، نیز اسی وجہ سے آپ کی تحریروں کا پڑھنا عام علماء کیلئے بہت دشوار ہوتا تھا۔ سارا کام کرنے کے باوجود صحیح بخاری کا ایک پارہ ایک دن میں نسخ کر لینا آسان ہوتا تھا۔ ابن فہد فرماتے ہیں کہ: "بلغ الغاية القصوى في الكتابة والكشف والقراءة"(۳)

۲- سرعت قرأت: آپ کے پڑھنے میں اس قدر تیزی پائی جاتی تھی کہ سنن ابن ماجہ اور صحیح مسلم کو صرف چار چار مجلس میں ختم کر دیتے تھے۔ امام طبرانی کی معجم صغیر کو صرف ایک مجلس میں (ظہر اور عصر کے درمیان) ختم کر لیا تھا۔

وفات:- بالآخر وقت موعود آپہنچا اور تقریباً ایک ماہ کی علالت کے بعد مصر میں ماہ ذی الحجہ ۸۵۲ھ میں مالک حقیقی سے جا ملے۔ ظہر کی نماز سے پہلے نماز جنازہ ادا کی گئی۔ آپ کے جنازہ میں اس قدر بھیڑ جمع تھی جس کی نظیر بڑے بوڑھوں نے بھی نہیں دیکھی تھی، امراء و سلاطین حتی کہ امیر المومنین بھی جنازہ میں شریک تھے جو آپ کی نعش مبارک کو کندھا دینے کیلئے ایک دوسرے پر سبقت کر رہے تھے، امام شافعی اور شیخ مسلم سلمی کی قبر کے درمیان مقام قرافہ صغری میں آپ کو سپرد خاک کیا گیا۔(۴)

---

(۱) لحظ الالحاظ ص ۳۳۱ (۲) شذرات الذهب ۲۷۱/۷
(۳) لحظ الالحاظ ص ۳۳۶، ابن حجر العسقلانی و دراسة مصنفاته ص ۱۳۳-۱۳۶
(٤) البدر الطالع ۹۲/۱، لحظ الالحاظ ص ۳۳۸

چوتھا باب

کتب جرح و تعدیل کے بارے میں

راویان حدیث پر کلام:-

ائمہ محدثین اور علمائے امت نے دین مبین کی حفاظت اور اس کو خارجی مداخلت سے محفوظ رکھنے کیلئے فن جرح و تعدیل ایجاد کیا، جسکی جھلک کتاب اللہ میں "فاسق" و "کذاب" اور سنت رسول ﷺ میں "نعم" و "بئس" کی شکل میں نظر آتی ہے۔

پھر دور صحابہ، تابعین اور تبع تابعین میں بتدریج رجال پر نقد اور کلام حسب ضرورت وسیع تر ہوتا گیا، اور چونکہ یہ دور، راویان حدیث کا دور اور ائمہ محدثین کا ایک دوسرے سے قربت اور ہم عصری کا دور تھا، اس لئے طلاب علوم نبوت کو رجال حدیث پر کئے گئے کلام کی معرفت اور اس کے حفظ و فہم میں زیادہ دقت نہیں ہوتی تھی۔

تیسری صدی کی ابتدا تک یہ کلام جو راویان حدیث پر جرح و تعدیل کے سلسلے میں وارد ہوئے تھے زبانی کلام تھے، جسکو خدام سنت نبوی اور طالبان علوم نبوت یا تو اپنے مشائخ اور ان کے اساتذہ سے (مشائخ کے واسطہ سے) سن کر معلوم کرتے تھے چاہے وہ سوال و جواب کی شکل میں ہو یا درس عمومی کی صورت میں ہو اور یا تو بذات خود اپنے ہم عصروں کو سامنے پرکھ کر ان کے بود و باش، تقویٰ و پرہیزگاری، عدالت و ثقاہت کو دیکھ کر ان پر فیصلہ کرتے تھے۔

تاریخ تدوین کتب جرح و تعدیل:-

تقریباً اس دو سو سال کے دوران جرح و تعدیل کے مصطلحات متعارف، اصول وضوابط متعین اور اہل علم کے یہاں متداول و معمول بہ ہو چکے تھے، کلمات جرح و تعدیل کے زیر و بم پیچ و خم اور مدلول واضح ہو چکے تھے۔ اب ان کو قلمبند کرنے کی ضرورت تھی، تاکہ اس پر بحث و تمحیص نقد و موازنہ اور مختلف آراء کا تقابلی جائزہ آسانی سے لیا جاسکے، اور

ان اقوال کی روشنی میں مختلف فیہ راویوں پر دقیق سے دقیق تر فیصلہ کیا جاسکے۔[1]

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ان بندوں کے دلوں میں جن کو حفاظتِ حدیثِ رسول کیلئے منتخب فرمایا تھا یہ الہام کیا کہ اس فن کی تصنیف اور ان اقوال کی تدوین ہونی چاہئے، انہوں نے اس علمی خزانہ کو محفوظ کرنا شروع کر دیا اور سب سے پہلے یحییٰ بن سعید قطان (متوفی ۱۹۸ھ) نے راویانِ حدیث کے بارے میں معلومات کو قلمبند کرنا شروع کیا۔

امام ذہبی فرماتے ہیں کہ: **فأول من جمع كلامه في ذلك الامام يحيىٰ بن سعيد القطان، الذي قال عنه الامام أحمد: ما رايت بعيني مثله**[2] یعنی سب سے پہلے راویانِ حدیث کے سلسلہ کی گفتگو کو امام یحییٰ بن سعید قطان (متوفی ۱۹۸ھ) نے جمع کیا جن کے بارے میں امام احمد بن حنبل (متوفی ۲۴۱ھ) کا فرمان ہے کہ اپنی نگاہوں سے اس جیسی شخصیت میں نے دیکھی ہی نہیں۔

"**وتكلم في ذلك بعده تلامذته يحيىٰ بن معين، وعلي بن المديني، وأحمد بن حنبل، وعمرو بن علي الفلاس، وأبو خيثمة وتلامذتهم**"[3]

انہیں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ان کے تلامذہ مثلاً امام یحییٰ بن معین (متوفی ۲۳۳ھ) اور امام علی بن مدینی (متوفی ۲۳۴ھ) اور امام احمد بن حنبل (متوفی ۲۴۱ھ) عمرو بن علی فلاس (متوفی ۲۴۹ھ) اور ابو خیثمہ زہیر بن حرب (متوفی ۲۳۴ھ) رحمۃ اللہ علیہم اجمعین وغیرہ نے یہ ذمہ داری سنبھالی، رجال حدیث پر معلومات تحریری شکل میں جمع کیا، ان کی تالیفات اس فن کی ابتدائی اور بنیادی تصنیفات تصور کی جاتی ہیں۔

آہستہ آہستہ اس فن کی تالیفات میں کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے اضافہ ہوا اور راویان کے سلسلے کی وہ گفتگو جو کبھی سوال وجواب کی شکل میں انتہائی مختصر ہوا کرتی تھی، ترقی کر کے مکمل سوانح حیات کی شکل اختیار کر گئی اور اس سلسلے کی متنوع

---

(۱) الجرح والتعديل ابو لبابه حسين ص ۱۴۴، نیز ملاحظه هو مقدمه "التاريخ" ليحيىٰ بن معين

(۲) ميزان الاعتدال ۱/۱

ڈاکٹر اکرم ضیاء عمری کا کہنا ہے کہ اس سلسلے میں سب سے پہلی تصنیف امام لیث بن سعد مصری (متوفی ۱۷۵ھ) کی کتاب "التاریخ" اور عبداللہ بن مبارک (متوفی ۱۸۱ھ) کی کتاب "التاریخ" ہے، بحوث في تاريخ السنة المشرفة ص ۱۰۴

(۳) ميزان الاعتدال ۱/۱–۲

تالیفات منظم اور مرتب ہونے لگیں۔

چنانچہ مذکورہ محدثین کے شاگردوں میں امام محمد بن اسمٰعیل بخاری رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۲۵۶ھ) نے ایک علمی شاہکار، چاند کی روشنی میں روضۂ اقدس کے جوار میں بیٹھ کر "التاریخ الکبیر" کے نام سے تحریر کیا۔

ایسے ہی امام ابو اسحٰق ابراہیم بن یعقوب سعدی (متوفی ۲۵۹ھ) اور امام مسلم بن حجاج نیساپوری (متوفی ۲۶۱ھ) اور احمد بن عبد اللہ عجلی (متوفی ۲۶۱ھ) نے راویان حدیث کے احوال و کوائف کو مختلف شکلوں میں جمع کیا۔

انہیں قدوسی نفوس کی روش کو اپناتے ہوئے امام احمد بن شعیب نسائیؒ (متوفی ۳۰۳ھ) امام ابو جعفر عقیلی (متوفی ۳۲۲ھ) امام ابن ابی حاتم رازیؒ (متوفی ۳۲۷ھ) علامہ ابن حبان بستیؒ (متوفی ۳۵۴ھ) علامہ ابن عدیؒ (متوفی ۳۶۵ھ) نے اس فن کو جلا بخشا اور اپنے فیصلہ کے ساتھ دوسرے ائمہ نقاد کے اقوال کو جو انہوں نے راویان حدیث کے سلسلے میں کیا تھا، بطور مقارنہ ذکر کیا۔ ان اقوال کو انہوں نے اپنی سندوں سے اسی طرح بیان کیا ہے جیسے حدیث پاک سند سے بیان کی جاتی ہے اور بطور نمونہ ان کی حدیثوں کو بھی سند سے ذکر کیا ہے۔ (۱)

اس طرح سے فن جرح و تعدیل و اسماء رجال میں تالیفات مولف کے دور، مزاج اور ذوق، نیز ضرورت کے مطابق ترقی پذیر ہوتی رہیں اور انواع و اقسام کی تصانیف وجود میں آئیں، جس نے ہر ایک راوی کی حیثیت کو واضح کر دیا، جو اس امت کی بقاء کی ضمانت دیتی ہیں اور اس دین کی حفاظت اور حدیث پاک سے دفاع کیلئے تیغ بے نیام بن کر آج بھی کتب خانوں کے ایک بڑے حصہ پر قابض ہیں یہاں تک کہ دشمنان اسلام کو بھی یہ کہنے پر مجبور ہونا پڑا کہ:

"دنیا میں کوئی قوم آج تک ایسی نہیں گذری اور نہ موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء رجال پر ایسا فن ایجاد کیا جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصیتوں کا حال معلوم ہو سکتا ہے (۲)

---

(۱) میزان الاعتدال ۱/۲ (۲) السنۃ قبل التدوین ص ۲۳۸

راویان حدیث کی محسوس مثال:-

اور بقول امام سخاوی (متوفی ۹۰۲ھ) جب جرح و تعدیل کی کتابیں تصنیف کی گئیں تو ہر ایک کو اس کا صحیح مقام بتادیا گیا اور یہ وضاحت کردی گئی کہ:

۱- وہ کون ہے جو ستون کی طرح ثابت قدم مضبوط اور ثقہ ہے۔
۲- اور وہ کون ہے جو ثقاہت میں تندرست نوجوان کی مانند ہے۔
۳- اور وہ کون ہے جو پابند شریعت اور دین دار ہونے کے باوجود لیّن ہے، جسکی مثال اس نوجوان کی طرح ہے جو دردسر میں مبتلا ہے، لیکن اس کا شمار بھی تندرستوں میں ہوتا ہے۔
٤- اور وہ کون ہے جس کی مثال اس بخار زدہ (مریض) کی طرح ہے جس کی صحت کی امید کی جاسکتی ہے۔
۵- اور وہ کون ہے جسکی صفت اس دائمی مریض کی طرح ہے جس کو بیماری کھاگئی ہے۔
٦- اور وہ کون ہے جسکے ہاتھ پیر ڈھیلے ہوچکے ہیں اور اعضاء جواب دے چکے ہیں جو ہلاکت کے قریب پہنچ چکا ہے، یہی وہ ہے جس کی روایت ساقط الاعتبار ہے۔ (۱)

کتب جرح و تعدیل کے تالیفی مراحل اور کیفیت:-

فن جرح و تعدیل میں جو کتابیں تحریر کی گئی ہیں ان کو تین مرحلوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱- پہلے مرحلہ کی کتابیں انتہائی مختصر ہوا کرتی تھیں جس میں راوی کا مختصر نام اور ایک لفظ میں اس کا حکم ذکر کردیا جاتا تھا، خواہ وہ مؤلف کا اپنا قول ہو، یا ان کے کسی استاد یا کسی امام کا قول ہو، اس طرز کی مختصر کتابیں اہل علم نے بعد میں بھی تحریر کی ہیں اس طرح کی کتابوں میں امام بخاری کی "الضعفاء الصغیر" امام ابو زرعہ رازی ور امام نسائی کی "الضعفاء والمتروکین"، امام دار قطنی کی "الضعفاء" اور "کتب أسئلہ" وغیرہ کو مثال میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

۲- دوسرے مرحلے کی کتابیں عموماً متوسط ہوا کرتی تھیں، ان کتابوں میں تراجم

---

(۱) المتکلمون فی الرجال ص ۹۲-۹۳

میں قدرے وسعت دی گئی، راوی کا حسب ونسب، اس کے بعض اساتذہ و تلامذہ، اس کے بارے میں علماء کے اقوال اور مثال کے طور پر ایک یا چند حدیثیں بذریعہ اسناد ذکر کی جاتی تھیں جو اس راوی کے واسطہ سے مروی ہوتی تھیں، اس مرحلہ کی کتابوں کی سب سے اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس میں اقوال ائمہ کو جو راویوں کے بارے میں ہوتے تھے بذریعہ اسناد ذکر کیا جاتا تھا، اس سلسلہ میں جن کتابوں کو مثال میں پیش کیا جا سکتا ہے ان میں امام بخاری کی "تاریخ کبیر" امام ابو جعفر عقیلی کی "تاریخ الضعفاء" "ابن حبان کی "المجروحین من المحدثین"، ابن عدی کی "الکامل فی ضعفاء الرجال"، ابن ابی حاتم رازی کی "جرح و تعدیل" وغیرہ کتابیں ہیں۔

۳- تیسرے مرحلہ کی کتابیں کافی مفصل ہوا کرتی تھیں، راوی کے بارے میں جو ضروری معلومات دستیاب ہو سکتی تھیں تقریباً ان سب کا احاطہ ہو تا تھا، خاص طور سے ائمہ جرح و تعدیل کے مختلف اقوال کا ذکر حتی المقدور کیا جاتا تھا، مؤلف کے اپنے ذوق کے مطابق کوئی خاص گوشہ کبھی کبھی اجاگر ہو تا تھا، مثلاً" تہذیب الکمال" میں اساتذہ و تلامذہ کے جمع کرنے کا گوشہ کافی روشن ہے، تو "تہذیب التہذیب" میں اقوال ائمہ کے جمع کرنے کا گوشہ کافی حد تک اجاگر ہے۔

ان کتابوں میں ائمہ کے اقوال ذکر کرنے کیلئے اسناد کو ذکر نہیں کیا جاتا تھا، بلکہ سابقہ کتابوں پر ان کا اعتماد ہو تا تھا جو مستند کتابیں ہوتی تھیں، اسلئے انہیں سندوں کو کافی سمجھا جاتا تھا اور عموماً احادیث کو بھی حذف کر دیا گیا تھا، جبکہ بعض کتابوں میں بطور مثال حدیثیں بغیر سند کے مذکور ہوا کرتی تھیں، اسطرح کی کتابوں میں "تہذیب الکمال"، "میزان الاعتدال"، "تہذیب التہذیب" اور اسکے اخوات قابل ذکر ہیں۔

اقسام کتب جرح و تعدیل:-

اسماء رجال کی ان جملہ تالیفات کو دو بنیادی قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱- کتب عامہ (عام کتابیں)

۲- کتب خاصہ (خاص کتابیں)

کتب عامہ: ان کتابوں کو کہتے ہیں جن میں ہر قسم کے، ہر مقام اور ہر صفات کے

راویوں کاذکر ہو، خواہ وہ مغرب کے رہنے والے ہوں یا مشرق کے، صحابی ہوں یا تابعی، ثقہ ہوں یا ضعیف، کنیت سے معروف ہوں یا نام سے، لقب سے مشہور ہوں یا نسبت سے۔

کتب خاصہ: ان کتابوں کو کہتے ہیں جن میں کسی خاص صفت سے متصف راویوں کا تذکرہ ہو مثلاً صرف ثقہ راویوں کاذکر ہو، یا صرف ضعفاء کا ہو، یا کسی خاص مقام و جگہ کے راویوں کے حالات ہوں، یا کسی خاص کتاب، یا چند کتابوں میں وارد شدہ راویوں کا بیان ہو، یا صرف اصحاب کنی یا لقب یا مدلسین یا مختلطین کا تذکرہ ہو۔

کتب جرح و تعدیل کی جملہ اقسام اور جملہ کتابوں کا احاطہ بہت مشکل ہے، اس لئے یہاں صرف مشہور اُقسام اور ان میں معروف کتابوں کا تذکرہ کیا جارہا ہے، جس کا مقصد ان کا تعارف اور طریقۂ استفادہ بیان کرنا ہے نہ کہ ان کا احاطہ کرنا۔

پہلی قسم کتب عامہ

سب سے پہلے کتب عامہ کا تذکرہ کیا جارہا ہے، اس میں وہ ساری کتابیں بھی شامل ہیں جو سوال و جواب کی شکل میں بغیر کسی ترتیب کے تالیف شدہ ہیں جن کو اصطلاح میں "كتب الأسئلة" کہا جاتا ہے، ان میں کتب طبقات کو باعتبار موضوع شامل کیا گیا ہے جبکہ باعتبار تنظیم وترتیب وہ ایک قسم کی بھی حیثیت رکھتی ہیں۔ کتب تواریخ عامہ کی بعض قسمیں بھی موضوعی اعتبار سے اس میں شریک ہوسکتی ہیں، کتب عامہ میں جو کتابیں کافی شہرت یافتہ ہیں ان میں کچھ انتہائی اہم ہیں ان میں محمد بن سعد کی "الطبقات الكبرىٰ" امام بخاری کی "التاريخ الكبير" ابن ابی حاتم رازی کی "الجرح و تعديل" ابن جوزی کی "المنتظم" ابن کثیر کی "البداية والنهاية" امام ذہبی کی "تاریخ اسلام" جن میں اسمائے رجال کا بہت بڑا سرمایہ موجود ہے۔

۱- کتب سوالات

راویوں کے بارے میں بہت ساری بنیادی معلومات سوال وجواب کے ذریعے جمع کی گئی ہیں، اس فن سے دلچسپی رکھنے والے طالبان علوم نبوت بڑے بڑے ائمہ ونقادِ فن سے راویوں کے بارے میں سوالات کرتے تھے وہ حضرات ان کو جواب دیتے تھے سوال کرنے والے حضرات ان جوابات کو یاد کرلیتے تھے، اور جس کی مرضی ہوتی تھی اس کو تحریر کرلیتے تھے، اور پھر انکو کتابی شکل میں ترتیب دیتے تھے، یا بغیر ترتیب کے تحریر کرلیتے، یہ ترتیب سائل کے اپنے ذوق ومزاج کے مطابق ہوا کرتی تھی یا آسان ترکرنے کیلئے کسی خاص ترتیب پر مرتب کرلی جاتی تھی، انہیں کتابوں کو کتب الاسئلة (کتب سوالات) کہا جاتا ہے، یہ کتابیں اس فن کی انتہائی بنیادی کتابیں ہیں اور اس کی معلومات انتہائی دقیق ہوا کرتی ہیں، اس لئے ان کتابوں کی بڑی اہمیت ہے اور یہ بقامت کہتر اور بقیمت بہتر کی مصداق ہے۔ ان کتابوں میں سے کچھ یہ ہیں:

۱-سوالات محمدبن عثمان بن أبي شيبة لعلي بن المديني في الجرح والتعديل: یہ کتاب موفق بن عبد اللہ کی تحقیق سے مطبوع ہے، جس میں (۲۶۰) تراجم ہیں۔ جو بغیر ترتیب کے مرتب ہے لیکن آخر میں حروف معجم کے

ترتیب پر بڑی اچھی فہرست مرتب کردی گئی ہے جس سے استفادہ بالکل آسان ہو گیا ہے۔

۲- سوالات حمزه بن یوسف السهمی للدار قطنی وغیره من المشایخ فی الجرح والتعدیل: یہ کتاب بھی مذکور محقق کی تحقیق سے مطبوع ہے، جس میں (۴۱۳) تراجم ہیں۔ یہ کتاب بھی سابقہ کتاب کی طرح بغیر کسی ترتیب کے مرتب ہے۔ البتہ آخر میں فہرست لگادی گئی ہے جو حروف معجم پر ہے۔

۳- سوالات البرقانی للدار قطنی فی الجرح والتعدیل: یہ کتاب استاذ محترم ڈاکٹر عبدالرحیم قشقری کی تحقیق سے مطبوع ہے جس میں (۶۲۱) تراجم ہیں۔ یہ کتاب حروف معجم پر صرف پہلے حرف کے اعتبار سے مرتب ہے۔

کچھ "کتب سوالات" بلدان پر مرتب ہیں جو کتب عامہ میں نہیں، بلکہ کتب خاصہ میں شامل ہیں۔ (۱)

۲- کتب طبقات

کچھ کتابیں ایسی ہیں جو ترتیب و تنظیم کے اعتبار سے طبقات پر مرتب ہیں، لیکن موضوع کے اعتبار سے وہ بھی کتب عامہ میں شامل ہیں۔

کتب طبقات:- ان کتابوں کو کہتے ہیں جن میں راویوں کا تذکرہ ان کے احوال و واقعات اور روایتوں کا ذکر طبقہ در طبقہ مؤلف کے زمانہ تک کیا جائے۔ (۲)

طبقات کی یہ کتابیں ابتداء میں صرف حدیث کی خدمت کیلئے تالیف کی گئی تھیں، پھر کتب طبقات کا استعمال راویان اور غیر راویان سب کیلئے ہونے لگا تھا، اگرچہ علماء وفقہاء اور محدثین کے تراجم اس میں غالب رہے جیسے:

سیر أعلام النبلا امام ذہبی (متوفی ۷۴۸ھ) کی
تذکرۃ الحفاظ امام ذہبی (متوفی ۷۴۸ھ) کی
طبقات الحفاظ امام سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ) کی وغیرہ

---

(۱) مثلاً سوالات أبو عبید الآجری أبا داود السجستانی فی الجرح والتعدیل جو بتحقیق محمد علی قاسم عمری مطبوع ہے۔ جس میں (۶۰۳) تراجم ہیں۔ اور سوالات الحاکم للدار قطنی من مشائخ العراق۔ جو موفق بن عبداللہ کی تحقیق سے مطبوع ہے اس میں (۵۳۱) تراجم ہیں۔

(۲) الرسالة المستطرفة ص ١٠٤

اس طرح سے مخصوص صفات سے متصف لوگوں کو بھی کتب طبقات میں الگ الگ جمع کیا جانے لگا، مثلاً طبقات قراء، طبقات فقہاء، طبقات صوفیۃ، طبقات شعرا، طبقات اطباء، ادباء، نحات وغیرہ۔[1]

نیز فقہاء کو مذاہب کے اعتبار سے الگ الگ طبقات میں شامل کر کے کتابیں تصنیف کی گئی، مثلاً: طبقات الشافعیة الکبری امام سبکی (متوفی ۷۷۱ھ) کی۔

طبقات الحنابلة قاضی ابوالحسین محمد بن ابی یعلی (متوفی ۵۲۷ھ) کی۔

الجواهر المضیئة فی طبقات الحنفیة ابو محمد عبد القادر بن ابوالوفا محمد بن محمد بن نصر قریشی مصری (متوفی ۷۷۵ھ) کی۔

اور الدیباج المذهب فی معرفة أعیان علماء المذهب (طبقات مالکیہ) ابن فرحون مالکی (متوفی ۷۹۹ھ) کی۔

لیکن یہاں پر مفید اور مطلوب وہ ابتدائی کتابیں ہیں جو صرف راویان حدیث کیلئے تحریر کی گئی تھیں اگرچہ کہ بعد کے ان کتابوں میں بھی کچھ راویان کا نام مل سکتا ہے، خاص طور سے طبقات فقہاء اور طبقات صوفیہ میں۔

طبقات کی ان بنیادی کتابوں میں سے تین کتابیں:

الطبقات الکبری محمد بن سعد (متوفی ۲۳۰ھ)

الطبقات لخلیفة بن خیاط عصفری (متوفی ۲۴۰ھ)

الطبقات لامام مسلم بن حجاج قشیری (متوفی ۲۶۱ھ) کی کافی مشہور ہیں، جن کا مختصر تعارف مندرجہ ذیل ہے۔

۱ - الطبقات الکبری

تالیف: محمد بن سعد (متوفی ۲۳۰ھ)

تعارف: - یہ کتاب طبقات کی موجودہ کتابوں میں سب سے بہتر، جامع مشہور اور قدیم کتاب ہے۔ ان سے پہلے صرف واقدی (متوفی ۲۰۷ھ) اور ہیثم بن عدی

---

(۱) مثلاً طبقات القراء لخلیفة، طبقات الفقهاء للشیرازی، حلیة الأولیاء فی طبقات الاصفیاء ابونعیم اصبهانی وغیره

(متوفی ۲۰۷ھ) نے طبقات پر کتابیں تحریر کی ہیں۔

ترتیب :- یہ کتاب اس فن کی بنیادی کتاب ہے جس میں سیرت رسول، تذکرہ صحابہ و تابعین پر توجہ دی گئی ہے، یہ کتاب ترتیب زمانی و مکانی دونوں اعتبار سے مرتب ہے صحابہ کرام اور دیگر حضرات کو شہروں پر تقسیم کر کے طبقات پر مرتب کیا ہے، مثلاً مدنی صحابہ، پھر یہاں کے رہنے والے تابعین، تبع تابعین، مکی صحابہ اور مکہ میں رہنے والے تابعین، تبع تابعین۔ وعلی هذا القياس۔

یہ کتاب آٹھ جلدوں میں مطبوع ہے، لیکن مطبوعہ نسخہ ناقص ہے، بعض تراجم جو طبع کتاب کے وقت نہ مل سکے تھے اس کو چھوڑ کر بقیہ موجود کو طبع کر دیا گیا تھا، پھر جب یہ حصہ مل گیا تو اس کو ایک جلد میں الگ سے طبع کیا گیا جس کی تحقیق شیخ زیاد محمد منصور نے کی ہے، جو جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے مطبوع ہے۔

مطبوعہ جلدوں کے اعتبار سے موضوعات اس طرح منقسم ہیں:

پہلی اور دوسری جلد	سیرت نبوی
تیسری جلد	بدری صحابہ
چوتھی جلد	قدیم الاسلام صحابہ جو بدر میں شریک نہ ہو سکے تھے نیز وہ لوگ جو فتح مکہ سے قبل ایمان لائے۔
پانچویں جلد	اہل مدینہ کے صحابہ و تابعین نیز مکہ، طائف، یمامہ اور بحرین کے رہنے والے
چھٹی جلد	کوفہ میں رہنے والے صحابہ و تابعین۔
ساتویں جلد	اھل بصرہ، واسط، مدائن، خراسان، ری، ھمدان، قم، انبار، شام، جزیرہ، عواصم، ثغور، مصر، ایلۃ، افریقہ اور اندلس، میں رہنے والے صحابہ و تابعین وغیرہ۔
آٹھویں جلد	صرف صحابیات کیلئے مخصوص ہے۔[1]

نوعیت تراجم : اس کتاب میں صحابہ و تابعین کے تراجم کو مؤلف نے اپنے ہم

(۱) بحوث فی السنة ص ۷۸

عصروں کے بہ نسبت زیادہ تفصیل سے ذکر کیا ہے، اور چونکہ یہ انساب اور اخبار کے ماہر فن تھے لہٰذا اخبار وانساب کا تذکرہ غالب ہے، صاحب ترجمہ کے نام و نسب کے ساتھ ساتھ لقب وکنیت نیز اخلاقی حالت، علمی مقام، اداری کام، مفتی و قاضی ہونا، وغیرہ کی جانب اشارہ کیا ہے، مترجم لہ کی بعض روایتوں کو بذریعہ اسناد ذکر کیا ہے، قلت وکثرت روایت کی جانب بھی اشارہ کیا ہے۔(۱)

ترجمہ کے آخر میں راوی سے متعلق جرح و تعدیل کا بھی ذکر کیا ہے، جس کیلئے مختلف مراتب کے کلمات کا استعمال کیا ہے، اہل علم نے ان کے جرح و تعدیل کو قابل قبول اور قابل اعتماد بتایا ہے۔(۲)

علماء کی نظر میں:- اہل علم نے اس کتاب کی کافی تعریف کی ہے، خطیب بغدادی فرماتے ہیں کہ صنف كتابا فى طبقات الصحابة والتابعين والخالفين إلى وقته فاجاد فيه وأحسن.(۳) طبقات صحابہ تابعین اور اپنے زمانے تک گذرے ہوئے لوگوں پر ایک کتاب تصنیف کی ہے، جو انتہائی بہتر اور مفید ہے۔

امام ذہبی فرماتے ہیں کہ: "من نظر فى كتاب الطبقات خضع لعلمه"(۴) جو انکی کتاب طبقات کو دیکھے گا تو ان کے سامنے سر تسلیم خم کردے گا۔

طریقہ استفادہ:- کتاب سے استفادہ کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ان فہارس سے مدد لی جائے جو مطبوعہ نسخوں کے ہر جلد کے آخر میں مطبوع ہے اسکی ایک فہرست الگ سے بھی مطبوع ہے، جسکو شیخ محمد علی ادلبی نے ترتیب دیا ہے، اس فہرست میں کتاب کے دونوں طبعات کا حوالہ دیا ہے، جس سے کافی آسانی ہوتی ہے، اس ترتیب کا نام: "فهرسة الأعلام المترجمين فى الطبقات الكبرىٰ لابن سعد" ہے۔

۲- الطبقات لخليفة بن خياط

(متوفی ۲۴۰ھ)

تعارف و ترتیب - طبقات میں یہ دوسری بنیادی اور معروف کتاب ہے جسکو

(۱) الطبقات الكبرى (قسم متمم) ۶۰، ۶۶ مقدمہ محقق
(۲) الاعلان بالتوبيخ ص ۱۶۴ (۳) تاريخ بغداد ۳۲۱/۵
(۴) سير أعلام النبلاء ۶۶۵/۱۰

مؤلف نے بلدان کی ترتیب پر مرتب کیا ہے، جن شہروں میں اہل علم کی تعداد زیادہ اور روایتیں مشہور تھیں ان کو مقدم کیا ہے، لہٰذا اس میں کوئی جغرافی ترتیب نہیں ہے بلکہ ترتیب کافی پر پیچ ہے۔

جملہ صحابہ کو ایک طبقہ میں پھر تابعین و اتباع تابعین کو مختلف طبقات میں تقسیم کیا ہے، یہاں بھی سن وفات کے بجائے کثرت روایت و ملازمت کا خیال کیا ہے، یعنی کبار تابعین کا طبقہ وہ ہوگا جنہوں نے کبار صحابہ سے روایت کیا ہے۔

پھر صحابہ کو انساب پر مرتب کیا ہے، یعنی ایک خاندان و قبیلہ کے لوگوں کو اکٹھا کر دیا ہے، مثلاً قریش کے لوگ، بنی ہاشم کے لوگ وغیرہ

البتہ تابعین میں اس کا اہتمام نہیں کیا ہے، غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ تابعین و تبع تابعین کے زمانہ میں اسلام احرار و موالی، عرب و عجم میں منتشر ہو چکا تھا، اس لئے ان کا حسب و نسب ماننا مشکل تھا۔[1]

لہٰذا ابتدائی طبقات والے تراجم میں انساب کا ذکر کیا گیا ہے، اور جوں جوں طبقات متاخر ہوتے گئے ہیں، انساب کا ذکر کم ہوتا گیا ہے، یہاں تک کہ بعد کے طبقات میں نسبت صرف پیشہ اور شہروں تک محدود ہو گیا۔

نوعیت تراجم :- ترجمہ میں راوی کے نام و نسب کے ساتھ کنیت، جائے مقام، سفر علم، سن وفات، کا بھی ذکر کیا ہے، صحابہ کے تراجم میں ان کی کچھ روایتوں کا ذکر کیا ہے جس سے صحبت کا پتہ چلتا ہے، اس طرح سے غزوات و فتوحات میں شرکت، علمی و اداری کام کا تذکرہ بھی ہے، اساتذہ و تلامذہ کا ذکر شاذ و نادر ہی کیا ہے، دیگر احوال و واقعات کی جانب بھی کوئی خاص توجہ نہیں دی ہے، جیسا کہ ابن سعد نے کیا ہے، نیز جرح و تعدیل کے کلمات کا استعمال بھی نہیں کیا ہے جس سے افادیت کم ہو گئی ہے۔ حالانکہ راویان کے تراجم میں یہی لب لباب ہوتا ہے۔[2]

۳- الطبقات لمسلم بن الحجاج

(متوفی ۲۶۱ھ)

اس کتاب میں صرف صحابہ و تابعین کا سرسری ذکر ہے کسی کا تفصیلی ترجمہ

(۱) مقدمۃ الطبقات، ص ۳۱ مقدمہ محقق (۲) الطبقات ص ۳۸ مقدمۃ محقق

نہیں کیا ہے، پہلے صحابہ کرام کا ذکر شہروں کی ترتیب پر کیا ہے، سب سے پہلے مدینہ، پھر مکہ، اس کے بعد کوفہ، بصرہ، شام، مصر، یمن، اور پھر مختلف شہرون کا ذکر کیا ہے، پھر خواتین کو شہروں کی ترتیب پر مرتب کیا ہے، اس کے بعد تابعین کو ذکر کیا ہے،

فی الحال یہ کتاب مطبوع نہیں، اس کا ایک قلمی نسخہ سرائے احمد ثالث ترکی میں (۶۲۴) نمبر پر ۱۹ ورق میں موجود ہے۔(۱)

۳- کتب تاریخ

کتب تاریخ کی تاریخ :- کتب رجال کے ابتدائی تالیفی دور ہی سے محدثین نے اپنی ان کتابوں کو جو خالص راویان حدیث کے حالات بیان کرنے کیلئے تالیف کی تھیں "التاریخ" سے موسوم کیا ہے، چنانچہ امام علی بن عبد اللہ مدینی (متوفی ۲۳۴ھ) نے اپنی خالص رجال کی کتاب کو "التاریخ" کے نام سے موسوم کیا ہے، اس طرح سے امام یحیٰی بن معین (متوفی ۲۳۳ھ) کی کتاب کا نام "التاریخ" رکھا گیا ہے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تینوں کتابوں "التاریخ الکبیر"، "التاریخ الاوسط" اور "التاریخ الصغیر" کو تاریخ کے نام موسوم کیا ہے، امام ابن ابی خیثمہ (متوفی ۲۷۹ھ) نے اپنی کتاب کو "التاریخ" کا نام دیا ہے، اسی طرح امام احمد بن عبد اللہ عجلی (متوفی ۲۶۱ھ) کی کتاب کو کچھ لوگوں نے "تاریخ الثقات" کا نام دیا ہے، جس طرح سے امام ابو جعفر عقیلی (متوفی ۳۲۲ھ) کی ضعفاء کبیر کو "تاریخ الضعفاء" کہا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محدثین عظام راویان حدیث اور ان کے حالات کو تاریخ کا ایک جزء تصور کرتے تھے۔

ڈاکٹر اکرم ضیاء عمری فرماتے ہیں کہ غالباً اس کیوجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس میں بعض مترجمین کی تاریخ وفات اور ولادت مذکور ہوتی ہے۔(۲)

نیز اسکے علاوہ دیگر دقیق تاریخی معلومات بھی راویان حدیث کے حالات کے ضمن میں پائے جاتے ہیں مثلاً اداری امور جیسے کسی کا قاضی اور والی ہونا، کسی واقعہ اور حادثہ سے متعلق ہونا، غزوات و معارک میں شرکت کرنا، جس شہر کا رہنے والا ہے اسکی

(۱) بحوث فی تاریخ السنة المشرفة ص ۸۱ (۲) بحوث فی السنة المشرفة ص ۲۰۷

اور وہاں کے محلات کی معرفت جس قبیلہ سے متعلق ہے انکاذ کر وغیرہ پائے جاتے ہیں[1]

ویسے بھی ہر زمانہ میں پائے جانے والے افراد اس زمانہ کی تاریخ کا ایک حصہ ہوتے ہیں، یعنی کل پر جز کا اطلاق کیا گیا ہے، لہذا محدثین اس طرح کی کتابوں کو تاریخ میں شامل کرنے اور التاریخ سے موسوم کرنے میں حق بجانب ہیں۔

بعد کے محدثین وعلماء نے بھی رجال کو تاریخ کا ایک جزء قرار دیا ہے، امام سخاوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۹۰۲ھ) نے تو علم کو تاریخ کو فنون حدیث کی ایک قسم بتائی ہے۔[2]

حاجی خلیفہ اور طاش کبری زادہ نے بھی رجال کو علم تاریخ کا جز قرار دیا ہے۔[3]

کتب تاریخ کی قسمیں: عمومی تاریخ کی کچھ کتابیں ایسی بھی ہیں جن میں صرف حادثات وواقعات رونما ہوتے ہیں۔

اور کچھ دونوں کا مجموعہ ہوتی ہیں، لہذا عمومی تاریخ کی ان کتابوں کو تین قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ پہلی قسم ان کتابوں کی ہے جن میں صرف راویان حدیث کے بارے میں تفصیلی معلومات یا مختصر معلومات ہوتی ہے، دیگر حالات وواقعاتِ عالم قطعاً نہیں پائے جاتے، (حالانکہ ان کتابوں کے نام سے خصوصیات کا کوئی اظہار نہیں ہوتا ہے۔) اس طرح کی کتابوں میں یحییٰ بن معین کی کتاب "التاریخ"، امام بخاری کی "التاریخ الکبیر"، "التاریخ الاوسط"، اور "التاریخ الصغیر"، امام عجلی کی "تاریخ الثقات"، امام عقیلی کی "تاریخ الضعفاء" وغیرہ کافی معروف کتابیں ہیں۔

۲۔ دوسری قسم کی وہ کتابیں ہیں جن میں حالات وواقعاتِ زمانہ اور علماء ومحدثین دونوں کا ذکر کیا گیا ہے، لیکن حادثات وواقعات کی جانب توجہ کم دی گئی ہے۔ راویان حدیث ومحدثین کے حالات بیان کرنے اور ان کے ذکر خیر پر زیادہ توجہ دی گئی ہے، اس طرح کی کتابیں رجال حدیث کی معلومات کیلئے کافی مفید ہوتی ہیں، اس طرح کی کتابوں میں تین کتابیں کافی اہم ہیں۔ "المنتظم" ابن جوزی، "البدایۃ والنھایۃ" ابن

---

(۱) بحوث في السنة، ۲۰۸

(۲) الإعلان بالتوبيخ ص ٤٤ (۳) كشف الظنون، ۱/ ۲۷۱، ومفتاح السعادة ۲/ ۲۳۷

کثیر، ''تاریخ اسلام'' امام ذہبی۔

۳- تیسری قسم کی وہ کتابیں ہیں جن میں مختلف زمانہ کے حالات و واقعات اور حوادثات، ملوک و سلاطین، امراء، ووزراء کا ذکر تفصیل سے ہوتا ہے ان میں مشہور محدثین اور راویان حدیث کا تذکرہ شاذ و نادر اور ضمناً ہوتا ہے، جن میں ان کے سلسلہ میں کوئی خاص معلومات فراہم نہیں کی جاتی ہے صرف سن وفات کی جانب اشارہ ہوتا ہے، لہٰذا اس طرح کی کتابوں سے راویان حدیث، ائمہ جرح و تعدیل، فقہاء و محدثین کی معرفت میں کوئی خاص مدد نہیں ملتی، اس طرح کی کتابوں میں دو کتابیں کافی مشہور و معروف اور متداول ہیں، پہلی کتاب ''تاریخ الامم والملوك''، دوسری کتاب ''الکامل فی التاریخ'' ابن اثیر جزری کی ہے۔

کتب تاریخ کی پہلی قسم: کتب تاریخ کی پہلی قسم کی جو مشہور کتابیں ہیں ان میں سے کچھ کا ذکر ''کتب ثقات'' اور کتب ضعفائے رجال کے قسم میں آئے گا۔ دیگر مشہور کتابوں کا ذکر کیا جارہا ہے ان بنیادی کتابوں میں ایک کتاب ''التاریخ'' یحییٰ بن معین کی بھی ہے۔ جس کی ترتیب ڈاکٹر احمد نور سیف نے کی ہے۔ اس ترتیب میں چونکہ ہر قسم اور ہر جگہ کے راویوں کا ذکر ہے اسلئے یہاں اس لئے یہاں اس کا شامل کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ورنہ یہ کتاب اصلاً طبقات پر مرتب ہے۔

۱- التاریخ یحییٰ بن معین

(متوفی ۲۳۳ھ)

تعارف: جیسا کہ پہلے گذرچکا ہے کہ یحییٰ بن معین فن رجال کے شہسوار اور جرح و تعدیل کے امام وقت تھے، ساتھ ہی ساتھ کثرتِ حدیث، معرفتِ علل واسناد میں بے حد معروف و مشہور تھے، لہٰذا طالبان علوم نبوت جوق در جوق آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے، جو آپ کے سامنے زانوئے تلمذتہ کرتے اور اپنی علمی تشنگی بجھاتے۔

آپ کے ہونہار لائق شاگرد آپ سے رجال کے بارے میں سوالات کرتے، آپ ان کا جواب دیتے، ان سوالات میں رجال کے نام و نسب، متفق اسماء میں شخصیت کی تعیین، اصحاب کنی کے ناموں کی معرفت وغیرہ شامل ہوتی تھی، لیکن ان میں سب سے

اہم جوابات ان سوالوں کے ہوتے تھے جنکا تعلق راویوں کی توثیق یا تجریح سے ہوتا تھا۔

امام ابن معین نے اپنے ہاتھ سے اس فن میں کوئی کتاب تحریر نہیں کی ہے بلکہ وہ اپنے اقوال کی تدوین کو بطور ورع ناپسند کرتے تھے۔چنانچہ علامہ ابن رجب فرماتے ہیں کہ:وکان ابن معین یکرہ أن یدون کلامہ فی الجرح و التعدیل ولم یدون ھو شیئا [1] یعنی امام ابن معین جرح وتعدیل کے سلسلہ میں اپنے کلام کی تدوین ناپسند سمجھتے تھے نہ ہی انہوں نے اس فن میں کوئی کتاب لکھی ہے، لیکن ان کے شاگردوں نے وہ سارے جوابات تحریری طور پر جمع کرلیا جن کو انھوں نے راویان حدیث کے سلسلہ میں دیا، یہی جوابات جن کو شاگردوں نے تحریری طور پر جمع کیا ہے یحیٰی بن معین کے اس فن کی تصانیف تصور کئے جاتے ہیں اور جن لوگوں نے یہ تحریری جواب تیار کیا ہے وہ اس کتاب کے راوی سمجھے جاتے ہیں۔

علامہ ابن رجب فرماتے ہیں: إنما سألہ أصحابہ و دونوا کلامہ، منھم: عباس الدوری، و إبراھیم بن الجنید، و مضر بن محمد الغلابی، و عثمان بن سعید الدارمی، و یزید بن الھیثم. [2] یعنی ان کے شاگردوں نے ان سے سوالات کئے اور ان کے کلام کو جمع کیا جن میں عباس دوری، ابراہیم بن جنید، مضر غلابی، عثمان بن سعید دارمی، یزید بن ہیثم بھی ہیں۔

دکتور احمد نور سیف –حفظہ اللہ– نے اس طرح کی سولہ روایتوں کا ذکر تاریخ کے مقدمہ میں کیا ہے۔[3] لیکن ان میں پانچ روایتیں وہ زیادہ معروف اور اہم ہیں، وہ یہ ہیں:

۱- **روایت ابن محرز** : (احمد بن محمد قاسم بن محرز) یہ روایت" معرفۃ الرجال عن یحیٰی بن معین " کے نام سے موسوم ہے۔

۲-**روایت ابن جنید** : (ابواسحاق ابراہیم بن عبداللہ ختلی)جو"سوالات ابن الجنید لیحییٰ بن معین فی تجریح الرواۃ و تعدیلھم" کے نام سے موسوم ہے۔

۳- **روایت امام دارمی**: (عثمان بن سعید متوفی ۲۸۰ھ) یہ تاریخ عثمان بن

---

(۱) شرح علل الترمذی ۱۸۹ (۲) شرح علل الترمذی ص ۲۸۹

(۳) مقدمۃ التاریخ ۱/ ۱۳۹-۱۴۰

سعید الدارمی عن یحییٰ کے نام سے موسوم ہے۔

٤-روایت کوسج :(اسحاق بن منصور متوفی ۲۵۱ھ) یہ "سوالات اسحاق بن منصور" کے نام سے جانی جاتی ہے۔

٥- روایت الدوری : (ابوالفضل عباس بن محمد متوفی ۲۷۱ھ)[1]

یہی وہ روایت ہے جو: "التاریخ لیحییٰ بن معین" کے نام سے مشہور ہے۔

امام دوری : کا اسم گرامی ابوالفضل عباس بن محمد بن حاتم دوری ہے جو فی نفسہ ثقہ اور معتمد علیہ ہیں، امام نسائی نے ان کو ثقہ اور ابو حاتم نے صدوق کہا ہے، اصحاب سنن اربعہ نے ان سے روایت کی ہے۔[2] نیز فن جرح و تعدیل کے ناقدین میں شمار کئے جاتے ہیں۔[3]

یہ امام ابن معین کے خصوصی شاگردوں میں سے ہیں، ایک طویل مدت تک آپ کے ساتھ تھے، بسا اوقات سفر میں بھی ساتھ رہتے تھے، امام ابن معینؒ نے انکے بارے میں فرمایا کہ: "هو صديقنا و صاحبنا."[4] کہ وہ ہمارے شاگرد اور رفیق ہیں۔

اس رفاقت و دوستی اور طول ملازمت کی وجہ سے ان کی یہ روایت دوسروں کے مقابلے میں کافی ضخیم، متنوع، اور وسیع ہے اور چونکہ یہ روایت سب سے آخری روایت ہے، اسلئے سب سے زیادہ معتبر سمجھی جاتی ہے، خصوصیت کے ساتھ جن روایوں کے بارے میں ان کے مختلف اقوال ہیں، ان میں یہ روایت فیصلہ کن ہوتی ہے۔

امام دوری نے بہت سارے مقامات پر یحییٰ بن معین کے مقصد کی وضاحت کی ہے، اور بہت سارے راویوں پر تبصرہ کیا ہے، جس نے اس روایت کو چار چاند لگا دیا ہے۔[5]

امام یحییٰ بن معین کے اقوال جرح و تعدیل انتہائی اہم سمجھے جاتے ہیں، جس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ بڑے بڑے ائمہ نقاد نے آپ کے اقوال کو بطور شاہد بڑے اہتمام سے سندوں کے ذریعے ذکر کیا ہے، جرح و تعدیل کی کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جس میں آپ کے اقوال بطور استدلال مذکور نہ ہوں۔

تنظیم کتاب: -امام دوری نے اس کتاب کو اصلا طبقات پر شہروں کے اعتبار سے

---

(۱) مقدمة التاريخ ۱٤٩/۱ (۲) تهذيب التهذيب ۱۳۹/٥

(۳) ذكر من يعتمد قوله في الجرح والتعديل ص ۱۷۹ (نمبر ۲۸۳)

(٤) تهذيب التهذيب ۱۳۹/٥ (٥) ملاحظہ ہو ترجمہ بریدہ بن سفیان اور عمیر بن اسحٰق۔

مرتب کیا ہے، سب سے پہلے صحابہ کرامؓ پھر تابعین عظامؒ اور اس کے بعد دیگر راویان کا تذکرہ کیا ہے، جس کو آٹھ ابواب (عناوین) میں تقسیم کیا ہے۔[1]

وہ آٹھ ابواب یہ ہیں:

۱- اہل مکہ و طائف و یمن
۲- اہل مدینہ
۳- اہل کوفہ
٤- اہل بصرہ کی پہلی جماعت
۵- اہل بصرہ کی دوسری جماعت
٦- اہل خراسان
۷- اہل واسط و سواد، اہل مدائن و بغداد اور ان کے قرب وجوار والے۔
۸- اہل شام و مصر، اہل جزیرہ و رِقّة اور ان کے قرب وجوا۔ کے لوگ۔[2]

لیکن کہیں کہیں تداخل بھی پایا جاتا ہے۔

اس لئے کتاب سے معلومات کے حصول کیلئے کافی دقت اور پریشانی ہوتی تھی، خاص طور سے اس وقت بہت مشکل پیش آتی تھی جب راوی کا طبقہ معلوم نہ ہو۔

ترتیب جدید:- اس وجہ سے حافظ ابو سعید احمد بن محمد بن زیاد نے جو ابن الاعرابی (متوفی ۳۴۰ھ) کے نام سے مشہور ہیں، اسکو حروف معجم پر مرتب کیا تھا، لیکن یہ ترتیب مفقود ہو چکی ہے۔[3]

اس لئے اس کی جدید ترتیب، تحقیق، اور ترقیم ڈاکٹر احمد نور – اثابه الله – نے کی ہے یہ ترتیب حروف معجم پر نہایت دقت کے ساتھ مرتب ہے، جس سے استفادہ بہت آسان ہو گیا ہے، یہاں پر اس کتاب کو اسی ترتیب کے اعتبار سے کتب عامہ میں شمار کیا گیا ہے، ورنہ اصل کتاب کے اعتبار سے یہ "کتب طبقات" میں آتی ہے۔ یہ کتاب چار جلدوں میں مطبوع ہے۔[4]

پہلی جلد میں مؤلف اور کتاب پر جامع اور علمی مقدمہ ہے، دوسری جلد میں اصل کتاب کی ترتیب ہے، اور یہی جلد یہاں پر مقصود حقیقی ہے۔

طریقہ استعمال:- لہٰذا جس نام کے تلاش کی ضرورت ہو پہلے یہ دیکھ لیا جائے

---

(۱) التاریخ ۱/۱۷۰، مقدمہ محقق (۲) التاریخ ۱/۱۵۳ مقدمہ محقق
(۳) مقدمة التاریخ، ۱/۱۵٤
(٤) مرکز البحث العلمی وإحیاء التراث الإسلامی مکہ مکرمہ نے اس کو طبع کرایا ہے۔

کہ وہ کس حروف سے شروع ہوتا ہے، پھر اس حرف میں اس نام کا جو مقام ہو سکتا ہے وہاں پر اس کتاب کی دوسری جلد میں تلاش کریں، اگر وہ نام اس کتاب میں ہوگا تو فوراً دستیاب ہو جائے گا، تیسری اور چوتھی جلد اصل ترتیب (طبقات پر) مرتب ہے۔ لہٰذا اس میں تلاش کرنے میں بڑی مشقت اٹھانی پڑے گی۔

مصادر کتاب: -اس کتاب میں جو معلومات ہیں ان کے لئے یحییٰ بن معین نے دو مصادر کو بنیاد بنایا ہے

۱۔ اپنے مشائخ اور ان کے اساتذہ کی معلومات۔

۲۔ ذاتی معلومات جو اپنے ہم عصروں، ذاتی تجربوں اور اسانید کے جمع و ترتیب سے حاصل کیا تھا۔

مختلف اقوال میں فیصلہ کن: -امام ابن معین سے رجال کے بارے میں مختلف اوقات میں سوالات کئے تھے، اس لئے ان کے اقوال ان کے بارے میں مختلف ہو گئے، کبھی راوی کے بارے میں معلومات کچھ تھی، جب سوال کیا گیا تو وہی جواب دیدیا، بعد میں ان کے بارے میں معلومات میں اضافہ ہوا تو رائے بدل گئی۔[۱]

لہٰذا اس بارے میں آپ کی آخری رائے ہی قابل قبول ہو گی، اور وہ رائے امام دوری کی اس روایت میں موجود ہے۔

خصوصی مصطلحات: -الفاظ جرح و تعدیل کے سلسلے میں امام ابن معین کی کچھ خصوصی اصطلاحات ہیں جو دوسرے محدثین سے مختلف ہیں، چنانچہ وہ جب "لاباس بہ" کہتے ہیں تو اس کا مطلب "ثقہ" ہوتا ہے۔[۲] اور جب "مجہول" کہتے ہیں تو اس کا مطلب "جہالت حال" ہوتا ہے۔[۳] جب کہ محدثین اس سے "جہالت عین" مراد لیتے ہیں، اور جب امام ابن معین " لیس بشیئ" کہتے ہیں تو اس سے مراد قلت حدیث ہوتی ہے، ابن قطان فاسی کا یہی خیال ہے۔[۴] اور کبھی کبھی مجہول کے لئے بھی اس کو استعمال کیا ہے۔[۵]

---

(۱) ذکر من یعتمد قولہ فی الجرح والتعدیل (ص ۱۷۲) و مقدمۃ التاریخ ۱/ ۱۲۱

(۲) الکفایۃ فی علم الراویۃ ص ۲۲، و لسان المیزان ۱/ ۱۲

(۳) مقدمۃ التاریخ ۱/ ۱۱۹

(۴) ھدی الساری مقدمۃ فتح الباری ص ۴۲۱

(۵) مقدمۃ التاریخ ۱/ ۱۱۶

لیکن اس سے عموماً ضعف شدید ہی مراد ہوتا ہے، جیسے کہ عام محدثین کے یہاں ہے۔[۱]

بہر حال یہ کتاب اس فن کے اہم مصادر اور طالبان علم علونم نبوت کیلئے ایک نادر تحفہ ہے۔

۲-تاریخ کبیر

تالیف: امام بخاری (متوفی ۲۵۶ھ)

تعارف: -امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی یہ وہ مایہ ناز تصنیف ہے جس پر یہ امت جتنا فخر کرے کم ہے، فن وجرح وتعدیل کا یہ شاہکار اپنے فن میں سب سے پہلی موضوعی اور جامع کتاب ہے، جس کو مؤلف نے بذات خود تحریر کیا ہے۔

اسی وجہ سے اس کو فضل اسبقیت کیساتھ ساتھ اساسی حیثیت بھی حاصل ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخ کے نام سے تین کتابیں تالیف کی ہیں، تاریخ کبیر، تاریخ اوسط، اور تاریخ صغیر۔

ان میں سب سے اہم مقام "تاریخ کبیر" کو حاصل ہے، اس لئے کہ یہ کتاب ان دونوں کے مقابلہ میں جامع اور مفصل ہے، تاریخ کبیر اور تاریخ صغیر دونوں مطبوع ہیں، لیکن تاریخ اوسط کا مکتبات عالم میں ابھی تک صحیح پتہ نہیں چل سکا ہے۔

تاریخ اوسط و صغیر:- کچھ بزرگوں کا خیال ہے کہ وہ کتاب جو "تاریخ صغیر" کے نام سے مطبوع ہے وہی حقیقت میں "تاریخ اوسط" ہے، جیسا کہ طریقہ تالیف سے بھی پتہ چلتا ہے، ابن خیر اشبیلی کا یہی خیال ہے، کیونکہ انہوں نے "الضعفاء والمتروکین" کے بارے میں کہا ہے کہ " **وهو التاريخ الصغير له**" یعنی یہی ان کی تاریخ صغیر ہے۔[۲]

"تاریخ اوسط" کو انہوں نے سات اجزاء میں بتایا ہے، اور مطبوعہ "تاریخ صغیر" سات اجزاء میں مولف کی جزء بندی کے اعتبار سے پائی جاتی ہے، نیز اسکی جو سند ابن خیر اشبیلی نے ذکر کی ہے اس میں سے ایک سند بعینہٖ وہی ہے، جو مطبوعہ تاریخ

(۱) مقدمة التاريخ ۱/ ۱۱۷ (۲) فهرست ابن خير ص ۲۰۵، ۲۰۶

صغیر کی ہے،اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ "تاریخ صغیر" کے نام سے جو کتاب مطبوع ہے حقیقت میں وہی "تاریخ اوسط" ہے۔

واقعہ جو بھی ہو امام بخاریؒ نے اپنی اس کتاب کو حسب عادت تین بار میں آخری شکل دی ہے۔[۱]

اہل علم کی نگاہ میں :- جب یہ تالیف منظر عام پر آئی تو علمی حلقہ میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، محدثین نے اس کو بڑی حیرت واستعجاب سے دیکھا،اس زمانے میں وہ یہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ اتنی عظیم کتاب اس طرح ترتیب کے ساتھ تالیف کی جا سکتی ہے، جس میں روایان حدیث کے مجموعی حالات یکجا مل سکیں، چنانچہ جب اس کتاب کی خبر آپ کے استاد اسحٰق بن راھویہ کو ہوئی (جن کے مشورہ سے آپ نے جامع صحیح لکھی تھی،) تو ان کے حیرت وخوشی کا یہ عالم تھا کہ وہ امیر وقت عبد اللہ بن طاہر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ اے امیر! کیا میں آپ کو کوئی جادو نہ دکھاؤں پھر انہوں نے ان کے سامنے "تاریخ کبیر" رکھ دی۔[۲]

ابو احمد حاکم نے فرمایا ہے کہ "إنه لم يسبق إليه ومن ألف بعده في التاريخ أو الأسماء أوا لكنى لم يستغن عنه" اس طرح کی کوئی کتاب اس سے پہلے نہیں دیکھی گئی ہے، اور جس نے بھی آپ کے بعد راویان کی تاریخ واسماء رجال میں تالیف کیا ہے وہ آپ کی کتاب کا محتاج رہا۔[۳]

آگے فرماتے ہیں: "فمنهم من نسبه إلى نفسه مثل أبي زرعة و أبي حاتم و مسلم، ومنهم من حكاه عنه فا لله يرحمه فانه أصل الأصول"

ابو العباس بن سعید کہتے ہیں کہ: اگر کوئی شخص تیس ہزار حدیثیں بھی لکھ ڈالے تو امام بخاری کی کتاب تاریخ کبیر کا محتارج رہے گا۔[۴]

---

(۱) تاریخ بغداد، ۲/۷

(۲) طبقات الشافعية ۲/۷ ، مقدمة فتح الباری ص ٤٨٤، تاریخ بغداد ۲/۷

(۳) طبقات الشافعية ۲/۸ اسی طرح کا قول کتانی نے سبکی کی جانب منسوب کیا ہے۔(الرسالة المستطرفه ص ۹٦/) بظاہر ایسا لگتا ہے کہ یہ نقل کی غلطی ہے کیونکہ طبقات شافعیہ میں امام سبکی نے یہ قول ابو احمد حاکم سے نقل کیا ہے۔

(٤) تهذيب التهذيب ۹/٤٨، تاريخ بغداد ،۲/۸

اہم خصوصیت:- جس وقت آپ نے یہ کتاب تالیف کی اس وقت آپ کی عمر اٹھارہ سال کی تھی،[1] اور سب سے اہم عجوبہ یہ ہے کہ آپ نے اس کتاب کو چاند کی روشنی میں روضۂ اطہر کے پاس بیٹھ کر تحریر کیا ہے، آپ کا فرمان ہے کہ جتنے بھی نام اس کتاب میں موجود ہیں تقریباً ہر ایک کے بارے میں میرے پاس کوئی نہ کوئی واقعہ اور قصہ موجود ہے، لیکن کتاب کے طویل ہونے کے خوف سے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔[2]

تنظیم اور نوعیت:- امام بخاری نے اس کتاب کو چار جلدوں میں تقسیم کیا ہے، پھر ہر جلد کو دو حصوں میں منقسم کیا ہے، مطبوعہ نسخہ طابع کی تجلید کے اعتبار سے آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے، اس کی ہر دو جلدیں امام بخاری کی جلد بندی کے اعتبار سے ایک جلد ہوتی ہے، یعنی مطبوعہ جلدوں میں پہلی اور دوسری جلد امام بخاری کی جلد بندی کے اعتبار سے پہلی جلد ہے، اس طرح سے تیسری چوتھی، پانچویں چھٹی، ساتویں اور آٹھویں، بالترتیب دوسری، تیسری اور چوتھی جلد اس طرح سے ہے:

مولف کی جزء بندی	واقسام	مطبوعہ جزبندی
۱	۱	۱
۱	۲	۲
۲	۱	۳
۲	۲	۴
۳	۱	۵
۳	۲	۶
۴	۱	۷
۴	۲	۸

یہ کتاب کتب جرح و تعدیل کے نوعیت کے اعتبار سے کتب عامہ میں شامل ہے، اس لئے کہ امام بخاری نے اس میں ہر قسم کے راویوں کا تذکرہ کیا ہے، چاہے وہ ثقہ ہوں یا ضعیف، صحابی ہوں یا تابعی، حجاز کے رہنے والے ہوں یا عراق کے، اس کتاب میں مطبوعہ نسخہ کے نمبرات کے اعتبار سے کل بارہ ہزار تین سو پندرہ افراد کا

---

(۱) طبقات الشافعية، ۲/ ۵ هدى السارى، ص ٤٨٤

(۲) تاريخ بغداد، ۲/ ۷، سير أعلام النبلاء ۱۲/ ٤۰۰

تذکرہ پایا جاتا ہے۔

بطور تتمہ "کتاب الکنی" بھی تحریر فرمائی ہے، جس میں ان راویوں کا ذکر ہے جو اپنی کنیت سے زیادہ مشہور ہیں، اس میں تقریباً ایک ہزار افراد کا تذکرہ ہے۔[1]

یہ کتاب کی آٹھویں جلد کے آخر میں مطبوع ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کتاب میں سب سے پہلے رسول پاک ﷺ کا ذکر کیا ہے، آپ کے اسم پاک کی مناسبت سے ان سارے راویوں کا تذکرہ بھی یہیں کر دیا ہے، جن کا نام محمد ہے۔

ترتیب:۔ اس کے بعد پوری کتاب کو حروف معجم (اب ت ث) کی ترتیب پر مرتب کیا ہے،[2] اس لئے سب سے پہلے بابِ الف کا ذکر ہے اس باب میں ان سارے راویوں کا ذکر ہے، جن کا نام حرف الف سے شروع ہوتا ہے، اس میں کسی خاص ترتیب کا لحاظ نہیں کیا گیا ہے، یوں لگتا ہے کہ جن کے نام بکثرت استعمال ہوتے ہیں، ان کو مقدم کیا ہے، اور جس نام میں بہت سے افراد مشرک ہیں ان کو ایک باب کے ضمن میں اکٹھا ذکر کر دیا ہے۔ مثلاً باب ابراہیم میں وہ سارے راوی موجود ہوں گے جن کا نام ابراہیم ہے، اور باب اسماعیل میں وہ راوی ملیں گے جن کا نام اسماعیل ہے، پھر ان ناموں کو ان کے والد کے نام کی ترتیب پر مرتب کیا ہے، یعنی باب ابراہیم میں ان راویوں کا نام پہلے ملے گا جن کے والد کا نام حرف الف سے شروع ہوتا ہے، اس کے بعد وہ ابراہیم نامی راوی ہوں گے جن کے والد کا نام حرف ب سے شروع ہوتا ہے۔ وعلی هذا القياس .

سارے حروف میں امام بخاری نے صحابہ کے نام کو ۔ اگر اس نام کے صحابی ہیں تو ۔ مقدم رکھا گیا ہے، اسکے بعد ہی دوسرے راویوں کا نام لکھا ہے، ہر حرف میں مشترک اسماء کے ذکر کرنے کے بعد اس حرف کے آخر میں مفردات، (یعنی وہ راوی جس نام کا کوئی دوسرا راوی نہ ہو) اور مبہمات کا تذکرہ "ومن أفناء الناس" کے زیر عنوان کیا ہے۔

---

(۱) اس طرح سے اس کتاب میں جملہ راویوں کی تعداد تقریباً سوا تیرہ ہزار ہوتی ہے، حالانکہ علامہ کتانی نے کہا ہے کہ ان کی تعداد تقریباً چالیس ہزار ہے، جو بظاہر غلط اندازہ ہے۔ دیکھئے الرسالة المستطرفة ص ۹۶

(۲) تاریخ کبیر ۱/۱۱

چونکہ کتاب بنیادی اعتبار سے حروف معجم پر مرتب ہے، اسلئے استفادہ قدرے آسان ہے، لیکن چونکہ ترتیب میں صرف پہلے حرف کا اعتبار کیا گیا ہے، لہٰذا نام کی تلاش میں کچھ وقت لگتا ہے، کتاب کے آخر یا شروع میں موجودہ فہرست سے مدد لینے میں مزید سہولت سے مطلوبہ نام دستیاب ہو سکتا ہے، راوی کا نام جس حرف سے شروع ہوتا ہے، اس میں تلاش کرنے سے بسہولت مطلوب تک پہنچا جا سکتا ہے۔

نوعیت تراجم:- ترجمہ میں عموماً راوی کے نام و نسب، نسبت و کنیت کا ذکر کیا ہے، نیز اس کے مقام و زمانے کی تحدید کی بھرپور کوشش کی گئی ہے، کبھی کبھی سن وفات کا ذکر صراحت یا کسی واقعہ کی جانب اشارے سے کیا ہے۔

اسی طرح سے راوی کے بعض شیوخ و تلامذہ کا بھی ذکر کیا ہے اور کہیں کہیں بطور مثال ایک یا ایک سے زائد روایت کا بھی تذکرہ کیا ہے، جنکی تعداد تقریباً چار ہزار ہے۔

اس کتاب میں عموماً تراجم متوسط ہیں، جب کہ کہیں کہیں بہت مختصر بھی ہو گئے ہیں، بلکہ بعض اوقات کوئی خاص معلومات نہیں رہتی۔

کلمات جرح و تعدیل میں تورع:- امام بخاریؒ کے تقویٰ و پرہیز گاری کا اس کتاب کی تالیف پر بہت گہرا اثر پڑا ہے، اسی لئے الفاظ جرح و تعدیل کو بڑے محتاط انداز میں استعمال کیا ہے، عموماً آپ نے معتدل کلموں کا استعمال کیا ہے، جس سے راوی پر حکم معلوم ہو جائے مثلاً جرح کیلئے آپ کہتے ہیں کہ فيه نظر، سكتوا عنه اور تعدیل کیلئے ثقة، حسن الحديث، آپ کا سب سے شدید کلمہ جو جرح کیلئے استعمال کیا ہے وہ منكر الحديث کا کلمہ ہے۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ: جو شخص امام بخاریؒ کے کلام کو جرح و تعدیل کے بارے میں غور سے دیکھے گا وہ خود بخود سمجھ لے گا کہ امام بخاری نے کس طرح احتیاط و بچاؤ سے کام لیا ہے، عموماً آپ نے سكتوا عنه، فيه نظر، تركوه، جیسے کلمات کا استعمال کیا ہے، بہت کم كذاب یا وضاع کا اطلاق کیا ہے بلکہ كذبه فلان، رماه فلان، یعنی بالكذب کہہ کر کام چلا لیا ہے۔[1]

(۱) مقدمة فتح الباری ص ۴۸۰، نیز ملاحظہ ہو طبقات الشافعية ۹/۲

مسکوت عنه کا حکم:- اس کتاب میں بہت سارے تراجم ایسے بھی پائے جاتے ہیں جن میں آپ نے جرح وتعدیل کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ بلکہ سکوت اختیار کیا ہے، کچھ علماء نے سکوت بخاری کو تعدیل پر محمول کیا ہے، حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ بعض بڑے بڑے ائمہ پر امام بخاری نے سکوت اختیار کیا ہے۔ مثلاً امام شافعی، امام احمد بن حنبل، احمد بن اشکاب وغیرہ جب کہ اس کے بر خلاف کہیں کہیں مشہور ضعفاء پر بھی سکوت اختیار کیا ہے جیسے محمد بن اشعث بن قیس کندي ومحمد بن ابراہیم یشکری۔ اور کہیں کہیں ایسے لوگوں پر سکوت اختیار کیا ہے جن کے تعیین میں شبہ ہے مثلاً محمد بن قیس اسدی، محمد بن قیس مکی، محمد بن کلیب مدینی[1]

امام مزی نے عبدالکریم بن ابی مخارق کے ترجمہ میں امام بخاری کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "من لم ابین فیه جرحاً فهو علی الاحتمال" [2] کہ میں نے جن پر جرح کی وضاحت نہیں کی ہے تو وہ محتمل ہیں۔ (یعنی ثقہ اور غیر ثقہ دونوں ہو سکتے ہیں۔)

لہٰذا یہ کہنا صحیح نہیں کہ جن راویوں پر امام بخاری نے سکوت اختیار کیا ہے وہ ثقہ ہیں، بلکہ ایسے راویوں پر حکم کیلئے دوسروں کے اقوال کو معلوم کرنا پڑے گا، اور ان کے حالات کی بنیاد پر صحیح حکم لگانا پڑے گا۔

مصادر کتاب:- اس کتاب میں امام بخاریؒ نے جمع مواد کیلئے اپنی ذاتی معلومات پر اعتماد کیا ہے، نیز اپنے اساتذہ اور ان کے واسطہ سے انکے مشائخ کے اقوال سے بھی استدلال کیا ہے، مثلاً ابن مبارک، یحییٰ بن سعید قطان، عبدالرحمٰن بن مهدی، یحییٰ بن معین، امام احمد بن حنبل، وغیرہ، جس سے کتاب کی اہمیت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔

خصوصی اصطلاح:- بعض کلمات جرح وتعدیل جو آپ نے اس کتاب میں استعمال کیا ہے وہ عام محدثین کے استعمال سے جدا ہیں، جن کی معرفت ضروری ہے، مثلاً جب آپ کسی راوی کے بارے میں کہتے ہیں کہ "فیہ نظر" تو اس سے مراد "متروک" لیتے ہیں۔ قریب قریب یہی معاملہ "سکتوا عنہ" کا بھی ہے[3] اور جب "منکر الحدیث" کہتے ہیں تو اسکا مطلب یہ ہوتا ہے کہ راوی سے روایت کرنا جائز نہیں بلکہ وہ متروک ہے۔[4]

---

(۱) رواة الذین سکت عنهم ائمة الجرح وتعدیل ص ۳۳-۳۴ (۲) مصدر سابق ص ۱۳۷
(۳) میزان الاعتدال ۱/ ۴۱۶ (۴) میزان الإعتدال ۱/ ۶،۲/۲۰۲

استاذگرامی ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن فرماتے ہیں کہ: امام بخاریؒ کے قول "فیہ نظر" سے "متروک" ہی مراد لینا یہ عام قاعدہ نہیں، اس طرح سے جب وہ "منکر الحدیث" کہتے ہیں تو اس سے ہمیشہ " لا تحل الروایة عنه" (متروک) ہی مراد لینا درست نہیں، بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ راوی اس صورت متروک ہوتا ہے جب منفرد ہو، اسی وجہ سے بعض راویوں کو جس پر "منکر الحدیث" کا اطلاق کیا ہے، اس کو ضعفاء میں نہیں ذکر کیا ہے۔[1]

اور جب کسی راوی پر لفظ "صدوق" کا اطلاق کیا ہے، تو اس سے مراد "ثقہ" لیا ہے۔[2]

تاریخ کبیر پر ائمہ کا نقد اور اسکی حیثیت:- ائمہ جرح وتعدیل کے کچھ عالی مرتب و صاحب نقد و بصیرت علماء نے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب تاریخ کبیر پر نقد کیا ہے، اور آپ کی لغزشوں کو جمع کیا ہے۔

استاد محترم ڈاکٹر سعدی ہاشمی کی تحقیق کے مطابق سب سے پہلے یہ کام ابوزرعہ رازی نے ایک منفرد تالیف میں کیا ہے، اس کے بعد امام ابو حاتم رازی نے دوسری منفرد تالیف میں کیا ہے، پھر امام ابن ابی حاتم نے ان دونوں ائمہ کی تالیف کو یکجا کر کے اور اپنی معلومات کے سہارے سے الگ تیسری تالیف بنائی، ہے اور اس کو اسی نام سے موسوم کیا ہے جس نام سے امام زرعہ نے موسوم کیا تھا۔[3]

استاد گرامی نے جن نصوص کا سہارا لے کر یہ ثابت کیا ہے کہ ان تینوں ائمہ کی الگ الگ اس سلسلے میں تصانیف ہیں، بظاہر وہ نصوص اس مدعا پر دلالت سے قاصر ہیں، لیکن واقعہ جو بھی ہو تینوں نے الگ الگ تصنیف کر کے لغزشات کی گرفت کی ہو یا ان لوگوں نے اشارہ کر دیا ہو اور ابن ابی حاتم نے جمع کیا ہو، سب کا خلاصہ یہ ہے کہ "ری" کی تین اہم شخصیتوں نے اس عظیم کتاب پر نقد کی ہے، اور جو تالیف اس سلسلہ میں کی ہے، اس کا نام رکھا ہے " بیان خطاء أبی عبد الله البخاری فی تاریخه" اس سے ملتی جلتی گرفت امام خطیب بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کی ہے، جس کتاب کا نام انہوں نے " الموضح لأوهام الجمع التفریق" رکھا ہے، ان لغزشوں کی تعداد

---

(۱) دراسات فی الجرح و التعدیل ص ۲۶۷ (۲) مصدر سابق
(۳) ابو زرعة الرازی وجهوده فی السنة ۱/ ۱۸۹- ۱۹۰

اس کتاب میں اسی ہے۔

یہ غلطیاں فی نفسہ درست بھی ہوں تو اتنی عظیم کتاب میں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے، چہ جائے کہ اکثر و بیشتر غلط الزام اور سوء فہم پر مبنی ہے، جس کتاب میں تقریباً بارہ ہزار تراجم موجود ہوں جس میں بیشمار مشترک اسماء ہوں جو ایکدوسرے کے ہم طبقہ ہوں، اور اکثر و بیشتر اساتذہ و شاگرد میں مشترک ہوں، پھر ان کے اخبار و واقعات متعدد و متشابہ ہوں، اس میں غلطی و تسامح نہ ہو، جوئے شیر لانے کے مترادف ہے، ناظرین امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول پر ذرا غور کریں، "قل اسم فی التاریخ إلا وله عندی قصة "(۱) تاریخ میں بہت کم ایسے نام ہیں جن کے متعلق میرے پاس کوئی قصہ نہ ہو تو یہ اندازہ ہوگا کہ کتاب کس بحر بیکراں کے لؤلو آب دار کا مجموعہ ہے، "والکامل من عدت سقطاته" خود امام ابن ابی حاتم اور خطیب بغدادی کی کتاب میں اس طرح کی غلطیاں موجود ہیں، جس کا نمونہ شیخ یمانی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔(۲)

امام خطیب بغدادیؒ نے اپنی اس کتاب میں امام بخاری سے ائمہ مذکورین کے الزامات کا دفاع کرتے ہوئے یہ غرض کیا ہے کہ اکثر و بیشتر غلطیاں جو امام بخاری کی طرف منسوب کی گئی ہیں، وہ ان پر صادق نہیں آتیں، ان لوگوں نے امام بخاری کی تاریخ سے کچھ چیزیں ایسی نقل کی ہیں جو ان کے بیان کے بر خلاف اس میں بالکل درست شکل میں موجود ہیں۔(۳)

شیخ عبدالرحمٰن بن یحییٰ معلمی یمانی نے "تاریخ کبیر" و "جرح تعدیل" کا بغائر مطالعہ ہی نہیں کیا ہے، بلکہ ان کی تحقیق کی ہے اور ان پر تعلیق تحریر فرمائی ہے، انہوں نے بھی امام بخاری کی طرف سے مناسب دفاع کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: امام بخاری کا یہ فرمان ہے کہ " صنفت جمیع کتبی ثلاث مرات" اس کا بظاہر مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ تصنیف کرنے کے بعد دوبارہ اس میں حذف و اضافہ کیا ہے، اور سہ

---

(۱) تاریخ بغداد ۲/ ۷ ، کشف الظنون ۱ / ۲۱۷

(۲) جرح وتعدیل کا مقدمہ نیز ملاحظہ ہو الموضح لأوهام الجمع والتفريق مقدمه محقق

(۳) الموضح لأوهام الجمع والتفريق ۱/ ۷-۸

بارہ اس کی تحقیق و تدقیق ہوئی ہے، ایسا لگتا ہے کہ کتاب کا پہلا نسخہ ان ائمہ ثلاثہ ابو حاتم وابوزرعہ اور ابن ابی حاتم کے ہاتھ لگا، آخری نسخہ نظر سے نہی گذرا، اس لئے امام بخاری کی تحقیق و تدقیق سے پہلے جو غلطیاں تھیں اس کو ان لوگوں نے شمار کرلیا جبکہ بعد کا نسخہ جو ان غلطیوں سے پاک تھا، اس کو انہوں نے نہیں دیکھا، لہٰذا اکثر و بیشتر اعتراضات ان پر وارد نہیں ہوتے۔

خطیب بغدادی فرماتے ہیں کہ: "نظرت فيه فوجدت كثيراً منها لاتلزمه ،وقد حكى عنه في ذلك الكتاب أشياء مدونة في تاريخه على الصواب بخلاف الحكاية عنه"[۳]

علامہ معلّمی فرماتے ہیں کہ: خطیب بغدادی نے جو عرض کیا ہے کہ بہت سی ایسی غلطیاں اس کتاب میں جمع کردی گئی ہیں جو امام بخاری کی کتاب میں نہیں ہے، اس سے اسکی تائید ہوتی ہے کہ "تاریخ کبیر" کا جو صحیح ترین نسخہ تھا وہ ان کو دستیاب نہ ہو سکا۔[۱]

حالانکہ جس کو خطیب بغدادی اور دوسرے ائمہ نے غلط تصور کیا ہے، کوئی ضروری نہیں کہ وہ مبنی بر حقیقت ہوں، اس کتاب میں بھی تقریباً خطیب بغدادی سے وہی دھوکہ ہوا ہے جو ائمہ ثلاثہ سے ہو چکا ہے، جس طرح سے ان حضرات کے پاس اس کتاب کا پہلا نسخہ تھا، جو عقیل بن عباس الصائغ کے واسطہ سے ملا تھا، اسی طرح سے خطیب بغدادی کے پاس جو نسخہ تھا وہ آخری نسخہ نہیں تھا بلکہ تصنیف کا دوسرا نسخہ تھا جس میں بھی کچھ خامیاں رہ گئی تھیں، یہ نسخہ ابو احمد محمد بن سلیمان بن فارس دلال، نیساپوری (متوفی ۳۱۲ھ) کا نسخہ تھا، اس کا اندازہ کتاب کے آخری (تیسرے) نسخے سے ہوتا ہے، جو محمد بن سھل بن کردی کی روایت ہے، جس میں اکثر و بیشتر وہ غلطیاں نہیں ہیں جس کو امام خطیب نے اپنی کتاب الموضح میں شمار کیا ہے۔[۲]

امام بخاریؒ کی کتاب میں جو اشارات پائے جاتے ہیں ان کا سمجھنا چنداں آسان نہیں ہے، طالب علم کی توجہ اور اس کی فہم و فراست کو متنبہ کرنے کیلئے اس طرح کے

---

(۳) الموضح لأوهام الجمع ۱/ ۷-۸

(۱) الموضح لأوهام الجمع مقدمه محقق ۱/ ۱۱

(۲) الموضح لأوهام الجميع والتفريق مقدمه محقق ۱/ ۱۱-۱۲

اشارے امام بخاری کی کتابوں میں بہت پائے جاتے ہیں، یعنی امام بخاری پر نقد عدم فہم کی بنا پر بھی ہو گیا ہے۔

مثال کے طور پر ایک جگہ امام بخاری نے اپنے استاذ محمد بن ابی اسحٰق بن ابی یعقوب کا ترجمہ یوں کیا ہے: "محمد بن إسحٰق هو ابن أبي يعقوب الكرماني مات سنة أربع وأربعين. پھر باب محمدیین میں ان کا ترجمہ دوسری جگہ یوں ذکر کیا ہے کہ: محمد بن أبي يعقوب أبو عبد الله الكرماني سمع حسان بن إبراهيم.

یہ راوی محمد بن ابی یعقوب سے مشہور ہیں، اس لئے ان کا ترجمہ امام بخاری نے مشہور نام کی جگہ پر ذکر کیا ہے، لیکن چونکہ اصل نام محمد بن اسحٰق بن ابی یعقوب ہے، اس لئے وہاں بھی ذکر کر دیا تاکہ یہ نام ہر اس شخص کو مل جائے جس کو جو نام معلوم ہو، پہلے مقام پر آپ دیکھئے کس طرح سے آپ نے لفظ "هو" سے ایک لطیف اشارہ کر دیا ہے، اب جن لوگوں نے یہ تصور کیا کہ یہ امام بخاری سے وہم ہو گیا ہے، کہ انہوں نے ایک راوی کو دو سمجھ لیا ظاہر بات ہے یہ ان کی غلط فہمی ہے نہ کہ امام بخاری کی غلطی ہے، کیا امام بخاری اپنے استاد کو بھی نہ پہچان سکے، اور اور ان کو دو جگہوں پر ذکر کر دیا۔ حاشا وکلا.

ناظرین ذرا امام بخاری کا یہ قول بھی "تاریخ کبیر" کے سلسلے میں ملاحظہ کریں، جس میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ تاریخ کبیر کا سمجھنا آسان نہیں، آپ فرماتے ہیں: لو نشر إسنادي، هو لاء لم يفهموا كيف صنفت التاريخ[1] اگر ہماری اسناد واضح کر دی جائیں تو بھی لوگ نہیں سمجھ سکتے کہ میں نے اسکو کس طرح تصنیف کیا ہے۔

علامہ معلّمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ امام بخاری کا منہج ہے کہ اگر راوی دو طرح سے مشہور ہے اور ترتیب کے اعتبار سے دو جگہ ان کا ذکر آتا ہے، تو ان دونوں جگہوں پر کرتے ہیں۔

کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ ناقد نے نقد ضرور کیا لیکن اس میں وہ حق بجانب نہیں، بلکہ حق امام بخاری کی طرف ہے، مثال کے طور پر ایک راوی محمد بن ابراہیم

---

(۱) تاريخ بغداد ۲/۷ بعض روایتوں میں "لو نشر بعض استادي هولاء" غالبا جسکا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اگر ہمارے بعض اساتذہ بھی اسکو کھولیں تو وہ سمجھ نہیں سکتے کہ میں نے تاریخ کی کس طرح تصنیف کی ہے۔

الہاشمی ہیں، امام بخاری نے پہلے ان کا ترجمہ ذکر کیا ہے، اور فرمایا ہے" سمع إدريس بن يزيد الأؤدی مرسلا، سمع منه حرمی بن عمارة"[1] پھر آپ نے چند ناموں کے بعد دوسر امتشابہ ترجمہ اسطرح ذکر کیا ہے" محمدبن إبراهيم بن عبدالله بن معبد بن عباس الهاشمي القرشي: اعداده فی أهل المدينة سمع منه ابن أبی إدريس وأخوه يروی عن حرام ولم يثبت حديث حرام.[2]

آپ اندازہ لگائیے کہ کس دقت کے ساتھ دوسرے ترجمہ کو امام بخاری نے ذکر کیا ہے، جبکہ خطیب بغدادی کا دعویٰ ہے کہ دونوں ایک راوی ہیں جن کو امام بخاری نے دو جگہ ذکر کیا ہے، حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ دونوں دو راوی ہیں، ایک کے استاد وشاگرد سب عراقی ہیں، اور دوسرے کے شاگرد و استاد سب حجازی ہیں، امام بخاری نے " اعداده فی أهل المدينة " کہہ کر خلاصہ کردیا ہے، امام ابو حاتم، ابن ابی حاتم اور ابن حبان نے ان کو دو ہی شمار کیا ہے، ظاہر بات ہے یہ نقد بالکل بیجا ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ امام بخاری نے کسی سے جیسے سنا ویسے ذکر کردیا ہے، اب اگر غلطی ہے تو یہ امام بخاری کی نہیں بلکہ ان سے اوپر بیان کرنے والے کی ہے، بطور مثال ایک راوی ہیں جنکا نام ابراہیم بن شعیث ہے، لیکن امام بخاری نے ابن شعیب کہا ہے، جن سے ابن وھب نے روایت کیا ہے، امام بخاری نے اس ترجمہ کے بارے میں فرمایا ہے کہ "قاله الأ ويسی "[3] کہ اویسی نے ایسے ہی بتایا ہے، یعنی ابراہیم بن شعیب" تو یہاں اصل غلطی امام بخاری کی نہیں بلکہ استاد کی ہے، اب اسکو امام بخاری کیطرف سے منسوب کرنا درست نہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ امام بخاری کو یہ نقطہ معلوم تھا، اسی لئے آپ نے وہاں ایک لطیف اشارہ "قاله الأويسی" کہہ کر کردیا ہے۔

حافظ ابو علی فرماتے ہیں کہ: امام بخاری کے ساتھ کبھی یہ مشکل پیش آگئی کہ اہل بخارا کے جو لوگ عراق سے معلومات لیکر آئے تھے تو امام بخاری انکی کتاب لیکر مطالعہ کیا کرتے تھے، جس راوی کے بارے میں آپ کو معلومات نہیں رہتی تھی اس

---

(۱) تاریخ کبیر ۱/ ۷۰ (۲) مصدر سابق ۱/ ۷

(٤) تاریخ کبیر ۱/ ۲۹۲

کتاب سے نقل کر لیتے تھے، اہل بخارا کی غلطی یہ تھی کہ یہ اپنی کتاب میں ضبط نہیں کرتے تھے، اور بغیر نقطے کے لکھتے تھے، اسلئے نقل کرنے والے اسی طرح نقل کر لیتے تھے۔[۱]

یہاں غلطی اصل میں صاحب کتاب کی ہے ناقل کی نہیں اس لئے کہ اس طرح کے کلمات جو ضبط کے محتاج ہوتے ہیں، ان کو ضبط کرنا صاحب کتاب کی ذمہ داری ہوتی ہے، ظاہر ہے کہ شعیب اور شعیث کے شکل میں کوئی فرق نہیں ہر پڑھنے والا اس کو شعیب ہی پڑھے گا، شعیث کوئی نہیں پڑھے گا، کیونکہ یہ بالکل غریب اور غیر مانوس نام ہے لہٰذا یہاں ضبط کی ضرورت تھی تو امام بخاری سے یہاں شعیب اور شعیث کے بارے میں فرق میں لغزش ہو بھی گئی تو یہ انکی غلطی نہیں ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ امام بخاری نے کسی راوی کے بارے میں جو چند اوصاف سے متصف تھے کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا کیونکہ یہ بھی امکان ہے کہ شخصیت ایک ہی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ دو شخصیتیں ہوں، اس احتمال پر امام بخاری نے اس کو بطور توقف بر قرار رکھا، معترض نے کسی ایک احتمال کو راجح قرار دے دیا اور دوسرے کو مرجوح اور اسی کو لے کر اعتراض کر دیا، تو ظاہر بات ہے امام بخاری کا توقف وہم اور غلطی نہیں ہے کہ ان پر اعتراض کیا جائے۔[۲]

چونکہ یہ کتاب اپنی نوعیت کی پہلی کتاب تھی جس میں بے شمار متشابہ اور متفق نام پائے جاتے ہیں، لہٰذا اس طرح کی غلطیوں کا امکان ایک فطری امر ہے، اس عظیم کردار کے بمقابل ان چند غلطیوں کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔

گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں

ورنہ یہ امام بخاریؒ ہی کا علمی خزانہ تھا جنہوں نے اس بحر بیکراں سے موتیوں کو جمع کیا، اور ان سارے اسماء کی تعیین کر دی جو متشابہ تھے، جس سے آنے والے محدثین کو رہنمائی ملی، انہیں میں سے امام ابو حاتم اور ابو زرعہ رازی بھی ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ امام بخاری کی کتاب "تاریخ کبیر" پر جو نقد و گرفت کی گئی

---

(۱) مقدمة الموضح لأوهام الجمع ۱۳/۱

(۲) تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو، مقدمہ محقق علی الموضح لأوهام الجمع والتفریق

ہے اس میں اکثر و بیشتر نا قابل قبول ہیں، اور اتنی وسیع کتاب میں چند غلطیاں ہو جانا کتاب کی اہمیت کو کم نہیں کرتا۔

۲- الجرح والتعدیل

تالیف : ابن ابی حاتم رازی (متوفی ۳۲۷ھ)

تعارف: - کتاب کے نام سے اس کا موضوع واضح ہے انواع کتب جرح کے اعتبار سے اسے کتب عامہ میں شمار کیا جاتا ہے، یہ تالیف اپنے فن میں انتہائی اہم اور مستند دستاویز ہے، اسے کتب عامہ میں ام الکتب کی حیثیت حاصل ہے، طالبان علوم نبوت کیلئے یہ ایک گراں قدر علمی تحفہ اور بے مثال سرمایہ ہے۔

اس کے مولف نے صحابہ کرام سے لیکر اپنے عصر تک کے راویوں کا تذکرہ بغیر کسی خصوصیت کے کیا ہے، بنیادی طور پر یہ کتاب امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "تاریخ کبیر" کی تکمیل ہے چونکہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب اپنے فن کی اساسی کتاب ہے جس کو علماء وقت نے حیرت واستعجاب سے دیکھا، لیکن اس کتاب میں عموماً راویان حدیث پر جرح وتعدیل کا حکم نہیں تھا، جو راویوں کے تراجم میں سب سے اہم مقصد ہوتا ہے۔

امام ابو زرعہ اور امام ابو حاتم نے اسی کمی کو محسوس کیا اور اس کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے یہ سوچا کہ اس کتاب کو فنی اعتبار سے مکمل کر دیا جائے، انہوں نے یہ ذمہ داری امام عبد الرحمٰن بن ابو حاتم کو سونپ دی، کہ اس کتاب کے راویوں کے بارے میں ہم لوگوں سے معلومات لیکر اس کی تکمیل کریں، اب ان کے سامنے بطور قدوہ امام بخاری کی کتاب تھی، اور بحیثیت معلم امام ابو زرعہ اور امام ابو حاتم تھے، امام ابن ابی حاتم ان سے سوالات کرتے اور یہ دونوں ائمہ رجال پر جرح وتعدیل کا حکم لگاتے جاتے تھے، اگر کہیں غلطی ہو گئی تھی تو اس کی اصلاح بھی فرماتے تھے اور مزید راویوں کا اضافہ بھی فرماتے رہتے تھے۔

ابن عبدویہ وراق فرماتے ہیں کہ " اعلم أن أبا زرعة وأبا حاتم لما حمل إليهما هذا الكتاب قال هذا علم حسن لا يستغنى عنه ولا يحسن بنا أن نذكره عن غيرنا فاقعدا أبا محمد عبد الرحمٰن فسألهما عن رجل بعد

رجل وزادا فيه ونقصا، و نسبه عبد الرحمٰن إليهما"[1]

جب امام ابوزرعہ اور ابوحاتم کو یہ کتاب "تاریخ کبیر" ملی توانہوں نے کہا کہ یہ ایسا علم ہے جس سے بے نیاز نہیں ہوا جا سکتا، اور ہمارے لئے یہ مناسب بھی نہیں کہ (اسکی تکمیل کیلئے) دوسرے سے کہیں، چنانچہ ان دونوں نے ابو محمد کو بیٹھا کر یہ کام شروع کر دیا، وہ فرداً فرداً ہر روای کے بارے میں سوالات کرتے تھے، اور یہ دونوں حضرات جواب دیتے تھے، اسی طرح سے کچھ حذف واضافہ بھی کیا، اس تالیف کو ابو محمد نے ان دونوں ائمہ کی جانب منسوب بھی کر دیا۔

استاذ گرامی ڈاکٹر سعدی ہاشمی کا خیال ہے کہ یہ ابن عبدویہ وراق کی ذاتی رائے ہے، صحیح یہ ہے اکہ ان دونوں نے امام بخاری کی کتاب کو دیکھ کر انہیں کے طریقے پر الگ الگ کتابیں تحریر کیا ان دونوں نے اپنی اپنی کتاب کا نام "الجرح والتعديل" رکھا، ان دونوں کتابوں کو ابن ابی حاتم نے اکٹھا کر کے تیسری بار کتاب تیار کی، اور انہوں نے بھی اس کا نام "الجرح والتعديل" ہی رکھا۔[2]

استاذ محترم نے اس رائے پر علامہ ابن رجب کے قول سے استدلال کیا ہے، جنہوں نے فرمایا۔" ثم لما وقف عليه أبو زرعة وأبو حاتم الرازيان صنف على أنواعه كتابين أحدهما: الجرح والتعديل وفيه ذكر الأسماء فقط، وزادا على ما ذكره البخاري أشياء من الجرح والتعديل. والثاني : كتاب العلل أفرد فيه الكلام في المعلل.[3] پھر امام ابوزرعہ اور امام ابوحاتم کو اس پر اطلاع ملی توانہوں نے اسی تاریخ کے طرز پر دو کتابیں لکھیں، ایک جرح وتعدیل سے متعلق تھی جس میں صرف اسماء رجال کا تذکرہ ہے، اسمیں امام بخاری کی معلومات پر ان لوگوں نے جرح وتعدیل سے متعلق چند چیزوں کا اضافہ کیا ہے، دوسری کتاب "علل حدیث" ہے جس میں علل حدیث پر کلام کیا ہے۔

حالانکہ اس نص سے الگ الگ تالیفات کا ثبوت اتنا واضح نہیں جس قدر کی ابن عبدویہ وراق کا قول واضح ہے، چونکہ یہ دونوں اس کتاب "الجرح والتعديل"

---

(۱) الموضح لأوهام الجمع والتفريق ۱/۸-۹ ، تذكرة الحفاظ ۳/ ۹۷۸

(۲) أبو زرعة الرازي وجهوده في السنة ۱/ ۱۸۹ (۳) شرح علل الترمذي ص ۵۹

کے رکن رکین تھے، اور اس کی تالیف کے سبب بنے تھے اس لئے ان کی جانب اس کو منسوب کرنا کوئی نادر شئے نہیں تھی، بلکہ خود امام ابن ابی حاتم نے ان دونوں کی جانب اسی بنیاد پر منسوب کیا تھا، علامہ ابن رجب نے اسی نسبت کو ذکر کیا ہے۔ اور چونکہ عملی طور پر ابن ابی حاتم نے یہ کام انجام دیا تھا، اس لئے بعد میں ان کی جانب منسوب ہو گئی۔ لہٰذا اس موہوم بنیاد پر ابن عبدویہ جو حاضر تھے ان کے قول کو ترک نہیں کیا جا سکتا۔

مصادر کتاب : واقعہ جو بھی ہو چاہے ابن ابی حاتم نے ان دونوں کی الگ الگ تالیف کو یکجا کر دیا ہو، یا ان کے جوابات کو جمع کیا ہو، یا دونوں کا مجموعہ ہو، خلاصہ یہ ہے کہ اس کتاب میں اول وہلہ میں تین بڑے بڑے ائمہ وقت (امام بخاری، امام ابوزرعہ، امام ابو حاتم جو اپنی مثال آپ تھے) کے علم کا نچوڑ جمع ہو گیا، جو اس کتاب کی عظمت کیلئے کافی ہے، مزید برآں امام ابن ابی حاتم نے اس پر چار چاند لگاتے ہوئے چوٹی کے نقادوں کی گراں قدر معلومات کو جمع کر کے انتہائی جامع بنا دیا، مذکورہ ائمہ نقاد کے علاوہ جن ناقدین کے اقوال سے اس کتاب کو مزین کیا گیا ہے ان میں امام شعبہ، عبد اللہ بن مبارک، اوزاعی، یحییٰ بن سعید قطان، سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، حماد بن زید، علی بن مدینی، عبد الرحمٰن بن مہدی، یحییٰ بن معین، امام احمد بن حنبل، عمرو بن علی فلاس رحمہم اللہ تعالیٰ قابل ذکر ہیں، احتیاط کے سارے اصول کو اپناتے ہوئے ان ائمہ کے اقوال کو اپنی سند کے واسطہ سے نقل کیا ہے، اور اس سلسلہ میں ایک ایک محدث کے کئی کئی شاگردوں سے معلومات اکٹھا کیا ہے۔[1]

اس طرح یہ کتاب اہم ترین اہل نقد کے اقوال کی جامع ایک حسین گلدستہ اور مستند ترین تصنیف ہو گئی جو بعد میں آنے والوں کو اپنا محتاج بنا گئی۔

امام مزی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کتاب کو اقوال ائمہ کے جمع کرنے کے سلسلہ میں اپنی عظیم کتاب "تهذيب الكمال" کیلئے اہم مرجع بنایا ہے،[2] فرماتے ہیں کہ:

إن ما كان في هذا الكتاب من أقوال أئمة الجرح والتعديل ونحو ذلك فعامته مقبول من كتاب الجرح والتعديل لأبي محمد عبد الرحمٰن بن أبي حاتم

---

(۱) ملاحظہ ہو برائے تفصیل الجرح والتعدیل، مقدمہ محقق ص: یا یب

(۲) مقدمة تهذيب الكمال ۱/۱۵۲

الرازی بن الحافظ ومن کتاب.......... الخ. یعنی اس کتاب (تهذیب الکمال فی أسماء الرجال) میں ائمہ جرح وتعدیل کے جو اقوال ہیں ان میں سے اکثر وبیشتر امام ابو محمد عبدالرحمٰن بن ابو حاتم کی کتاب " الجرح والتعدیل " سے منقول ہیں۔

دقت نقل: نقل اقوال میں دقت کا یہ عالم تھا کہ راوی کے سلسلہ میں اگر کسی دوسرے ساتھی نے سوال کیا تو اس کی وضاحت کر دی ہے، جس کا سوال انہوں نے نہیں کیا ہے، وہاں "سألت" کے بجائے "سئل" کا کلمہ استعمال کیا ہے، چنانچہ طاؤس بن کیسان کے ترجمہ میں یہ جملہ ملاحظہ کریں کہ: " سألنا أبا محمد فقلنا هذا الذی تقول سئل أبو زرعة سأله غیرك وأنت تسأ له؟ أو ساله وأنت لا تسمع؟ فقال: کلما أقول سئل أبو زرعة فانی قد سمعته منه إلا أنه ساله غیری بحضرتی فلذلك لا أقول سالته."[1]

اهم خوبی: امام ابن ابی حاتم نے صرف اقوال ہی کے جمع کرنے پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ اپنی رائے کا اظہار بھی کیا ہے، اور غامض و متعارض اقوال سے صحیح حکم کا استخراج کیا ہے مشکل اور نادر کلمات کی وضاحت بھی فرمادی ہے، جس کی وجہ سے یہ کتاب اس فن کی سب سے اہم اور جامع تصنیف بن گئی ہے، اس لئے فنی اعتبار سے یہ کتاب "تاریخ کبیر" پر فوقیت رکھتی ہے، اس کے علاوہ دوسری حیثیت سے بھی اس پر فوقیت حاصل ہے، وہ کتاب کا جامع مقدمہ ہے جو مکمل ایک جلد پر مشتمل ہے، جس میں علم جرح وتعدیل کے پیچ وخم کو سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے، صحیح وسقیم حدیث میں تمیز کی اہمیت، معرفت رجال کی ضرورت، عدالت صحابہؓ اور راویوں کے طبقات کا ذکر، نیز مشہور ائمہ فن کا مبسوط ترجمہ بھی موجود ہے۔

تنظیم و ترتیب:- پوری کتاب چار جلدوں میں منقسم ہے، اور ہر جلد میں دو قسمیں پائی جاتی ہیں، طباعت کی جزء بندی کے اعتبار سے ہر قسم کو الگ الگ کر دیا گیا ہے، اس طرح سے کتاب آٹھ جلدوں پر اور مع مقدمہ نو جلدوں پر مشتمل ہے، جسکی تفصیل یہ ہے۔

(۱) الجرح والتعدیل ٤/ ٥٠١

مؤلف کی جزبندی	طابع کی جزبندی	تعداد تراجم
مقدمہ	پہلی جلد	ائمہ جرح وتعدیل
ج ۱ ق ۱	دوسری جلد	۲۲۹۳
ج ۱ ق ۲	تیسری جلد	۲۸۲۶
ج ۲ ق ۱	چوتھی جلد	۲۲۱۵
ج ۲ ق ۲	پانچویں جلد	۱۹۱۶
ج ۳ ق ۱	چھٹی جلد	۲۲۹۴
ج ۳ ق ۲	ساتویں جلد	۱۷۶۴
ج ۴ ق ۱	آٹھویں جلد	۲۳۴۹
ج ۴ ق ۲	نویں جلد	۲۳۸۳

اس طرح اس کتاب میں اٹھارہ ہزار چالیس تراجم ہیں، کتاب کی ترتیب تقریباً تاریخ کبیر کی طرح ہے، جو حروف معجم پر مرتب ہے، ہر حروف میں مختلف ابواب ہیں، تاریخ کبیر میں محمدبین کا ترجمہ سب سے پہلے ہے، اس کتاب میں یہ تراجم حرف ''میم'' میں مذکور ہیں، اس میں بھی ترتیب میں صرف حرف اول کا اعتبار کیا گیا ہے، اس طرح سے حرف الف سے شروع ہونے والے نام ابتدائی کتاب میں یکجا ہیں، باب الف میں سب سے پہلے ''احمد'' کا ذکر ہے، پھر جو نام مشہور یا بکثرت استعمال ہوتے ہیں ان کا ذکر ہے، اس طرح سے ہر حرف میں مختلف ذیلی ابواب پائے جاتے ہیں مثلاً باب ابراہیم، باب اسماعیل، اس میں جو اسماء مشترک ہیں اور ان کی تعداد زیادہ ہے ان کو راوی کے والد کے نام پر مرتب کر دیا گیا ہے، مثلاً ابراہیم نام کے بہت سارے راوی ہیں، اس میں سب سے پہلے وہ ابراہیم مذکور ہیں جن کے والد کا نام حرف الف سے شروع ہوتا ہے، پھر وہ ابراہیم ہیں جن کے والد کا نام حرف ''ب'' سے شروع ہوتا ہے، وعلی هذا القياس۔

جو اسماء مشترک نہیں ہیں بلکہ اس نام کا صرف ایک ہی راوی ہے یا غیر منسوب ہے تو ایسے راوی کو ہر حرف کے آخر میں ''باب الافراد'' کے تحت ذکر کیا ہے، ہر نام میں اگر اس نام کے کوئی صحابی ہیں تو ان کو مقدم کر دیا گیا ہے، اسی ترتیب پر یہ کتاب

حرف ''الف'' سے ''ی'' تک مرتب ہے، آخری کتاب میں قدرے تنوع کرتے ہوئے اور مفید تر بنانے کیلئے پانچ ابواب کا ذکر خصوصیت سے کیا گیا ہے۔

۱- پہلا باب:- ان راویوں کیلئے خاص ہے جو ابن فلاں سے مشہور ہیں۔(۹/۱۳۵)

۲-دوسرا باب:- ان راویوں کیلئے خاص ہے جو اخو فلاں سے مشہور ہیں۔(۹/۳۲۹)

۳- تیسرا باب:-ان راویوں کیلئے خاص ہے جو مبہم ہیں،(۹/۳۳۰)

٤-چوتھا باب:- ان راویوں کیلئے خاص ہے جو کنیت سے مشہور ہیں۔(۹/۳۳۱)

۵- پانچواں باب:-ان خواتین کیلئے خاص ہے جو کنیت سے مشہور ہیں۔(۹/۴٦۱)

طریقہ استفادہ :- اس طرح سے کتاب سے استفادہ آسان کرنے کیلئے اس کو بہت اچھی طرح منظّم کیا گیا ہے، مطلوبہ راوی کا ترجمہ جس حرف سے شروع ہوتا ہے اس حرف میں اگر تلاش کیا جائے تو بہت جلد مل جائے گا، کتاب کی ہر جلد کے شروع یا آخر میں اس جلد کی فہرست بھی موجود ہے، اس سے مدد لی جائے تو مزید آسانی ہوتی ہے، نیز اس کتاب کی مکمل فہرست الگ سے بھی مطبوع ہے، اس کے ذریعہ بھی مطلوبہ راوی اگر اس کتاب میں موجود ہے تو فوراً مل جائے گا۔

نوعیت تراجم: - ترجمہ میں راوی کا نام، نسب ونسبت، اور کنیت کا ذکر بھی کیا گیا ہے، اس طرح سے بعض شیوخ اور بعض تلامذہ کا بھی ذکر پایا جاتا ہے، کہیں کہیں راوی کی رحلات علمیہ یا دیگر صفاتِ خلقیہ یا خُلقیہ کا ذکر بھی کیا ہے، نیز راوی پر حکم صادر فرمایا ہے عموماً تراجم متوسط اور کہیں کہیں بہت مختصر ہیں، اور کہیں ایسا بھی ہے کہ کوئی خاص معلومات نہیں ہے۔[1]

کہیں کہیں صرف راوی کا نام ہے اور روی عن ...... اور روی عنہ ...... کہہ کر خالی جگہ چھوڑ دیا ہے، بعض مقامات پر راوی کا نام بھی نہیں بلکہ صرف روی عن ...... اور روی عنہ ...... موجود ہے۔

مسکوت عنہ کا حکم : - اس کتاب میں بھی بہت سارے تراجم ایسے ہیں جو حکم سے یکسر خالی ہیں، جس کا بظاہر مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان ائمہ کو اس راوی کے بارے میں مکمل معلومات نہیں مل سکی، اس سکوت کا یہ مطلب ہر گز نہیں ہوتا کہ یہ

---

(۱) بحوث فی السنة ص ۱۲۲

راوی ابن ابی حاتم کے نزدیک ثقہ ہے، جیسا کہ بعض علماء کا خیال ہے ان کی تردید کیلئے امام ابن ابی حاتم کا یہ فرمان کافی ہے کہ " إنا قد ذكرنا أسامي مهملة عن الجرح والتعديل كتبنا ها ليشتمل الكتاب على كل من روى عنه العلم رجاء وجود الجرح والتعديل فيهم فنحن ملحقوها بهم ان شاء الله" (۱)

ہم نے کچھ ناموں کو جرح و تعدیل سے خالی ذکر کیا ہے تاکہ یہ کتاب ان تمام راویوں کو شامل ہو جائے جن سے علم مروی ہے اس امید پر ایسا کیا ہے کہ ممکن ہے کہ جرح و تعدیل کا آئندہ پتہ چل جائے تو ہم انشااللہ اس کو لکھ لیں گے۔

شیخ عداب محمود الحمش نے اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کرنے کے بعد خاتمے میں جو نتیجہ تحریر کیا ہے وہ یہ ہے کہ: "فمجرد سكوت ابن أبي حاتم والبخاری عن الراوی واخراج ابن حبان له فی ثقاته ليس توثيقاله" یعنی ابن ابی حاتم امام بخاری کا مجرد سکوت اختیار کرنا نیز ابن حبان کا اپنی کتاب "الثقات" میں ذکر کرنا توثیق نہیں۔ (۲)

خصوصی اصطلاح:- اس کتاب کے کچھ خصوصی مصطلحات ہیں مثلاً جب ابن ابی حاتم یہ فرماتے ہیں کہ "فلان مجهول" تو ان کا مقصد اس سے "جہالت حال" ہوتا ہے جبکہ عام محدثین کے یہاں یہ کلمہ "جہالت عین" کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ (۳)

کتب تاریخ کی دوسری قسم:- کتب تاریخ کی دوسری قسم کی کتابوں میں جو مشہور کتابیں ہیں ان میں تین کتابوں کا تعارف مندرجہ ذیل ہے:

۱- المنتظم فی تاریخ الملوک والامم

تالیف: ابن الجوزی (متوفی ۵۹۵ھ)

امام ابن جوزی کی یہ تالیف فن تاریخ میں ایک اہم باب ہے، جس میں آپ نے امت اسلامیہ کو فن تاریخ میں تالیف کا ایک جدید طرز دیا ہے، اس کتاب کو آپ نے ایک علمی مقدمہ سے شروع کیا ہے جس میں فن تاریخ کی اہمیت وضرورت کا ذکر

(۱) الجرح والتعديل ۳۸/۲
(۲) رواة الذين سكت عنهم ائمة الجرح واتعديل ص ۱۳۶
(۳) فتح المغيث ۳۴۹/۱، شرح ألفاظ التجريح النادرة ص ۸۳

کیا ہے، آپ سے پہلے جن مورخین نے کتابیں تصنیف کیں ہیں ان کے طریقہ تصنیف میں اختیار نصوص کی جانب اشارہ کیا ہے۔

کتاب کا نام:- علامہ ابن جوزی کی اس کتاب کے نام کے سلسلہ میں مورخین میں قدرے اختلاف پایا جاتا ہے، عموماً لوگوں نے اس کو "المنتظم" یا "منتظم" کے نام سے یاد کیا ہے، جو اس کا مختصر نام ہے، کچھ لوگوں نے مکمل نام بھی ذکر کر دیا ہے، جو اس طرح ہے، "المنتظم فی تواریخ الملوك والأمم" کسی نے "المنتظم فی تواریخ الأمم" توکسی نے "المنتظم فی أخبار الأمم" یا "المنتظم فی أخبار الملوك والأمم" کہا ہے، توکسی نے "المنتظم فی تواریخ الأمم فی العرب والعجم" سے موسوم کیا ہے، بعض حضرات نے "المنتظم فی تاریخ المملكة الإسلامية" کے نام سے ذکر کیا ہے، لیکن خود مولف نے اپنی کتاب "صید الخاطر" اور "شذور العقود" میں "المنتظم فی تاریخ الملوك والأمم" کے نام سے ذکر کیا ہے، اس لئے یہی راجح ہے۔[1]

مشتملات:- بعد ازیں اصل کتاب وجود باری پر دلائل سے شروع کیا ہے اس کے بعد تخلیق عالم، پھر آدم علیہ السلام سے لے کر ما قبل اسلام تک کے حالات، حادثات، وواقعات، انبیاء وملوک، علماء وحکماء، فراعنہ ونمارده کا ذکر کیا ہے، پھر تاریخ اسلام کی ابتداء ولادت نبوی سے کی ہے، نبوت اور سیرت رسول کا مکمل تذکرہ کیا ہے، اس کے بعد خلفاء راشدین، خلفاء بنو امیہ، بنو عباسیہ کا ذکر ۵۷۴ھ تک کیا ہے، جس میں ان زمانوں کے سیاسی، اقتصادی حالات، معاشرتی اور اداری معاملات، فرق وجماعات کا ذکر کیا ہے۔

ترتیب:- ہجرت رسول سے لیکر (۵۷۴ھ) کے آخر تک مکمل کتاب کو سنوات کے اعتبار سے مرتب کیا ہے، ہر سال میں رونما ہونے والے واقعات و حالات ذکر کرنے کے بعد ایک عنوان یہ قائم کیا ہے کہ اس سال میں کون کون اہم شخصیات تھیں جن کا انتقال ہوا، ان شخصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی سوانح قلمبند کیا ہے، جو مختلف پہلوؤں پر مشتمل ہے، اسطرح سے عام حالات اور وفیات کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہے،

(۱) كتاب المنتظم لابن الجوزی دراسة فی منهجه ص ۲۱ . ۲۲

جو ایک جدید طرز تحریر ہے، بعد کے بہت سے مورخین نے اسی طرز کو پسند فرمایا، خاص طور پر سبط ابن الجوزی نے " مرآة الزمان " میں علامہ ابن کثیر نے "البداية والنها ية "میں، امام ذہبی نے "تاریخ اسلام "میں، علامہ یافعی نے "مرآة الجنان" میں۔(۱)

فن حدیث ورجال سے تعلق رکھنے والے افراد کی تعداد زیادہ ہے، توان کو حروف معجم پر مرتب کردیا ہے، جن کی تاریخ وفات قطعی طور سے معلوم نہ ہو سکی تو ان کا ذکر ان کے ہم عصروں کے ساتھ کر دیا ہے۔

طریقہ استفادہ :- کتاب سے استفادہ کا طریقہ یہ ہے کہ مطلوبہ شخص کو سن وفات پر تلاش کیا جائے اگر سن وفات معلوم ہے تو یہ کام چند منٹوں میں مکمل ہو جائے گا، لیکن اگر سن وفات معلوم نہیں تو کافی وقت لگ سکتا ہے، ایسی صورت میں فہرست کی مدد سے ناموں کو تلاش کیا جا سکتا ہے۔

علماء کی نگاہ میں:- کتاب اپنے فن میں کافی اہمیت کی حامل ہے، اس لئے علماء کی توجہ اور استفادہ کیلئے معتمد رہی ہے، علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ: "وكتاب المنتظم في تواريخ الأمم من العرب والعجم في عشرين مجلد ا ، قد أوردنا في كتابنا هذا كثيرا منه من حوادثه و تراجمه"،(۲) یعنی امام ابن الجوزی کی کتاب المنتظم بیس جلدوں میں ہے، ہم نے اپنی اس کتاب " البداية والنها ية " میں اس میں سے بہت سارے حوادثات اور تراجم کو شامل کیا ہے۔

ذیول و مختصرات:- بہت سے علماء نے اسکا اختصار کیا ہے، نیز اس پر ذیل تحریر کی ہے، خود حافظ ابن الجوزیؒ نے اس کتاب کی ایک تلخیص " شذور العقود في تاريخ العهود " کے نام سے کیا ہے، جس میں ۵۷۸ھ تک کے واقعات مذکور ہیں، امام سخاوی فرماتے ہیں کہ اسؒ کا قلمی نسخہ بدست مولف خود میں نے دیکھا ہے۔(۳)

شیخ علاؤ الدین علی بن محمد مصنفک (متوفی ۸۷۰ھ) نے ایک اختصار " مختصر المنتظم و ملتقط الملتوم " کے نام سے کیا ہے۔(۴)

---

(۱) دیکھئے کتاب المنتظم لا بن الجوزی دراسة فی منهجه ص ۲۱۸
(۲) البداية والنهاية ۱۳/ ۲۸ (۳) الاعلان بالتوبيخ ص ۱۴۶
(۴) كتاب المنتظم لابن الجوزی ودراسة فی منهجه ص ۲۴

علامہ محمد بن احمد بن محمد قادسی (متوفی ۶۳۴ھ) نے اس پر ذیل تحریر کیا ہے، جس کا نام " الفاخر فی حوادث أیام الإمام الناصر " رکھا ہے۔

اس طرح امام ابو بکر محفوظ بن معتوف بن بزوری (متوفی ۶۹۴ھ) نے بھی ایک ذیل تحریر کیا ہے۔ (۱)

ڈاکٹر حسن عیسیٰ علی حکیم نے امام ابن جوزی کی اس کتاب کے طور طریقے، مصادر اور اہمیت پر ایک خاص تالیف میں بڑی تفصیلی نظر ڈالی ہے جس کا نام "کتاب المنتظم لابن الجوزی دراسة فی منهجه وموارده وأهميته" رکھا ہے، جو عالم الکتاب بیروت سے مطبوع ہے۔

۲- البداية والنهاية لابن كثير

(متوفی ۷۷۴ھ)

تعارف:- تاریخ عمومی کی وہ کتابیں جس میں حادثات وواقعات کے ساتھ ساتھ علماء و محدثین کے تراجم پائے جاتے ہیں، ان میں حافظ ابن کثیر کی کتاب " البداية والنهاية" ہے جو اپنے فن کی بڑی عظیم کتاب ہے بلکہ اس کو فن تاریخ میں انسائیکلو پیڈیا کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا، ابتدائے خلق سے لیکر فناءِ عالم تک، بلکہ حشر ونشر، قیامت کے لرزہ خیز مناظر، جنت و جہنم کا ذکر کر کے کتاب کو اسم با مسمی بنادیا ہے۔

دقت تحریر:- معلومات جمع کرنے میں جس دقت اور صحت کا خیال کیا ہے وہ بھی قابل ستائش ہے، اسی وجہ سے علماء نے اس پر مکمل اعتماد کیا ہے، علامہ ابن تغری بردی فرماتے ہیں" هو فی غاية الجودة عليه يعول البدر العينی فی تاريخه "(۲)

معلومات جمع کرنے کرنے لئے سب سے پہلے کتاب و سنت پر اعتماد کیا ہے، اس کے بعد ان اخبار و آثار سے استدلال کیا ہے جو علماء کے یہاں مقبول و متداول ہیں جن نقول میں ضعف اور نسبت میں کمزوری پائی جاتی تھی، اسکی وضاحت کر دی گئی ہے۔ (۳)

اسرائیلیات کا ذکر:- ماقبل اسلام کی تاریخ کیلئے اسرائیلیات سے استفادہ کیا

(۱) الاعلان بالتوبيخ ص ۱۴۶ (۲) النجوم الزاهره ۱۱/ ۱۲۳

(۳) البداية والنهاية ۱/ ۷

ہے، لیکن یہ استفادہ اعتماد و تکریم کیلئے نہیں بلکہ تزئین ودلچسپی کیلئے ہے، ان اسرائیلیات سے صرف انہیں چیزوں کو ذکر کیا ہے جسکی شریعت نے "حد ثوا عن بني إسرائيل ولا حرج "[۱] میں اجازت دی ہے، یہ ایسی چیزیں ہیں جس میں کتاب و سنت کی موافقت و مخالفت نہیں پائی جاتی ہے، نہ ان کی تکذیب کی جاسکتی ہے، نہ تصدیق، عموماً اس طرح کی اسرائیلیات کا استعمال اجمال کی تفصیل یا مبہم کی تعین کیلئے کیا گیا ہے، جس کا کوئی خاص فائدہ بھی نہیں اور جو شریعت کے مزاج کے مخالف بھی نہیں البتہ وہ اسرائیلیات جو مخالف شرع ہیں وہ قابل مردود ہیں، انکا ذکر نہیں کیا ہے۔[۲]

موضوع کتاب:- کتاب کا موضوع نام ہی سے واضح ہے، ابتدائے عالم سے لیکر انتہائے عالم بلکہ اخروی زندگی کی ابتدائی حالات کا بھی ذکر کیا ہے، بنیادی اعتبار سے یہ کتاب تین حصوں میں منقسم ہے۔

اقسام کتاب :-

۱- **پہلی قسم**:- ابتداء (البدایۃ) ہے اس قسم میں ابتدائے خلق، عرش، کرسی، قلم، زمین، آسمان، اور ان کے درمیان کی چیزیں جن وانس، ملائکہ وشیاطین، کی تخلیق کا تذکرہ ہے اسکے ساتھ ساتھ حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر خاتم النبین ﷺ تک کے انبیاء ورسل، فراعنہ، نمارده، بنی اسرائیل اور دور جاہلیت کے احوال، یاجوج ماجوج، قوم سباء، ذوالقرنین، اصحاب اخدود وغیرہ سمیت ما قبل اسلام کی تاریخ پائی جاتی ہے۔[۳]

۲- **دوسری قسم** :- تاریخ اسلام ہے جو ابتداء وانتہا کے درمیان کا حصہ ہے، اس کی ابتداء سرور عالم ﷺ کی ولادت باسعادت اور سیرت مطہرہ سے ہوتی ہے۔ جس میں آپ کے بابرکت آثار، صفات جمیلہ، خصال حمیدہ، اخلاق عالیہ اور معجزات باہرہ کا تذکرہ ہے، اسکے بعد خلفاء راشدین اور دیگر خلفاء کا ذکر اپنے زمانہ ۴۷۷ھ سے کچھ پہلے تک کیا ہے، اس قسم کو سنہ ہجری پر مرتب کیا ہے جس سن کا تذکرہ کرنا ہوتا ہے، پہلے اس میں پیش ہونے والے حادثات وواقعات کا ذکر کیا ہے، (قابل قدر بات یہ ہے کہ صرف انہیں واقعات وحادثات کو ذکر کیا ہے، جسکی سند، صحیح یا حسن ہو، جو

---

(۱) متواتر روایت ہے من كذب علي متعمدا کا ابتدائی ٹکڑا ہے۔

(۲) البداية والنهاية ۱/ ۷ (۳) المصدر السابق ۱/ ۶

فن تاریخ میں بہت بڑی خوبی ہے،)

حادثات واقعات کے ذکر کرنے کے بعد اس سن میں وفات پانے والے اہل علم کے حالات پر روشنی ڈالی ہے، جن پر بحیثیت جرح و تعدیل، ثقہ اور غیر ثقہ کا حکم لگایا گیا ہے، کتاب کا یہی حصہ (خصوصیت کیساتھ راویان حدیث سے تعلق رکھنے والوں کیلئے) مفید و نفع بخش ہے،اس طرح سے یہ کتاب اگرچہ بذات خود فن رجال سے تعلق نہیں رکھتی ہے پھر بھی حدیث اور راویان کی خادم کتابوں میں سے ایک ہے،اوراس فن سے متعلق حضرات کیلئے مرجع کی حیثیت رکھتی ہے۔

۳- **تیسری قسم** :- انتہا (النهاية) اس میں قرب قیامت سے پہلے ظاہر ہونے والے فتن اور حروب، علامات قیامت، بعث و نشور، حشر و نشر، یوم قیامت کی کیفیت اس میں رونما ہونیوالے ہوش ربا مناظر، دل دہلا دینے والے واقعات، نفسی نفسی اورکسمپرسی کا عالم، حساب و کتاب کا منظر، پل صراط سے گذرنے کی کیفیت، جنت میں داخلہ کا منظر اور اسکی لازوال نعمتیں، جہنم کی ہولناکیاں، اور دل سوز مناظر وغیرہ کا حال ذکر کیا گیا ہے، اسطرح سے ابتدائے عالم وانتہائے عالم کی تاریخ اسمیں موجود ہے۔[1]

حاجی خلیفه کا تبصره: - حاجی خلیفہ نے اس کتاب پر تنقید و تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: اس میں ایسے حضرات کا ذکر تفصیل سے کیا ہے جن کا چھوڑ دینا چھوٹے ہوئے اہل علم کے مقابلے میں بہتر تھا، (یعنی اس میں کچھ اہم علماء کا ذکر نہیں جب کہ غیر اہم لوگوں کا ذکر تفصیل سے آگیا ہے) نیز اس میں ایسی ایسی غلطیاں پائی جاتی ہیں جو نا قابل معافی ہیں، اس کے باوجود مصر و شام میں تاریخی معلومات کیلئے اس زمانہ میں ان تین افراد (ابن کثیر، برزالی، ذہبی) کی کتابوں پر علماء کا اعتماد ہے۔[2]

اس تنقید کی کیا حقیقت ہے، خود ان کی اپنی عبارت سے واضح ہے، جہاں تک اہم اور غیر اہم کا تعلق ہے نقطہ نظر اور معیار کا فرق ہو سکتا ہے، البتہ "وہ اہم اہم غلطیاں جو نا قابل معافی ہیں" ان کی حیثیت اس وقت خود بخود ختم ہو جاتی ہے، جب مصر وشام (جو اس زمانہ مین علم و فن کے مرکز تھے) کے علماء اس پر اعتماد کرتے تھے۔

(۱) مقدمة البداية والنهاية ۱/ ۶ (۲) کشف الظنون ۱/ ۸۳۴

اکمال وذیل :- علماء نے اس کی اہمیت وافادیت کے پیش نظر اس کی تکمیل کرنے کی کوشش کی ہے، علامہ ابن کثیر کے ایک فرزند نے اس پر ذیل تحریر کی ہے، امام سخاویؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے استاد (حافظ ابن حجر) کی کتاب " أنباء الغمر فی أبناء العمر " اس کی ذیل کی حیثیت رکھتی ہے، اس لئے کہ اس میں ۷۷۳ھ سے تاریخ کی ابتداء کی گئی ہے، اس طرح ابن کثیر کے ایک شاگرد ابن حجی نے اس پر ایک ذیل تحریر کی تھی، لیکن تبییض سے پہلے ہی ان کا انتقال ہو گیا، لہٰذا قاضی ابن شحنہ نے کچھ اضافہ کے ساتھ اس کی تبییض کی ہے۔(۱)

تاریخ الاسلام ووفیات المشاهیر والأعلام

تالیف: امام ذہبی (۷۴۸ھ)

تعارف:- اس قسم کی کتابوں میں ایک اور اہم، قابل فخر اور جامع ترین کتاب مورخ اسلام امام ذہبیؒ (متوفی ۷۴۸ھ) کی تالیف کردہ، " تاریخ الاسلام و وفیات المشاهیر والأعلام " ہے جو صحابہؓ و تابعین، راویان حدیث و محدثین، فقہاء و مفتیین، قراء و مفسرین، حکام و سلاطین، امراء وزراء، اہل فکر وفن پر ایسا حسین مجموعہ ہے، جس پر ملت اسلامیہ جتنا فخر کرے کم ہے، تاریخ اسلام پر ایسی جامع و منتخب کتاب آج تک تالیف نہ کی جا سکی۔

علماء کی نگاہ میں :- حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ انہوں نے تاریخ اسلام کو اسطرح جمع کیا کہ اپنے متقدمین پر فوقیت لے گئے، خصوصاً محدثین کے حالات ذکر کرنے میں۔(۲)

امام شوکانی فرماتے ہیں کہ: " الناس فی التاریخ من أهل عصره فمن بعدهم عيال عليه ، لم يجمع أحد فی هذا الفن كجمعه ولاحرره كتحريره. "(۳) آپ کے زمانہ سے آج تک فن تاریخ میں لوگ آپ کے محتاج ہیں، اس طرح اس فن میں کسی دوسرے نے جمع و تالیف نہیں کیا ہے۔

اہمیت:- اس کی اہمیت و وسعت، وافادیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ

---

(۱) الاعلان بالتوبیخ ص ۱۵۰. مطبوعہ مروجہ کتاب ناقص ہے اسمیں تیسری قسم مذکور نہیں، برادرم عزیر شمس نے یہ اطلاع دی ہے کہ اسکا کامل نسخہ وزارت شئون اسلامیہ ریاض سے مطبوع ہو چکا ہے۔

(۲) الدر الکامنة ۳/ ۳۳۷ (۳) البدر الطالع ۲/ ۱۱۱

انہوں نے اپنی اس کتاب سے مختلف کتابیں تیار کی ہیں، جن میں "سیر أعلام النبلاء" جیسی عظیم الشان کتاب بھی شامل ہے جو ۲۳ جلدوں میں مطبوع ہے۔ اسکے علاوہ "تذکرة الحفاظ، العبر فی خبر من غبر، طبقات القراء، الاشارة إلى وفیات الأعیان " اسی کتاب سے ماخوذ ہیں، جیسا کہ حافظ ابن حجر، امام شوکانی، علامہ کتانی، حاجی خلیفہ وغیرہ کا خیال ہے، (۱)

حاجی خلیفہ فرماتے ہیں کہ امام ذہبی نے "تاریخ اسلام" سے "سیر" کو، "سیر" سے "العبر" کو "العبر" سے "الاشارة" کو مختصر کیا ہے۔ (۲)

البتہ ڈاکٹر بشار عواد کا خیال ہے کہ "سیر أعلام النبلاء" تاریخ اسلام کی مختصر نہیں بلکہ مستقل تصنیف ہے، اس لئے کہ دونوں کی کیفیت میں کافی فرق ہے۔ (۳)

اس میں کوئی شک نہیں کہ دونوں کتابوں میں کافی فرق ہے، لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا بھی محل نظر ہے کہ یہ اس کی مختصر نہیں، اصل میں "سیر أعلام النبلاء" چونکہ "تاریخ اسلام" کے بعد تحریر کی گئی ہے، اس لئے موضوع کے پیش نظر اس میں کچھ اضافہ ضرور کیا ہے، اس طرح سے بہت سے علماء نے کیا ہے خود حافظ ابن حجر نے تقریب التہذیب میں ایک باب "مبہمات النساء" کا اضافہ کیا ہے، حالانکہ یہ "تہذیب التہذیب" کی مختصر ہے جبکہ "تہذیب التہذیب" میں وہ باب موجود نہیں ہے۔

امام شوکانیؒ فرماتے ہیں کہ "وهو مختصر من تاریخ الاسلام باعتبار"......الخ یعنی سیر أعلام النبلاء تاریخ اسلام کی اس اعتبار سے مختصر ہے کہ اس (تاریخ اسلام میں) نبیل اور غیر نبیل سب کا ذکر کیا ہے، لیکن سیر اعلام النبلاء میں صرف نبلاء کا ذکر کیا ہے، البتہ اس میں تراجم کو طویل کر دیا ہے، اس لئے دونوں کتابیں حجم میں قریب قریب برابر ہو گئی ہیں۔ (۴)

سیر اعلام تاریخ سے مختصر ہے اسکی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ مطبوعہ سیر اعلام کی پہلی جلد کا پہلا ترجمہ حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کا ہے، حافظ ذہبی نے

---

(۱) الدرالکامنة، البدر الطالع، الرسالة المستطرفة ص ۱۰۱، کشف الظنون ۱/۲۹۵
(۲) کشف االظنون ۲/۱۹۳۳ (۳) تقدیم سیر أعلام النبلاء، ۱/ ۱۳۵
(٤) البدر الطالع ۲/ ۱۱۰

اس سے پہلے کی معلومات، سیرت نبوی سیرت خلفاء راشدین کیلئے تاریخ اسلام کا حوالہ دیا تھا، کہ وہاں سے سے نقل کر لیا جائے لیکن نسخ کرنے والوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ اسی حصہ کو نقل کیا جہاں سے امام ذہبی نے سیر اعلام کو شروع کیا تھا۔ (۱)

ترتیب :- اس کتاب میں جو معلومات مذکور ہیں انکی ابتداء اھ سے کی ہے، اس زمانے میں پیش آنیوالے واقعات اور حادثات کو سن ہجری پر مرتب کیا ہے، اسطرح سے وفیات کو بھی سنوات پر مرتب کیا ہے، ہر دس سال کو ایک طبقہ قرار دیا ہے ہے اسطرح پوری کتاب ستر طبقات پر مشتمل ہے، ہر طبقہ کو حروف معجم پر مرتب کیا ہے، یہ سلسلہ ۷۰۰ھ تک چلتا ہے، اس طرح اس کتاب میں جو معلومات ہیں وہ اھ سے لے کر ۷۰۰ھ تک ہیں۔

علماء کا تبصرہ:- قاضی شہبہ فرماتے ہیں کہ: تعجب خیز بات یہ ہے کہ اس کتاب کو ۷۰۰ھ پر ہی ختم کر دیا ہے، ۷۴۰ھ تک نہیں لے گئے جیسا کہ "العبر" میں کیا ہے، جب کہ حاجی خلیفہ کا کہنا ہے کہ اسکی ابتداء سن ایک ہجری سے کیا ہے اور خاتمہ ۷۴۱ھ پر کیا ہے۔ (۲)

ڈاکٹر بشار عواد فرماتے ہیں کہ: "إن تاريخ الاسلام تمتد من أول الهجرة البنوية إلى سنة سبع مأة" چونکہ ان کی کتاب پر بہت گہری نظر ہے، اس کی تحقیق اور اس کا دراستہ انہوں نے کیا ہے، اس کا مکمل نسخہ بھی ان کے پاس موجود ہے، اس لئے یہی قول راجح ہے، ممکن ہے حاجی خلیفہ نے ان کی دیگر کتابوں "العبر" وغیرہ پر قیاس کر کے یہ تحریر کر دیا ہو۔

تالیف میں عرق ریزی:- کتاب کی تالیف میں مصنف نے جو عرق ریزی و جگر سوزی کی ہے اس کا اندازہ ان کے اس بیان سے بخوبی ہوتا ہے وہ فرماتے ہی کہ ابتدائے اسلام سے لیکر آج تک بے شمار کتب تاریخ (جن میں سیرت، مغازی، جرح و تعدیل، دلائل نبوت انساب وغیرہ شامل ہیں) سے استفادہ کرنا، ان سے معلومات اکٹھا کر کے منظم اسلوب میں ڈھالنا کوئی آسان کام نہیں، خاص طور سے فقہاو محدثین، امراء وسلاطین خلفاء و حکام، شعراء وادباء وغیرہ کے حالات ان کے طبقات، ان کی وفات،

---

(۱) تقديم سير أعلام، ۱/ ۹۳، ۹۴ بعد میں سیرت نبوی اور خلفاء راشدین کا حصہ بھی طبع کر دیا گیا۔
(۲) كشف الظنون، ۱/ ۲۹۵

شاگرد و اساتذہ اور وفات کی معرفت، اہم فتوحات، لڑائیاں، حادثات و واقعات کا انتخاب واختصار بڑی عرق ریزی اور دل سوزی کا کام ہے، اگر اس طرح سے انتخاب و اختصار نہ کرتا تو یہ سو جلدوں سے بھی تجاوز کر جاتی۔[1]

مختصرات و ذیول:- جیسا کہ گزر چکا ہے امام ذہبی نے اس کا مختصر مختلف شکلوں میں کیا ہے نیز شیخ علاء الدین علی بن خلف عنزی (متوفی ۷۹۲ھ) اور شمس الدین محمد بن محمد جزوری (متوفی ۸۳۳ھ) نے اس کا اختصار کیا ہے، امام اسخاوی (متوفی ۹۰۲ھ) نے اس پر ایک ذیل "الذیل الحافل لتاریخ الاسلام" کے نام سے تحریر کی ہے۔ ابن قاضی شہبہ (متوفی ۸۵۱ھ) نے بھی اس کی ذیل تحریر کی ہے۔[2]

اسکی ابتداء وہاں سے کی گئی ہے، جہاں امام ذہبی نے ختم کیا اور خاتمہ ۸۰۶ھ پر کیا ہے، اسکا نسخہ کتب خانہ اہلیہ پیرس میں موجود ہے، دار الکتب المصریۃ میں بھی اسکا نسخہ ہے،[3] کتاب کے متفرق اجزاء مطبوع ہیں پوری کتاب اب تک شاید طبع نہ ہو سکی جب کہ اسکے مختلف نسخے مختلف کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔[4]

کتب تاریخ کی تیسری قسم:- کتب تواریخ عامہ کی تیسری قسم کی جو کتابیں ہیں ان میں راویان کے متعلق حالات نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں، شاذ و نادر ہی کسی خاص نام سے متعلق معلومات مل سکتی ہے، یہاں پر محض کتب تاریخ کی اقسام کی اتمام کیلئے ان میں سے جو اہم اور مشہور کتابیں ہیں ان کا تعارف کیا جا رہا ہے۔

۱- تاریخ الامم والملوک

تالیف: امام طبری، (متوفی ۳۱۰ھ)

یہ چوتھی صدی ہجری کے عظیم محدث، معروف مفسر، بلند پایہ مورخ حافظ ابن جریر (محمد بن جریر بن یزید) طبری (متوفی ۳۱۰ھ) کی نادر گرانقدر تصنیف ہے، اس کا نام "تاریخ الرسل والملوك"، بھی ہے، یہ ایک انتہائی معتبر اور جامع تاریخ ہے ،علامہ کتانی نے " الرسالة المستطرفة "[5] میں "كتب في تواريخ الرجال

(۱) الاعلان بالتوبیخ ص ۸۶- ۸۷ (۲) کشف الظنون، ۲۹۵/۱
(۳) مقدمة مسند الإمام أحمد، از أحمد شاكر ۱۳۵/۱ (٤) تقديم سير أعلام ۸۷/۱
(۵) ص ۱۰۱

وأحوالهم" کے ضمن میں ابن جریر طبری کی اس تالیف کاذکر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ انتہائی مشہور تاریخ کی کتاب ہے، جواپنے دامن میں تاریخ اسلام کو سمیٹے ہوئے ہے، ابن خلکان نے اس کتاب کو " أصح التاریخ " کہا ہے۔ (۱)

علامہ ابن الجوزی نے فرمایا ہے کہ یہ کتاب جو معروف ومتداول ہے، "تاریخ کبیر" کی مختصر ہے۔

ابن سبکی فرماتے ہیں کہ حافظ ابن جریر نے ایک دن عرض کیا کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر پوری تاریخ عالم کو سمیٹنے کی دلچسپی کسی کو ہے؟

لوگوں نے سوال کیا کہ کتنا ہے؟ انہوں نے فرمایا تیس ہزار ورق، لوگوں نے کہا کتاب ختم ہونے سے پہلے تو عمر ہی ختم ہو جائے گی، انہوں نے کہا انا للہ اس قدر لوگوں کی ہمتیں ٹوٹ چکی ہیں! چنانچہ انہوں نے اس کتاب کو مختصر کر کے تقریباً اتنا برقرار رکھا جتنا کہ اپنی تفسیر کو مختصر کر کے باقی رکھا تھا۔ (۲)

مشتملات:- اس کتاب میں جو معلومات مذکور ہیں انکے بارے میں خود مولف نے یوں وضاحت فرمائی ہے۔

ابتدائے عالم، تخلیق ارض وسماء سے لیکر ۳۰۲ھ تک کے دنیا میں ہونے والے انقلاب وحالات وواقعات، ملوک وسلاطین، انبیاء ورسل علیہم السلام، امراء وحکماء کاذکر کیا جائے گا۔ (۳) آگے رقم طراز ہیں کہ "ثم إنا متبع آخر ذلك كله ذكر صحابة نبينا صلى الله عليه وسلم" الخ یعنی پھر ان حالات وواقعات کے بعد صحابہ کرام کاذکر خیر ان کے نام ونسب، علم وعمر، سن وفات اور محل وفات کاذکر کریں گے، ان کے بعد تابعین عظام کاذکر اسی طرز پر کریں گے، ان کے بعد دیگر اہم عمل کاذکر خیر ہوگا، جن کے حالات میں مزید یہ معلومات دی جائے گی کہ ان میں کس کی روایت قابل قبول ہے، اور کس کی قابل رد، نیز ان کے اسباب وعلل کا بھی جائزہ لیا جائے گا، جن کی وجہ سے ان کی روایت مردود ہو گئی ہے۔ (۴)

---

(۱) مصدر سابق ص ۱۰۱ (۲) كشف الظنون ، ۱/ ۲۹۷ - ۲۹۸

(۲) تاريخ الملوك والأمم ۱/ ۱۲ (٤) تاريخ الملوك والأمم ، (تاريخ طبرى) ۱/ ۱۳

یہ وہ نقطہ ہے جس کی وضاحت یہاں پر ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ یہ وعدہ امام طبری نے اس کتاب میں پورا نہیں کیا، بلکہ دوسری کتاب میں پورا کیا ہے، جس کا نام "ذیل المذیل" رکھا ہے، جو بحیثیت ذیل اس تاریخ کے ساتھ مطبوع بھی نہیں ہے۔

تاریخ ملوک والامم (تاریخ طبری) راویان حدیث کے سلسلہ میں معلومات کیلئے مفید نہیں "ذیل المذیل" مطبوع ہے کہ نہیں فی الحال اس کا علم نہیں ہے، البتہ اس کی منتخب مطبوع ہے۔

امام سخاویؒ فرماتے ہیں کہ یہ انتہائی معتبر تاریخ ہے، ان کے بعد میں آنے والوں نے اس سے بھرپور استفادہ کیا ہے، لیکن اس کتاب کو انہوں نے علم تاریخ و فتوحات و واقعات کے ذکر کیلئے تحریر کیا ہے، اس لئے جرح و تعدیل کے سلسلہ میں اشارہ بھی نہیں پایا جاتا، حتی کہ بڑے بڑے ائمہ فن میں کسی کے حالات کا ذکر انہوں نے نہیں کیا ہے، بلکہ عام واقعات کا ذکر مختلف اسانید اور متعدد طرق سے کیا ہے، اس لئے کہ وہ اس فن اور دیگر فنون میں سمندر تھے، تاریخ رجال کے بارے میں رجال پر جو کتاب ہے اس پر اکتفاء کیا ہے۔(۱)

اس کتاب کی دو ذیل تاریخ طبری کے آخر میں مطبوع ہے۔

۱- **صلة تاريخ الطبري**:- یہ عریب بن سعد قرطبی کی تالیف ہے، اس کتاب کو مولف نے ۲۹۱ھ سے شروع کیا ہے، اور ۳۲۰ھ پر ختم کر دیا ہے، (جبکہ امام طبری نے اپنی تاریخ کو ۳۰۲ھ پر ختم کیا ہے)

۲- **تكملة تاريخ الطبري**:- یہ محمد عبد الملک ہمدانی کی تالیف ہے، امام طبری نے اپنی تاریخ کو مقتدر باللہ کی خلافت کے درمیان میں ختم کیا تھا، مولف نے اس تکملہ کو مقتدر باللہ کے ابتدائی خلافت ۲۹۶ھ سے شروع کیا ہے اور ۳۶۷ھ پر ختم کیا ہے۔

امام طبری کی تاریخ کا وہ حصہ جسکو ذیل المذیل کہا جاتا ہے کسی عالم نے اسکو منتخب کیا ہے، یہ منتخب جسکا نام "المنتخب من كتاب ذيل المذيل من تاريخ الصحابة والتابعين" ہے تاریخ طبری کے آخر میں تکملہ کے بعد مطبوع ہے، یہ کتاب بھی سنوات

(۱) الإعلان بالتوبيخ ص ١٤٤

کی ترتیب پر ہے، جو کافی مختصر ہے، اس میں ۱۶۱ھ تک ہی کا انتخاب ہے اگر چہ کچھ محدثین جنکا انتقال اسکے بعد ہوا ہے انکا بھی تذکرہ پایا جاتا ہے، جیسے سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ وغیرہ، پھر اسماء وکنی کا ذکر اختصار کیساتھ کیا ہے، یہ تینوں کتابیں محمد ابو الفضل ابراہیم کی تحقیق سے (جنہوں نے تاریخ طبری کی تحقیق کی ہے) مطبوع ہیں۔[۱]

۲-الکامل فی التاریخ

تالیف:ابن اثیر جزری (متوفی ۶۳۰ھ)

اس طرز پر تحریر کی گئی دوسری اہم کتاب تاریخ کامل ہے یہ کتاب علامہ عزالدین ابوالحسن علی بن محمد بن عبدالکریم شیبانی جزری (متوفی ۶۳۰ھ) کی تالیف ہے، جوابن الاثیر کے نام سے مشہور ہیں۔

اس نام سے ایک دوسرے محدث بھی مشہور ہیں، جو آپ کے بڑے بھائی تھے، جن کا نام مجد الدین ابوالسعادات مبارک بن محمد بن عبدالکریم جزری ہے آپ کی وفات (۶۰۶ھ) میں ہوئی ہے۔

آپکے ایک تیسرے بھائی ابوالفتح ضیاء الدین نصر اللہ ہیں جنکا انتقال (۶۳۷ھ) میں ہوا ہے آپ تینوں بھائیوں کا تعلق اگر چہ غیر علمی گھرانے سے تھا، لیکن یہ تینوں فرزاندن توحید افق عالم پر روشنی بن کر چمکے اور اپنے اپنے فن کے بے مثال عالم بنے، آپ کے برادر کبیر فن حدیث وفقہ کے امام سمجھے جاتے تھے، تو آپ تاریخ اور انساب کے ماہر گردانے جاتے تھے، فن حدیث میں بھی آپ کو امامت کا درجہ حاصل تھا[۲]

علامہ عزالدین کی یہ تاریخ انتہائی مشہور و متداول ہے، علامہ سخاویؒ فرماتے ہیں کہ: کتاب یقیناً اسم بامسمی ہے، بلکہ ہمارے استاد محترم (حافظ ابن حجرؒ) نے یہاں تک فرمایا ہے کہ یہ کتاب فن تاریخ میں سب سے بہتر کتاب ہے، احادیث وواقعات کا ذکر اس انداز سے کیا ہے کہ سننے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کو دیکھ رہا ہے۔[۳]

کتاب کی ترتیب وطرز تحریر تاریخ طبری کی طرح ہے، بلکہ اسی کتاب کو اس

---

(۱) دیکھئے تاریخ طبری ۶/۱۱ مقدمہ محقق ص ۶

(۲) ائمہ جرح وتعدیل کے باب میں کچھ حالات گذر چکے ہیں دیکھئے ص ۳۶۰

(۳) الاعلان بالتوبیخ ص ۱۴۶

کیلئے بنیاد بنایا گیا ہے، پوری کتاب کو سنین پر مرتب کیا ہے، مولف کتاب نے اپنی اس کتاب کے بارے میں یوں اظہار خیال فرمایا ہے۔

مشرق اور مغرب اور ان کے درمیان وقوع پذیر حالات کے ذکر کرنے کیلئے ایک جامع تاریخ کی ابتداء کر رہا ہوں، تاکہ اپنی یادداشت برقرار رہے اور نسیان کے وقت اس کا مراجعہ کر سکوں، اس کتاب میں مَیں نے ایسی معلومات جمع کی ہے جو کسی ایک کتاب میں نہیں مل سکتی، جو اس کتاب کا غور سے مطالعہ کرے گا، وہ خود بخود اس کی تصدیق کریگا، اس کتاب کی ابتداء اس عظیم کتاب سے کی ہے جسکو امام طبری نے تحریر کیا ہے، جس پر سارے لوگوں کا اعتماد ہے، پہلے اس کتاب کے سارے تراجم کو ذکر کیا ہے، اس کے ختم ہونے کے بعد (جو ۳۰۲ھ) پر ختم ہو جاتی ہے۔ آگے کی مشہور تاریخ کا تذکرہ کیا ہے۔(۱)

آپ کا انتقال ۶۳۰ھ میں ہوا ہے۔ انتقال کے ایک سال قبل ۶۲۹ھ تک کے واقعات وحادثات اس کتاب میں موجود ہیں، لہٰذا یہ کتاب تخلیق عالم کی ابتداء سے لے کر ۶۲۹ھ تک کے حالات وواقعات پر ایک گرانقدر علمی مجموعہ ہے، پھر بعد میں اس پر اضافہ کیا گیا ہے۔(۲)

یہ کتاب اپنے فن کی جامع ترین اور مفید کتاب ہے لیکن راویان حدیث، محدثین وفقہاء کا ذکر اس میں بھی نہیں پایا جاتا ہے، لہٰذا اس مقصد کیلئے اس کتاب کی ورق گردانی بے سود ہے۔

☆☆☆

---

(۱) الکامل فی التاریخ ۱/ ۶-۷ (۲) کشف الظنون ۲/ ۱۳۸۰

دوسری قسم کتب خاصہ

فن جرح و تعدیل میں دوسری قسم کی وہ کتابیں ہیں جن کو اصطلاح میں "کتب خاصہ" کہا جاتا ہے، کتب خاصہ ان کتابوں کو کہتے ہیں جو کسی خاص صفت سے متصف راویوں کے حالات کیلئے مخصوص ہوں۔

"کتب عامہ" کے مقابلہ میں "کتب خاصہ" کی تعداد بہت زیادہ ہے، "کتب عامہ میں چند ہی کتابیں ہیں البتہ کتب خاصہ کی تعداد بے شمار ہے، اسلئے کہ کتب خاصہ مختلف انواع و اقسام کو شامل ہے، مثلاً:

وہ کتابیں جو صرف ضعیف و متکلم فیہ راویوں کیلئے مخصوص ہوں
یا وہ کتابیں جو صرف ثقہ راویوں کیلئے مخصوص ہوں
یا وہ کتابیں جو کسی خاص شہر کے راویوں کے لئے مخصوص ہوں
یا وہ کتابیں جو کسی خاص کتاب کے راویوں سے متعلق ہوں
یا وہ کتابیں جو صرف کنیت والوں کیلئے مخصوص ہوں
یا وہ کتابیں جو صرف اصحاب کنی، القاب، انساب کے لئے مخصوص ہوں
یا وہ کتابیں جو کسی خاص مقام کیلئے مخصوص ہوں
یا وہ کتابیں جو وفیات یا شہروں کی کیفیات کیلئے مختص ہوں

کتب خاصہ کی پہلی قسم

کتب ضعفاء رجال

انہیں کتب خاصہ میں ایک قسم "کتب ضعفاء رجال" کی ہے کتب ضعفاء رجال ان کتابوں کو کہتے ہیں جن میں ایسے راویوں کا ذکر کیا جاتا ہے، جو ضعیف اور متکلم فیہ ہوتے ہیں، "کتب ضعفاء رجال" کی تصنیف پر علماء کی توجہ "کتب ثقات" کے مقابلے زیادہ رہی ہے یہی وجہ ہے کہ اس فن کی کتابیں "کتب ثقات" سے پہلے اور زیادہ تعداد میں تالیف کی گئی ہیں۔

اس لئے کہ شر کا جاننا اور اس سے بچنا خیر کے جاننے اور اس پر عمل کرنے کے مقابلہ میں زیادہ اہم ہوتا ہے، اس زمنی تقدم کثرت و اہمیت کے پیش نظر کتب ضعفاء رجال کا ذکر "کتب ثقات" سے پہلے کیا جارہا ہے۔

مراحل کتب ضعفاء رجال :- ضعیف راویوں کے حالات ذکر کرنے کیلئے پہلے مرحلہ میں جو مخصوص کتابیں تحریر کی گئی تھیں ان میں راویوں کا نام یا کنیت ذکر کر کے ان کا حکم بیان کر دیا جاتا تھا، خواہ یہ حکم مؤلفِ کتاب کی ذاتی رائے ہو، یا اس کے کسی استاد یا کسی امام نقد کا قول ہو، اس لئے ان کتابوں میں راویوں کے تراجم بمشکل نصف سطر کے ہوتے تھے، دیگر حالات کا تذکرہ نہیں ہوتا تھا، اس فن کی جو ابتدائی کتابیں ہیں ان کتابوں میں:

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "الضعفاء الصغیر"
امام سعدی جوزجانی کی کتاب "أحوال الرجال"
امام ابوزرعہ رازیؒ کی کتاب "الضعفاء"
امام نسائیؒ کی کتاب "الضعفاء والمتروکین" کافی مشہور اور قابل ذکر کتابیں ہیں۔

ان ابتدائی کتابوں کے بعد دوسرے مرحلے میں کچھ ایسی کتابیں لکھی گئی جن میں راویوں کے حالات کا مکمل تذکرہ کیا گیا، اس مرحلہ کی کتابوں میں راویوں کے نام، ان کے حسب و نسب، نسبت اور کنیت، تاریخ وفات کے ساتھ راوی کا سبب ضعف، علماء کے اقوال اور ان کی روایتوں کا ذکر بطور نمونہ کیا گیا ہے، کہیں کہیں شاگرد اور استاد کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

ان میں احادیث و اقوال کو بذریعہ اسناد ذکر کیا گیا، دوسرے مرحلے کی ان کتابوں میں مشہور کتابیں یہ ہیں:

"الضعفاء الكبير" حافظ ابو جعفر عقیلی کی
"المجروحين من المحدثين" ابن حبان کی
"الكامل فی ضعفاء الرجال" ابن عدی کی

پھر تیسرے مرحلہ میں کتابیں تحریر کی گئیں، ان میں راویوں کے بارے میں تفصیلی معلومات حتی الامکان جمع کیا گیا، خاص طور سے اقوال جرح و تعدیل کے جمع کرنے کا اہتمام کیا گیا، پھر ان پر نقد اور ان کا مقابلہ دوسروں کے اقوال سے کیا گیا، راجح اور مرجوح کی وضاحت کر دی گئی، اس مرحلہ میں سلسلہ اسناد کو ترک کر کے بعض مولفات کا حوالہ دیدیا گیا، اس مرحلہ میں مشہور کتابوں میں ''میزان الاعتدال''، امام ذہبی کی ''لسان المیزان''، حافظ ابن حجر کی کافی مشہور و معروف کتابیں ہیں۔

اس فن کی جو اہم کتابیں ہیں ان کا مختصر تعارف، محتویات، اور طریقہ استفادہ مندرجہ ذیل ہے۔

۱- الضعفاء الكبير

تالیف: حافظ ابو جعفر عقیلی (متوفی ۳۲۲ھ)

محتویات:- یہ کتاب آپ کی ان گراں قدر تصانیف میں سے ہے جسکو فنی اعتبار سے پہلی اور جامع کتاب ہونے کا شرف حاصل ہے، اس کتاب میں جملہ متکلم فیہ راویوں کا تذکرہ مصنف نے اپنے علم کے مطابق کیا ہے، اس طرح اس میں کذاب، متہم بالکذب، مجہول، ضعیف، نیز داعی بدعت راویوں کا تفصیلی تذکرہ پایا جاتا ہے، اس میں ان بعض راویوں کا بھی ذکر آگیا ہے جو صحیحین کے راوی ہیں، اور ان پر کلام کیا گیا ہے۔[1]

ترتیب:- اس کتاب کو امام عقیلی نے حروف معجم پر مرتب کیا ہے، لیکن یہ ترتیب متقدین کے طرز پر ہے جس میں نام کے صرف پہلے حرف کا اعتبار کیا جاتا تھا دوسرے حرف کا اعتبار نہیں کیا جاتا تھا۔

لہذا حرف الف سے شروع ہونے والے تمام راویوں کے نام اور ان کے حالات اس کتاب کے بالکل ابتداء میں ملیں گے، البتہ داخلی ترتیب میں ناموں میں تقدیم و تاخیر پائی جاتی ہے، بکثرت استعمال ہونے والے ناموں کو ابواب پر تقسیم کر دیا گیا ہے، مثلاً باب ابراہیمؒ، باب اسماعیل وغیرہ، حرف الف کے ختم ہونے کے بعد حرف ب سے شروع ہونے والے روایوں کے نام اور حالات مذکور ہیں، اسی طرح سے

(۱) الضعفاء الكبير ۱/ ۱۴۱ مقدمہ محقق

آخری حرف تک یہ کتاب اس ترتیب پر مرتب ہے۔

اس لئے راویوں کا نام تلاش کرنے میں کوئی دقت و پریشانی نہیں ہوتی، تلاش کے عمل کو مزید آسان بنانے کیلئے مطبوعہ جلدوں کے آخر میں ہر جلد کی فہرست منسلک کر دی گئی ہے، جس سے بہت مدد ملتی ہے۔

نوعیت تراجم:- ترجمہ میں راوی کا نام ونسب، اور کنیت کا ذکر کیا گیا ہے، اس کے بعد راوی پر حکم لگانے کیلئے ائمہ جرح و تعدیل کے اقوال کو بطور استدلال ذکر کیا گیا ہے، قابل قدر بات یہ ہے کہ ان محدثین ائمہ کے اقوال کو امام عقیلی نے اپنی سند سے ذکر کیا گیا ہے۔

جن علمائے کے اقوال کو اس کتاب میں بطور مصدر ذکر کیا گیا ہے، ان میں مشہور ائمہ فن عبد الرحمٰن بن مہدی، یحیٰی بن معین، احمد بن حنبل، امام بخاری رحمہم اللہ قابل ذکر ہیں، بہت سے راویوں پر اپنا ذاتی فیصلہ بھی سنایا ہے جسکی دلیل ذکر کر دی ہے۔

راوی کے ترجمہ میں ایک دو عدد غریب اور منکر حدیثوں کا ذکر بطور نمونہ کیا گیا ہے، جس کی وجہ سے یہ کتاب ضعیف اور موضوع حدیثوں کی معرفت کیلئے اہم مصدر بن گئی ہے، بعض تراجم مختصر اور بعض کثرت اخبار کی بنا پر مطول بھی ہیں۔

خاص اصطلاح:- ایک خاص بات یہ ہے کہ امام عقیلیؒ کا موقف جرح رجال کے بارے میں قدرے وسیع ہے، اسلئے بہت سے راویوں کو غیر مسلمہ اسباب جرح کی بناء پر انہوں نے ضعیف قرار دیدیا ہے، اسلئے مذکورہ راوی ان کے یہاں اگرچہ ضعیف سمجھا جائے گا لیکن ضروری نہیں کہ وہ حقیقۃً میں بھی ضعیف ہو، صحیحین کے جو راوی اس کتاب میں آگئے ہیں عموماً ان کا حال یہی ہے، کچھ ایسے افراد کو جو فتنہ خلق قرآن میں ابتلاء و آزمائش سے بچنے کیلئے خلق قرآن کے قائل تھے یا جنکے یہاں کوئی بھی بدعت پائی جاتی تھی خواہ وہ جرح کے لائق ہو یا نہ ہو محض اس بنیاد پر ضعیف قرار دیدیا ہے۔(۱)

اسی طرح سے بعض راویوں کو تفرد کی بنیاد پر ” لا يتابع عليه“ کہہ کر

---

(۱) دراسات فی الجرح والتعدیل ص ۴۱۳

ضعیف قرار دے دیا ہے۔[1]

سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس کتاب میں انہوں نے علی بن مدینی جیسے امام فن کا تذکرہ کیا ہے۔[2]

امام ذہبی کا تبصرہ اور اسکی کمزوری:- ان کا جواب حافظ ذہبی نے یہ کہہ کر دیا ہے کہ ہر تفرد قابل گرفت نہیں ہوتا ہے، بلکہ ثقہ اور متقن کا تفرد صحیح ہوتا ہے، صدوق اور اس سے نیچے درجے کے راوی کا تفرد منکر ہوتا ہے۔[3]

نیز فرمایا کہ ضروری نہیں کہ ہر وہ شخص جو صاحب بدعت ہو یا جس سے کوئی لغزش یا غلطی پائی جائے تو اسکی روایت بھی مردود ہو، اور نہ ثقہ ہونے کیلئے یہ شرط ہی ہے کہ آدمی معصوم عن الخطاء ہو۔[4]

رد عمل کے طور پر امام ذہبی نے انہیں اسباب کی بنیاد پر ان پر شدید نقطہ چینی کی ہے، جو حد ادب سے بھی آگے بڑھ گئی ہے۔[5] اسی طرح کے شدید رد عمل کا اظہار انہوں نے اور ائمہ کے بارے میں بھی کیا ہے، جس میں شخصیت پسندی حقیقت پسندی پر غالب ہے۔

امام عقیلی کو جو باتیں حافظ عصر علی بن مدینی کے بارے میں معلوم تھیں یا امام عبدالرحمٰن بن مہدی، اور امام احمد بن حنبلؒ کے اقوال سے جو نتیجہ اخذ کیا تھا اس بنیاد پر انہوں نے مناسب اسلوب میں ان کا ذکر کر دیا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ: جنح إلى ابن أبي دُوَاد والجهمية وحديثه مستقيم إن شاء الله[6] تاکہ مفسدین اور اعداء کو یہ کہنے کا موقع نہ مل سکے کہ محدثین نے اپنے ائمہ کے بارے میں جانب داری سے کام لیا ہے، اور ان کے بارے میں جو جرحیں وارد تھیں ان کو نظر انداز کر دیا ہے۔

رہی دیگر باتیں تو یہ ان کا اپنا موقف ہے، سارے علماء کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں، اور نہ ہی یہ ضروری ہے کہ ان کا موقف صحیح بھی ہو، کتاب کے موضوع کے اعتبار سے ایسے راویوں کا ذکر کرنا ان کے لئے ضروری تھا جن پر کسی بھی

---

(۱) حافظ ذہبی نے اس کا تفصیلی جواب دیا ہے اور یہ بتایا ہے ہر تفرد باعث ضعف نہیں ہوتی ہے۔ میزان الاعتدال ۳/ ۱۴۰، (۲) مقدمة الضعفاء ، ۱/ ۵۹، میزان الاعتدال ۳/ ۱۴۰

(۳) میزان الاعتدال ۳/ ۱۴۰ (٤) ایضاً ۳/ ۱٤۱

(٥) میزان الاعتدال ۳/ ۱٤۰ (٦) الضعفاء الكبير ۳/ ۲۳٥

طرح کا عیب لگا ہوا ہے، جیسے امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ خود ایسے راویوں کا ذکر کرنے پر اس وجہ سے مجبور ہوگئے تاکہ کوئی ان پر استدراک نہ کرے۔

یہ ان کی ذاتی اصطلاح اور رائے ہے، "ولا مشاحة فی الاصطلاح" لہٰذا اس طرح کے اعتراض سے کتاب کی اہمیت کم نہیں ہوتی ہے، جب کہ خود امام ذہبی نے اس کتاب کی تعریف کی ہے اور فرمایا ہے کہ: **للعقیلی مصنف مفید فی معرفة الضعفاء.** [1] اور اس پر اعتماد کر کے اس سے استفادہ کیا ہے، دیگر علماء نے بھی اس کو بحیثیت مصدر تسلیم کیا ہے اور اس سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔

۲- المجروحین من المحدثین والضعفاء والمتروکین

تالیف: ابن حبان بُستی (متوفی ۳۵۴ھ)

تعارف و مشتملات: - یہ کتاب امام ابو حاتم بن حبان بستی کی گرانقدر تالیف ہے جو کتب رجال کے فن ضعفاء میں دوسرے مرحلے کی دوسری اہم اور بنیادی کتاب ہے، مولف کتاب نے اس کتاب کو اپنی عظیم تصنیف "تاریخ کبیر" سے مختصر کیا ہے تاریخ کبیر میں ہر طرح کے راویوں اور ان کے حالات کا تفصیلی ذکر کیا تھا، چونکہ یہ کتاب بڑی طویل اور مفصل تھی اس کا حفظ کرنا مشکل تھا، اسلئے اس کو دوسری قسموں میں مختصر کر کے تقسیم کر دیا، تاکہ اس کا حفظ کرنا اور اس سے استفادہ آسان ہو، پہلی قسم میں صرف ثقہ راویوں کو طبقات پر مرتب کیا ہے، یہ کتاب "الثقات" کے نام سے مشہور ہے، دوسری قسم میں ضعیف راویوں کو جمع کیا ہے۔[2] یہی کتاب "المجروحین من المحدثین" کے نام سے مشہور ہے، جو "الثقات" کے بعد تصنیف کی گئی ہے۔

کتاب کو ایک طویل علمی مقدمہ سے شروع کیا ہے، جو ۹۶ صفحات پر مشتمل ہے اس مقدمہ میں جرح و تعدیل سے متعلق نہایت اہم و ضروری معلومات کا تذکرہ ہے، جس میں سنت رسولؐ کی حفاظت کی تاکید، کذب بیانی، اور وضع حدیث پر وعید، ضعفاء اور مجروحین کی معرفت کی ضرورت پر زور دیا ہے، اور براہین ساطعہ سے اس کو ثابت کیا ہے، اس کے بعد صحابہ اور ائمہ دین کی ان کوششوں کا ذکر کیا ہے جو شرع

(۱) میزان الاعتدال ۱/۴ (۲) الثقات ۱/۱۴

متین کی حفاظت کیلئے انہوں نے کیا تھا، پھر مجروحین راویوں کو بیس قسموں میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، اس کے بعد ان ثقہ راویوں کا ذکر کیا ہے جن کی روایت قابل احتجاج نہیں ہوتی ان کی چھ قسمیں بتائی ہیں۔(۱)

ترتیب:- اس طویل علمی مقدمہ کے بعد اصل کتاب کو حروف تہجی پر مرتب کیا ہے، لیکن اس ترتیب میں متقدین کے نقش قدم پر چلتے ہوئے حرف ثانی کا اعتبار نہیں کیا، بلکہ ہر حرف سے شروع ہونے والے ناموں کو اس کے باب میں ذکر کر دیا ہے، لہذا راویوں کا نام تلاش کرنے میں اس ناحیہ سے آسانی ضرور ہوتی ہے، کہ ایک حرف سے شروع ہونے نام اکٹھا مل جاتے ہیں لیکن تقدیم و تاخیر کی بنا پر ناموں کی تلاش میں کچھ وقت بھی لگ سکتا ہے، تلاش کے عمل کو آسان بنانے کیلئے ہر جلد کے آخر میں فہرست لگا دی گئی، جو کتاب کی ترتیب پر مرتب ہے، اس سے قدرے آسانی ہو جاتی ہے، اس کو مزید آسان بنانے کیلئے تیسری جلد کے آخر میں پوری کتاب کی دقیق فہرست حروف تہجی پر مرتب کر دی گئی ہے۔

حرف ''الف'' کے بعد حرف ''ب'' کو مذکورہ ترتیب پر مرتب کیا ہے اسی طرح سے یہ کتاب حرف ''الف'' سے ''ی'' تک مرتب ہے، ناموں کے ختم ہونے کے بعد کنیت کا ذکر کیا ہے۔(۲)

کتاب میں پہلا نام ابان بن ابی عیاش کا ہے، او آخری نام الیسع بن طلحہ کا ہے پہلی کنیت ابو بکر بن عبد اللہ اور آخری کنیت ابو طیب حربی کی ہے، اس طرح اس کتاب میں تقریباً (۱۲۷۸) راویوں کا ترجمہ پایا جاتا ہے۔

نوعیت تراجم:- ترجمہ میں راویوں کے نام و نسب، نسبت اور کنیت کا ذکر کیا ہے عموماً راوی کے بعض اساتذہ شاگردوں کا بھی ذکر کیا ہے، ہر راوی پر مختلف کلمات کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، بعض ائمہ فن کے اقوال سے بھی استدلال کیا ہے، جن کو بذریعہ سند نقل کیا ہے، راوی کے سبب ضعف کو بھی بتا دیا ہے، اور بطور مثال ایک آدھ منکر روایتوں کا بھی ذکر کیا ہے، اسلئے اس کتاب میں احادیث موضوعہ اور

(۱) المجروحین ۱/ ۳-۹۶ (۲) المجروحین ۱/ ۱۴۰

ضعیفہ کی اچھی خاصی تعداد ہے، اس میں سے تقریباً ساری روایتوں کو ابن الجوزی نے "الموضوعات الکبریٰ" میں جمع کیا ہے، اس کتاب کے تراجم عموماً، متوسط ہیں اور یہ اور اپنے موضوع کی سابقہ کتاب " تاریخ الضعفاء للعقیلی" سے کافی مشابہت رکھتی ہے۔

خصوصی اصطلاح:- جرح و تعدیل کے سلسلہ میں امام ابو حاتم بن حبان کا خصوصی نقطہ نظر ہے جو عام محدثین سے مختلف ہے، ان کا یہ خیال ہے کہ جس راوی کے بارے میں کوئی جرح معلوم نہ ہو، تو وہ عادل سمجھا جائے گا، کیونکہ لوگوں کو اس کا مکلّف نہیں بنایا گیا ہے، کہ وہ نامعلوم اور مخفی چیزوں کی جستجو کریں۔ (۱)

ابن حجر کا تبصرہ:- حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ابن حبان کا یہ مذہب کہ راوی اگر مجہول عین نہ ہو تو عادل سمجھا جائے گا، یہاں تک کے جرح کے بارے میں اسکا پتہ لگ جائے، عجیب نقطہ نظر ہے، جمہور اس کے خلاف ہیں۔ (۲) ایسا لگتا ہے کہ انکے یہاں جہالت عین ایک شخص کی روایت سے ختم ہوتی جاتی ہے، یہی نقطہ انکے شیخ ابن خزیمہ کا بھی حالانکہ دوسروں کے یہاں وہ مجہول ہوتا ہے، کیونکہ جہالت حال باقی رہتی ہے۔

۳-الکامل فی ضعفاء الرجال

تالیف: حافظ ابن عدی (متوفی ۳۶۵ھ)

یہ کتاب ضعفاء رجال میں دوسرے مرحلہ کی سب سے اہم اور جامع کتاب ہے، علماء جرح و تعدیل نے اس کتاب کو اپنی تالیف کیلئے مرجع بنایا ہے، اور راویوں کے بارے میں آپ کے اقوال کو بطور فیصل تسلیم کیا ہے، خاص طور پر امام ذہبیؒ نے اپنی نادر تالیف "میزان الاعتدال" کیلئے اس کتاب کو بنیاد بنایا ہے، دیگر علماء جرح و تعدیل نے بھی اس کتاب کو بڑی اہمیت دی ہے۔

مشتملات:- امام ابن عدی نے اس کتاب کو ایک گرانقدر علمی مقدمے سے شروع کیا ہے، جو (۱/۱۶۹) پر ختم ہوتا ہے، اس مقدمہ میں کذب بیانی کی فضیحت، حدیث رسولؐ میں دروغ گوئی پر وعید اور سزا، بعض صحابہؓ کی قلت راویت کے اسباب، کتابت حدیث کا جواز اور عدم جواز کا معاملہ، کاذبین کی قسمیں، ائمہ جرح و تعدیل کے تراجم کا ذکر (صحابہ سے لیکر مولف کے زمانہ تک جو اس مقدمہ کا سب سے اہم جزء ہے) اسکے بعد غیر

(۱) الثقات، ۱/ ۱۳ (۲) لسان المیزان ۱/۱۶

ثقات سے روایت کرنے کا نقصان، صالحین سے غفلت اور دروغ گوئی کا صدور اور آخر میں ان لوگوں کا تذکرہ جن سے علم حاصل کیا جاسکتا ہے، اور جن سے نہیں کیا جاسکتا۔

اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے، اس کتاب میں تمام راویوں کا تذکرہ ہے جن پر کسی طرح کلام کیا گیا ہے، خواہ وہ قادح ہو یا غیر قادح، اسی وجہ سے بہت سے ائمہ اور صحیحین کے رجال کا تذکرہ بھی اسمیں پایا جاتا ہے۔

اسکی وجہ یہ ہے کہ مولف نے جملہ متکلم فیہ راویوں کے جمع کرنے کا قصد کیا ہے، جسکی وجہ سے یہ التزام کرنا پڑا کہ اسمیں ہر شخص کا تذکرہ کیا جائے، جس پر کسی کا بھی کلام ہو، اسی وجہ سے بہت سے راویوں کا ذکر کرنے کے بعد ان کی طرف سے دفاع بھی کیا ہے، اور بتایا ہے کہ اس کتاب میں ذکر کرنے کا مقصد ان پر عیب لگانا نہیں ہے۔

امام ذہبی فرماتے ہیں: **یذکر فی الکامل کل من تکلم فیه بأدنی شئ ولو کان من رجال الصحیحین لکنه ینتصر له إذا أمکن ، ویروی فی الترجمة حدیثا أو أحادیث ما استنکر للرجل، وهو منصف فی الرجال بحسب اجتهاده.** (۱)

ترتیب:- کتاب کو حروف تہجی پر مرتب کیا گیا ہے، اس کی ترتیب بھی اس مرحلہ کی سابقہ دونوں کتابوں کی طرح ہے، یعنی صرف پہلے حرف کا اعتبار کیا گیا ہے، دوسرے کا نہیں، لہذا ہر حرف سے شروع ہونے والے نام اکٹھا بآسانی دستیاب ہو سکتے ہیں، البتہ تقدیم و تاخیر کی وجہ سے کچھ وقت لگ سکتا ہے، کتاب سے استفادہ کو مزید آسان بنانے کیلئے ہر جلد کے آخر میں فہرست مرتب کر دی گئی ہے، جس سے بہت مدد ملتی ہے۔

نوعیت تراجم:- تراجم میں حسب و نسب پر زیادہ زور نہیں دیا گیا ہے، بلکہ راوی کے نام مع ولدیت بعض مشائخ اور نسبت پر اکتفا کیا ہے تاریخ وفات بھی بہت کم ذکر کیا ہے۔

ہر راوی کے بارے میں اپنا واضح فیصلہ سنادیا ہے جو عموماً ہر ترجمہ کے آخر میں ہے اس فیصلے کا انتخاب متکلم فیہ راوی کی روایتوں کی چھان بین کے بعد کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ آپ کے فیصلے عموماً معتدل ہیں۔

علماء نقاد کے اقوال سے بھی استفادہ کیا ہے، ان اقوال کو اپنی سند کے واسطہ

---

(۱) سیر أعلام النبلاء ۱۶/ ۱۵۵- ۱۵۷

سے ذکر کیا ہے، جو اس مرحلہ کی کتابوں کی اہم خصوصیت ہے۔

ہر راوی کے ترجمہ میں بطور مثال ایک یا چند ضعیف روایتوں کا بھی ذکر کیا ہے کثرت اخبار کی وجہ سے بعض تراجم طویل ہوگئے ہیں، اور اسی بناء پر اس کتاب میں ضعیف اور منکر روایتوں کا بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے، جو ایک اہم مرجع کی حیثیت رکھتی ہے، (۱) ناموں کے ختم ہونے کے بعد آخر میں ان راویوں کا ذکر کیا ہے جو کنیت سے مشہور ہیں۔

علماء کی نگاہ میں :- اہل علم نے اس کتاب کو بہت پسند کیا ہے، حمزہ بن یوسف سہمیؒ نے جب امام دار قطنی سے یہ درخواست کی کہ فن ضعفاء میں کوئی کتاب تصنیف کر دیں تو انہوں نے فرمایا کہ کیا تمہارے پاس ابن عدی کی کتاب نہیں ہے؟ امام سہمی نے کہا جی ہاں موجود ہے، امام دار قطنی نے فرمایا کہ بس وہ کتاب کافی ہے اس پر اضافہ کی گنجائش نہیں۔ (۲)

امام خلیلی نے (ارشاد ق ۱۵۵) میں فرمایا ہے کہ ضعفاء رجال میں ابن عدی کی جو تالیف ہے اس طرح کی کوئی دوسری کتاب نہیں۔ (۳)

امام ذہبی فرماتے ہیں کہ ابن عدی کی کتاب 'الکامل'' اس فن کی سب سے زیادہ جامع اور عظیم کتاب ہے۔ (۴)

امام سبکیؒ فرماتے ہیں کہ : ''وکتابه الكامل طابق اسمه معناه ووافق لفظه فحواه من عينه انتجع المنتجعون وبشهادته حكم الحاكمون''(۵) ابن عدی کتاب '' الکامل '' اسم با مسمی ہے، اس کے الفاظ کلام کے عین مطابق ہیں اسی چشمہ سے لوگوں نے فائدہ حاصل کیا ہے، اور انہیں کی شہادت سے فیصلہ کیا ہے،

ذیول و اختصار :- ابن رومیۃ نے '' الحافل فی تکملۃ الکامل'' اور ابن طاہر نے '' تکملۃ الکامل '' کے نام سے کتاب پر ذیل تحریر کی ہے، (۶) نیز ابن ایبک دمیاطی نے اس کو مختصر کیا ہے، (۷) جو کتاب کی اہمیت پر غماز ہے۔

---

(۱) ان روایتوں کو ابن طاہر مقدسی نے ایک الگ تصنیف میں جمع کیا ہے، نیز محقق کتاب و صاحب مطبع نے جملہ احادیث کو حروف معجم پر مرتب کر کے ایک جلد میں جمع کر دیا ہے، جو کتاب کے ہمراہ مطبوع ہے

(۲) تاریخ جرجان ۲۲۶

(۳) مقدمہ کامل صبحی سامرائی ص ۷

(۴) میزان الاعتدال ۱ / ۲

(۵) طبقات الشافعیۃ ۲ / ۲۳۳

(۶) میزان الاعتدال ۱ / ۲۰۱

(۷) مقدمہ کامل صبحی سامرائی ص ۱۲

٤- میزان الاعتدال فی نقد الرجال

تالیف: ابو عبد اللہ ذہبی (متوفی ۷۴۸ھ)

یہ کتاب ضعفاء رجال کے تیسرے مرحلہ کی کتابوں میں جامع ترین اور مقبو ل کتاب ہے، اس مرحلہ کی کتابوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں راویوں کے متعلق معلومات میں اضافہ ہوتا ہے، بالخصوص جرح وتعدیل سے متعلق ، نیز وہ راوی جن کا ذکر سابقہ کتابوں میں نہیں آسکا ہے ان کا بھی ذکر آگیا ہے، ائمہ جرح وتعدیل کے اقوال کی نقل کیلئے جو اسانید دوسرے مرحلہ کی کتابوں میں پائی جاتی ہیں وہ اس مرحلہ کی کتابوں میں نہیں ہیں، اس طرح منکر احادیث جس کثرت سے ان کتابوں میں ہوتی ہیں، اس میں اس طرح نہیں ہوتی ہیں، اور نہ زیادہ اسناد کا ذکر کیا جاتا ہے،

علماء کی نگاہ میں :- زمانہ کے مزاج اور ضروریات کے مطابق یہ کتابیں لکھی گئی ہیں اس لئے یہ کتابیں کافی مفید ہیں اس مرحلہ کی کتابوں میں امام ذہبیؒ کی یہ وہ مایہ ناز تصنیف ہے جو یقیناً اسم با مسمّی ہے، اس زمانہ اور بعد کے زمانے میں علماء نے اس کی بڑی تعریف کی اور اس پر بھرپور اعتبار کیا ہے۔

واقعہ بھی یہی ہے، اس کتاب کو اگر اس سلسلہ سے حذف کر دیا جائے تو ضعفاء رجال کے حالات اور ان کی معرفت " دونها خرط القتاد " کے مصداق ہوگا، علامہ سبکی فرماتے ہیں: "وهو من أجل الكتب" [1]

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ: "ألف الحفاظ فی أسماء المجروحين كتبا...... من أجمع ما وقفت عليه كتاب الميزان "[2] حفاظ نے اسماء مجروحین کے متعلق بہت سی کتابیں لکھی ہیں، میرے علم میں ان میں سب سے جامع کتاب "المیزان" ہے۔

علامہ حسینی فرماتے ہیں کہ: من أحسنها ميزان الاعتدال فی نقد الرجال [3]

امام سخاوی کا کہنا ہے کہ: "وعول عليه من جاء بعده "[4] نیز فرمایا کہ: "هل انتفع الناس فی هذا الفن بعده وإلى الآن بغير تصانيفه ؟"[5] اسکی اہمیت

---

(١) طبقات الشافعية ٥/ ٢١٧ — (٢) لسان الميزان ١/ ٤

(٣) ذيل تذكرة الحفاظ ص ٣٥ — (٤) الإعلان بالتوبيخ ص ١٠٩

(٥) الإعلان بالتوبيخ ص ٧٦

ہی کے پیش نظر حافظ ابوالفضل عراقی نے ذیل تحریر فرمائی ہے،[1] نیز حافظ ابن حجرؒ نے اس کی تلخیص (اختصار) اور تکمیل "لسان المیزان" میں کیا ہے،[2] اس کتاب میں حافظ ذہبی نے بہت اہم اور دقیق اصولوں کی طرف بھی جا بجا اشارہ کیا ہے۔[3]، نیز مجرد نقل پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ اپنی رائے کا اظہار علی وجہ البصیرۃ فرمایا ہے۔[4]

نیز اہل علم کی اس فن میں تصنیف شدہ کتابوں پر مثبت یا منفی پہلو سے تبصرہ کیا ہے، اوان کے اقوال پر رد و قدح بھی کیا ہے،[5]

مشتملات:- اس کتاب کو ایک مختصر مقدمہ سے شروع کیا گیا ہے، جس میں تاریخ تدوین رجال حدیث، کتاب کی ترتیب و تصنیف نیز محتویات و منہج کے متعلق وضاحت فرمائی ہے، آخر میں جرح و تعدیل کے کلمات اور ان کے مراتب کا ذکر کرتے ہوئے متقدمین اور متاخرین میں حد فاصل کی وضاحت کی ہے۔[6]

اس کتاب میں کذابین، وضاعین، متہمین، ضعفاء اور مجہولین کیساتھ ساتھ ان ثقات کا بھی ذکر ہے، جو بدعتی ہیں، اور ایسے ثقات بھی ہیں جن پر کلام قادح نہیں ہے۔

جن کے بارے میں محلہ الصدق اور لاباس بہ جیسا حکم لگایا گیا تھا، ان کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔

اس کتاب کو آٹھ قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱- پہلی قسم میں مردوں اور عورتوں کے تراجم بترتیب اسماء ذکر کیے گئے ہیں۔

۲- دوسری قسم میں رجال کی کنیت ذکر کی ہے۔

۳- تیسری قسم میں ان افراد کا ذکر کیا ہے جو ابن فلاں سے مشہور ہیں۔

٤- چوتھی قسم میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو نسبت سے مشہور ہیں۔

۵- پانچویں قسم میں ایسے راویوں کا ذکر کیا گیا ہے جو مبہم ہیں۔

٦- چھٹی قسم میں ان راویات (خواتین) کا ذکر کیا گیا ہے جو مبہم ہیں۔

---

(۱) لسان المیزان ۱/ ٤ یہ ذیل جامعہ ام القری کے زیر اہتمام مطبوع ہے، اس میں (۷۹۹) تراجم ہیں۔
(۲) لسان المیزان ۱/ ٤، الإعلان بالتوبیخ ص ۱۱۰، یہ کتاب سات جلدوں میں مطبوع ہے
(۳) دیکھئے ۱/ ٦، ۲۷، ۱۱۱، ۱۱۸، ٦۰۵ (٤) مختلف تراجم میں اس کی مثال موجود ہے دیکھئے، ۱/ ۵
(۵) ملاحظہ ہو، میزان الاعتدال، ۱/ ۲، ۳، ۱٦، ۲۹، ۲۷٤ (٦) دیکھئے مقدمہ کتاب ۱/ ۱/ ٤

۷- ساتویں قسم میں راویات کا ذکر باعتبار کنیت کیا گیا ہے۔

۸- آٹھویں قسم میں ان خواتین کا ذکر ہے جو (ام) والدہ فلاں سے معروف ہیں۔

ترتیب:- ابتداء سے لیکر انتہا تک ساری قسمیں نہایت دقت کے ساتھ حروف تہجی پر مرتب ہیں، اس ترتیب میں راویوں کے نام اور ان کے آباو اجداد کے نام میں بھی ترتیب کا خیال رکھا گیا ہے۔

لہٰذا اس کتاب سے استفادہ انتہائی آسان ہے، جس راوی کی بھی تلاش ہو پہلے اس کے نام کے حروف کو دیکھیں، پھر اس جگہ تلاش کریں جہاں وہ نام ہو سکتا ہے، چند لمحوں میں مطلوبہ ترجمہ مل جائے گا۔

ثقات کے ذکر کا مقصد:- اس کتاب میں ہر اس راوی کا ذکر کیا گیا ہے جس پر کسی بھی قسم کا کلام کیا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس میں بھی بہت سے صحیحین کے رجال اور بڑے بڑے اهل علم کا ذکر آ گیا ہے، لیکن ان کے ذکر کرنے کا مقصد ان پر عیب لگانا نہیں تھا بلکہ ان کا دفاع کرنا اور اپنے اوپر تعقیب اور استدراک سے بچنا تھا، وہ فرماتے ہیں کہ: **وفيه من تكلم فيه مع ثقته وجلالته بأدنى لين وبأقل تجريح فلولا أن ابن عدى أو غيره من مولفى كتب الجرح ذكروا ذلك لما ذكرته لثقته، ولم أرمن الرأى أن أحذف اسم أحد خوفا من أن يتعقب علي، لأني ذكرته لضعف فيه عندي.**[1]

نیز اس میں ائمہ متبوعین کا ذکر نہیں کیا گیا ہے، اور اگر کسی کا ذکر آ بھی گیا ہے تو انصاف کے ساتھ ان کا ذکر کیا گیا ہے، جو ان کیلئے قابل ضرر نہیں۔

اشارات:- کتب ستہ کے جو رجال اس میں مذکور ہیں ان کیلئے مشہور اشارات استعمال کئے گئے ہیں، جس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ مذکورہ راوی کتب ستہ میں سے کس کتاب کے یا کن کن کتابوں کے راویوں میں سے ہیں، وہ رموز یہ ہیں: خ، م، د، س، ت، ق، اگر مذکور راوی کا نام ساری کتابوں میں ہے تو ایسی صورت میں حرف ''ع'' سے اشارہ کیا گیا ہے، اور اگر سنن اربعہ کے ہیں تو ان کیلئے ''عو'' کا استعمال کیا گیا ہے۔[2] نیز جن

---

(۱) میزان الاعتدال ۱/ ۲ (۲) مصدر سابق

راویوں کاذکر اس میں آگیا ہے اور حقیقت میں ثقہ ہیں ان کے نام پر کلمہ "صح" لکھ کر ثقاہت کی جانب اشارہ کیا ہے۔(۱)

نوعیت تراجم:- تراجم میں راوی کانام ونسب، شیوخ تلامذہ اور ائمہ کے اقوال کا ذکر کیا گیا ہے، کہیں کہیں راوی کے عام حالات اخبار واحادیث کا بھی ذکر ہے، تراجم عموماً متوسط ہیں کہیں کہیں مفصل اور کہیں کہیں مختصر بھی ہیں۔

علامہ حسینی فرماتے ہیں کہ: وفی کثیر من تراجمه اختصار یحتاج إلی تحریر، بہت سے تراجم مختصر ہیں جن میں اضافہ کی ضرورت ہے۔(۲)

خاص اصطلاح: - وہ راوی جن کو مجہول کہا ہے، اور اسکی نسبت کسی امام کی طرف نہیں کی ہے تو یہ امام ابو حاتم کا قول ہے، اور اگر یہ کہا ہے کہ :فیه جهالة أو نکرة، أو یجهل، أو لا یعرف وغیرہ اور قول کی نسبت کسی طرف نہیں کیا ہے، تو وہ خود امام ذہبیؒ کا فیصلہ ہے، اسطرح اگر صدوق، ثقہ، صالح، یالین وغیرہ کہا ہے تو وہ بھی امام ذہبی کا قول ہے۔(۳)

۵-لسان المیزان

تالیف: خاتمہ حفاظ ابن حجر عسقلانی (متوفی ۸۵۲ھ)

فن ضعفاء رجال میں یہ آخری مرحلہ کی تصنیف ہے، جس کے بعد کوئی اہم کتاب وجود میں نہیں آئی، اور نہ ہی اس کی ضرورت محسوس کی گئی، یہ کتاب آپ کی ان تصانیف میں سے ہے، جس کو آپ نے خود پسند کیا ہے،(۴) لیکن یہ بھی فرمایا کہ اگر میں نے ذہبی کی اقتدا نہ کی ہوتی بلکہ مستقل کتاب تحریر کرتا تو زیادہ بہتر تھا۔(۵)

یہ کتاب امام ذہبی کی تصنیف میزان الاعتدال کا تتمہ، اختصار، اور تہذیب ہے، اس میں سے میزان الاعتدال کے ان راویوں کو حذف کر دیا گیا ہے، جو تھذیب الکمال میں موجود ہیں، اس لئے کہ میزان اور تہذیب دونوں جگہ ان کا تذکرہ موجود ہے، اس میں بہت سے افراد کا اضافہ کیا ہے، جو میزان الاعتدال میں موجود نہیں، وہ اضافے جن کو اپنی معلومات کی بنیاد پر کیا ہے ان کے نام پر حرف "ز" کی علامت لگادی

---

(۱) لسان المیزان ۱/ ۹ نیز دیکھئے میزان الاعتدال ۱/ ۱۶ ترجمہ ابان بن یزید
(۲) ذیل تذکرة الحفاظ ص ۳۵ (۳) میزان الاعتدال، ۱/ ۶، ولسان المیزان ۱/ ۹
(٤) البدر الطالع، ۱/ ۸۸ (۵) ابن حجر العسقلانی ودراسة مصنفاته ص ۵۲۱

ہے، جو زیادتی کی نشاندہی کرتی ہے۔

بہت سے افراد کا اضافہ امام عراقی کی کتاب " ذیل المیزان " سے کیا ہے، ایسے ناموں پر حرف "ذ" کی علامت لگادی ہے، جو ذیل کی طرف اشارہ ہے، میزان الاعتدال کے بعض رجال میں کچھ معلومات کا اضافہ کیا ہے، جو امام ذہبی کے کلام کے خاتمہ کے بعد ہے، جس کو کلمہ "انتھی" کے بعد ذکر کیا ہے۔

میزان میں جو اوہام پائے جاتے تھے ان کی تصحیح کی ہے، "میزان" کے وہ رجال جن کو "لسان" سے حذف کر دیا گیا ہے ان کی فہرست آخری کتاب میں دے دی گئی ہے۔ (۱) ان رجال پر وہ سارے رموز بر قرار رکھے گئے تھے، جو رجال کتب ستہ کیلئے تہذیب میں استعمال کئے گئے ہیں۔

جن ناموں کے اوپر "صح" لکھا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ان پر بغیر دلیل کے کلام کیا گیا ہے جو غیر موثر ہے، وہ راوی ثقہ ہے، کچھ راویوں پر "مخ" کا رمز لگایا گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ راوی مختلف فیہ ہے، لیکن ثقاہت غالب ہے۔ (۲) لیکن افسوس یہ ہے کہ صاحب مطبعہ نے ان رموز کو یکسر حذف کر دیا ہے، پوری کتاب میں صرف "ز" اور "ذ" کی علامت کو بر قرار رکھا ہے۔

ترتیب:۔ کتاب کی ترتیب و تنظیم بالکل ویسے ہی ہے جس طرح "میزان الاعتدال" کی ہے، یعنی پوری کتاب حروف تہجی پر بڑی دقت کے ساتھ راویوں کے نام ان کے آباء و اجداد کے نام کی رعایت کرتے ہوئے مرتب کی گئی ہے، ناموں کے اختتام کے بعد کنیت اور پھر مبہمات کا ذکر کیا گیا ہے۔

پھر ان راویوں کا نام ہے جو کسی بھی نسبت سے مشہور نہیں۔ اس کے بعد ان لوگوں کا نام ہے جن کی کسی کی طرف اضافت کی گئی ہے، جیسے ابن فلاں، اخو فلاں، یا خادم فلاں وغیرہ۔ پھر القاب و صفات سے مشہور راویوں کا ذکر ہے، عورتوں کے ناموں کو کتاب میں مردوں کیساتھ کر دیا ہے، لہذا آخر میں ان کا کوئی ذکر نہیں ہے، پھر ان رجال کی فہرست ہے جنکو "میزان" سے حذف کر دیا گیا تھا، اسماء کا تذکرہ کتاب کی چھٹی جلد تک ہے بقیہ اقسام کتاب کی ساتویں (آخری) جلد میں ہیں، تراجم میں تقریباً

---

(۱) لسان المیزان ۱/ ٤ (۲) مصدر سابق ۷/ ۱٦۷

وہی معلومات ہیں جو میزان الاعتدال کے رجال کے تراجم میں ذکر کی جاچکی ہے۔

تکمیل و تصحیح :- لسان المیزان لکھتے وقت کچھ تراجم چھوٹ گئے تھے، یا ان میں وہم ہو گیا تھا ان کا اضافہ اور تصحیح ایک دوسری کتاب میں کیا ہے، جس کا نام تحریر المیزان رکھا ہے۔ اس طرح سے تقویم اللسان تحریر کیا ہے، اس میں ان لوگوں کا تذکرہ ہے جن کو صاحب "میزان" نے ذکر کیا تھا، لیکن ان کی تضعیف پر کوئی دلیل نہیں ذکر کی تھی۔[1]

ضعفاء سے متعلق کچھ متنوع کتابیں

اب تک جن کتابوں کا ذکر گذرا ہے ان میں ہر قسم کے ضعفاء کا ذکر آگیا ہے، لیکن کچھ اہل علم نے اصناف ضعفاء میں سے کچھ خاص صنف کے لوگوں کو منفرد کتابوں میں جمع کر دیا ہے، وہ کتابیں بھی کتب ضعفاء میں شمار ہوں گی، ان میں سے کچھ یہ ہیں۔

۱- مدلسین پر مخصوص کتابیں

ان راویوں کو جن پر تدلیس کا عیب لگا ہوا ہے اہل علم نے منفرد کتابوں میں ان کا نام جمع کر دیا ہے، ان میں کچھ کتابیں یہ ہیں۔

۱- **التبیین لأسماء المدلسین** :- یہ سبط ابن عجمی (متوفی ۸۴۱ھ) کی تالیف ہے جو تقریباً بیس صفحات پر مشتمل ہے، اس میں ناموں کا ذکر کیا گیا ہے کوئی خاص تفصیل نہیں ہے، البتہ جن لوگوں نے تدلیس کا حکم لگایا ہے، اس کی نسبت ان کی طرف کر دی گئی ہے، کتاب حروف معجم پر مرتب ہے، اگر کتب ستہ کا راوی ہے تو اس کی جانب اشارہ کر دیا ہے، عموماً سن وفات کا ذکر کر دیا ہے، مولف کتاب فرماتے ہیں: یہ نام اگر ترجمہ کے ساتھ ذکر کر دیا جائے تو ایک مجلد (طویل) کتاب بن جائے گی، اس لئے ناموں کا ذکر انتہائی اختصار سے کیا تاکہ ان کا حصول آسان ہو، ان میں اکثر و بیشتر نام ہمارے استاذ حافظ صلاح الدین علائی کی کتاب المراسیل میں موجود ہیں۔[2]

---

(۱) ابن حجر العسقلانی و دراسة مصنفاته ص ۵۲۳

(۲) مقدمة التبیین لأسماء المدلسین، اس موضوع پر کچھ قدیم کتابیں بھی تحریر کی گئی ہیں، ان تحریر کرنے والوں میں حسین بن علی کرابیسی، امام نسائی، امام دار قطنی بھی ہیں، حافظ ذہبی نے نظم میں ان حضرات کا ذکر کیا ہے۔ تعریف أهل التقدیس بمراتب الموصوفین بالتدلیس ص ۲۴

۲- تعریف أهل التقدیس بمراتب الموصوفین بالتدیس:- یہ حافظ ابن حجر کی کتاب ہے، جو اس موضوع کی سب سے جامع تصنیف ہے، اور کتاب طبقات المدلسین کے نام سے معروف ہے، اس میں جملہ مدلسین کو پانچ طبقات پر تقسیم کیا گیا ہے، اور ہر طبقہ کو حروف معجم پر مرتب کردیا ہے، اور ان کی روایتوں کا حکم بتادیا ہے، اس کتاب میں (۱۰۷) مدلس راویوں کا ذکر ہے۔

اس سلسلہ میں کچھ باتیں قواعد جرح وتعدیل کے باب میں گذر چکی ہیں۔(۱)

۳- اتحاف ذوی الرسوخ عمن رمی بالتدیس من الشیوخ:- یہ کتاب استاد محترم محدث مدینہ شیخ حماد بن محمد انصاریؒ (متوفی ۱۴۱۹ھ) کی تصنیف ہے، اس میں کل (۱۶۱) مدلس راویوں کا ذکر حروف معجم پر کیا گیا ہے۔

۲- مختلطین پر مخصوص کتابیں

وہ راویان جو ابتدائی دور میں ثقہ تھے لیکن زندگی کے آخری دور میں یا کسی وقت کسی وجہ سے ان کا حافظہ کمزور یا خراب ہو گیا تھا، ایسے راویوں کو ایک جگہ جمع کردیا گیا ہے، اس میں جو کتابیں مشہور ہیں وہ یہ ہیں۔

۱- الاغتباط بمن رمی بالاختلاط:- یہ کتاب بھی سبط بن عجمی (متوفی ۸۴۱ھ) کی تالیف ہے، یہ ایک مختصر رسالہ ہے جو حروف معجم پر مرتب ہے، یہ رسالہ التبیین لأسماء المدلسین کے ساتھ مطبوع ہے، اس کتاب میں ان لوگوں کو نہیں ذکر کیا ہے جن کے بارے میں "ساء حفظه بآخره" کہا گیا ہے، اس لئے کہ بڑھاپے میں اکثر نسیان ہو ہی جاتا ہے، کتب ستہ کے راویوں پر ان کی نشانی (جو متداول ہے) لگا دی ہے۔(۲)

۲- الکواکب النیرات فی معرفة من اختلط من الرواة الثقات:- یہ کتاب ابن کیال (ابو برکات محمد بن احمد متوفی ۹۳۹ھ) کی تالیف ہے، اس میں ستر افراد کا ذکر حروف معجم پر کیا گیا ہے، جو مشہور اور متفق علیہ مختلط ہیں، پھر محقق کتاب

---

(۱) دیکھئے ص ۱۵۲ (۲) مقدمة الاغتباط بمن رمی بالاختلاط ص ۳۸

شیخ عبد القیوم بن عبد رب النبی نے ۵۱/افراد کا اور اضافہ کیا ہے، اس طرح اس میں کل (۱۲۱) مختلط افراد کا تذکرہ ہے۔

۳-مرسل روایت کرنے والوں پر کتابیں

۱- المراسیل :- تالیف: ابن ابی حاتم رازی (متوفی ۳۲۷ھ)

۲- جامع التحصیل فی أحکام المراسیل:- تالیف: حافظ صلاح الدین علائی (متوفی ۷۶۱ھ)

مراسیل پر بعض کتابیں بھی ایسی ہیں جن میں صرف مرسل روایتوں کا ذکر کیا گیا ہے، جیسے "مراسیل امام ابوداوٗد" لیکن وہ اس موضوع سے خارج ہیں، یہاں وہ کتابیں موضوع بحث ہیں، جن میں مرسل راویت کرنے والوں کا نام درج ہے، مذکورہ دونوں کتابوں میں مرسلین کے ساتھ ساتھ مختلطین کا بھی ذکر پایا جاتا ہے۔

٤- ان ثقات پر کتابیں
جو خاص شیوخ میں ضعیف ہیں

اس موضوع پر ایک جدید تالیف:

الثقات الذین ضعفوا فی بعض شیوخهم:- یہ ہمارے رفیق ہم درس، محترم ڈاکٹر صالح حامد رفاعی کی تالیف ہے، جو اپنے باب میں بالکل نئی ہے، جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے یہ تالیف ترتیب دی گئی ہے۔

کتب خاصہ کی دوسری قسم

کتب ثقات

کتب خاصہ میں دوسری قسم ان کتابوں کی ہے جن میں صرف ثقہ راویوں کے حالات مذکور ہوتے ہیں، ان کو عرف محدثین میں ”کتب ثقات“ کہا جاتا ہے۔

”کتب ضعفاء“ کے مقابلہ میں ”کتب ثقات“ کی تالیف بعد میں ہوئی ہے، نیز اس فن میں تالیفات بہت مختصر ہیں، جن کو انگلیوں پر شمار کیا جاسکتا ہے، اس فن کی جو مشہور کتابیں ہیں وہ یہ ہیں: **معرفة الثقات للعجلی، الثقات لابن حبان، تاریخ أسماء الثقات لا بن شاهين، الثقات عمن لم يقع في الكتب الستة لا بن قطلوبغا**

معرفة الثقات

تالیف: حافظ عجلی (متوفی ۲۶۱ھ)

مشتملات:- یہ کتاب فنی اعتبار سے رجال ثقات پر پہلی کتاب ہے، جس میں ضمناً کچھ ضعفاء کا ذکر بھی پایا جاتا ہے، اس کتاب کو امام عجلی نے بدست خود تحریر نہیں کیا تھا بلکہ سوالات وجوابات کا یہ مجموعہ ہے، اسی وجہ سے یہ کتاب غیر مرتب ہے۔(۱)

نام کتاب :- حتی کہ نام کے بارے میں بھی اختلاف ہے کیونکہ امام عجلی یا انکے صاحبزادے نے اس کتاب کا کوئی معین نام نہیں رکھا تھا، غالباً اسی وجہ سے اختلافات ہوئے، ابتداء میں یہ کتاب ”سوالات ابو مسلم“ کے نام سے مشہور تھی۔ غالباً یہ وہی کتاب ہے جس کو اصحاب تراجم نے ان کی تالیفات میں ”**الجرح والتعديل**“ اور ”**كتاب التاريخ**“ کے نام سے موسوم کیا ہے، جبکہ کتاب کے مرتبین نے اسکو **معرفة الثقات** کا نام دیا ہے، نیز یہی کتاب ”**تاريخ الثقات**“ اور ”**الثقات**“ کے نام سے موسوم ہے۔(۲)

ترتیب :- چونکہ اصل کتاب غیر مرتب تھی لیکن فنی اعتبار سے بڑی اہمیت کی حامل تھی، اس لئے اس کی افادیت اور اہمیت کے پیش نظر متاخرین کے دو ممتاز علماء دین نے اس کو حروف معجم پر مرتب کیا ہے، تاکہ استفادہ آسان ہو، سب سے پہلے امام تقی الدین سبکی (متوفی ۷۵۶ھ) نے پھر اور امام نور الدین ہیثمی (متوفی ۸۰۷ھ) نے

(۱) معرفة الثقات، مقدمه سبكی ۱/ ۱۸۰ (۲) معرفة الثقات، مقدمه بستوی، ۱/ ۶۷-۷۰

حافظ عراقی کے کہنے پر مرتب کیا ہے۔[1]

جناب ڈاکٹر عبد العلیم صاحب بستوی حفظہ اللہ نے انہیں دونوں ترتیبوں کو حافظ ابن حجر کی کتاب ''تہذیب التہذیب'' سے مزید اضافہ کے ساتھ تحقیق کی ہے جو دو جلدوں میں مطبوع ہے، اصل کتاب کا کچھ ہی حصہ موجود ہے، بقیہ مفقود ہے اس لئے یہی ترتیب اصل کے قائم مقام ہے۔

جناب ڈاکٹر عبد المعطی نے امام عجلی کی کتاب کی دوسری ترتیب جس کو امام ہیثمی نے مرتب کیا تھا ''تہذیب التہذیب'' سے کچھ اضافہ کے ساتھ تحقیق کر کے ایک جلد میں شائع کیا ہے، جس کو'' تاریخ الثقات'' کے نام موسوم کیا ہے،

ان ترتیبوں میں امام سبکیؒ کی ترتیب زیادہ مفید اور جامع ہے، اس لئے کہ انہوں نے اصل کتاب میں سے کچھ حذف نہیں کیا ہے، نیز انہوں نے اس کتاب پر علمی مقدمہ بھی تحریر کیا ہے۔[2] چونکہ ڈاکٹر عبد العلیم صاحب نے سبکی اور ہیثمی دونوں ترتیبوں کو سامنے رکھا ہے اس وجہ سے ان کی تحقیق زیادہ مفید ہے۔

نوعیت تراجم :- کتاب کے اکثر و بیشتر تراجم مختصر ہیں، جن میں راوی کا نام و نسب مختصراً ذکر کر کے حکم لگا دیا گیا ہے، راوی کے صحابی یا تابعی ہونے کی بھی وضاحت کر دی ہے۔

کہیں کہیں راوی کے بچوں اور بھائیوں کا بھی ذکر پایا جاتا ہے، اسی طرح سے راوی کے مذہب، کاروبار، نیز علمی خصوصیت کا بھی ذکر کیا گیا ہے، کہیں کہیں اخبار و حکایات کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔

مصادر کتاب :- عموماً اس کتاب میں راویوں پر اپنی ذاتی معلومات کی بنیاد پر فیصلہ کیا گیا ہے، کہیں کہیں دوسرے ناقدین کے اقوال سے بھی استدلال کیا ہے، جن میں عبد اللہ بن مبارک، ابن ابی ذئب، ابن مہدی،، ابن معین، امام شعبہ، اور مولف کتاب کے والد عبد اللہ رحمہ اللہ قابل ذکر ہیں۔[3]

علماء کی نگاہ میں :- یہ کتاب اپنی جگہ انتہائی اہم و مفید ہے جس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ علماء کے جم غفیر نے اس سے استفادہ کیا ہے امام عجلی

---

(۱) معرفة الثقات مقدمه هيثمى، ۱/ ۱۸۹ (۲) معرفة الثقات مقدمه سبكى، ۱/ ۱۷۹

(۳) مزید تفصیل کیلئے دیکھئے معرفة الثقات مقدمه بستوى ۱/ ۱۳۶

کے بعد جن لوگوں نے اس فن میں کتابیں لکھی ہیں انہوں نے ان کے فیصلہ کو قبول کیا ہے، اور اپنی تالیفات میں ان کے اقوال کو بطور استدلال ذکر کیا ہے۔

ابو العباس اندلسی راوی کتاب فرماتے ہیں کہ: میں نے مصر میں بعض ائمہ حدیث سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ متبدی طالب علم کو سب سے پہلے یہ کتاب پڑھنی چاہیے، علم حدیث کی ایک بڑی جماعت نے مجھ سے اس کو پڑھا ہے، اور جس شخص نے بھی اس کتاب کو دیکھا اس نے اس کو نقل کر لیا، یا پڑھا، یا استفادہ کیا۔[1]

اسی اہمیت کے پیش نظر علماء نے اسکو مرتب کیا ہے، اس کی ترتیب کے منظر عام پر آجانے سے استفادہ انتہائی آسان ہو گیا ہے، جس راوی کا نام معلوم کرنا ہو پہلے یہ معلوم کرلیں اسکا نام کس حرف سے شروع ہوتا ہے، پھر جس جگہ ترتیب میں اس کا نام آسکتا ہے وہاں تلاش کرنے سے وہ فوراً مل جائے گا۔

خاص اصطلاح :- امام عجلیؒ نے بعض ایسے کلمات جرح و تعدیل کا استعمال کیا ہے جو دیگر نقاد سے مختلف ہے، بنابریں ان پر تساہل پسندی کا حکم لگایا گیا ہے، مثلاً انہوں نے کلمہ ''ثقہ'' کا استعمال کبھی کبھی ایسے راویوں پر کر دیا ہے جو ''صدوق'' یا اس سے کمتر درجہ کے لائق ہیں، اسی طرح ''لاباس به'' کا اطلاق ایسے لوگوں پر بھی کر دیا ہے جو ''ضعیف'' ہیں نیز کلمہ ''ضعیف'' کا اطلاق ایسے لوگوں پر کر دیا ہے جو ''متروک'' ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ''مجہول'' راویوں کی بھی انہوں نے توثیق کر دی ہے۔

شیخ معلمیؒ فرماتے ہیں: امام عجلی علامہ ابن حبانؒ سے مجاہیل کی توثیق میں بہت مشابہ ہیں۔[2]

اگر چہ اپنے اس منہج کو انہوں نے ہر جگہ استعمال نہیں کیا، پھر بھی کہیں کہیں اس کا استعمال ضرور ہوا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا ہے کہ آپ کی توثیق غیر معتبر ہے، یا کتاب کی کوئی علمی قیمت نہیں ہے، آپ امام فن اور صاحب نقد و بصیرت ہیں، ہر ایک کا اپنا اپنا منہج اور طریقہ ہوتا ہے، جو دوسرے سے مختلف ہوتا ہے، چونکہ آپ پر ورع و تقویٰ غالب تھا، اس لئے شدید کلمات کے استعمال سے آپ نے پرہیز کیا ہے، جس میں کچھ اختلافِ رائے کا بھی دخل ہو سکتا ہے۔

---

(۱) معرفة الثقات مقدمه سبکی ۱/ ۱۸۰

(۲) التنكيل بمافي تانيب الكوثري من الأباطيل ۱/ ٦٦

۲- الثقات

تالیف: علامہ ابن حبان (متوفی ۳۵۴ھ)

تعارف:- یہ تصنیف حافظ ابن حبان کی ہے جو اپنے فن میں ایک نادر علمی شاہکار ہے، اور اس فن کی سب سے عظیم کتاب ہے۔

اس کو حافظ ابن حبان نے اپنی طویل کتاب "التاریخ" سے مختصر کیا ہے، اس میں صرف انہیں راویوں کا ذکر کیا گیا ہے، جن کی خبریں قابل قبول ہوتی ہیں۔ لہذا ہر وہ راوی جس کا تذکرہ اس کتاب میں آگیا ہے کم از کم وہ قابل احتجاج ہے، مولف نے اس کی جانب یوں اشارہ کیا ہے۔ "**ولا أذكر في هذا الكتاب الأول إلا الثقات الذين يجوز الاحتجاج بخبره إذا تعرى خبره عن خصال خمس**" (۱)

نیز اس میں ان راویوں کا بھی ذکر ہے جو دوسروں کے یہاں اگرچہ ضعیف ہیں لیکن ان کے یہاں دلائل کی بنیاد پر قابل قبول ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ: "**إنما أذكر في هذا الكتاب الشيخ بعد الشيخ وقد ضعفه بعض ائمتنا ووثقه بعضهم فمن صح عندي منهم أنهم ثقه بالدلائل النيرة أدخلنا ه في هذا الكتاب، ومن صح عندي أنه ضعيف لم أذكره في هذا الكتاب**" (۲)

ترتیب:- بنیادی طور پر یہ کتاب طبقات پر مرتب ہے، جس میں کل چار طبقات کئے گئے ہیں۔

۱- طبقہ صحابہ (جو مطبوعہ جلدوں کے اعتبار سے کچھ دوسری اور بقیہ تیسری جلد پر مشتمل ہے۔)

۲- طبقہ تابعین (جو چوتھی و پانچویں جلد پر مشتمل ہے)

۳- طبقہ تبع تابعین (جو چھٹی اور ساتویں جلد پر مشتمل ہے)

٤- طبقہ تابع تبع تابعین (جو آٹھویں اور نویں جلد پر مشتمل ہے)

پھر ہر طبقہ کو حروف معجم پر مرتب کیا گیا ہے، تاکہ استفادہ میں آسانی ہو، البتہ اس ترتیب میں صرف حرف اول کا خیال کیا گیا ہے، اسلئے ہر حرف سے شروع ہونے والے تراجم باہم مل جاتے ہیں، لیکن چونکہ حرف میں داخلی ترتیب کا خیال نہیں رکھا گیا ہے اسلئے کسی نام کی تلاش کیلئے کبھی کبھی اس حروف کے جملہ تراجم پر نظر ڈالنی پڑ

---

(۱) الثقات ۱/ ۱۱، ۱۲ (۲) الثقات ۱/ ۱۳

سکتی ہے۔ ہر حرف کے آخر میں ان خواتین کا تذکرہ ہے، جن کا نام ان حرف سے شروع ہوتا ہے، اس طرح سے ایک طبقہ کے مکمل ہونے کے بعد دوسرے طبقہ کو مذکورہ ترتیب پر مرتب کیا ہے، اس طرح یہ کتاب طبقات اور حروف دونوں پر مرتب ہے۔

ہر طبقہ کے آخر میں اس طبقہ کے ان راویوں کا ذکر ہے جو کنیت سے مشہور ہیں

طبقہ اولی (طبقہ صحابہ) میں صرف ان لوگوں کا ذکر ہے جن سے احادیث مروی ہیں، ان میں عشرہ مبشرہؓ کو مقدم کیا گیا ہے، جو دوسری جلد میں پائے جاتے ہیں، مولف کتاب اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: "إنا ذاكرون أسماء الصحابة ونقصد منهم من روى عنهم الأخبار ونقصد في ذكر هو لا ء المعجم من أسمائهم لتكون أسهل". (۱)

اس کتاب کی ابتداء سیرت نبوی سے کی گئی ہے، اس کے بعد خلفاء راشدین اور دیگر خلفاء کا ذکر (۳۳۵ھ) تک کیا ہے، جو دوسری جلد کے قریب قریب آخر میں ختم ہوتا ہے، پھر عشرہ مبشرہؓ کا ذکر ہے اس کے بعد کتاب طبقات پر مرتب ہے۔

طریقہ استفادہ :- لہٰذا کتاب سے استفادہ آسان ہے، اس کو مزید آسان بنانے کیلئے امام ہیثمی نے پوری کتاب کو حروف معجم پر مرتب کر دیا ہے۔

اس کتاب کی ایک جدید فہرست "اتمام الانعام" کے نام سے تیار کی گئی ہے، جو الدار السلفیہ ممبئی سے طبع ہو کر منظر عام پر آ گئی ہے، لہٰذا اس کتاب کے سہارے استفادہ انتہائی سہل ہو گیا ہے، امام ہیثمی نے جو ترتیب دی تھی اس کے مطبوع یا موجود ہونے کا علم فی الحال مجھ کو نہیں ہے۔

نوعیت تراجم :- تراجم میں راویوں کا نام و نسب، نسبت و کنیت، مشہور اساتذہ و تلامذہ کا ذکر کیا گیا ہے، کبھی کبھی سن وفات اور مقام وفات بھی بتایا گیا ہے، تراجم عموماً مختصر تین چار سطر پر مشتمل ہوتے ہیں، کبھی کبھی اس سے کم یا زیادہ ہوتے ہیں، جسکی وجہ مولف نے یہ بتائی ہے کہ: تاکہ جو اس کتاب کو حفظ کرنا چاہتے ہوں ان کیلئے آسانی ہو۔ (۲)

صحابہ کرامؓ کے تراجم میں خصوصیت کے ساتھ یہ ذکر کیا ہے کہ ان کا تعلق

---

(۱) الثقات ۳/ ۱۳ (۲) الثقات ۱/ ۱۳

کس شہر سے تھا اور ان کی روایتیں کس مقام پر زیادہ منتشر ہوئیں۔

خصوصی اصطلاح:- حافظ ابن حبان کی کچھ خصوصی مصطلحات ہیں جنکا تذکرہ "المجروحین" کے تعارف میں گذر چکا ہے۔ مثلاً ان کا یہ کہنا ہے کہ: "العدل من لم يعرف فيه الجرح إذ لم يكلف الناس من الناس معرفة ما غاب عنهم". (۱)

اس لئے اس کتاب میں بہت سے ایسے راویوں کو ثقہ قرار دے دیا ہے، جو دوسروں کے یہاں مجہول ہیں، حافظ ابن حجر نے اس نقطہ نظر پر تنقید کی ہے اور فرمایا ہے کہ یہ عجیب نقطہ نظر ہے، جو جمہور کے منہج کے برخلاف ہے۔ (۲)

واقعہ جو بھی ہو یہ کتاب فن ثقات کی نادر ترین تصنیف ہے، چونکہ فن جرح و تعدیل انتہائی نازک و حساس علم ہے اسلئے اس میں راویوں کے پرکھنے کا معیار مختلف ہونا ناگزیر ہے۔

علماء نے اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور استفادہ کیا، فن جرح و تعدیل کی ہر کتاب میں آپ کے اقوال بطور استدلال موجود ہیں، جو اس کی اہمیت پر دال ہیں۔

۳- تاريخ أسماء الثقات

تالیف: حافظ ابن شاہین (متوفی ۳۸۵ھ)

تعارف:- علامہ ابن شاہین کی یہ کتاب مطبوعہ ایک جلد پر مشتمل ہے، جس میں (۱۶۶۰) تراجم ہیں، اس کتاب کو حرف معجم پر مرتب کیا ہے، لیکن صرف پہلے حرف کا اعتبار کیا ہے، البتہ مشترک ناموں کو اکٹھا کر دیا ہے ہر حرف کو باب کے تحت ذکر کیا ہے، مثلاً باب الالف، باب الباء وغیرہ۔

نوعیت تراجم:- اکثر و بیشتر تراجم انتہائی مختصر بلکہ ایک سطر سے بھی کم ہیں، جن میں راوی کا مختصر نام و نسب اور کبھی کبھی ان کے بلاد و قبیلہ کا ذکر کیا ہے راویوں پر حکم لگانے کیلئے مکمل طور سے ائمہ کے اقوال پر اعتماد کیا ہے جن کی تعداد تقریباً ۲۷ ہے ان میں امام احمد ابن حنبلؒ اور یحیٰ بن معینؒ کے اقوال سے بکثرت استفادہ و استدلال کیا ہے۔

کبھی کبھی راوی کی وضاحت اخو فلان، یا ابن اخی فلاں سے کیا ہے، اس کتاب میں خواتین اور کنیت سے مشہور راویوں کا ذکر نہیں ہے، مولف کتاب نے اپنی کتاب کا تعارف

---

(۱) الثقات ۱/ ۱۳ (۲) لسان الميزان ، ۱/ ۱۴

کچھ اسطرح سے کیا ہے: "کتاب الثقات" ایسے راویوں پر مشتمل ہے جن سے احادیث رسول ﷺ مروی ہیں اور انکے بارے میں ہم تک معلومات بڑے بڑے ائمہ فن کے واسطہ سے پہونچی ہے، مثلاً یحییٰ بن معین، احمد بن حنبل، علی بن مدینی، ابن ابی شیبہ، محمد بن عبد اللہ موصلی، احمد بن صالح عجلی رحمہم اللہ اور وہ لوگ جو ان سے مشابہ ہیں اسمائے ثقات کو میں نے حروف معجم پر ذکر کیا ہے، تاکہ دیکھنے والے اور پڑھنے والے کو آسانی ہو۔[1]

استفادہ:- کتاب چونکہ بنیادی طور سے حروف معجم پر مرتب ہے اس لئے استفادہ آسان ہے، محقق کتاب شیخ صبحی سامرائی حفظہ اللہ نے کتاب کے آخر میں ایک جامع فہرست حروف معجم پر تیار کردی ہے، جس کی وجہ سے استفادہ انتہائی آسان ہو گیا ہے۔

٤- الثقات عمن لم يقع فى الكتب الستة

تالیف: حافظ ابن قطلوبغا (متوفی ۸۷۹ھ)

یہ اس فن کی ایک اہم کتاب ہے۔ شیخ صبحی حفظہ اللہ نے اس کو ایک اہم کتاب بتاتے ہوئے اس کے وجود کی نشاندہی کی ہے، اور یہ بتایا ہے کہ استنبول کی ایک لائبریری "کوپرلی" میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے، جس کا نمبر ۲۶۳-۲۶۴ ہے۔[2]

ڈاکٹر اکرم ضیاء عمری فرماتے ہیں کہ اس کتاب کی پہلی اور دوسری جلد کوبرلی میں ہے، اور کچھ حصہ رباط کے خزانہ عامہ میں موجود ہے جسکا نمبر ۳۶۱ ک ہے۔[3]

اس فن سے متعلق ایک اور کتاب علامہ ابن حبان کی کتاب:

٥- مشاهير علماء الامصار

جس میں (۱۶۰۲) تراجم ہیں، اسمیں صحابہ تابعین، اور تبع تابعین کا تذکرہ طبقات پر شہروں کے اعتبار سے کیا گیا ہے،[4] وہ شہر یہ ہیں: حجاز، عراق، شام، مصر، یمن، خراسان، اور انکے قرب وجوار، ان کے ذکر کی وجہ یہ بتایا ہے کہ یہی شہر زیادہ معروف ہیں۔

کتاب کے آخر میں اس کے محقق نے حروف معجم پر ایک فہرست منسلک کر دی ہے، جس سے استفادہ بہت آسان ہو گیا ہے، اس فن میں دو ایک کتابوں کا اور ذکر ملتا ہے، لیکن وہ موجود نہیں ہیں، واللہ اعلم۔

---

(۱) مقدمه تاريخ الثقات، ص ٢٥ (٢) تاريخ الثقات مقدمه محقق ص ١٧

(٣) بحوث فى تاريخ السنة المشرفة ص ١٠٠ (٤) مشاهير علماء المصار ص ٤

کتب خاصه کی تیسری قسم

کتب بر رجالِ کتب ستہ

کتب خاصہ میں تیسری قسم ان کتابوں کی ہے جن میں کسی ایک کتاب یا چند کتابوں کے راویوں کے حالات قلمبند کئے گئے ہیں، علماء محدثین نے جب جرح و تعدیل میں کتابیں تصنیف کیں، اور حسب ضرورت ان میں تنوع پیدا کیا تو اس طرح کی کتابیں منظر عام پر آئیں جس میں حدیث کی کسی ایک کتاب کے راویوں کے حالات یکجا کئے گئے، غالباً اس سلسلہ کی سب سے پہلی کڑی امام ابوزکریا یحییٰ بن زکریا بن مزیق قرطبی (متوفی ۲۵۵ھ) کی تالیف "التعریف برجال المؤطاء" ہے۔

اسی طرح محمد بن وضاح (متوفی ۲۸۷ھ) کی تالیف " تسمية رجال عبد الله بن وهب " ہے۔[1]

چونکہ کتب احادیث میں صحیحین کو امت کی جانب سے جو شرف قبولیت حاصل ہوا کسی دوسری حدیث کی کتاب کو نہ مل سکا، اس لئے یہ دونوں کتابیں ہمیشہ علماء کی توجہ کا مرکز بنی رہیں، چنانچہ کتب ستہ میں سب سے پہلے ان کے راویوں کے حالات الگ الگ منفرد کتابوں میں پھر یکجا طور سے مشترک کتابوں میں تحریر کئے گئے۔[2]

۱- رجال صحيح البخاری

تالیف: ابونصر کلاباذی (متوفی ۳۹۸ھ)

انہیں خاص کتابوں میں سے ایک کتاب "رجال البخاری" ہے جس کا اصل نام "الهداية والارشاد في معرفة أهل الثقة والسداد الذين أخرج لهم البخاری في جامعه " ہے۔ جو امام ابونصر احمد بن محمد بن حسین کلاباذی بخاری (متوفی ۳۹۸ھ) کی تالیف ہے۔ یہ کتاب ان بنیادی کتابوں میں سے ایک ہے، جس میں صرف صحیح بخاری میں وارد شدہ راویوں کے حالات ذکر کئے گئے ہیں، بعد میں آنے والے نقاد محدثین اور مصنفین جرح و تعدیل نے اس کتاب پر بہت اعتماد کیا ہے، اور اس کی

---

(۱) بحوث فی السنة المشرفة ص ٤٢٤ رجال المسلم (مقدمه محقق) ۱/۸

(۲) بحوث فی السنة المشرفة ص ۱۲۳، التعديل والتجريح ۱/ ۲۱۰ - ۲۱٤، مقدمه محقق

معلومات کو اپنی تالیفات میں بطور استشہاد پیش کیا ہے۔

یہ کتاب حروف تہجی پر مرتب ہے، لیکن اس کی ترتیب متقدمین کے طرز پر ہے یعنی یہ کہ صرف پہلے حرف کا خیال کیا گیا ہے، ترتیب میں دوسرے حرف کا خیال نہیں کیا گیا ہے، اس لئے ہر حرف سے شروع ہونے والے نام بہ ترتیب الف، ب، ت ایک جگہ مل جائیں گے، البتہ ہر حرف کی اندرونی ترتیب نہ ہونے کی وجہ سے کبھی کبھی راوی کی تلاش کیلئے مکمل باب پر نظر ڈالنا پڑ سکتی ہے۔

اس کتاب میں سب سے پہلے ان راویوں کا ذکر ہے، جن کا نام احمد سے شروع ہوتا ہے، نام و نسب و نسبت وغیرہ ذکر کرنے کے بعد یہ وضاحت کر دی گی ہے کہ صحیح بخاری کے دیگر راویوں میں سے صاحب ترجمہ سے کس نے روایت کی ہے، اور اس نے کن سے روایت کی ہے، نیز یہ بھی اشارہ دیا گیا ہے کہ صحیح بخاری میں صاحب ترجمہ کی روایت کس جگہ پائی جاتی ہے۔

کتاب میں سب سے پہلے رجال کے تراجم حسب ترتیب سابق اور پھر انکی کنیت ذکر کی گئی ہے، پھر خواتین راویات کے حالات ناموں کی ترتیب پر ذکر کیئے گئے ہیں، پھر ان کی کنیت مذکور ہے، کہیں کہیں صاحب ترجمہ کی سن وفات بھی ذکر کیا ہے۔

۲- رجال صحیح مسلم

تالیف: ابن منجویہ (متوفی ۴۲۸ھ)

اس سلسلہ کی دوسری کتاب "رجال صحیح مسلم" ہے، جس کے مولف ابو بکر احمد بن علی بن منجویہ (متوفی ۴۲۸ھ) ہیں، اس میں صرف صحیح مسلم کے راویوں کے حالات کو ذکر کیا گیا ہے، یہ کتاب بھی سابق کتاب کی طرح حروف معجم پر مرتب ہے، اس کی ترتیب میں بھی صرف پہلے حرف کا خیال کیا گیا ہے، دوسرے کا نہیں، اس لئے ہر حرف سے شروع ہونے والے نام یکجا مل جاتے ہیں، لیکن اندرونی ترتیب نہ ہونے کی وجہ سے مطلوبہ راوی کو تلاش کرنے کیلئے کبھی کبھی مکمل باب دیکھنا پڑ سکتا ہے۔

سب سے پہلے راویوں کو ان کے نام کے اعتبار سے مرتب کیا ہے، پھر کنیت اس کے بعد خواتین کے نام، پھر ان کی کنیت کا ترتیب وار ذکر ہے۔

اس میں راوی کے نام و نسب اور نسبت کا ذکر کرتے ہوئے بعض شیوخ اور اساتذہ کا ذکر کیا ہے، نیز صحیح مسلم میں ان کی روایتیں جس جگہ پائی جاتی ہے، ان مقامات کی بھی وضاحت کردی گئی ہے، عموماً راویوں پر جرح و تعدیل کا کوئی حکم نہیں لگایا گیا ہے۔

۳ - التعدیل والتجریح

تالیف: ابوالولید باجی (متوفی ۴۷۴ھ)

اس سلسلہ کی ایک کتاب " التعدیل و التجریح لمن خرج له البخاری فی الجامع الصحیح "ہے، جس کے مولف ابو الولید سلیمان بن خلف باجی متوفی ۴۷۴ھ ہیں۔ یہ کتاب بھی بنیادی طور سے حروف معجم پر مرتب ہے جس میں صرف پہلے حرف کا اعتبار کیا گیا ہے، البتہ اس میں حروف معجم کی وہ ترتیب نہیں ہے، جو مشرق میں رائج ہے، بلکہ مغربی ترتیب پر ہے، جو اندلس وغیرہ میں رائج ہے، یہ مشرقی ترتیب سے قدرے مختلف ہے اس کی ترتیب کچھ یوں ہے۔

ا ب ت ث ژ ج ح خ د ذ ر ز ط ظ ک ل م ن و ص ض ع غ ف ق س ش ھ و لا ی

اس کتاب میں اسماء مشترکہ کو باب کے تحت اور منفرد اسماء کو ہر حرف کے آخر میں اکٹھا ذکر کیا ہے، کتاب پر ایک مختصر مقدمہ تحریر کیا گیا ہے، اس میں بعد کے راویوں کے حالات سابقہ حروف معجم کی ترتیب پر مرتب کیا ہے، ناموں کے بعد کنیت کا ذکر کیا ہے، اور آخر میں خواتین کا تذکرہ ہے اس کتاب میں راوی کا نام حسب روایت پائی جاتی ہے، اس طرح سے صاحب ترجمہ کے ان شیوخ و تلامذہ کا ذکر کیا ہے جو صحیح بخاری میں موجود ہیں۔ علماء جرح و تعدیل کے اقوال کی روشنی میں راوی پر حکم لگادیا گیا ہے، تراجم کہیں مفصل اور کہیں مختصر ہیں۔ (۱)

ان کے علاوہ دیگر کتب حدیث میں صحیحین کے بعد موطاء اور سنن اربعہ کا مقام ہے، ان کے رجال پر بھی کچھ منفرد اور کچھ مشترک کتابیں تحریر کی گئی ہیں، ان منفرد کتابوں میں سے کچھ مندرجہ ذیل ہیں۔

٤ - التعریف برجال الموطاء:- یہ محمد بن یحیٰ بن حذاء تمیمی (متوفی ۴۱۶ھ)

---

(۱) تفصیل کیلئے دیکھئے: التعدیل والتجریح ١/ ٢٣٨ مقدمہ مولف، نیز دیکھئے مقدمہ محقق

کی تالیف ہے، جس میں امام مالک کی مشہور کتاب "الموطاء" کے راویوں کے حالات مذکور ہیں، اسکا قلمی نسخہ جامعہ قزوین فاس کے کتب خانہ میں ٦٩ نمبر پر موجود ہے۔ (١)

اسی نام کی ایک اور تالیف ہے، جس کا ذکر پہلے گذر چکا ہے، وہ ابوزکریا قرطبی کی تالیف ہے۔

٥- تسمية شيوخ أبي داؤد:- جو علی بن حسین بن محمد جیانی غانی (متوفی ۴۹۸ھ) کی تالیف ہے، جو صرف امام ابوداؤد کے مشائخ کے حالات پر مشتمل ہے، اسکا قلمی نسخہ "لالہ لی" کے کتب خانہ میں ۲۰۸۹/۲ نمبر پر موجود ہے۔ (٢)

٦- رجال سنن النسائي :- یہ کتاب بھی علی بن حسین غانی مذکور کی تالیف ہے، جس کے نام سے موضوع واضح ہے، س کا تذکرہ امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ (۱۲۳۳/۳) اور صاحب شجرۃ الزکیۃ نے (۱۲۳/۱) پر کیا ہے

٧- المجرد في أسماء رجال كتاب سنن ابن ماجه :- یہ کتاب حافظ ذہبی (متوفی ۷۴۸ھ) کی تالیف ہے جس میں سنن ابن ماجہ کے ان راویوں کے حالات ہیں جو صحیحین کے راویوں میں سے نہیں ہیں، اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ ظاہریہ میں حدیث ۵۳۱ نمبر پر موجود ہے۔ (٣)

٨- تسمية شيوخ النسائي:- یہ ابو محمد عبد اللہ بن محمد جُہنی کی تالیف ہے۔

٩- تسمية شيوخ ابي عيسیٰ :- یہ عبد العزیز بن محمد دورقی کی تالیف ہے۔

ان دونوں کتابوں کا ذکر ابن خیر نے اپنی فہرست میں کیا ہے۔ (٤)

١٠- كشف الأستار رجال معاني الآثار:- یہ کتاب ابو تراب اسد اللہ سندھی کی تالیف ہے۔

شرح معانی الاثار جو امام طحاوی کی مشہور کتاب حدیث ہے اس کے راویوں کے حالات کو علامہ عینی نے ایک خاص تالیف میں جمع کیا تھا، جس کا نام "معانی الأخيار من رجال معاني الآثار" رکھا تھا۔

اس کتاب کو شیخ ابو تراب اسد اللہ سندھی نے مختصر کیا ہے، اور اس کا نام

---

(١) بحوث في تاريخ السنة المشرفة ص ١٢٤ (٢) تاريخ التراث العربي ١/ ٢٣٨
(٣) مصدر سابق ١/ ٢٣٢ (٤) فهرسة ماروٰاه ابن خير عن شيوخه ص ٢٢١

"كشف الأستار عن رجال معاني الآثار" رکھا ہے جو مطبوع ہے۔[1]

فن جرح و تعدیل میں کچھ ایسی بھی کتابیں ہیں جن میں چند کتب احادیث کے راویوں کے حالات کو اکٹھا ذکر کیا گیا ہے، اس میں بھی صحیحین کو سبقت حاصل ہوئی ہے اور سب سے پہلے ان کے راویوں کے حالات کو ایک کتاب میں مشترکہ طور پر ذکر کیا گیا ہے، اس سلسلہ کی کئی اہم کتابیں ہیں ان میں کچھ مشہور کتابیں یہ ہیں۔

۱۱- رجال البخاري و مسلم :- یہ امام دار قطنی (متوفی ۳۸۵ھ) کی تالیف ہے، امام دار قطنی کی اس تالیف میں صرف صحیحین کے راویوں کا ذکر کیا گیا ہے، اس کتاب کا قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں (نمبر ۱۲۷ رجال) پر موجود ہے۔[2]

۱۲- الجمع بين رجال الصحيحين:- انہیں کتابوں میں سے یہ کتاب بھی ہے، جس کے مولف علامہ ابن قیسرانی ابوالفضل محمد بن طاہر (متوفی ۵۰۷ھ) ہیں، اس کتاب میں مولف نے " الهداية والارشاد في معرفة أهل الثقة والسداد " جو کلاباذی کی تالیف ہے، (جس کا ذکر پہلے گذر چکا ہے) اور "رجال صحیح مسلم" جو ابن منجویہ کی تالیف ہے، دونوں کو اختصار و استدراک کے ساتھ یکجا کر کے حروف تہجی پر مرتب کر دیا ہے۔[3] یہ کتاب حیدر آباد سے دو جلدوں میں مطبوع ہے۔

۱۳- الجمع بين رجال الصحيحين:- یہ کتاب امام ابو نصر کلاباذی (متوفی ۳۹۸ھ) کی تالیف ہے۔

۱٤- رجال البخاري و مسلم:- یہ امام ابو عبد اللہ حاکم (متوفی ۴۰۵ھ) کی تالیف ہے۔

۱۵- رجال البخاري و مسلم:- یہ امام ھبۃ اللہ بن حسن لالکائی (متوفی ۴۱۸ھ) کی تالیف ہے۔[4]

ان کے علاوہ دیگر مزید کتابیں ہیں جو صحیح بخاری یا صحیح مسلم سے متعلق ہیں،

---

(۱) كشف الأستار رجال معاني الآثار. مقدمه كتاب

(۲) تاريخ التراث العربي فواد سزكين ١/ ٢٦٤

(۳) مقدمة تحفة الأحوذي ص ٩٤ نیز ملاحظہ ہو مفتاح السنة للخولي ص ١٠٤

(٤) بحوث في تاريخ السنة المشرفة ص ١٦٤

بطور اختصار اتنے پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔[۱]

صحیحین کے رجال پر مشترکہ تالیف کے بعد سنن اربعہ (سنن ابو داؤد، سنن ترمذی، سنن نسائی، اور سنن ابن ماجہ) اور پھر کتب ستہ کے رجال پر مشترک کتابیں تحریر کی گئی ہیں، ان مشترکہ کتابوں میں سب سے پہلی تالیف حسب علم:

۱۶-تسمية شيوخ البخاري ومسلم و ابو داؤد والترمذي والنسائي في مصنفاتهم عن الصحابة والتابعين إلى شيوخهم:- ہے جو حافظ ابو بکر احمد بن محمد بن احمد بن غالب برقانی (متوفی ۴۲۵ھ) کی تالیف ہے۔[۲]

اسی سلسلہ کی ایک کڑی " المعجم المشتمل على ذكر شيوخ الائمة النبل " ہے۔

۱۷- ألمعجم المشتمل

تالیف: حافظ ابن عساکر (متوفی ۵۷۱ھ)

اس کتاب میں کتب ستہ کے مولفین (بخاری، مسلم، ابو داؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ) کے مشائخ کا تذکرہ بالاختصار کیا گیا ہے، اس میں مذکورین کے اساتذہ کے ناموں کو حروف تہجی کے اعتبار سے بڑی اچھی ترتیب پر مرتب کیا گیا ہے، البتہ حرف الف کے تحت "احمد" سے موسوم ناموں کو مقدم کر دیا گیا ہے، تراجم میں کافی اختصار سے کام لیا گیا ہے، جس میں صرف راوی کے نام و نسب پر اکتفاء ہے، دیگر معلومات میں صرف یہ مذکور ہے کہ کتب ستہ میں سے کس نے ان سے روایت کی ہے، جن کی تاریخ وفات معلوم ہو سکی ان کی تاریخ وفات بھی ذکر کر دی گئی ہے، کتب ستہ کے مولفین کے ناموں کیلئے اشارے استعمال کئے گئے ہیں، جو اس طرح ہیں۔

خ: بخاری، **م**: مسلم، **د**: ابو داؤد،

ت: ترمذی، **ن**: نسائی، **ق**: ابن ماجہ قزوینی۔[۳]

عام طور سے مذکورہ تراجم پر کوئی حکم نہیں لگایا گیا ہے، کہیں کہیں کسی کا قول

(۱) تفصیل کیلئے دیکھئے: بحوث في تاريخ السنة ص ۱۲٤

(۲) فهرست ابن خير ص ۲۲۲، بحوث في تاريخ السنة ص ۱۲٦

(۳) المعجم المشتمل ص ۳٥-۳٦

ذکر کر دیا ہے جو عموماً امام نسائی کے اقوال ہیں، غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اسمیں ثقات کے تراجم ذکر کرنے کا وعدہ کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: "رأیت أن أجمع أسماء شیوخهم الثقات النبل" (۱)

یہ کتاب دار الفکر بیروت سے سکینہ شہابی کی تحقیق سے مطبوع ہے۔

ان کتابوں کے بعد کتب ستہ کے جملہ راویوں کے حالات کچھ مخصوص کتابوں میں قلمبند کئے گئے جن میں "الکمال فی أسماء الرجال" کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔

۱۸- الکمال فی أسماء الرجال

تالیف: حافظ عبد الغنی مقدسی (متوفی ۶۰۰ھ)

اس کتاب کے مولف حافظ عبد الغنی بن عبد الواحد بن سرور مقدسی (متوفی ۶۰۰ھ) ہیں۔ اس میں مولف نے کتب ستہ کے جملہ راویوں کے حالات کو قلمبند کرنے کا بیڑا اٹھایا جو فی نفسہ انتہائی مشکل اور محنت طلب عمل تھا۔ مذکورہ کتابوں سے راویوں کو تلاش کرنا، ان میں تمیز کرنا، پھر ترتیب دے کر حالات تحریر کرنا، شیوخ و اساتذہ کا ذکر کرنا، علماء کے اقوال جمع کرنا اور کون کس کتاب کے راوی ہیں وغیرہ کا بیان کرنا نہایت ہی مشکل اور جگر سوزی کا کام تھا، لیکن خدام سنت نبوی نے ہر وہ کارنامہ انجام دیا جو بظاہر ناممکن معلوم ہوتا ہے۔

مولف نے اس کتاب میں سب سے پہلے سیرت نبوی ﷺ کا تذکرہ کیا ہے اس کے بعد ان صحابہ کرام کے حالات کو جمع کیا ہے، جن کی روایتیں کتب ستہ میں پائی جاتی ہیں، پھر جملہ راویوں کو حروف تہجی پر مرتب کر کے ان کے حالات کو قلمبند کیا ہے۔ البتہ حرف الف میں احمد سے موسوم اور حرف میم میں محمد سے موسوم ناموں کو مقدم کر دیا ہے، کنیت اور خواتین کا تذکرہ آخری کتاب میں کیا ہے۔ یاقوت حموی اس کتاب کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ بڑی اچھی کتاب ہے۔ (۲)

امام مزی اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: اس میں جس قدر محنت کرنی چاہئے وہ نہ کر سکے اور نہ ہی جملہ راویوں کو ذکر کر سکے، تراجم کی معلومات میں

---

(۱) المعجم المشتمل ص ۳۵ (۲) معجم البلدان ۲/ ۱۶۰

بھی کمی رہ گئی اور تقریباستر ہ سو راویوں کا نام ان سے چھوٹ گیا، آپ کی اولاد میں سے کسی نے اس کو مکمل کرنے کی کوشس کی جس میں بے شمار غلطیاں کر بیٹھے۔ (۱)

ظاہر بات ہے اتنا عظیم کام جو شخص پہلی مرتبہ کرے گا اس میں اس قسم کی خامیاں رہ جانا فطری امر ہے۔ یہی کیا کم ہے کہ اتنا بڑا کارنامہ انجام دینے کیلئے انھوں نے پہل کی۔

۱۹ - تهذيب الكمال فى أسماء الرجال

تالیف: حافظ ابو حجاج مزی (متوفی ۷۴۲ھ)

کتب ستہ کے راویوں کے حالات ذکر کرنے میں "الکمال" کے بعد "تہذیب الکمال" دوسرے نمبر کی تصنیف ہے جسے کتب ستہ کے علاوہ انکے مولفین کی دیگر تالیفات میں موجود راویوں کے حالات بیان کرنے میں شرف اولیت بھی حاصل ہے۔

یہ امام مزی کا وہ مایہ ناز علمی شاہکار ہے جس کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے کتب ستہ کے راویوں کے تعارف میں اس کو امام اور اصل کا درجہ حاصل ہے، امام مزی نے اس تالیف کے ذریعہ ایسا کارنامہ انجام دیا ہے جس نے امت اسلامیہ کی جبیں پر چار چاند لگا دیا۔ امہات کتب حدیث (صحاح ستہ یا کتب ستہ) جن پر اسلام کا دارومدار ہے ان کے راویوں کے مبنی بر حقیقت حالات کو جس فنی مہارت، ترتیب بدیع اور خوش اسلوبی سے جمع کیا گیا ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔

وجه تاليف و تسميه:- ہوا یوں کہ جب امام مزی نے امام مقدسی کی کتاب "الكمال فى أسماء الرجال" کا مطالعہ کیا تو اس میں بڑی کمی اور نقص محسوس کیا، نیز کچھ غلطیاں و خامیاں بھی نظر آئیں، چنانچہ انھوں نے اس کتاب کی تکمیل، تہذیب اور تصحیح کا بیڑا اٹھایا اور ایسی عظیم الشان جامع تصنیف تیار کی کہ دونوں کتابوں میں کمیت و کیفیت میں کوئی تناسب باقی نہ رہا اور یہ فی نفسہ ایک منفرد کتاب بن گئی، اسی وجہ سے بہت سے علماء اس کتاب کو "الکمال" کا اختصار نہیں تسلیم کرتے بلکہ ایک مستقل تصنیف مانتے ہیں، حقیقت جو بھی ہو امام مزی نے انتہائی محنت و مشقت، عرق ریزی و جگر سوزی کر کے کتب ستہ اور اصحاب کتب ستہ کی دیگر مولفات کے راویوں کا جو حق اس

---

(۱) تهذيب الكمال فى أسماء الرجال ۱/ ۳۸، ۱۴۸

امت کے ذمہ تھا اسکو ادا کر دیا اور ایک طویل مدت کے بعد اسکو مکمل کیا، کتاب کی تکمیل کے بعد نظر ثانی، مسودہ کی تبییض کرنے اور آخری شکل دینے میں تقریباً آٹھ سال کا وقفہ لگ گیا، اور اس کتاب کا نام "تهذيب الكمال في أسماء الرجال" رکھا۔[1]

اضافی کام:- اس کتاب میں امام مزی نے جو اضافی کام کیا ہے وہ یہ ہے:

۱- کتب ستہ کے رجال میں سے جنکا نام اور ترجمہ امام مقدسی سے فوت ہو گیا تھا (جنکی تعداد تقریباً سترہ سو ہے) ان کو تحریر کیا۔ (البتہ کچھ ایسے راوی جو کتب ستہ کے نہیں تھے غلط فہمی کی وجہ سے "الکمال" میں ان کا ترجمہ درج ہوا تھا ان کو حذف کر دیا)

۲- علامہ مقدسی نے صرف کتب ستہ میں موجود راویوں کے حالات کو قلمبند کیا تھا۔ امام مزی نے اصحاب کتب ستہ کے دیگر مولفات کے راویوں کا بھی (جن کا ذکر آگے آرہا ہے) تذکرہ کیا اور ان کے حالات قلمبند کر دیا۔

۳- بعض ایسے راویوں کا اضافہ کیا جو کتب ستہ یا ان کے مولفین کی دیگر کتابوں کے راوی نہیں تھے، لیکن راویوں کے ہم نام تھے۔ تاکہ دونوں میں تمیز کی جا سکے ایسے راویوں کے نام پر لفظ "تمیز" لکھ دیا ہے۔

٤- اکثر و بیشتر تراجم میں معلومات کا اضافہ کیا جس میں صاحب ترجمہ کے اساتذہ تلامذہ، انکے بارے میں علماء جرح و تعدیل کے اقوال، تاریخ پیدائش و وفات وغیرہ کا اضافہ تھا۔

۵- بعض راویوں کے ترجمہ میں ان کے واسطے سے وارد شدہ حدیثوں میں سے بطور مثال ایک دو روایتوں کو عالی سند سے ذکر کیا ہے۔

٦- کتاب کے آخر میں چار فصلوں کا اضافہ کیا ہے۔ جو انتہائی مفید و نفع بخش ہیں۔ جن سے راویوں کی تلاش میں بڑی آسانی ہوتی ہے وہ یہ ہیں:

۱- **پہلی فصل**:- ان راویوں کے بیان میں جو اپنے باپ، دادا، ماں، چچا وغیرہ کی جانب منسوب ہیں اور اسی سے معروف بھی ہیں ایسے راویوں کو ہر فصل میں حروف معجم پر مرتب کر دیا ہے جیسے ابن جریج، ابن شہاب، ابن عُلیہ وغیرہ۔

۲- **دوسری فصل**:- ان راویوں کے بارے میں ہے جو قبیلہ، شہر، گاؤں یا

---

(۱) ملاحظہ ہو برائے تفصیل مقدمہ ڈاکٹر بشار عواد بر تهذيب الكمال ۱/ ٤١-٤٩

صنعت و حرفت کی جانب منسوب اور مشہور ہیں۔ جیسے اوزاعی، شافعی وغیرہ۔

۳- تیسری فصل:- ان راویوں کے بارے میں ہے جو لقب وغیرہ سے مشہور ہیں جیسے اعرج، اعمش، غندر وغیرہ۔

٤- چوتھی فصل:- ان راویوں کے بارے میں ہے، جن سے روایت مبہم طور سے وارد ہے، صراحت کے ساتھ نام موجود نہیں، اس میں جن کا نام معلوم ہو سکا ہے ان کی وضاحت کر دی ہے۔ اور انھیں ناموں کی ترتیب پر اس کو مرتب کیا ہے۔

ترتیب و تنظیم:- بنیادی طور سے یہ کتاب "الکمال" کی ترتیب پر مرتب ہے البتہ اس کتاب میں صحابہ و صحابیات کو دیگر راویوں سے جدا کر کے الگ الگ فصل میں ذکر کیا تھا اس ترتیب کو امام مزی نے بدل دیا صحابہ کرام کو (قسم الرجال) میں اسی جگہ ذکر کیا ہے جہاں وہ ترتیب میں مناسبت رکھتے تھے۔ اسی طرح صحابیات کو (قسم النساء) میں جہاں ان کا نام ترتیب میں پڑتا تھا ذکر کیا ہے۔

جس کی وجہ امام مزی نے یہ بتائی ہے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ: ایک صحابی نے دوسرے سے روایت کیا ہے، جن لوگوں کو اس کی معرفت نہیں ہے وہ دوسرے صحابی کو تابعی سمجھ بیٹھتے ہیں اور تابعی کی فہرست میں ان کو تلاش کرتے ہیں پھر وہ دریافت نہیں کر پاتے، اور کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی تابعی مرسل روایت بیان کرتا ہے تو دیکھنے والا ان کو صحابی سمجھ بیٹھتا ہے اور صحابہ کی فہرست میں تلاش کرتا ہے، جب کہ یہ نام ایک ترتیب پر آجانے سے اس خدشہ کا امکان نہیں رہ جاتا، اور جب آدمی ان کے ترجمہ کو دیکھتا ہے تو وہاں ان کی صحابیت اور تابعیت معلوم ہی ہو جاتی ہے۔[1]

پوری کتاب ابتدا سے لے کر انتہا تک حروف تہجی پر بڑی دقت کے ساتھ مرتب کی گئی ہے جس میں راوی کے نام اس کے آبا و اجداد نیز نسبت وغیرہ میں بھی اس ترتیب کو ملحوظ رکھا گیا ہے، صرف حرف الف میں ان راویوں کو مقدم کر دیا ہے جن کا نام "احمد" ہے اور حرف میم میں ان لوگوں کو مقدم کر دیا ہے جن کا نام "محمد" ہے جو راوی نسبت سے مشہور ہیں یا اصل نام کے علاوہ کسی اور چیز سے مشہور ہیں تو ان کے

---

(۱) تهذیب الکمال ۱/۱٥٤

ناموں کو دونوں جگہوں پر ذکر کر دیا ہے۔ البتہ ترجمہ ایک جگہ کیا ہے، اور دوسری جگہ اسی کا حوالہ دے دیا ہے، اس لئے کسی بھی نام کے تلاش کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی ہے، بلکہ انتہائی سہولت اور سرعت کے ساتھ مطلوبہ نام دستیاب ہو جاتا ہے۔

مشتملات:- خطبہ اور تمہیدی کلمات کے بعد "الکمال" کا تعارف اور اس پر تبصرہ کیا ہے پھر "تهذيب الكمال" کا ذکر ہے جس میں اس کی وجہ تالیف، ترتیب، اضافی عمل اور رموز وغیرہ کا ذکر کیا ہے، پھر علم جرح و تعدیل کے بارے میں علماء کے خیالات ان کے اقوال کا ذکر، اس کے بعد کتب ستہ کے بارے میں علماء کے اقوال کو بیان کیا ہے پھر اصل کتاب سیرت نبوی سے شروع کیا ہے، سیرت کے بعد تراجم رجال کا سلسلہ ناموں کی ترتیب پر شروع ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ آخر سے کچھ پہلے ختم ہوتا ہے پھر کنیت کا ذکر ہے، اس کے بعد چاروں اضافی فصلوں کا ذکر ہے، مردوں کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد خواتین راویات کو اسی ترتیب پر ذکر کیا ہے۔

کیفیت تراجم :- ہر راوی کے ترجمہ میں اس کے مکمل نام و نسب اور نسبت کا ذکر کیا ہے، اس کے بعد اس کے جملہ اساتذہ اور شاگردوں کا ذکر ہے جن کو حروف معجم پر مرتب کر دیا ہے، ان میں سے بہت سے راویوں کے نام کے ساتھ اشاریہ دیا ہے جس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ صاحب ترجمہ سے کتب ستہ کے راویوں میں سے کس کس کی روایت ان سے پائی جاتی ہے۔ اساتذہ اور شاگردوں کے ذکر کے بعد علماء جرح و تعدیل کے اقوال کو ذکر کیا ہے اس کے بعد کچھ دیگر احوال واخبار و صفات کا حسب موقع ذکر کیا ہے، پھر راوی کی تاریخ وفات کی نشاندہی کی گئی ہے، بہت سے راویوں کے تراجم کے آخر میں اپنی عالی سند کے ذریعہ ایک آدھ حدیث نقل کی ہے۔

رموز و اشارئیے :- ہر راوی کے نام کے اوپر کچھ حروف لکھے ہوئے ہیں یہ ایک طرح کے اشاریئے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مذکور راوی کی روایت (کتب ستہ اور اس کے ملحقات میں سے) کس کتاب میں پائی جاتی ہے ان اشاروں کی جملہ تعداد (۲۷) ہے جو مندرجہ ذیل ہے۔

ع: الجماعۃ کا مخفف ہے، جس راوی پر یہ اشارہ ہے اس کی روایت ساری

کتابوں میں پائی جاتی ہے وعلی ہذاالقیاس

۴ع :(یا٤)یہ اربعہ کا مخفف ہے اس سے اشارہ سنن اربعہ کی جانب ہے۔

امام بخاری کی مندرجہ ذیل کتابوں کے راوی اسمیں ہیں جنکا اشارہ اسطرح ہے۔

خ: صحیح بخاری **خت**: صحیح بخاری میں معلق روایت

بخ : ألادب المفرد **عخ** : خلق أفعال العباد

ز : جزء القرأة خلف الامام **ی** : جزء رفع الیدین

امام مسلم کیلئے صرف دو اشارے ہیں:

م : صحیح مسلم **مق** : مقدمہ صحیح مسلم

امام ابوداؤد کی جو کتابیں ہیں ان کا رمزیہ ہے:

د: السنن **مد**: کتاب المراسیل

قد : کتاب الرد علی اہل القدر **خد** : الناسخ والمنسوخ

صد: فضائل انصار **کد** : مسند مالک بن أنس

ف: کتاب التفرد **ل**: مسند مالک بن أنس

امام ترمذی کے لئے دو اشارے ہیں:

ت : السنن **تم** : الشمائل

امام نسائی کے لئے پانچ اشارے ہیں:

س: کتاب السنن **سی** : عمل الیوم واللیلة

عس : مسند علی بن ابی طالب **کن** : مسند مالک بن أنس

ص : خصائص أمیر المومنین علی بن ابی طالب

امام ابن ماجہ کیلئے بھی دو رمز ہیں:

ق : السنن **فق** : کتاب التفسیر(۱)

مصادر مؤلف :- اس کتاب میں مؤلف نے بے شمار مصادر مراجع سے استفادہ کیاہے، عمومی طور سے اس فن میں تصنیف شدہ سابقہ کتابیں آپ کی مصدر ہیں لیکن

(۱) تهذيب الكمال ١٥٢/١

خصوصی طور سے چار کتابوں کو بنیاد بنایا ہے جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱- الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم ۲- الکامل فی ضعفاء الرجال لابن عدی
۳- تاریخ بغداد للخطیب البغدادی ٤- تاریخ دمشق لابن عساکر (۱)

علماء کی نگاہ میں:- علماء امت نے اس کتاب کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، جس میں سے چند یہ ہیں۔

علامہ صفدیؒ فرماتے ہیں کہ: اس کتاب نے سابقہ کتابوں پر گہن لگا دیا، اس کے حصول کے لیے لوگوں نے دور و دراز کا سفر کیا۔ (۲)

امام سبکیؒ فرماتے ہیں کہ: "صنف تهذيب الكمال المجمع على أنه لم يصنف مثله" (۳) یعنی علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس طرح کی کوئی دوسری کتاب تصنیف نہیں کی گئی ہے۔

علامہ مغلطائی فرماتے ہیں کہ: یہ کتاب عظیم فائدہ، کثرت منفعت سے بھرپور ہے اس فن میں جو اختراعی ترتیب دی ہے اور جو طریقہ اختیار کیا ہے سابقین میں اسکی نظیر نہیں، یہ کتاب فقہاء و محدثین کے درمیان فیصل کی حیثیت رکھتی ہے۔ (۴)

مرکز توجہ :- یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب اپنی عظمت قدر و منزلت و افادیت کی وجہ سے مؤلف کے زمانہ ہی میں ہر چہار جانب مشہور ہو چکی تھی، اور بعد میں آنے والے محدثین و علماء کی توجہ کا مرکز بنی رہی، چنانچہ کچھ علماء نے اس کی تہذیب و تنقیح کی، تو کچھ نے اس کو مختصر کیا، تو کچھ نے اس کی تکمیل کی، جن لوگوں نے اس کی تہذیب کی ہے ان میں امام ذہبیؒ، حافظ ابن حجرؒ قابل ذکر ہیں۔ امام ذہبیؒ کی تصنیف کا نام "تذهيب التهذيب" اور حافظ ابن حجر کی تصنیف کا نام "تهذيب التهذيب" ہے، جس کا تذکرہ ان شاء اللہ آئندہ آئے گا۔

جن لوگوں نے اس کا اختصار کیا ہے ان میں امام ذہبیؒ کی کتاب "الكاشف لمن له رواية في كتب الستة" کافی مشہور ہے، ان کے علاوہ رافع سلامی، ابو العباس اندرشی، ابن بردس بعلبکی نے بھی اس کا اختصار کیا ہے۔

---

(۱) تهذيب الكمال ۵۲/۱ (۲) مقدمہ ڈاکٹر بشار عواد بر تهذيب الكمال ٤٨/١
(۳) طبقات الشافعية ٢٥٤/٦ (٤) مقدمہ ڈاکٹر بشار عواد ٤٩/١

جن حضرات نے دوسری کتابوں کے راویوں کا اضافہ کر کے اس کی تکمیل کی ہے ان میں حافظ علاء الدین مغلطائی اور ابن ملقن کی اکمال تهذيب الكمال قابل ذکر ہیں اُن کے علاوہ علامہ حسینیؒ، ابن کثیرؒ، امام عراقیؒ اور علامہ سیوطیؒ نے بھی اس پر اکمالات تحریر کی ہیں۔ (۱)

یہ کتاب ڈاکٹر بشار عواد معروف حفظہ اللہ و تقبل جہودہ۔ کی گرانقدر تحقیق سے ۳۵ جلدوں میں مطبوع ہو کر منظر عام پر آچکی ہے، جس پر محقق کا ایک نفیس علمی مقدمہ بھی ہے، قابل ذکر بات یہ ہے کہ محقق نے اس میں بہت سے ایسے راویوں کا اضافہ بھی کیا ہے جو اس کتاب میں موجود راویوں کے ہم نام تھے، یہ اضافہ تمیز کے طور پر حاشیہ میں کیا گیا ہے۔

سنت نبویؐ سے تعلق رکھنے والے علماء و طلبہ کے لئے یہ گرانقدر علمی سرمایہ، عظیم تحفہ اور نعمت بے بہا ہے۔

رجال کتب ستہ پر امام ذہبیؒ (متوفی ۷۴۸ھ) کی تالیفات

تہذیب الکمال کے بعد ائمہ دین و محدثین میں سے جن لوگوں نے کتب ستہ کے راویوں کے حالات قلمبند کیا ہے ان میں امام ذہبی کا نام خصوصیت سے لیا جاتا ہے، امام ذہبیؒ نے "تهذيب الكمال" کی مختلف طرح سے خدمت کی ہے اور اس سے انہوں نے چار کتابیں تیار کی ہیں یہ چاروں کتابیں کتب ستہ یا اس کے لواحقات کے راویوں سے متعلق ہیں۔

ان کتابوں میں سب سے پہلی کتاب "تذهيب تهذيب الكمال في أسماء الرجال" ہے۔

۲۰- تذهيب تهذيب الكمال في أسماء الرجال

یہ کتاب جیسا کہ نام سے واضح ہے امام مزیؒ کی کتاب "تہذیب الکمال" کا اختصار اور تہذیب ہے جس میں کچھ معلومات کا اضافہ امام ذہبی نے اپنی طرف سے کیا

(۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ تهذيب الكمال ۱/۱ ۵-۷۱ مقدمه محقق

ہے۔ یہ اضافے عموماً راویوں کے بارے میں جرح و تعدیل سے متعلق ائمہ محدثین کے اقوال ہیں۔ اسی طرح سے ضبط اسماء، نیز تاریخ وفات کا بھی اضافہ کیا ہے۔ اس کتاب کی تصنیف میں آٹھ مہینے کا وقت لگا ہے۔ (۱)

کتاب کی ترتیب و تنظیم اسی طرح سے ہے جس طرح سے "تہذیب الکمال" کی ہے "تہذیب الکمال" چونکہ کتب ستہ اور ان کے ملحقات کے راویوں پر مشتمل ہے۔ لہٰذا یہ کتاب بھی انہیں راویوں کے حالات پر مشتمل ہے وہ سارے رموز و اشاریئے جو اصل کتاب میں مستعمل ہوئے تھے اس میں بھی سب کو برقرار رکھا گیا ہے۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کتاب پر (خاص طور سے جو اضافہ امام ذہبی نے کیا ہے اس پر) یوں تبصرہ کیا ہے، "وإن زاد ففي بعض الأحايين و فيات با لظن و التخمين ، أو مناقب لبعض المترجمين مع اهمال كثير من التوثيق و التجريح" (۲) یعنی انہوں نے بہت کم اضافہ کیا ہے اور جو اضافہ کہیں کہیں کیا بھی ہے وہ تاریخ وفات سے متعلق ہے جو اندازہ کیا گیا ہے، یا بعض صاحب ترجمہ کے فضائل کا اضافہ ہے، البتہ جرح و تعدیل کے بارے میں بہت اہمال سے کام لیا ہے۔

یہ حافظ ابن حجر کا تبصرہ امام ذہبی کی اس کتاب پر ہے جس میں بظاہر مبالغہ پایا جاتا ہے ہر ایک مؤلف کا اپنا اپنا نظریہ اور طریقہ ہوتا ہے جس کے مطابق وہ کام کرتا ہے، امام ذہبی نے اپنی پسند کے مطابق جو کام کیا ہے کوئی ضروری نہیں کہ وہ حافظ ابن حجر کو بھی پسند آجائے، حافظ ذہبی جیسے حضرات جن کو خود حافظ ابن حجر نے "وهو من أهل الاستقراء التام في الرجال " کا خطاب دیا ہے ان سے یہ کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ انہوں نے ظن و تخمین سے کام لیا ہے۔ خود حافظ ابن حجر نے ان اضافات سے استفادہ کا اقرار بھی کیا ہے وہ اپنی کتاب "تہذیب التہذیب" کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: قد الحقت في هذا المختصر ما التقطته من تذهيب التهذيب للحافظ الذهبي فإنه زاد قليلاً فرأيت أن أضم زياداته لكمل الفائدة (۳) یعنی "تذہیب التہذیب" میں امام ذہبی نے کچھ اضافہ کیا ہے، میں نے ان

---

(۱) تهذيب الكمال ۱/۵۳، مقدمه محقق (۲) تهذيب التهذيب ۱/۲
(۳) تهذيب التهذيب ۱/۸.

اضافوں کو اس مختصر (تہذیب التہذیب) میں شامل کر لیا ہے تا کہ فائدہ مکمل ہو جائے۔

یہ زیادتی جو ظن و تخمین پر مبنی ہے (خواہ صرف وفیات ہی سے متعلق کیوں نہ ہو) اس سے استفادہ کرنا اور اپنی کتاب میں شامل کر لینا پھر کیونکر درست ہوگا لہٰذا کتاب کی اہمیت اپنی جگہ پر مسلم ہے اور حافظ ابن حجر کا یہ تبصرہ محل نظر ہے۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ بعد کے علماء نے اس کا بھی اختصار کیا ہے۔ انہیں میں سے "خلاصة الخزرجي" ہے جس کا ذکر آرہا ہے۔

۲۱- الكاشف في معرفة من له رواية في الكتب الستة

یہ کتاب بھی امام ذہبی کی تالیف ہے جس کو انہوں نے امام مزی کی کتاب "تہذیب الکمال" سے مختصر کیا ہے، کتاب کے نام ہی سے موضوع واضح ہے یعنی اسمیں صرف انہیں راویوں کا تذکرہ ہے جنکی روایتیں کتب ستہ میں پائی جاتی ہیں۔ دیگر ملحقات کی نہیں، اصحاب کتب ستہ کی دیگر کتابوں کے راویوں کو، نیز ان رایوں کو جنہیں تمیز کے طور پر یا تنبیہ کے طور پر امام مزی نے ذکر کیا ہے ان کو حافظ ذہبی نے حذف کر دیا ہے۔ (۱)

ترتیب و تنظیم اور اشارے اصل کی مانند ہیں، تراجم کافی مختصر ہیں عموماً سطر دو سطر سے زیادہ نہیں، اس کتاب کے بارے میں حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ: "إنما هي كالعنوان تشوق النفوس إلى الاطلاع على ماوراءه" (۲)

ابوزرعہ عراقی نے اس پر ایک ذیل تحریر کی ہے جس کا ذکر آگے آرہا ہے۔

۲۲- المجرد من تهذيب الكمال

یہ بھی امام ذہبی کی تالیف ہے جسکو انہوں نے "تہذیب الکمال" سے مختصر کیا ہے، اس کتاب میں بھی صرف کتب ستہ کے راویوں کا ذکر ہے، اس میں اور "الکاشف" میں فرق یہ ہے کہ اس کو طبقات پر مرتب کیا گیا ہے جبکہ "الکاشف" حروف معجم پر مرتب ہے جملہ راویوں کو دس طبقات میں تقسیم کیا گیا ہے پھر ہر طبقہ کو حروف معجم پر مرتب کیا گیا ہے اس کتاب کے نسخے فاتیکان (وٹیکین) استنبول وغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔ (۳)

---

(۱) الكاشف في معرفة من له رواية في الكتب الستة ۱/ ۴۹

(۲) تهذيب التهذيب ۱/ ۲ (۳) مقدمة تهذيب الكمال ۱/ ۵۶ ڈاکٹر بشار عواد

۲۳-المقتضب من تهذيب الكمال

یہ بھی امام ذہبی کی تالیف ہے جو "تہذیب الکمال" سے ماخوذ ہے اس کتاب میں امام ذہبیؒ نے صرف ان راویوں کو ذکر کیا ہے جو کتب ستہ کے مولفین کے کتب ستہ کے علاوہ دیگر کتابوں کے راوی تھے۔

یہ کتاب بھی حروف معجم پر مرتب ہے اسلئے استفادہ بہت آسان ہے جس حرف سے راوی کا نام شروع ہوتا ہے اس حرف کو دیکھنے سے مطلوبہ راوی فوراً مل جائے گا۔

اس کتاب کا ذکر امام سخاویؒ اور صاحب ہدیۃ العارفین نے کیا ہے، ڈاکٹر بشار عواد نے اس کتاب کا تعارف کیا ہے لیکن اس کے وجود اور نسخوں کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے، جس سے معلوم ہو سکتا کہ کتاب موجود ہے کہ نہیں؟(۱)

کتب ستہ سے متعلق یہ چار کتابیں ہیں جن کو امام ذہبی نے "تہذیب الکمال" کو بنیاد بنا کر تحریر کیا ہے۔

۲۴ - إكمال تهذيب الكمال فى اسماء الرجال

تالیف: حافظ مغلطائی (متوفی ۷۶۲ھ)

رجال کتب ستہ سے متعلق کتابوں میں سے ایک عظیم کتاب حافظ علاؤالدین مغلطائی بن قلیج (متوفی ۷۶۲ھ) کی ہے جو کافی مفید کتاب ہے، حافظ ابن حجر کا اس پر کافی اعتماد رہا ہے، اس کتاب میں علامہ علاء الدین مغلطائیؒ نے امام مزی کی کتاب "تہذیب الکمال" سے کچھ چیزوں کو حذف کر دیا ہے اور کچھ معلومات کا اضافہ کر کے اس کی تکمیل کی ہے جس کی تفصیل یہ ہے:

اس کتاب کو اس کی اصل کی ترتیب پر مرتب کیا ہے۔ اور سارے تراجم اور رموز کو اپنی جگہ پر برقرار رکھا ہے۔ ہر ترجمہ کے ذکر کے بعد کسی نہ کسی قسم کی تعلیق اس پر لگائی ہے اور تبصرہ کیا ہے۔ وہ ساری عبارتیں جن کو امام مزی نے کہیں سے نقل کیا تھا انھوں نے ان کا مراجعہ کیا ہے اس طرح ان نصوص کی توثیق و تصدیق کر دی ہے۔ جرح و تعدیل سے متعلق معلومات کا اضافہ کیا ہے۔ ضبط اسماء و انساب کی جانب خصوصی توجہ

---

(۱) مقدمه ڈاکٹر بشار عواد بر تهذيب الكمال ۵۶/۱

دی ہے۔بہت سے ناموں کا اضافہ کیا ہے جو عموماً تمیز کے طور پر کئے گئے ہیں۔

اس کتاب میں سیرت نبوی ﷺ کو مکمل طور سے حذف کر دیا گیا ہے نیز ان حدیثوں کو بھی (مع سند و متن) حذف کر دیا ہے۔جن کو امام مزی نے اپنی سند عالی سے ذکر کیا تھا ایسے اخبار و واقعات جن کا تعلق جرح و تعدیل سے نہیں تھا حذف کر دیا ہے،امام مزی نے صاحب ترجمہ کے شیوخ و تلامذہ کے استیعاب کی جو کوشش کی ہے اس پر تنقید کی ہے اور ان میں اکثر و بیشتر کو حذف کر دیا ہے۔

ان ساری چیزوں کے حذف کرنے کے باوجود یہ کتاب حجم میں تقریباً "تہذیب الکمال" کے مساوی ہے۔

حافظ ابن حجر نے اپنی "تہذیب" میں اس کتاب سے کافی استفادہ کیا ہے حذف و تہذیب میں ان کی اتباع کی ہے اور اس کو ایک عظیم کتاب قرار دیا ہے، "تہذیب التہذیب" میں جو اضافے ہیں عموماً اسی کتاب سے ماخوذ ہیں[(۱)]

اس کتاب کے مختلف اجزاء مختلف کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں مزید تفصیل کیلئے ڈاکٹر بشار عواد کا مقدمہ ملاحظہ فرمائیں[(۲)]

اس کتاب کی تکمیل کے بعد مغلطائی نے اس میں سے ان راویوں کو الگ جمع کر دیا ہے جن کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ امام مزی سے ان کے بارے میں غلطیاں ہو گئی ہیں اس کا نام "أوهام التهذيب" رکھا ہے[(۳)]

۲۵- ذیل الکاشف

تالیف:ابوزرعہ عراقی (متوفی ۸۲۶ھ)

امام ذہبی کی کتاب "الکاشف" پر اس کی اہمیت کے پیش نظر ابوزرعہ عراقی نے ایک ذیل "ذیل الکاشف" کے نام سے تحریر کیا ہے اس کتاب میں امام عراقی نے ان راویوں کا ذکر کیا ہے جو مولفین کتب ستہ کی دیگر کتابوں کے راوی تھے جن کو امام ذہبی نے "الکاشف" سے حذف کر دیا تھا،اس کے ساتھ ساتھ "مسند احمد بن حنبل" اور "زیادات عبداللہ" کے راویوں کا اضافہ کیا ہے۔[(۴)]

---

(۱) تهذيب التهذيب ۸/۱ (۲) مقدمه تهذيب الكمال ۵۸/۱، ۶۲
(۳) ملاحظہ ہو مقدمة تهذيب الكمال ۶۱/۱ (۴) ذيل الكاشف ص ۲۹

الکاشف اور ذیل دونوں محقق ومطبوع ہیں "الکاشف" میں (۷۷۸۰)اور "ذیل الکاشف" میں (۲۱۹۸) راویوں کا ذکر ہے۔

۲۶ - تھذیب التھذیب

تالیف: حافظ ابن حجر عسقلانی (متوفی ۸۵۲ھ)

کتب ستہ کے رجال کی خدمت کرنے والی کتابوں کی ایک نہایت اہم اور معتبر کڑی "تہذیب التہذیب" یعنی "تھذیب تھذیب الکمال فی أسماء الرجال" ہے۔

تعارف:- اس کتاب کے مولف حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ بنیادی طور سے یہ کتاب جیسا کہ نام سے واضح ہے امام مزی کی کتاب "تہذیب الکمال" سے متعلق ہے۔ اس میں مذکورہ کتاب کو مہذب اور مختصر کیا گیا ہے اس لئے اس میں ان تمام راویوں کا تذکرہ ہے جو کتب ستہ کے راوی ہیں نیز اصحاب کتب ستہ کی کچھ دیگر تالیفات کے راوی بھی ہیں اسی طرح سے ان کے ہم نام راویوں کو بھی برقرار رکھا ہے۔ جن کو مزی نے بطور تمیز (یعنی فرق بتانے کیلئے) ذکر کیا تھا۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی باکمال شخصیت ان کے تحری وتثبت نیز فیصلوں پر بعد میں آنے والوں نے بہت زیادہ اعتماد کیا ہے، اس لئے یہ کتاب علماء کے یہاں بیحد مقبول ومعتمد ہے۔ علماء نے کتب ستہ کے راویوں کے تراجم کیلئے حافظ ابن حجر کی دونوں کتابوں "تہذیب التہذیب" اور "تقریب التہذیب" پر زیادہ ہی اعتماد کیا ہے ان کی "تہذیب" کے منظر عام پر آنے کے بعد ذہبی کی "تذہیب" مغلطائی کی "الاکمال" اس کے سامنے ماند پڑ گئی، حتیٰ کہ اس کی اصل "تہذیب الکمال" کی طرف بھی علماء کی اتنی توجہ نہیں رہی جتنی کی ان کی دونوں کتابوں پر رہی۔

یہ کتاب "تہذیب الکمال" کے مقابلہ میں مختصر اور جامع تھی اس لئے کہ اس میں راویوں کے تعلق سے صرف ضروری معلومات ہی جمع کی گئی تھیں۔ نیز تراجم رجال کا اصل مقصد جرح وتعدیل کی معرفت ہوتی ہے جو اس کتاب میں دیگر کتابوں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔

وجہ اختصار:- حافظ ابن حجر نے اس کتاب کے مہذب ومختصر کرنے کی وجہ یہ

بتائی ہے کہ: عموماً لوگ طویل کتابوں سے گھبراتے ہیں اور ان سے استفادہ کرنے میں کاہلی کا مظاہرہ کرتے ہیں (چونکہ امام مزی کی کتاب انتہائی مفید ہونے کے باوجود کافی طویل تھی) لہٰذا لوگ امام ذہبی کی کتاب "الکاشف" کی طرف زیادہ توجہ دینے لگے، جس سے اصل مقصد پورا نہیں ہوتا تھا، نیز بعض تراجم میں معلومات بالکل نہ ہونے کے برابر تھی، اس میں اضافہ کی ضرورت تھی اس لئے میں نے سوچا کہ اس کتاب کو مناسب طریقے سے مختصر کر دیا جائے جو مفید ہو"۔(۱)

اختصاری عمل: -امام مزی نے اپنی کتاب "تہذیب الکمال" کے مقدمہ میں تین فصلیں قائم کی تھیں۔

☆ شروط الائمۃ الستۃ، ☆ الحث عن الروایۃ من الثقات، ☆ السیرۃ النبویۃ

۱- حافظ ابن حجر نے ان فصلوں کو یکسر حذف کر دیا، اس لئے کہ ان کا تعلق علوم حدیث اور سیرت کی کتابوں سے ہے۔

۲- امام مزی نے جن حدیثوں کو اپنی اسناد عالیہ کے واسطے سے ذکر کیا تھا (تخریج کی تھی) ان کو بالجملہ مع سند و متن حذف کر دیا ہے۔

۳- وہ سارے اختلافات جن کا تعلق راوی کی تاریخ وفات سے تھا ان کو بھی حذف کر دیا۔

٤- اسی طرح سے ان واقعات و اخبار کو بھی حذف کر دیا جن کا تعلق جرح و تعدیل سے نہ تھا۔

۵- امام مزی نے ہر راوی کے جملہ اساتذہ تلامذہ کو ذکر کرنے کی کوشش کی تھی حافظ ابن حجرؒ نے ان سب کو حذف کر کے جو زیادہ مشہور یا قریبی تھے صرف ان کو باقی رکھا جس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ راویوں کے اساتذہ و تلامذہ کا حصر کرنا ناممکن ہے۔(۲)

اسطرح سے یہ کتاب مختصر ہوکر "تہذیب الکمال" کے بہ نسبت ایک تہائی رہ گئی ہے۔

اضافی عمل: -حافظ ابن حجر نے اس کتاب میں کچھ اہم اضافی کام کیا ہے وہ یہ ہیں:

(۱) تهذيب التهذيب ۳/۱ (۲) تهذيب الكمال ۱/ ۳-٤

۱- بعض راویوں کا اضافہ کیا جو کتاب کی شرط پر تھے لیکن امام مزی سے فوت ہو گئے تھے۔
۲- بعض ایسے راویوں کا اضافہ کیا جو ان کتاب کے راویوں کے ہم نام تھے یہ اضافہ اس لئے کیا تاکہ دونوں میں فرق کیا جا سکے۔ اس لئے ان کے نام پر اشارہ کے بجائے لفظ ''تمییز'' لکھ دیا ہے۔
۳- الكمال في أسماء الرجال کے ان راویوں کو جن کی راویت امام مزی کو کتب ستہ میں نہیں مل سکی تھی انہوں نے ان کو حذف کر دیا تھا حافظ ابن حجر نے ان راویوں کو بھی اس کتاب میں شامل کر لیا۔ کیونکہ احتمال کے طور پر ذکر کر دینا (فائدہ سے خالی نہیں) اور حذف کے مقابلہ میں باقی رکھنا بہتر ہے۔
٤- سب سے اہم اضافہ ائمہ نقد کے اقوال کا ہے جو جرح و تعدیل سے متعلق ہیں اس طرح کے اضافہ کی جہاں گنجائش تھی اس کو ترجمہ کے بالکل آخر میں ذکر کیا ہے اور لفظ ''قلت'' سے اس کی ابتدا کی ہے۔ لہٰذا راوی کے ترجمہ میں جہاں لفظ ''قلت'' آیا ہے اس کے بعد کی معلومات حافظ ابن حجر کی زیادات ہیں۔

ترتیب و رموز :- یہ کتاب بھی اپنی اصل یعنی ''تہذیب الکمال'' کی طرح نہایت ہی دقیق ترتیب پر حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب ہے صرف حرف ''الف'' میں ''احمد یین'' اور حروف ''م'' میں ''محمد یین'' کو مقدم کیا گیا ہے۔ ناموں کے بعد کنیت سے مشہور راویوں کا تذکرہ، پھر دیگر چار فصلوں میں منقسم راویوں کا ذکر ہے جیسے کہ ''تہذیب الکمال'' میں ہے، آخر میں خواتین کا تذکرہ اسی دقیق ترتیب سے کیا گیا ہے۔ لہٰذا کتاب سے استفادہ بہت ہی آسان ہے ساری کتاب ایک فہرست جیسی ہے دونوں کتابوں کی ترتیب میں کوئی فرق نہیں سوائے اس کے کہ ''تہذیب التہذیب'' میں راوی کے مشایخ و تلامذہ کو شہرت اور قربت کی بنیاد پر مرتب کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں وہ سارے رموز اسی طرح برقرار رکھے گئے جس طرح ''تہذیب الکمال'' میں ہیں۔

مصادر :- اس کتاب کے وہی مصادر ہیں جو ''تہذیب الکمال'' کے مصادر ہیں البتہ اضافی معلومات کیلئے جو مصادر خصوصی طور سے استعمال کئے گئے ہیں ان میں علامہ مغلطائی کی تالیف ''اکمال تہذیب الکمال'' ہے اس سے مؤلف نے بھرپور استفادہ کیا

ہے اور اختصار میں عموماً اسی کتاب کا طریقہ استعمال کیا ہے، نیز امام ذہبی کی کتاب "تذہیب التہذیب" سے بھی مفید معلومات کو منتخب کیا ہے۔[1]

مؤلف کتاب نے اپنی کتاب کی افادیت بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ: فرض کیجئے کہ اس کتاب میں کچھ نہیں ہے تو بھی کم از کم مناسب حجم میں دو کتابوں (مزی کی تهذيب الكمال اور مغلطائی کی إكمال تهذيب الكمال) کا مجموعہ ضرور ہے اور یہ بھی بہت بامقصد عمل ہے۔[2]

۲۷ - تقريب التهذيب

تالیف: حافظ ابن حجر عسقلانی (متوفی ۸۵۲ھ)

تعارف اور وجه تالیف:- کتب ستہ اور اس کے ملحقات کے راویوں کی معلومات کیلئے یہ ایک مختصر، جامع ترین اور انتہائی مفید کتاب ہے جو "بقامت کہتر بقیمت بہتر" کی مصداق ہے اس کتاب کو حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے "تہذیب التہذیب" کے بعد تصنیف کی ہے "تہذیب التہذیب" جس میں "تہذیب الکمال" کو مختصر اور مہذب کیا گیا تھا مختصر ہونے کے باوجود بھی کافی طویل تھی (جو فی الحال بارہ جلدوں میں مطبوع ہے) اسلئے کچھ محبین علم نے ان سے یہ درخواست کی کہ اس کتاب کو بھی مختصر کر دیا جائے تو بہتر ہو گا۔ چنانچہ کچھ پس و پیش کے بعد انہوں نے اسکے اختصار کا بیڑا اٹھایا۔[3] اور ایسے نرالے ڈھنگ سے تیار کیا جس کی نظیر نہیں ملتی، معمولی سے وقت میں چند کلمات کے ذریعہ راوی کے بارے میں ضروری معلومات حاصل ہو جاتے ہیں، یہ کتاب اپنے اس قالب میں انتہائی مشہور اور متداول ہوئی، علماء نے اس پر بھرپور اعتماد کیا، جس کو تفصیل و تحقیق کی ضرورت ہوتی ہے وہی دوسری کتابوں کا مراجعہ کرتا ہے، ورنہ اسی کو کافی سمجھا جاتا ہے۔

ترتیب:- یہ کتاب ہو بہو اپنی اصل (تہذیب التہذیب) کی طرح حروف معجم پر مرتب ہے، آخر میں کنیت اور دیگر چار فصلیں اس میں بھی اسی طرح ہیں البتہ خواتین کے باب میں مبہمات کا اضافہ کیا گیا ہے جو "تہذیب التہذیب" میں نہیں ہے، ان مبہم

---

(۱) تهذيب التهذيب ۱/۳، ۵، ۸ (۲) تهذيب التهذيب ۱/۸

(۳) تقريب التهذيب ص ۹ نسخة هندية

خواتین کی ترتیب ان سے روایت کرنے والوں کے نام پر مرتب ہے۔

اہم خوبی:-اس کتاب کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں ہر راوی کی شخصیت اور اس کے بارے میں وارد شدہ اقوال کا بغائر مطالعہ کر کے ایک جامع فیصلہ تیار کیا گیا ہے جس میں جرح تعدیل کے جو بارہ مرتبے ہیں ان کو سامنے رکھ کر، راوی کیلئے جو مناسب کلمہ و مرتبہ ہوتا تھا اس پر حکم لگا دیا گیا ہے مثلاً ثقہ ثبت، ثقہ، صدوق، لاباس بہ، مقبول، ضعیف وغیرہ۔ راوی کے بارے میں (خاص طور سے متضاد اقوال کا) یہی جامع خلاصہ و فیصلہ اس کتاب کے مقبول و متداول ہونے کا سب سے اہم سبب ہے، اس لئے کہ راویوں کے حالات معلوم کرنے کا سب سے اہم مقصد یہی ہے۔

کیفیت تراجم :- اس کتاب میں عموماً تراجم ایک سطر میں مکمل ہو گئے ہیں جس میں راوی اور اس کے باپ دادا کے نام کے ساتھ ساتھ اس کی مشہور نسبت، کنیت، نیز لقب وغیرہ کا ذکر آ گیا ہے۔ مشکل اور متشابہ نام کو حروف کے ذریعہ ضبط کر دیا گیا ہے۔ راویوں کے اساتذہ و تلامذہ کا ذکر نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس کی جگہ ان کو طبقات پر تقسیم کر دیا گیا ہے جس سے اس کے عصر کی تعین ہو جاتی ہے، جملہ راویوں کو بارہ طبقات پر تقسیم کیا گیا ہے، اور جو راوی جس طبقہ کا ہے اس کا ذکر اس کے ترجمہ میں کر دیا گیا ہے انہیں طبقات کے ذریعہ راوی کی تاریخ وفات کی تعیین بھی کی گئی ہے، ان طبقات کا سمجھنا اس کتاب میں تاریخ وفات کی تعیین کیلئے بہت ضروری ہے اس کے بغیر تاریخ وفات سمجھنا ممکن نہیں، جس کی تفصیل یہ ہے۔

بذریعہ طبقات وفات کی تعیین:-

۱- اگر راوی پہلے یا دوسرے طبقہ کا ہوگا تو اسکی وفات سن ایک سو ہجری سے پہلے کی ہوگی۔

۲- اگر تیسرے طبقہ سے لیکر آٹھویں طبقہ کے آخر تک کا ہے تو اس کی وفات سنہ ایک سو کے بعد کی ہوگی۔

۳- اور اگر نویں سے لیکر بارہویں کے آخر تک کا ہے تو اسکی وفات سنہ دو سو کے بعد ہوگی۔

اگر کہیں اسکے برخلاف ہے تو اسکی وضاحت کر دی گئی ہے۔[1]

---

(۱) تفصیل کیلئے دیکھئے مقدمة تقريب التهذيب ص ۹-۱۰

مزید وضاحت:- مثال کے طور پر اس کتاب کے سب سے پہلے راوی احمد بن ابراہیم ہیں ان کا ترجمہ اس کتاب میں اس طرح ہے :

(د، فق) أحمد بن ابراهيم بن خالد الموصلي ، أبو علي نزيل بغداد ، صدوق من العاشرة مات سنة ست و ثلاثين. یعنی یہ راوی سنن ابوداؤد اورابن ماجہ کی "کتاب التفسیر" کے راوی ہیں جو اصلاً موصل کے رہنے والے تھے لیکن بغداد کو اپنا وطن بنایا، یہ راوی "صدوق" ہیں (یعنی یہ کہ مراتب تعدیل کے چوتھے درجہ کے راوی ہیں جن کی روایت قابل قبول ہوتی ہے) ان کا تعلق دسویں طبقہ سے ہے، ان کا انتقال ۳۶ھ میں ہوا ہے۔ یعنی چونکہ یہ دسویں طبقہ کے ہیں اس لئے ان کی وفات سنہ دوسو ہجری کے بعد کی ہے لہٰذا ۳۶ھ پر دوسو کا اضافہ کریں اس طرح سے ان کی وفات ۲۳۶ھ میں ہوئی ہے۔

یعنی راوی کے ترجمہ میں جو تاریخ وفات موجود ہے اگر وہ پہلے یا دوسرے طبقہ کا راوی ہے تو اس کی تاریخ میں کسی قسم کا اضافہ نہ ہوگا، وہی اس کی تاریخ وفات ہوگی، لیکن اگر تیسرے سے لیکر آٹھویں طبقہ تک کا ہے تو تاریخ وفات میں مذکور عدد پر ایک سو کا اضافہ کردیا جائے گا اور اگر نویں سے بارہویں طبقہ تک کا ہے تو مذکورہ عدد پر دوسو کا اضافہ کردیا جائے گا۔"

اشاریے :-راوی کے ترجمہ میں وہ سارے اشاریئے اسی طرح موجود ہیں جس طرح اس کی اصل "تہذیب التہذیب" اور اصل الاصل "تہذیب الکمال" میں موجود ہیں اگر کسی راوی پر یہ علامت نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ترجمہ یا تو گذر چکا یا آئندہ آئے گا۔ عموماً اس طرح کے تراجم کنیت اور اس کے بعد کے فصلوں میں پائے جاتے ہیں۔

خلاصہ:- یہ کتاب طالبان علوم نبوت کیلئے ایک بیش بہا خزانہ اور نادر تحفہ ہے جس سے بے نیاز نہیں ہوا جاسکتا۔ اس سے بے نیازی کوتاہی اور کم علمی کی دلیل ہے۔

۲۸ - التذكرة برجال العشرة

تالیف: علامہ حسینی (متوفی ۷۶۵ھ)

اس کتاب کی تصنیف کے لئے علامہ ابو عبد اللہ محمد بن علی بن حمزہ حسینی نے امام مزی کی کتاب ''تہذیب الکمال'' کو بنیاد بنایا ہے چنانچہ سب سے پہلے انہوں نے ''تہذیب الکمال'' کو مختصر کیا۔ اور وہ سارے راوی جنکا تعلق کتب ستہ سے نہیں تھا بلکہ انکے ملحقات سے تھا یا تمیز کے طور پر ذکر کیا گیا تھا ان کو حذف کر دیا، باقیماندہ راویوں کے حالات کو ویسے ہی مختصر کیا جیسا کہ امام ذہبیؒ نے ''الکاشف'' میں کیا تھا، اب یہ کتاب بالکل ''الکاشف'' کے مانند ہو گئی۔ اس کے بعد مزید چار کتاب کے راویوں کے حالات کا اضافہ کیا ہے، جس کیلئے اشارہ استعمال کیا ہے، وہ کتابیں یہ ہیں موطاء امام مالک جسکا اشارہ حرف (ک) ہے، مسند امام شافعیؒ جس کا اشارہ (فع) ہے، مسند احمد بن حنبلؒ جس کا اشارہ حرف (اً) ہے، مسند ابو حنیفہؒ جس کو ابن خسرو نے جمع کیا ہے۔ اس کا اشارہ (فہ) ہے، نیز عبد اللہ بن امام احمد نے مسند میں جو اضافہ کیا ہے اس کیلئے (عب) کا رمز متعین کیا ہے، کتب ستہ کے رموز کو اپنی شکل پر برقرار رکھا ہے۔ (۱)

ان چار کتابوں کے اضافہ کا سبب علامہ حسینی نے یہ بتایا ہے کہ ''ائمہ متبوعین کے استدلال کا دار و مدار عموماً انہیں روایتوں پر ہے جن کو انہوں نے اپنی سند سے روایت کیا ہے اور سواد اعظم کے عمل کا دار و مدار انہیں کے اقوال پر ہے لہٰذا ان کی جو مستدل روایتیں ہیں ان کے راویوں کے حالات کا جاننا بے حد ضروری تھا۔ (۲)

اس طرح سے یہ کتاب دواوین اسلام (صحاح ستہ) اور ائمہ اُربعہ کی مستدل روایتوں کے رجال کا مجموعہ ہے۔

چونکہ کتاب کی ترتیب سابقہ کتابوں کی طرح حروف معجم پر دقیق ترتیب سے مرتب ہے اسلئے استفادہ میں کوئی دقت نہیں ہوتی ہے، بہت آسانی سے مطلوبہ ترجمہ دستیاب ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر بشار عواد نے اس کے متعدد نسخوں کے وجود کی جانب اشارہ کیا ہے۔ (۳)

---

(۱) ملاحظہ ہو تعجيل المنفعة ص ۲ مقدمة تهذيب الكمال ڈاکٹر بشار عواد ۶۳/۱

(۲) تعجيل المنفعة ص — (۳) مقدمہ تهذيب الكمال ۶۳/۱

۲۹ - تعجیل المنفعة بزوائد رجال الائمة الأربعة

تالیف حافظ ابن حجر عسقلانی (متوفی ۸۵۲ھ)

یہ کتاب حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی تالیف ہے جو ان مخصوص کتابوں میں سے ہے جس کا تعلق کسی خاص کتاب کے راویوں سے ہے۔

اس کتاب کا تعلق اساسی طور سے علامہ حسینی کی سابقہ کتاب "التذکرۃ برجال العشرۃ" سے ہے اور خصوصی طور سے ان راویوں کے حالات کا ترجمان ہے جنکے واسطہ سے ائمہ اربعہ (امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور، امام احمدؒ) نے روایت کیا ہے۔

جب حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے علامہ حسینی کی کتاب کا مطالعہ کیا تو یہ کتاب ان کو بہت اہم نظر آئی اسلئے کہ اس میں دس اہم کتابوں کے راویوں کا تذکرہ ہے۔ چونکہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے کتب ستہ کے راویوں پر مختصر و مطول دونوں طرح سے کام کیا تھا، اس لئے اب انہوں نے یہ مناسب سمجھا کہ ائمہ اربعہ سے متعلق کتابوں کے راویوں کے حالات کو بھی قلمبند کرنا چاہیے۔

چنانچہ انہوں نے امام حسینی کی کتاب کو بنیاد بنا کر کام شروع کیا اور "التذکرۃ" سے ان راویوں کو حذف کر دیا جن کا تعلق کتب ستہ سے تھا، صرف انہیں راویوں کو باقی رکھا جو موطا مالک، مسند شافعی، مسند احمد اور مسند ابن خسرو کے راوی تھے اور جن کا ذکر کتب ستہ کے رجال میں نہیں آسکا تھا۔

ائمہ اربعہؒ کی مستدل روایتوں میں سے مذکورہ کتابوں کے علاوہ دیگر کتابوں کے راویوں کا اضافہ بھی کیا اس اضافہ میں انہوں نے امام دار قطنیؒ کی کتاب "غرائب مالک" امام بیہقیؒ کی کتاب "معرفۃ السنن والآثار" امام احمدؒ کی کتاب "الزہد" امام محمدؒ کی "کتاب الآثار" کے راویوں کا اضافہ کیا ان میں سے جن کا ترجمہ "تہذیب التہذیب" میں کیا جا چکا تھا صرف ان کا نام ذکر کر کے "تہذیب" کا حوالہ دے دیا ہے۔

علامہ حسینی کی دوسری کتاب "**الاکمال عمن فی مسند أحمد من الرجال**" سے کچھ دیگر فوائد و اضافی معلومات کا ذکر کیا ہے، نیز ان سے جو غلطیاں ہو

گئی تھیں ان کی اصلاح کر دی ہے، علامہ ہیثمی نے "الاکمال عمن فی مسند أحمد من الرجال " میں کچھ راویوں کا اضافہ کیا تھا اس سے بھی استفادہ کیا ہے، علامہ ہیثمی کی کتاب سے جن راویوں کا اضافہ کیا ہے ان کی جانب لفظ "ہب" سے اشارہ کیا ہے بقیہ رموز اسی طرح سے ہیں جس طرح سے "التذکرۃ" میں گذر چکا ہے۔

"التذکرۃ" کی معلومات نقل کرنے کے بعد اپنا جو بھی اضافہ کیا ہے اس کو لفظ "قلت" سے شروع کیا ہے۔

پوری کتاب حروف معجم پر بڑی دقیق ترتیب سے مرتب کی گئی ہے سب سے پہلے راویوں کو ان کے ناموں کے اعتبار سے مرتب کیا ہے پھر کنیت سے مشہور افراد کا تذکرہ ہے، اس کے بعد ابن فلاں سے مشہور راویوں کا ذکر ہے پھر مبہمین اور اس کے بعد خواتین کے تراجم، اسی ترتیب سے مرتب کئے گئے ہیں[1]

اس طرح سے یہ مختصر سی (ایک جلد کی) کتاب اپنے صفحات میں گرانقدر معلومات سمیٹے ہوئے ہے۔ اور حقیقت یہ ہی کہ حافظ ابن حجر کی دونوں مختصرات یعنی "تقریب التہذیب" اور "تعجیل المنفعہ" ایسی کتابیں ہیں جس میں قرون فاضلہ کے اکثر و بیشتر راویوں کے حالات کا اجمالی تعارف ہو جاتا ہے اور اس فن کی بڑی بڑی اور مطول کتابوں سے بے نیاز کر دیتی ہیں۔

طالبان علوم نبوت جو اس فن کی امہات کتب تک پہونچنے کی استطاعت نہیں رکھتے ان کیلئے یہ دونوں کتابیں مشعل راہ بن سکتی ہیں اور ان سے ان کا کام چل سکتا ہے۔

۳۰ - خلاصہ تذہیب التہذیب

علامہ صفی الدین احمد بن عبد اللہ خزرجی (جنکا انتقال ۹۲۳ھ کے بعد ہوا ہے) نے اس کو مختصر کیا ہے۔ جس کا نام "خلاصة تذهيب تهذيب الكمال" رکھا ہے۔ جسکو عرف عام میں "خلاصہ الخزرجی" کہا جاتا ہے۔

اس کی ترتیب و تنظیم بھی اپنی اصل کی طرح ہے اور موضوع بھی وہی ہے (یعنی کتب ستہ اور ان کے ملحقات کے رجال کے حالات) نیز رموز و اشاریئے اسی

---

(۱) مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مقدمة تعجيل المنفعه ص ۳، ۸، ۹

طرح سے برقرار رکھے گئے ہیں۔

کتاب کو مختصر کرنے کے ساتھ ساتھ علامہ خزرجی نے اپنی طرف سے کچھ اضافہ بھی کیاہے اور ضبط اسماء پر خصوصی توجہ دیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ: فهذا مختصرفي أسماء الرجال اختصرته من تذهيب تهذيب الكمال وضبطت مايحتاج إلى ضبط في غالب الأحوال ،وزدت فيه زيادات مفيدةوو فيات عديدة.[1]

یہ کتاب بغیر تحقیق کے ایک جلد میں اور تحقیق کے ساتھ تین جلدوں میں مطبوع ہے۔ البتہ امام ذہبی کی کتاب ''تذہیب التہذیب'' میرے علم کے مطابق اب تک منظر عام پر نہیں آئی۔[2]

یہ اس فن کی چند مشہور تصانیف ہیں جن کا تعلق کتب خاصہ کی اس قسم سے ہے جس میں کسی مخصوص کتاب یا چند کتابوں کے راویوں کے حالات قلمبند کئے گئے ہیں۔ انہیں کے تذکرہ کیساتھ ساتھ کتب جرح وتعدیل کی اہم کتابیں مکمل ہو جاتی ہیں صرف کچھ فروعی تالیفات رہ جاتی ہیں، جو راویان حدیث کیلئے تالیف کی گئی ہیں یا ان میں ان کا تذکرہ پایا جاتا ہے۔

امام مزی سے پہلے کتب ستہ پر جتنی بھی کتابیں انفرادی یا اجتماعی طور سے تالیف کی گئی تھیں انہوں نے سب کو اپنی اس عظیم کتاب میں سمیٹ لیا۔ اس طرح سے یہ کتاب کتب ستہ اور ان کے ملحقات کیلئے بہت سب سے عظیم مرجع بن گئی، بعد میں آنے والوں میں کسی نہ کسی طرح سے اسی کتاب کو اپنے عمل کیلئے مرکز بنایا ہے۔

تہذیب الکمال کے تعلق سے جو کتابیں تصنیف کی گئی ہیں اسکا ایک خاکہ یہ ہے۔

---

(۱) خلاصة تذهيب تهذيب الكمال ص ۲

(۲) ملاحظہ ہو خلاصة تذهيب الكمال ص ٦ مقدمه شيخ ابو غده

رجال صحيح البخاری،
رجال صحيح مسلم، التعديل و التجريح، رجال سنن
النسائی، المجرد فی أسماء رجال كتاب سنن ابن ماجه،
الجمع بين رجال الصحيحين، تسمية شيوخ البخاری و مسلم و
أبوداؤد، والترمذی، والنسائی، رجال البخاری و مسلم، المعجم المشتمل
علی ذكر أسماء شيوخ الأئمة النبل لابن عساكر، الكمال فی أسماء الرجال،

تهذيب الكمال فی أسماء الرجال للمزی

اختصار	تهذيب	اكمال
◎ منتخب البعلبكی ٨٠٤ھ	◎ تذهيب التهذيب للذهبی ٧٤٨ھ	◎ إكمال تهذيب الكمال للمغلطائی ٧٦٢ھ
◎ مختصر تهذيب الكمال لابن ماجد الصالحی ٨٠٤ھ	◎ تهذيب التهذيب لابن حجر ٨٥٢ھ	◎ التذكرة برجال العشرة للحسينی ٧٦٥ھ
◎ بغية الأريب فی اختصار التهذيب لابن بردس ٧٨٦ھ	◎ تقريب التهذيب لابن حجر ٨٥٢ھ	◎ تعجيل المنفعة ٨٥٢ھ
◎ مختصر التهذيب لأبی العباس الأندرسی ٨٥٠ھ	◎ نهايت التقريب وتكميل التهذيب بالتذهيب لابن فهد ٨٧١ھ	◎ التكميل فی الجرح والتعديل لابن كثير ٧٧٤ھ
◎ الكنی المختصر من تهذيب الكمال رافع السلامی ٧١٨ھ	◎ خلاصة تذهيب الكمال للخزرجی ٩٢٣ھ	◎ زوائد الرجال علی تهذيب الكمال للسيوطی ٩١١ھ
◎ الكاشف لمن له رواية فی كتب الستة		◎ رجال صحيح ابن حبان سوی مافی التهذيب للعراقی ٨٠٦ھ
◎ المقتضب من تهذيب الكمال		◎ رجال سنن الدار قطنی سوی ما فی التهذيب للعراقی ٨٠٦ھ
◎ المجرد من تهذيب الكمال كلها للذهبی ٧٤٠ھ		

☆☆☆

کتب خاصه کی چوتھی قسم

کتب مقامی تاریخ

علمائے امت نے کچھ ایسی کتابیں تالیف کی ہیں جن کا تعلق اگرچہ فن جرح و تعدیل سے براہ راست نہیں لیکن بالواسطہ ضرور ہے یہ کتابیں رجال حدیث کی معرفت میں انتہائی اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ انہیں قسموں میں سے ایک قسم "تواریخ محلیۃ" (مقامی تاریخ) کی ہے۔ جن میں کسی خاص شہر یا چند شہروں اور مقامات کے حالات و واقعات کے ساتھ ساتھ وہاں کے علماء محدثین اور رجال حدیث کا ذکر ہوتا ہے، اور چونکہ مؤلف عموماً اسی مقام کا رہنے والا ہوتا ہے اس لئے ان اشخاص کے بارے میں ان کی معلومات انتہائی اہم اور دقیق ہوتی ہیں۔ اس طرح کی کتابوں کی تدوین کا اصل مقصد خدمت حدیث ہوا کرتی تھی پھر بھی مقامی عصبیت، محلی فخر و مباہات کا بھی اہم رول ہوا کرتا تھا۔ جس سے اس مقام کے باشندے اپنے علماء و فضلاء کے ذریعہ دوسروں پر فخر و مباہات کرتے تھے، چنانچہ علامہ ابو القاسم سہمی نے تاریخ جرجان کی وجہ تالیف بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ جب میں نے یہ دیکھا کہ بہت سے اہل بلاد اپنے شہروں میں صحابہ کی آمد، امراء و حکام سے منتخب ہونے، علماء و محدثین کی وجود سے فخر و مباہات کرتے ہیں، لہٰذا میں نے بھی یہ سوچا کہ اس سلسلہ میں جرجان کے علماء و محدثین اور اہل علم کا ایک اہم مجموعہ تیار کیا جائے۔ (۱)

اسی جذبہ کے ساتھ انہوں نے تاریخ جرجان کی تصنیف کی، مقامی تواریخ پر تصنیف کا اہتمام تیسری صدی ہجری ہی سے شروع ہو گیا تھا اور آگے چل کر اس میں مزید اضافہ ہوا اور بہت ساری اہم اہم کتابیں خاص خاص شہروں کے بارے میں تصنیف کی گئیں، جن کے واسطہ سے وہاں کے راویان حدیث کے حالات کا معلوم کرنا بہت آسان ہو گیا، اس طرح کی کتابوں کی ایک فہرست استاذ محترم ڈاکٹر اکرم ضیاء عمری حفظہ اللہ نے تیار کی ہے جس میں تقریباً چالیس کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ (۲)

---

(۱) تاریخ جرجان ۴/۳ (۲) بحوث فی تاریخ السنة المشرفة ص ۱۴۳-۱۴۹

ان کتابوں کی معلومات کیلئے امام سخاویؒ کی کتاب "الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ، وفهرسة ابن خیر الأشبیلی، نیز کشف الظنون حاجی خلیفه" سے استفادہ کیا ہے ان میں سے کچھ مطبوعہ کتابیں یہ ہیں:

۱- **تاریخ واسط**: یہ أسلم بن سہل واسطی (متوفی ۲۹۳ھ) کی تالیف ہے جو "بحشل" کے نام سے معروف ہیں۔

۲- **طبقات علماء افریقیة و تونس**:- یہ کتاب ابو العرب محمد بن أحمد بن تمیم قیروانی (۳۳۳ھ) کی تالیف ہے۔

۳- **تاریخ رقة**:- اس کے مولف محمد بن سعید قشیری (متوفی ۳۳۴ھ) ہیں۔

٤- **تاریخ داریّا**:- اس کے مؤلف ابو عبداللہ عبدالجبار بن عبداللہ خولانی (متوفی ۳۷۰ھ) ہیں۔

٥- **تاریخ جرجان**:- یہ ابو القاسم حمزہ بن یوسف سہمی (متوفی ۴۲۷ھ) کی تالیف ہے۔

٦- **تاریخ اصبهان**:- یہ حافظ ابو نعیم اصبہانی (متوفی ۴۳۰ھ) کی تالیف ہے۔

۷- **تاریخ قزوین**:- یہ عبدالکریم بن محمد رافعی (متوفی ۶۲۳ھ) کی تالیف ہے۔

تواریخ محلیہ کی کتابوں میں تاریخ بغداد، تاریخ دمشق، تاریخ نیسابور انتہائی اہم اور مفید کتابیں ہیں، اس لئے یہاں ان کا تعارف پیش خدمت ہے۔

۱- تاریخ بغداد

تالیف: خطیب بغدادی (متوفی ۴۶۳ھ)

تعارف و اهمیت:- "تاریخ بغداد" مقامی تواریخ میں شہرۂ آفاق کتاب ہے، اپنی جامعیت و معنویت کے اعتبار سے انتہائی مفید اور مشہور ہے، علماء امت نے اس کتاب کو بڑی پسندیدہ نگاہ سے دیکھا ہے اور بے انتہا استفادہ کیا ہے، امام سخاویؒ نے اس کتاب کو تاریخ بغداد ہی نہیں بلکہ تاریخ عالم قرار دیا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ:

"والتاریخ للخطیب سماه تاریخ بغداد وهو تاریخ العالم" (۱)

حافظ ابن عماد حنبلی فرماتے ہیں کہ: "وله تاریخ لم یصنف مثله" (۲)

(۱) الإعلان بالتوبیخ ص ۱۵۱ (۲) شذرات الذهب ۳۱۲/۳

چونکہ بغداد ایک طویل مدت تک اسلامی دار الخلافت رہا ہے، اس لئے علماء و محدثین کا مرکز، علم و ثقافت کا گہوارہ تھا، بڑے بڑے ماہرین فن اس شہر میں رونق افروز ہوتے اور اپنی فنی مہارت سے لوگوں کو فیضیاب کرتے، طلبہ و علماء کی بڑی بڑی جماعت دور و دراز علاقہ سے جوق در جوق بغداد کا رخ کرتی، جس کی وجہ سے اس شہر میں رجال حدیث اور محدثین و فقہاء کی بہت بڑی تعداد کا گذر ہو چکا تھا۔

مشتملات: - خطیب بغدادیؒ نے تعمیر بغداد سے لے کر اپنی وفات تک کے علماء و محدثین فقہاء و قاضیان، جو اس شہر میں پیدا ہوئے یا اس کو اپنا وطن بنایا یا یہاں سے ان کا گذر ہوا اور انہوں نے اپنے علمی چشمے سے یہاں کے لوگوں کو سیراب کیا ان کے حالات بیان کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ البتہ جن حضرات کا گذر یہاں سے ہوا لیکن یہاں پر ان کا کوئی درس نہیں ہوا تو ایسے لوگوں کا ذکر، چند بڑے بڑے اہل علم کو چھوڑ کر، نہیں کیا اس لئے کہ ان کی تعداد بہت بڑی تھی۔ (۱)

علماء محدثین کے علاوہ یہاں کے خلفاء و امراء، زہاد و بزرگان دین، ادباء و شعراء نیز دیگر ماہرین فن حتی کہ مشہور تیر اندازوں، معروف شہسواروں، گویوں اور فنکاروں کا بھی ذکر کیا ہے۔ لیکن اس طرح کے لوگوں کے تراجم عموماً مختصر ہیں البتہ محدثین و رجال حدیث کے تراجم مفصل ہیں۔

شہر بغداد کے علاوہ قرب و جوار کے معروف مقامات جیسے مدائن، نہروان، عکبر، انبار، سُرّمن رأی، وغیرہ میں رہنے والے صحابہ کرامؓ، رجال حدیث اور محدثین کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ (۲)

اس کتاب میں مطبوعہ نسخے کے نمبرات کے مطابق (۷۸۳۱) افراد کا ذکر ہے، جس میں محدثین کی تعداد تقریباً چار ہزار ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رجال حدیث اور محدثین کی معرفت کے سلسلہ میں یہ کتنی عظیم کتاب ہے۔

ڈاکٹر طحان فرماتے ہیں کہ: محدثین کی اتنی بڑی تعداد کا ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں، کیونکہ کتاب کی تالیف کا اصل مقصد محدثین اور علوم اسلامیہ سے تعلق رکھنے

---

(۱) تاریخ بغداد ۱/ ۲۱۲، ۲۱۳ (۲) تاریخ بغداد ۱/ ۱۲۷

والے علماء و فضلاء کا ترجمہ پیش کرنا تھا دیگر حضرات کا ذکر مجرد تعریف کیلئے تھا سوانح حیات کیلئے نہیں تھا، لہٰذا یہ کتاب حقیقت میں رجال حدیث کی معرفت، ان کے بارے میں ائمہ نقد کے احوال، جرح و تعدیل کی معلومات کیلئے ہے تاکہ مشتغلین حدیث کو یہ معلوم ہو جائے کہ مذکورہ شخص قابل قبول ہے یا قابل ترک۔(۱)

نوعیت تراجم:- محدثین ورجال کے ترجمہ میں عموماً مترجم شدہ شخص کا نام و نسب، نسبت اور کنیت، شیوخ و تلامذہ اور بعض ایسے اخبار و واقعات کا ذکر کیا جاتا ہے جو مترجم کے مقام، منصب اور اخلاق سے متعلق ہوتے ہیں، نیز ائمہ فن جرح و تعدیل کے اقوال کو بحیثیت قبول اور رد جمع کیا ہے۔(۲) اگر کوئی ایسا شخص ہے جس کے بارے میں علماء نقد کا اختلاف ہے تو سب سے آخری قول جس پر ترجمہ ختم ہوتا ہے وہی مؤلف کے یہاں معتمد اور قابل اعتبار ہے۔(۳) عموماً تاریخ وفات اور عمر کا بھی ذکر کیا ہے، عدم اطلاع کی صورت میں اس شخص کے طبقہ سے کسی معروف فرد کا ذکر کر دیا ہے تاکہ اس کے زمانے کی تعیین ہو سکے۔(۴)

بطور مثال بعض حدیثوں کا ذکر کیا ہے اس وجہ سے اس کتاب میں حدیثوں کی ایک بڑی تعداد پائی جاتی ہے۔

ترتیب:- کتاب کی ابتداء ایک طویل مقدمہ سے کی ہے جو تقریباً ۱۲۷ صفحات پر مشتمل ہے اس میں بغداد کے متعلق جملہ معلومات پیش کیا ہے۔ جس میں بغداد کا حدود اربعہ، وہاں کی آب و ہوا، درجہ حرارت و برودت، شہر کی تخطیط و تجدید، مقابر، مساجد، سڑکوں، پلوں وغیرہ کا ذکر شامل ہے، اس کے بعد سب سے پہلے شہر مدائن کا ذکر بغداد کے قریب تر ہونے کی بنا پر کیا ہے۔ جو جلد اول کے صفحہ ایک سو ستائیس (۱۲۷) سے شروع ہوتا ہے اور صفحہ دو سو بارہ (۲۱۲) پر ختم ہوتا ہے۔ اس شہر کے تعلق سے صرف صحابہ کرامؓ کا بغیر کسی ترتیب کے ذکر کیا ہے۔ جو وہاں تشریف لائے تھے، البتہ تابعین وغیرہ کا ذکر بغدادیوں کے ساتھ کیا ہے۔(۴)

---

(۱) الحافظ الخطيب البغدادي و أثره في علوم الحديث ص ۲۷۸

(۲) تاريخ بغداد، ۲۱۳/۱ — (۳) سير أعلام النبلاء ۲۷۸/۱۸

(٤) تاريخ بغداد ۲۱۳/۱ — (٤) تاريخ بغداد ۲۱۲/۱

اس طرح سے دوسرے شہروں کے افراد کا ذکر بھی بغدادیوں کے ساتھ کر دیا ہے۔ پھر اصل کتاب صفحہ دو سو چودہ (۲۱۴) سے شروع ہوتی ہے یہیں سے پوری کتاب حروف معجم پر مرتب ہے، البتہ محمدین کو ہم نام رسول ﷺ کی بنا پر مقدم کر دیا ہے ان میں سب سے پہلے محمد بن اسحٰق بن یسار مدنی کو کبرسنی، علو اسناد، تقدیم وفات کی وجہ سے مقدم کر دیا ہے، ان کے بعد پوری کتاب حروف معجم پر مرتب ہے۔[1]

بکثرت استعمال ہونے والے اسماء مشترکہ کو آباء اجداد کے نام میں آنے والے حروف کا خیال کر کے مرتب کیا ہے، جن کے نام اور ان کے آباء واجداد کے نام مشترک ہیں ان کو ترتیب زمنی پر مرتب کیا ہے اس طرح سے کتاب کی ترتیب کافی بہتر ہے، کسی بھی نام کی تلاش کیلئے راوی کا نام معلوم ہو تو آسانی سے اس کتاب سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

جرح و تعدیل کی حیثیت:- خطیب بغدادیؒ کی شخصیت ایک صاحب بصیرت اور ناقد کی حیثیت رکھتی ہے اس لئے آپ کی ذکر کردہ جرح و تعدیل، جس کو آپ نے اپنی سند سے ذکر کیا ہے، یا آپ کا اپنا فیصلہ ہے، علماء کے یہاں معتمد اور قابل قبول ہے، آپ کے اقوال سے علماء نے بھرپور استفادہ کیا ہے، امام مزی، امام ذہبی، حافظ ابن حجر وغیرہم نے اپنی کتابوں میں ان اقوال کو بطور دلیل ذکر کیا ہے۔

ذیول:- کتاب کی اہمیت کے پیش نظر علماء نے اس پر ذیول تحریر کی ہیں، چنانچہ ابو سعد سمعانی (متوفی ۵۶۲ھ) نے اس کتاب پر ایک ذیل "ذیل تاریخ بغداد" کے نام سے تحریر کیا ہے، اس ذیل پر ابو عبداللہ دبیثی، واسطی (متوفی ۶۳۷ھ) نے "المذیل علی تاریخ بغداد للخطیب" کے نام سے تحریر فرمائی ہے، ابو عبداللہ محمد بن محمد الکاتب (متوفی ۵۹۷ھ) نے "السبل علی الذیل" کے نام سے ایک ذیل لکھی ہے۔ نیز محمد بن رافع بن نجار (متوفی ۶۴۳ھ) نے تاریخ بغداد پر ایک ذیل تحریر کیا ہے جس کا نام "ذیل تاریخ بغداد" رکھا ہے۔ اس کی تلخیص ابن ایبک دمیاطی نے "المستفاد من ذیل تاریخ بغداد" کے نام سے کی ہے۔

---

(۱) مصدر سابق ۲۱۳/۱

تاریخ بغداد ۱۴ جلدوں میں مطبوع ہے، بعد میں اس کے ساتھ ابن ایبک کی تلخیص ایک جلد میں اور دبیثی کی ذیل بھی طبع ہوئی ہے۔

فہرست کتاب:- اس کتاب کی ایک نہایت ہی عمدہ اور جامع فہرست بھی منظر عام پر آچکی ہے۔ جو ۶۵۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ جس نے اس کتاب سے استفادہ کو آسان تر کر دیا ہے اس میں احادیث و آثار ترجمہ شدہ اعلام اور کنی، مسانید صحابہ، مقامات اور قبائل نیز اشعار کی فہرست حروف معجم پر مرتب کی گئی ہے جو مستفیدین کیلئے ایک گرانقدر ہدیہ ہے۔

۲- تاریخ دمشق

تالیف: ابن عساکر (متوفی ۵۷۱ھ)

تعارف:- دمشق صدیوں پرانا قدیم تاریخی شہر ہے جو اپنی تہذیب و تمدن آب و ہوا سر سبزی و شادابی کی وجہ سے کافی شہرت رکھتا ہے، یہ شہر اسلام سے ماقبل انبیاء و رسل کا مرکز رہا ہے، اسلام کے بعد علماء و محدثین کا گہوارہ تھا، خصوصاً سقوط بغداد کے بعد عالم اسلام کا سب سے بڑا علمی مرکز تھا، بڑے بڑے نامور علماء و محدثین یہاں پیدا ہوئے، یاقوت حموی نے لکھا ہے کہ دمشق کی تعمیر حضرت ابراہیمؑ کی ولادت سے پانچ سال قبل کی ہے۔(۱)

حافظ ابن عساکرؒ (متوفی ۵۷۱ھ) نے مقامی تاریخ کے موضوع پر اپنے علمی خزانہ کو جمع کرنے کیلئے شہر دمشق کا انتخاب کیا جو ان کا اپنا وطن تھا اور اس موضوع پر ایسی جامع کتاب تصنیف کی جس کو دیکھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے، بڑے بڑے نامور علماء اس کو دیکھ کر انگشت بدنداں ہو جاتے ہیں۔

علماء کی نگاہ میں:- علماء نے اس کتاب کی بڑی تعریف کی ہے اور اسکے مقام کو اجاگر کیا ہے۔ چنانچہ امام زکی الدین منذری فرماتے ہیں کہ "میرا خیال ہے انہوں نے اس تاریخ کو جمع کرنے کا عزم اس وقت کیا تھا جب سے ہوش سنبھالا اور اسوقت سے کام بھی شروع کیا ہوگا ورنہ اس طرح کی کتاب تصنیف کرنے کیلئے پوری عمر بھی کم ہے۔(۲)

---

(۱) معجم البلدان ۴۶۳/۲ (۲) کشف الظنون ۲۹۴/۱

علامہ کتانی فرماتے ہیں: ”وقد قالوا إنه يقصر العمر عن أن يجمع الانسان فيه مثل هذا الكتاب“ (۱)

حاجی خلیفہ فرماتے ہیں: ”ذكر تراجم الأعيان والرواة و مروياتهم على نسق تاريخ بغداد ولكنه أعظم منه حجما“ (۲)

علامہ کتانی فرماتے ہیں کہ: اس کتاب میں عجوبہ روزگار باتیں ہیں، جس کو تاریخ بغداد کے طرز پر تحریر کیا ہے، اس میں بڑے بڑے اہل علم، رجال حدیث اور راویان کا تذکرہ ان کی مرویات کے ساتھ کیا ہے۔ (۳)

یہ وہی کتاب ہے جس کو تاریخ دمشق کہا جاتا ہے، یہ کتاب اسی جلدوں پر مشتمل ہے۔ (۴) حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ یہ کتاب آٹھ سو اجزاء پر مشتمل ہے ایک جز بیس ورق کا ہوتا ہے، اس طرح اس کتاب میں سولہ ہزار اوراق ہوتے ہیں۔ (۵)

مشتملات:- اس کتاب میں مؤلف نے ان اشخاص کا تذکرہ کیا ہے جو دمشق میں پیدا ہوئے، یا اس کو وطن بنایا، یا اس علاقے سے ان کا گذر ہوا۔ ان میں انبیاء و رسل، خلفاء و امراء، سلاطین و حکام، علماء و محدثین، قاضیان و فقہاء، ادباء و شعراء و دیگر اہل علم و فن شامل ہیں، قابل ذکر امر یہ ہے کہ رجال و محدثین کے بارے میں ضعیف و ثقہ کی وضاحت کردی ہے، ائمہ کے اقوال جرح و تعدیل سے استشہاد بھی کیا ہے۔ (۶)

اس کتاب کو مؤلف نے تاریخ بغداد کے طریقے پر تصنیف کیا ہے البتہ یہ تاریخ بغداد کے مقابلہ میں کافی وسیع ہے اس میں اخبار و حکایات اور مشہور روایات بکثرت پائی جاتی ہیں۔

مؤلف نے اس کتاب کو ایک تفصیلی مقدمہ سے شروع کیا ہے جس میں تاریخ عالم کی ابتداء، اسلامی تاریخ کی ابتداء، ملک شام اور وہاں کے باشندوں کی فضیلت، اس سلسلہ میں وارد شدہ احادیث و اقوال صحابہ، اسکی مذمت کے سلسلہ میں وارد شدہ اقوال وغیرہ کے بعد اسلام سے پہلے وہاں کے ملوک و سلاطین، رسول پاک

---

(۱) الرسالة المستطرفة ص ۹۹ (۲) كشف الظنون ۲۹٤/۱
(۳) الرسالة المستطرفة ص ۹۹ (٤) كشف الظنون ۲۹٤/۱، و معجم البلدان
(۵) سير اعلام النبلاء ۵۵۸/۲۰ (٦) مقدمة تهذيب تاريخ دمشق ۱۲/۱۰

ﷺ حضرت ابو بکر و عمرؓ کے زمانہ میں وہاں رونما ہونے والے واقعات، غزوات و فتوحات صلح وشرائط کا تذکرہ کیا ہے، بعد ازاں ان فتنوں کا ذکر کیا ہے جو ملک شام میں وقوع پذیر ہوں گے، وہاں کی مسجدیں، انبیاء ورسل و اہل فضل کی قبریں، آب وہوا و دیگر چیزوں کا تذکرہ کیا ہے۔(۱)

ترتیب:- پھر اصل کتاب کی ابتداء ہوئی ہے جس کو حروف معجم پر بڑی دقت کے ساتھ مرتب کیا ہے جس میں مترجم کے نام کے ساتھ ساتھ ان کے آباواجداد کے نام کے حروف کا بھی ترتیب میں خیال کیا ہے، حرف الف میں سب سے پہلے احمد سے موسوم ناموں کا ذکر کیا ہے اس لئے کتاب کی ابتداء احمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب ﷺ سے ہوئی ہے، تجارت کی غرض سے آپ کا ملک شام جانا، وہاں پر مختلف معجزات کا ظہور، اور سیرت پاک کا تذکرہ کرنے کے بعد دیگر احمدیین کا تذکرہ ہے پھر پوری کتاب حروف معجم پر مرتب ہے، ناموں کے ختم ہونے کے بعد کنیت سے مشہور افراد کا تذکرہ ہے، پھر ان لوگوں کا تذکرہ ہے، جو نسبت سے مشہور ہیں اس کے بعد مبہمات کا تذکرہ ہے، اس کے بعد خواتین کو اسی ترتیب پر مرتب کیا ہے حتی کہ مشہور لونڈیوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

مرکز توجه:- یہ کتاب اپنی گوناگوں خصوصیت کی بنا پر علماء کی توجہ کا مرکز بنی رہی مختلف حضرات نے اس کی تہذیب اور اختصار کیا، کچھ حضرات نے اس کی تکمیل و تذییل کی جس کا تفصیلی تذکرہ امام سخاویؒ، اور حاجی خلیفہؒ نے کیا ہے۔ (۲)

بعض اہل علم کے اطلاع کے مطابق یہ کتاب طبع ہو چکی ہے، ابھی تک اس کو دیکھنے کا موقع نہیں مل سکا، البتہ اس کی مختصرات میں شیخ عبدالقادر بدران (متوفی ۱۳۴۶ھ) کی مختصر کے بعض مطبوعہ اجزاء کو دیکھنے کا موقع ملا ہے۔

---

(۱) تهذيب تاريخ دمشق ۲۶۷/۱، و كشف الظنون ۲۹۲/۱

(۲) الاعلان بالتوبيخ ص۱۲۶، كشف الظنون ۲۹٤/۱

۲- تاریخ نیساپور

تالیف: امام ابو عبد اللہ حاکم (متوفی ۴۰۵ھ)

تعارف نیساپور:- بلاد عجم میں نیساپور کو بڑی شہرت واہمیت حاصل تھی، یہ کسی زمانہ میں اہل علم و فضل کا مرکز اور اسلامی تہذیب و ثقافت کا گہوارہ رہ چکا ہے، بغداد کے بعد مسلمانوں کا دوسرا "علمی مرکز" یہی تھا۔ جہاں امام مسلمؒ، امام ابن خزیمہؒ جیسے ائمہ فن پیدا ہوئے۔ لیکن بد قسمتی سے نیساپور ۵۴۷ھ میں تباہی و بربادی کا شکار ہوا پھر فتنہ تاتار میں چنگیز خان نے اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور پورے شہر کو زمین بوس کردیا یہاں تک کہ اس شہر کا نام و نشان مٹ گیا۔[1]

امام حاکمؒ جو اسی شہر کے پروردہ تھے انہوں نے اس کی تاریخ، "تاریخ نیساپور" کے نام سے قلمبند کی ہے جو مقامی تاریخ میں ایک عظیم تالیف سمجھی جاتی ہے، علماء نے اس کو بہت پسند کیا ہے اور اس کی بڑی تعریف کی ہے۔

علماء کی نگاہ میں:- علامہ سبکی فرماتے ہیں کہ: "وهو التاريخ الذى لم ترعينى تاريخاً أجل منه وهو عندى سيد الكتب الموضوعة للبلاد".[2] یہ ایسی تاریخ ہے جس سے عظیم تاریخ میری نگاہوں نے نہیں دیکھی، یہ کتاب میرے نزدیک مقامی تواریخ میں ساری کتابوں کی سردار ہے۔

علامہ کتانی فرماتے ہیں کہ: "وهو التاريخ الذى تخضع لها الجهابذة الحفاظ، ومن نظره عرف تفنن الرجل في العلوم جميعا"[3] وہ ایسی تاریخ ہے جس کے سامنے بڑے بڑے ماہرین فن و حفاظ سر تسلیم خم کرتے ہیں جس نے اس کو دیکھا ہے وہ امام حاکم کی سارے علوم میں مہارت کا قائل ہوگیا، اس کتاب کو پڑھنے کیلئے علماء نے نیساپور کا خصوصی سفر کیا جیسا کہ ابو الفضل فلکی کا بیان ہے۔[4]

امام بیہقی نے اس کو بارہ اجزاء میں اور علامہ کتانی نے چھ جلدوں میں بتایا ہے (یہ اختلاف نسخے کا اختلاف ہو سکتا ہے) اس کی مختصر ایک ضخیم جلد میں ہے۔

---

(۱) معجم البلدان ۳۳۲/۵ — (۲) كشف الظنون ۳۰۸/۱

(۳) الرسالة المستطرفة ص ۹۹ — (۴) تاريخ بغداد ۲۷۴/۵

سبب تالیف:- امام حاکم نے اس کے سب تالیف کی جانب یوں اشارہ فرمایا ہے:

جب میں نے دیکھا کہ خراسان اور ماوراء النہر کے شہروں کی کوئی نہ کوئی تاریخ ہے جس کو وہاں کے کسی مقامی عالم نے تحریر کیا ہے، نیساپور میں علم و علماء کی بڑی کثرت رہی ہے، پھر بھی کسی نے اس کی تاریخ پر قلم نہیں اٹھایا لہٰذا میرے دل میں تاریخ نیساپور تحریر کرنے کا خیال پیدا ہوا۔[1]

ترتیب:- اس کتاب کو امام حاکم نے بزبان فارسی تحریر کیا تھا، کتاب کی طرز تحریر، ترتیب و طریقہ کو تاریخ بغداد پر قیاس کیا جاسکتا ہے۔

فرق یہ ہے کہ تاریخ بغداد چونکہ امام حاکم کے انتقال کے کئی سال بعد تحریر کی گئی ہے اس لئے اس میں افراد کی تعداد زیادہ ہے ویسے بھی بغداد کے اہل علم کی تعداد نیساپور کے مقابلہ میں زیادہ ہے اس لئے کثرت تراجم کی وجہ سے تاریخ بغداد میں اختصار سے کام لیا گیا ہے، جبکہ تاریخ نیساپور میں افراد کم تھے اس لئے امام حاکم نے ان کے حالات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے حتی کہ ترجمہ شدہ راوی کے ترجمہ میں راوی کے استاذ اور استاذ الاستاذ حتی کہ ہم عصروں کا بھی ذکر کیا ہے۔[2]

لیکن افسوس یہ ہے کہ تاریخ کی اتنی عظیم کتاب مفقود ہو چکی ہے، اس لئے کتاب کے علمی مواد کا صحیح اندازہ لگانا آج ممکن نہیں البتہ اس کی مختصر جس کو احمد بن محمد بن حسن بن أحمد خلیفہ نیساپوری نے کیا ہے وہ موجود ہے۔[3] اور مکتبہ ابن سینا طہران سے مطبوع ہے۔

مشتملات:- اس مختصر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام حاکم نے سب سے پہلے خراسان کا ذکر کیا ہے اس لئے کہ نیساپور خراسان کا ایک شہر ہے اور خراسان کے سلسلہ میں جو آیات واحادیث وارد ہیں ان کا تذکرہ ہے، پھر یہاں تشریف لانے یا یہاں سے گذرنے والے صحابہ کرام تابعین و تبع تابعین کا ذکر کیا ہے، اس کے بعد نیساپور کا

---

(۱) سیر أعلام النبلاء ۱۶۷/۱۷ (۲) طبقات الشافعیة ۱۷۳/۱

(۳) اس مختصر کو ڈاکٹر اکرم ضیاء نے فارسی میں اور فواد سزگین نے عربی میں بتایا ہے۔ ملاحظہ ہو بحوث فی تاریخ السنة المشرفة ص ۱۵۲ حاشیہ. و تاریخ التراث العربی ۳۶۹/۱،

تذکرہ شروع ہوتا ہے، اس میں ان علماء و محدثین کا ذکر ہے جو ۳۸۸ھ تک یہاں پیدا ہوئے یا یہاں تشریف لائے۔ پوری کتاب چھ طبقوں پر مشتمل و منقسم ہے اور ہر طبقہ کو حروف معجم پر مرتب کیا گیا ہے۔[۱]

مختصرات:- امام ذہبی نے بھی تاریخ نیساپور کا اختصار "مختصر تاریخ الحاکم" کے نام سے کیا ہے۔[۲] چونکہ امام حاکم نے اس تاریخ میں ۳۸۸ھ تک کے اشخاص کا ذکر کیا تھا اس لئے اس کی تکمیل شیخ ابوالحسن عبدالغافر بن اسماعیل فارسی (متوفی ۵۲۹ھ) نے کیا ہے۔ جس کا نام "السیاق لتاریخ نیساپور"، ہے اس کا قلمی نسخہ مکتبہ صائب انقرہ میں ۲ / ۱۵۴۴ نمبر پر موجود ہے، نیز علامہ ابراہیم بن محمد صرفینی (متوفی ۶۴۱ھ) نے اس کتاب کا اختصار "المنتخب من کتاب السیاق لتاریخ نیساپور" کے نام سے کیا ہے جس کا قلمی نسخہ کوپرلی کے کتب خانہ میں ۱۱۵۲ نمبر پر موجود ہے۔[۳]

☆☆☆

---

(۱) بحوث فی تاریخ السنة ص ۱۵۲-۱۵۳، وانظر تاریخ التراث العربی ۱/ ۳۶۰

(۲) الرسالة المستطرفة ص ۹۹

(۳) تاریخ التراث العربی ۱/۳۶۹، ۳۷۰

کتب خاصہ کی پانچویں قسم

کتب کنی

اہل عرب کے یہاں کنیت کا استعمال بکثرت ہوا کرتا تھا، جس کے مختلف مقاصد ہوا کرتے تھے۔ کسی بڑے شخص کو اس کے نام سے پکارنا سوء ادب تصور کیا جاتا تھا، اس لیے نام کے بجائے احتراماً اس کو کنیت سے پکارا جاتا تھا، کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ ابتدا ہی سے کنیت ہی نام کے طور پر متعین کر دی جاتی، کبھی کبھی کسی چیز کا ذکر صریح قبیح سمجھا جاتا تھا اس لئے کنیت سے اس کی جانب اشارہ کر دیا جاتا تھا۔

کنیت کا استعمال مردوں اور عورتوں دونوں کیلئے ہوتا ہے اور عرب و عجم میں ہر جگہ مستعمل ہے۔

کنیت:- اہل لغت کے یہاں کنیت اس اسم کو کہتے ہیں جو "اب" یا "امّ" سے شروع ہو۔(۱) اسی طرح سے (صحیح قول کے مطابق) اس اسم کو بھی کہتے ہیں جو "ابن" یا "بنت" سے شروع ہو۔(۲)

"اب" اور "ابن" کا استعمال مردوں کیلئے "امّ" اور "بنت" کا استعمال خواتین کیلئے ہوتا ہے جیسے ابوالقاسم، ابن عمر، امّ عبداللہ، بنت عمر، وغیرہ۔

کنیت کی دو بنیادی قسمیں ہوتی ہیں۔ کنی مجردہ اور کنی مقیدہ۔ پھر ان کی مختلف شاخیں اور شکلیں بنتی ہیں۔

کنی مجردہ:- اس کنیت کو کہتے ہیں جو نام اور لقب وغیرہ سے عاری ہو۔ (یعنی ایسی کنیت جس کا نام، لقب وغیرہ موجود نہ ہوں)

کنی مقیدہ:- اس کنیت کو کہتے ہیں جو نام لقب وغیرہ سے مقید ہو۔ (یعنی ایسی کنیت جس کا نام لقب وغیرہ پایا جاتا ہو۔ خواہ معلوم ہو یا معلوم نہ ہو۔)

بہت سے راویان حدیث اپنی کنیت مجردہ یا مقیدہ سے مشہور ہوئے ہیں، ان کی معرفت کیلئے محدثین نے مخصوص کتابیں تیار کی ہیں، انہیں کتابوں کو "کتب الکنی" یا "کتب الاسماء والکنی" کہا جاتا ہے۔ لہٰذا اس طرح کی کتابوں میں صرف ان ہی راویوں کا

(۱) شرح شذور الذھب ص ۱۸۰ (۲) الکنی والأسماء از امام مسلم ۱/۹ مقدمہ محقق

ذکر ہوتا ہے جو صاحب کنیت ہوتے ہیں۔

اصحاب کنی کی شکلیں:- یہ کنیت والے عموماً ایسے ہوتے ہیں جن کا نام موجود و معلوم ہوتا ہے لیکن شہرت کنیت سے ہوتی ہے۔ نام عموماً ذہن میں ہوتا ہی نہیں جیسے ابو بکر الصدیق بن ابی قحافہؓ، باپ اور بیٹے دونوں کنیت سے کافی مشہور ہیں اور اسی سے پہچانے جاتے ہیں جبکہ نام عبداللہ بن عثمان ہے۔ اگر کسی سے یہ کہا جائے کہ عبداللہ بن عثمان کون ہیں؟ تو ممکن ہے نہ سمجھ سکے لیکن اگر یہ کہا جائے کہ ابو بکر بن ابی قحافہ کون ہیں تو فوراً سمجھ جائے گا۔

کبھی اس کے برعکس ہوتا ہے یعنی نام کافی مشہور ہوتا ہے، کنیت مشہور نہیں ہوتی جیسے خادم رسول انس بن مالک جنکی کنیت ابو حمزۃ ہے اگر کسی صاحب فن سے پوچھا جائے کہ ابو حمزہ کون ہیں تو شاید جواب نہ دے سکے، لیکن اگر یہ کہا جائے کہ انس بن مالک کون ہیں تو فوراً جواب دیدے گا۔

بہت سے راوی ایسے ہوتے ہیں جن کی کنیت ہی نام کے قائم مقام ہے ان کا کوئی دوسرا نام نہیں جیسے ابو بلال اشعری، ابو موہبہ مولی رسول اللہ ﷺ۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ راوی کی دو کنیت ہوتی ہے اس میں سے ایک کنیت کے طور پر استعمال کی جاتی ہے، دوسری نام یا لقب کے طور پر استعمال کی جاتی ہے، جیسے ابو بکر بن عبدالرحمٰن جو مدینہ منورہ کے فقہاء سبعہ میں سے ہیں، ان کا نام ابو بکر اور کنیت ابو عبدالرحمٰن ہے، اس طرح سے ابو الحسن علی بن ابی طالبؓ جن کی کنیت ابو الحسن اور لقب ابو تراب ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک راوی کی مختلف کنیتیں ہوتی ہیں، جیسے ابن جریج ان کی کنیت ابو الولید اور ابو خالد بھی ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کنیت مختلف فیہ ہوتی ہے جیسے اسامۃ بن زیدان کی کنیت ابو خارجہ، یا ابو محمد، یا ابو عبداللہ ہے۔[1]

---

(۱) کنیت کی مختلف شکلوں کی معلومات کیلئے ملاحظہ ہو مقدمۃ ابن الصلاح ص ۲۹۷-۳۰۲ فتح المغیث ۲۱۵/٤

ان تمام جزئیات کا جاننا سنت نبوی کے طالب علم اور ایک محدث کیلئے ضروری ہوتا ہے تاکہ کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائے (جیساکہ بعض محدثین کیساتھ ہوچکا ہے) اس لئے کہ راوی کہیں اپنے نام سے مذکور ہوتا ہے اور کہیں کنیت سے، کنیت اور نام کا نہ جاننے والا ان کو دو فرد سمجھ بیٹھتا ہے اور کبھی نام اور کنیت دونوں ساتھ میں مذکور ہوتے ہیں معرفت نہ رکھنے والا شخص دونوں کو دو فرد فرض کرلیتا ہے اور یہ تصور قائم کرلیتا ہے کہ شاید درمیان سے لفظ "عن" ساقط ہوگیا ہے۔ اس طرح سے ایک ہی فرد کو استاذ اور شاگرد دونوں بنادیتا ہے۔

اسطرح کی غلط فہمی امام حاکم جیسے ماہرفن سے بھی سرزد ہوگئی ہے چنانچہ ایک سند جو اسطرح سے تھی، عبدالله بن شداد أبو الوليد عن جابر انھوں نے اس کو عبدالله بن شداد عن أبي الوليد عن جابر سمجھ لیا اور اسی طرح سے ذکر کیا، جبکہ ابو الولید عبد اللہ مذکور کی کنیت ہے جیساکہ امام علی بن مدینی نے وضاحت فرمادی ہے۔

اسی طرح سے عن أبي أسامة حماد بن السائب میں ابو اسامۃ الگ اور حماد بن السائب الگ ہیں لیکن امام نسائی نے ان دونوں کو ایک سمجھ لیا اور عن ابی اسامہ عن حماد بن السائب کے بجائے عن اُبی اسامۃ حماد بن السائب کہہ دیا۔(۱)

کبھی کبھی راوی کا نام معلوم نہیں ہوتا ہے صرف کنیت معلوم ہوتی ہے اس سے دوسری نوعیت کی کتابوں میں ترجمہ کو تلاش کرنے میں بڑی دشواری ہوتی ہے جہاں اس کا ترجمہ نام کے تحت درج ہوتا ہے، چنانچہ امام نحو علامہ ابن ھشام انصاری کو ابو الزناد (جن کا نام عبد اللہ بن ذکوان ہے) کا ترجمہ تلاش کرنے میں سخت دشواری پیش آئی تھی، اور کوشش بسیار کے باوجود بھی وہ ان کا ترجمہ تلاش نہ کرسکے۔(۲)

اس طرح کی پیچیدگیوں کی وضاحت اور پریشانیوں سے بچنے کیلئے علماء امت نے احتیاطی تدبیر کی ہے چنانچہ جن لوگوں نے فن جرح وتعدیل پر مفصل کتابیں تحریر کی ہیں انھوں نے اپنی کتابوں کے آخر میں کنیت کا باب قائم کرکے اس طرح کے راویوں کو یکجا کردیا ہے اور ان کے ناموں کی وضاحت، مختلف فیہ ہونے کی کیفیت، یا

(۱) فتح المغيث ٤/٢١٣

(۲) فتح المغيث ٤/٢١٣

صرف کنیت سے موسوم ہونے کی صراحت کردی ہے،اس سے راویوں کی تلاش میں بڑی آسانی ہو جاتی ہے،اگر راوی کا نام معلوم نہیں ہے کنیت معلوم ہے تو اس طرح کی کتابوں میں "باب الکنی" کی طرف رجوع کرنے سے ان کی کنیت کے تحت نام مل جائے گا، پھر اس کے سہارے نام کی جگہ پر ترجمہ دیکھ سکتے ہیں اور اگر اس کا کوئی نام نہیں، یا کنیت سے زیادہ مشہور ہے تو بہت ممکن ہے کہ ترجمہ یہیں دستیاب ہو جائے۔

کچھ محدثین کرام نے خاص اسی موضوع پر کتابیں تحریر کی ہیں جن کو "کتب الکنی والاسماء" کہا جاتا ہے اس طرح کی کتابیں تحریر کرنے والوں میں امام علی بن مدینی، یحی بن معین، ابو بکر بن أبي شیبۃ، امام بخاری، امام مسلم، امام نسائی، شباب عصفری، ابن جارود، ابو القاسم بن مندہ، ابو عروبۃ حرانی، ابو موسی صریفینی، ابو احمد حاکم، امام ذہبیؒ وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔[1]

ان کتابوں میں سے کچھ مطول اور کچھ مختصر ہیں، بعض تو اتنی مختصر ہیں کہ اگر ان کی ساری کنیت کو اکٹھا کر دیا جائے تو بھی بعض کتابوں کے صرف آخر (باب الکنی) میں جو تعداد ہے ان کے برابر بھی نہیں ہو سکتیں، بہر صورت ان کتابوں میں جو میرے علم میں مطبوع یا موجود ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱- الاسامی والکنی

تالیف: امام احمد بن حنبل (۲۴۱ھ)

یہ کتاب عالم ربانی امام احمد بن حنبل شیبانی (متوفی ۲۴۱ھ) کی تالیف ہے جسکو آپ کے بیٹے صالح بن احمد بن حنبل نے روایت کیا ہے، کتاب کسی خاص ترتیب پر مرتب نہیں ہے، البتہ ابتداء کتاب میں ترجمہ نمبر ایک سے ترجمہ نمبر ۱۴۱ تک صحابہ کرامؓ کی کنیت کا ذکر ہے اسکے بعد آخری کتاب ترجمہ نمبر ۴۳۸ تک صحابہ وغیر صحابہ کو خلط ملط ذکر کیا ہے، منہج میں بھی یکسانیت نہیں کہیں کنیت پہلے ذکر ہے تو کہیں نام پہلے مذکور ہے۔ جو راوی امام صاحب کے دور کے نہیں بلکہ اس سے قبل کے ہیں، ان کے نام یا کنیت کو کس محدث نے ذکر کیا ہے، اسکی جانب منسوب قول کو اپنی سند سے ذکر کیا ہے۔

---

(۱) فتح المغیث ۲۱۳/٤، ۲۱٤

کتاب کی تحقیق عبداللہ یوسف الجدیع نے کی ہے جو دار اقصیٰ کویت سے (۱۴۰۶ھ) میں طبع ہو چکی ہے۔

۲ - الکنی للبخاری

متوفی (۲۵۶ھ)

یہ کتاب امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی تالیف ہے، جس کو امام بخاریؒ نے دو قسموں پر منقسم کیا ہے، پہلی قسم کنی مجردہ کی ہے، کتاب کا بیشتر حصہ اسی سے متعلق ہے، اس قسم کو امام نے حروف معجم پر صرف پہلے حرف کا اعتبار کر کے مرتب کیا ہے، اس طرح سے حرف الف سے شروع ہونے والی کنیتیں ابتداء میں اور حرف "ی" سے شروع ہونے والی آخر میں ہیں، جو کنیتیں مشترک ہیں ان کو باب کے تحت ذکر کیا ہے جیسے "باب ابوامیۃ" اور جو منفرد ہیں ان کو اس حرف کے آخر میں ذکر کیا ہے، جس سے وہ شروع ہوتی ہیں، کہیں کہیں اس طرح کی کنیتوں کیلئے "باب الواحد" کا عنوان قائم کیا ہے۔ (۱) لیکن عموماً بغیر عنوان کے ہیں۔

دوسری قسم کنی مقیدہ کی ہے جسکا عنوان اسطرح سے ہے: و فی الأسماء من کان الغالب علی اسمه کنیته و له اسم، اس قسم کو بغیر کسی ترتیب کے ذکر کیا ہے۔

قسم اول میں پہلی کنیت ابوامیۃ کی ہے۔ آخری کنیت ابو یسار کی ہے (۲)

دوسری قسم میں پہلی کنیت ابو شریح اور آخری کنیت ابو مھری کی ہے۔ (۳)

یہ کتاب فی الحال "تاریخ کبیر" کے آخر میں مطبوع ہے۔ کچھ حضرات نے اسکو تاریخ کبیر کا جزء تصور کیا ہے، اور کچھ نے ایک منفرد کتاب شمار کیا ہے جو بطور تتمہ ہے۔ (۴)

۳-الکنی و الاسماء

تالیف: امام مسلم (متوفی ۲۶۱ھ)

یہ کتاب امام مسلم بن حجاج قشیری نیساپوری صاحب صحیح مسلم (متوفی

---

(۱) دیکھئے الکنی ص ۸۰، ۸۳

(۲) دیکھئے الکنی ص ۲ ترجمہ نمبر ۱، ودیکھئے ص ۸۲ ترجمہ نمبر ۸۰۳

(۳) دیکھئے الکنی ص ۸۳ ترجمہ نمبر ۸۰٤، ودیکھئے الکنی ص ۹۲ ترجمہ نمبر ۹۹۳

(٤) دیکھئے کتاب الکنی ص ۹٤

۲۶۱ھ) کی تالیف ہے، جو اپنے فن کی ابتدائی کتابوں میں ایک اہم کتاب ہے، بنیادی طور سے اس کتاب کی تالیف میں امام بخاریؒ کی کتاب "التاریخ الکبیر" سے استفادہ کیا گیا ہے، چونکہ کتاب سے ماخوذ معلومات کی ترتیب اور قالب بدل گیا ہے، نیز اس میں مختلف اضافے بھی کئے گئے ہیں اس لئے اس کتاب کی نسبت اپنی طرف کرنے میں امام مسلم حق بجانب ہیں۔ لہٰذا امام ابو احمدؒ حاکم نے جو تبصرہ کیا ہے کہ "ومن تأمل كتاب مسلم الكنى علم أنه منقول من كتاب محمد" [1] غیر مؤثر ہے۔

اس لئے کہ اس کتاب سے مراد جس کی جانب امام ابو احمد نے اشارہ کیا ہے اگر "کتاب الکنیٰ" ہے تو ان کی بات اس لئے بے بنیاد ہے کیونکہ دونوں کتابوں میں کم وکیف میں کوئی نسبت نہیں، امام بخاری کی کتاب "الکنیٰ" میں ایک ہزار کنیتیں ہیں جبکہ امام مسلم کی کتاب "الکنیٰ والاسماء" میں تقریباً چار ہزار کنیتیں ہیں دونوں کی ترتیب و تنظیم میں بھی بہت فرق ہے۔ امام مسلم کی کتاب میں خواتین کی کنیت کا ذکر بالکل نہیں ہے جبکہ امام بخاری کی کتاب میں ان کی کنیت موجود ہے۔ شیخ محمد صالح عبد العزیز مراد نے "المقتنى في سرد الكنى" کے مقدمہ میں اس نقطے کی وضاحت اور امام ابو احمد حاکم کی تردید کی۔ [2]

اور اگر مشار الیہ کتاب سے مراد "التاریخ الکبیر" ہے تو بھی امام ابو احمد کا تبصرہ بے جا ہے، محقق کتاب شیخ معلمی یمنی فرماتے ہیں کہ امام حاکم نے جو تبصرہ کیا ہے وہ درست نہیں، اسلئے کہ امام مسلم کی "الکنیٰ" اور امام بخاری کی "التاریخ" کے موازنہ سے پتہ چلتا ہے کہ امام مسلم نے اس کو حرف بحرف نہیں نقل کیا ہے جیسا کہ ان کا دعویٰ ہے [3]

ڈاکٹر عبد الرحیم قشقری محقق کتاب "الکنیٰ والاسماء لمسلم" نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں اس نقطے کی جانب اشارہ کیا ہے اور امام ابو احمد کی تردید کی ہے اور فرمایا ہے کہ دونوں کتاب کی نوعیت میں کافی فرق ہے۔ جیسے کہ "جرح و تعدیل" اور "تاریخ کبیر" میں فرق ہے۔ [4]

امام مسلم کی اس کتاب میں ایسے افراد کا تذکرہ زیادہ ہے جو اپنی کنیت سے مشہور ہیں اور ان کا نام بھی موجود ہے امام بخاری کی کتاب الکنیٰ اس کے برعکس ہے، امام مسلم

---

(۱) تهذيب التهذيب ٣٥٨/٥ (۲) المقتنى في سرد الكنى ٢٣-٢٥ مقدمه محقق
(۳) كنى البخاري ص ٩٦-٩٧ (٤) الكنى و الأسماء ازامام مسلم ٢٦/١-٢٧

کی کتاب میں ایک چوتھائی تراجم ایسے ہیں جن کا تعلق کنی مجردہ سے ہے۔

بنیادی طور سے یہ کتاب حروف معجم پر مرتب ہے، لیکن صرف حرف اول کا خیال کیا گیا ہے لہٰذا ہر حرف سے شروع ہونے والی کنیت اکٹھا مذکور ہے البتہ اس میں قدرے تقدیم و تاخیر ہے، ہر کنیت کو باب سے شروع کیا ہے جیسے "باب ابو اسحاق"، "باب ابو اسماعیل" وغیرہ، صحابہ کو ہر کنیت میں مقدم کر دیا ہے۔ ہر حرف کے آخر میں ان متفرق کنیتوں کا ذکر کیا ہے جس کا کوئی ثانی نہیں اس کیلئے "باب کنی متفرقہ" یا "باب کنی شتی" کا عنوان بھی قائم کیا ہے، کہیں کہیں ایک ایک شخص کا ذکر مختلف کنیت ہونے کی بناء پر مکرر سہ کرر ہو گیا ہے۔

تراجم عام طور سے سطر دو سطر کے ہیں جن میں نام و نسب کیساتھ کہیں کہیں استاذ اور شاگرد کا بھی ذکر کیا ہے، جرح و تعدیل کے کلمات کا استعمال بھی شاذ و نادر ہی ہے، کتاب کی ابتداء ابو اسحاق سے اور خاتمہ ابو یریم پر کیا ہے[1] اس میں کل (۲۸۰۴) تراجم ہیں۔

کتاب سے استفادہ حروف معجم پر مرتب ہونے کی بناء پر قدرے آسان ہے۔ مزید سہولت کیلئے دوسری جلد کے آخر میں محقق نے ایک فہرست تیار کر دی ہے جو اگرچہ کتاب کی ترتیب پر ہے لیکن پھر بھی مزید سہولت بہم پہنچاتی ہے۔

اس کتاب کی تحقیق استاذ محترم ڈاکٹر عبدالرحیم قشقری نے کی ہے جو دو جلدوں میں مجلس علمی جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے ۱۴۰۴ھ میں طبع ہو چکی ہے۔ اس کی تہذیب امام ابوالولید ھشام بن احمد وقشی متوفی (۴۸۹ھ) نے کی ہے، جس کا نام "عکس الرتبة و قلب المعنى فى الأسماء والكنى" ہے۔[2]

٤- الكنى

تالیف: امام نسائی (متوفی ۳۰۳ھ)

یہ کتاب امام نسائیؒ صاحب سنن کی تالیف ہے، امام ذہبیؒ اس کتاب کا تعارف

---

(۱) دیکھئے ۳۳/۱ ترجمہ نمبر ۱؛ ۹۳۳/۲ ترجمہ نمبر ۲۸۰٤

(۲) الكنى والأسماء ۲٥/۱ مقدمہ محقق

کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ بہت سے حضرات نے کتاب الکنی تحریر کی ہے لیکن امام نسائیؒ کی کتاب سب سے عظیم اور مفصل کتاب ہے[1]

امام نسائی کی اس کتاب کے وجود کا فی الحال پتہ نہیں چل سکا ہے لیکن چونکہ اس کی ترتیب غیر معروف طریقے پر ہے اسلئے اس کا ذکر یہاں پر مناسب معلوم ہوا، اس کی ترتیب اس طرح ہے، الف، ل، ب، ت، ث، ی، ن، س، ش، ر، ز، د، ذ، ک، ط، ظ، ص، ض، ف، ق، و، ہ، م، ع، غ، ج، ج، ح، خ۔[2]

۵ - الکنی و الاسماء

تالیف: امام دولابی (متوفی ۳۱۰ھ)

یہ کتاب امام ابو بشر محمد بن احمد دولابیؒ کی ہے جو اپنے فن کی کافی معروف کتاب ہے اس میں ان کنیتوں کا ذکر ہے جن کا نام معلوم ہے، اس میں کنیت ذکر کرنے کا ایک جداگانہ طرز اختیار کیا گیا ہے، سب سے پہلے مجمل طور سے ہر حرف سے شروع ہونے والی کنیتوں کا یکجا ذکر کیا ہے پھر تفصیل کی ہے، اس تفصیل میں اس روایت اور سند کا ذکر کیا ہے جس میں یہ کنیت مستعمل ہے۔

کتاب بنیادی طور سے دو قسموں پر مرتب ہے قسم صحابہؓ اور قسم تابعینؒ ہر قسم کو حروف معجم پر حرف اول کے اعتبار سے مرتب کیا ہے سب سے پہلے رسول پاک ﷺ کی کنیت ابو القاسم کا ذکر خیر ہے پھر دوسروں کیلئے اس کے استعمال کا حکم اور اس سلسلہ میں وارد شدہ متضاد حدیثوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد خلیفۂ رسول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور پھر دیگر عشرہ مبشرہ رضی اللہ عنہم کا ذکر کیا ہے اس کے بعد اصل کتاب حروف معجم پر مرتب کی گئی ہے۔

صحابۂ کرامؓ کا ذکر مطبوعہ نسخہ میں صفحہ ۹۵ تک ہے اس کے بعد تابعین کا ذکر آخری کتاب تک ہے، تابعین میں کنیت ذکر کرنے کی نوعیت بدل گئی ہے یہاں پر عنوان اس طرح قائم کیا گیا ہے "وہ لوگ جن کی کنیت ابو ابراہیم ہے" پھر اس کے تحت ان اسماء کی فہرست ہوتی ہے جن کی یہ کنیت ہے۔ پھر دوسرا عنوان اس طرح قائم کیا

---

(۱) المقتنی فی سرد الکنی ص ۴۷ (۲) فتح المغیث ۴/۳۱۴

"وہ لوگ جن کی کنیت ابو اسماعیل ہے۔" اس کے تحت ان تمام تابعین کا نام مذکورہ ہے جنکی کنیت ابو اسماعیل ہے، وعلی هذا القياس

ان حضرات کی کنیت جن اماموں سے منقول ہے اس کی نسبت ان کی طرف بذریعہ سند کی گئی ہے، مشترک کنیت ختم ہونے کے بعد اس حرف میں باقی ماندہ منفرد کنیتوں کو "باب المفاريد" کا عنوان قائم کر کے ذکر کیا گیا ہے۔ یہ کتاب بڑی سائز میں حیدر آباد سے ایک جلد میں مطبوع ہے لیکن نئے ڈھنگ سے اس کی طباعت کی ضرورت ہے۔

٦-أسماء من يعرف بالكنى

٧-وكنى من يعرف بالأسماء

یہ دونوں کتابیں حافظ ابن حبان صاحب "الثقات" (متوفی ۳۵۴ھ) کی تالیف ہیں، ان کا قلمی نسخہ مکتبہ ظاہریہ دمشق میں موجود ہے۔[1]

٨- من وافقت كنيته كنية زوجته من الصحابة

تالیف: ابن حیویہ (متوفی ۳۶۶ھ)

یہ کتاب ابو الحسن محمد بن عبد اللہ بن زکریا بن حیویہ (متوفی ۳۶۶ھ) کی تالیف ہے جو صحابہؓ کی کنیت سے متعلق ہے یہ ایک مختصر رسالہ ہے جو ۱۹ اورق میں ہے دمشق سے شائع ہونے والے مجلّہ "مجمع الفقہ العربیہ" کی جلد نمبر ۴۷ میں ۱۹۷۲ء میں نشر کیا جا چکا ہے، اس کو محمد حسن آل یاسین نے نشر کیا ہے، اس میں صحابیؓ کی کنیت اور ان کا نام ذکر کر کے اپنی سند سے ان کی حدیث ذکر کی ہے، پھر اسی طرح سے ان کی اہلیہ کی کنیت نام اور کسی حدیث کا ذکر کیا ہے۔[2]

٩-أسماء من يعرف بكنيته من أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم

١٠-الكنى لمن لا يعرف له اسم من أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم

یہ دونوں رسالے حافظ ابو الفتح محمد بن حسین ازدی (متوفی ۳۷۴ھ) کی

(۱) دیکھئے بحوث فی تاریخ السنة ص ۱۳۳ ، فهرسة دار الكتب الظاهرية ص ۱۸۰

(۲) بحوث فی تاريخ السنة ص ۱۳٤

تالیف ہیں جو بہت ہی مختصر ہیں پہلے رسالے میں ان صحابہ و صحابیاتؓ کی کنیت کا ذکر ہے جن کا نام موجود ہے، ان کی جملہ تعداد اس کتاب میں دو سو ہے، دوسرے رسالے میں صرف ان صحابہؓ کا ذکر کیا ہے جو کنیت سے مشہور ہیں لیکن نام معلوم نہیں، ان کا تعارف ان سے روایت کرنے والوں کا ذکر کر کے کیا ہے اور عموماً ان کی حدیثوں میں کسی ایک حدیث کی جانب بغیر سند کے اشارہ کیا ہے یا حدیث ذکر کر دیا ہے، اس میں جملہ (۱۷۰) تراجم ہیں، اس رسالہ میں صحابیات کا ذکر نہیں ہے۔ دونوں کتابیں حروف معجم پر مرتب ہیں لیکن صرف پہلے حرف کا اعتبار کیا ہے، ہر حرف کو باب سے شروع کیا ہے، یہ دونوں کتابیں راقم کی تحقیق سے مطبوع ہیں جس کو الدار السلفیہ بمبئی نے نشر و طبع کیا ہے۔

۱۱-الاسامی والکنی

تالیف: ابواحمد حاکم الکبیر (متوفی ۳۷۸ھ)

تعارف:- محدث خراسان امام ابواحمد حاکم کبیر محمد بن محمد بن احمد (متوفی ۳۷۸ھ) کی ایک کتاب "الاسامی والکنی" ہے، جو اس فن کی انتہائی اہم، معروف اور وسیع تر تالیف ہے، اس میں جو معلومات مذکور ہیں وہ مکمل سوانح حیات کی حیثیت رکھتی ہیں اس لئے اس میں راوی کا نام و نسب، اساتذہ و تلامذہ اور کہیں کہیں ان کے واسطے سے مروی روایت، نیز جرح و تعدیل کے بارے میں اہم معلومات فراہم کی ہے، ہر ترجمہ میں سب سے پہلے صاحب ترجمہ کی کنیت کا ذکر کرتے ہیں پھر بقیہ معلومات پیش کرتے ہیں ڈاکٹر اکرم ضیاء عمریؒ فرماتے ہیں کہ: "فیہ معلومات قیمة فی الجرح والتعدیل و سرد الآثار" [1]

علماء کی نگاہ میں:- امام ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ اس فن میں بہت سے لوگوں کی تالیفات ہیں جن میں امام نسائی کی کتاب سب سے عظیم اور مبسوط کتاب ہے، ان کے بعد امام ابواحمد حاکم آئے جنھوں نے بہت اچھی کتاب تحریر کی، اور اہم معلومات کا اضافہ کیا جو دوسروں کے یہاں نہیں ہے [2]

---

(۱) بحوث فی تاریخ السنة ۱۳۴

(۲) المقتنی فی سرد الکنی ۱/۴۸ نیز دیکھئے الرسالة المستطرفة ص ۹۱

اس کتاب میں دونوں قسم کی کنیت: کنیتِ مجردہ (جن کا نام نہیں) اور کنیت مقیدہ (جن کا نام ہے) کاذکر ہے۔

ترتیب:- کتاب کی ترتیب کے بارے میں علامہ کتانی فرماتے ہیں کہ : "ولم یرتبه علی المعجم فرتبه الذهبی"[1] یعنی انھوں نے اس کو حروف معجم پر مرتب نہیں کیا ہے اس لئے امام ذہبی نے اس کو مرتب کیا ہے، لیکن حاجی خلیفہ فرماتے ہیں کہ: "إنه من أحسنها ترتيبا" [2] (لیکن انھوں نے نام ابو احمد حاکم کی بجائے امام ابو عبداللہ حاکم کہا ہے) کہ یہ کتاب اپنے فن میں بڑی اچھی ترتیب سے مرتب ہے ۔ڈاکٹر اکرم ضیاء فرماتے ہیں کہ اس کی ترتیب کنی مسلم سے ملتی جلتی ہے جو حروف معجم پر مرتب ہے۔[3]

معلوم ہوا کہ یہ کتاب بھی حروف معجم پر مرتب ہے، جو فی نفسہ متقدمین کے یہاں اچھی ترتیب سمجھی جاتی تھی لیکن چونکہ اس ترتیب میں صرف پہلے حرف کا خیال کیا گیا ہے اسلئے جن حضرات نے یہ کہا ہے کہ یہ غیر مرتب ہے انھوں نے ترتیب دقیق مراد لی ہے اور جنھوں نے مرتب کہا ہے انھوں نے حروف معجم پر اس کی موجودہ ترتیب مراد لی ہے۔

کتاب کے جو اجزاء پائے جاتے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ کتاب حروف پر مرتب ہے لیکن صرف پہلے حرف کا خیال کیا گیا ہے (یعنی جس طرح سے امام مسلم کے کتاب کی ترتیب ہے) مثلاً حروف ب کے چند تراجم اس طرح ہے ابو بکر، ابو بشر ،ابو بحر، ابو بختری، ابو بردہ، ابو بکیر اس میں اگر ترتیب کا خیال کیا جائے تو ابو بحر کو مقدم ہونا چاہئے پھر ابوالبختری، ابو بردہ، ابو بشر کو ہونا چاہئے۔

اگر کسی صحابی کی کنیت ہے تو "له صحبة" یا "صحابی" کہہ کر وضاحت کردی ہے۔[4]

وجود:- اس کتاب کا کچھ حصہ مکتبہ جامعہ ازہر میں (۳۶۱) ورق میں اور ایک ٹکڑا

---

(۱) الرسالة المستطرفة ص ۹۱ (۲) کشف الظنون ۱/ ۸۷

(۳) بحوث فی تاریخ السنة ص ۱۳٤ (٤) المقتنی فی سرد الکنی ۱/ ۲۹ مقدمہ محقق

(۴۲)ورق میں پایا جاتا ہے۔[1]

اس کتاب کی ایک تلخیص حافظ عبد الغنی مقدسی (متوفی ۶۰۰ھ) نے "تلخیص الکنی" کے نام سے کی ہے، جس کا کچھ حصہ مکتبہ ظاہریہ میں ۸۹ نمبر پر موجود ہے۔[2]

۱۲-الکنی

تالیف: ابن مندہ (متوفی ۳۹۶ھ)

یہ کتاب حافظ ابو عبد اللہ محمد بن اسحاق بن محمد بن یحیٰ بن مندہ اصبہانی (متوفی ۳۹۶ھ) کی تالیف ہے اور اسی نام سے مشہور ہے

بعض مورخین نے اس کا نام "فتح الباب في الكنى و الألقاب" بتایا ہے۔

اس کتاب کی تحقیق گرامی قدر ڈاکٹر عبد العزیز بن شیخ عبید اللہ رحمانی حفظہ اللہ نے کی ہے انھوں نے اس نام کو دخیل قرار دیا ہے، اسلئے کہ اس زمانہ میں کتابوں کا نام مقفی و مسجع عبارت میں تحریر نہیں کیا جاتا تھا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ کتاب کے نام سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب القاب میں بھی ہے جبکہ اس میں القاب شاذ و نادر ضمناً پائے جاتے ہیں، نیز کتاب کے مختلف مقامات میں اس کا نام الکنی لابن مندہ ہی مذکور ہے۔[3]

اہمیت اور خصوصیات:- کتب الکنی میں اس کتاب کو اپنی جامعیت و افادیت کی بناء پر بڑی شہرت حاصل ہے مؤلف نے کتاب کو ایک مختصر مقدمہ سے شروع کیا ہے جس میں کتاب کے سبب تالیف، ابو القاسم کنیت رکھنے کی ممانعت اور اس کی اجازت سے متعلق احادیث اور اقوال و آثار کا ذکر اور پھر اصحاب کنی کا ذکر ہے۔

ترتیب :- بنیادی طور سے یہ کتاب حروف معجم پر مرتب ہے لیکن متقدمین کی عادت کے مطابق صرف پہلے حرف کا خیال کر کے ہر حرف کے تراجم کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے داخلی ترتیب کا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ البتہ وہ افراد جن کی کنیت ابو القاسم ہے ان کو مقدم کر کے حرف الف سے پہلے ذکر کیا ہے پھر دوبارہ اس کے صحیح مقام یعنی

---

(۱) بحوث في تاريخ السنة ص ۱۳۴، فهرس الكتب الموجودة في المكتبة الأزهرية ۱/ ۲۶۵

(۲) المقتنى في سرد الكنى ۱/ ۳۰ مقدمه محقق (۳) الكنى لابن منده مقدمه محقق ص ۳۷

حرف فاء کے بعد بھی ذکر کیا ہے۔

وہ کنیتیں جو مشترک ہیں ان کو باب کے تحت یکجا کر دیا ہے جیسے باب "ابو ابراہیم"، "باب ابو اسماعیل" ہر حرف کے آخر میں مشترکہ کنی کے ختم ہونے کے بعد ان کنی کا ذکر کیا گیا ہے جو منفرد ہیں ان کو "باب الافراد" کے عنوان کے تحت ذکر کیا ہے، ہر باب میں صحابہ کرامؓ کی کنیت کو مقدم کر دیا ہے اور صحابی ہونے کی وضاحت بھی کر دی ہے صحابہؓ کے بعد تابعینؒ اور پھر اس کے بعد تبع تابعینؒ کو ذکر کیا ہے لہٰذا اس کتاب سے استفادہ کافی آسان ہے۔

اگر صاحب ترجمہ کی کنیت مختلف ہے تو سب سے پہلے مشہور کنیت کو ذکر کیا ہے اسکے بعد دیگر کی جانب اشارہ کر دیا ہے اگر ایک کنیت کے مختلف افراد ہیں لیکن نام میں اشتراک پایا جاتا ہے تو ان کو اکٹھا کر دیا ہے مثلاً وہ افراد جنکی کنیت ابو بکر ہے اور نام محمد ہے، یا وہ افراد جن کی کنیت ابو بکر ہے اور نام عبد اللہ ہے، وعلی ہذا القیاس، اسی طرح سے وہ افراد جو کنیت میں مشترک ہیں لیکن انکا نام معلوم نہیں ان کو یکجا کر دیا ہے نیز یہ کنیت ان کو کس سے معلوم ہوئی ہے، یا کس نے ان کی کنیت کا ذکر کیا گیا ہے بذریعہ سند اس کی نسبت ان کی طرف کر دی ہے، کبھی کبھی صاحب کنیت کی حدیث یا اثر کا بھی تذکرہ کیا ہے رجال حدیث کے علاوہ دیگر افراد مثلاً امراء خلفاء نیز اپنے دور کے مشائخ و علماء کی کنیت کا بھی ذکر کیا ہے۔

صحابہؓ کرام کے تراجم میں عام طور سے اسلام میں داخلہ، غزوات و مشاہدات میں شرکت، زندگی میں کسی خاص واقعہ سے وابستگی نیز تاریخ وفات وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ صحابہؓ کے علاوہ دیگر تراجم میں تلامذہ اور شیوخ کا ذکر اہتمام سے کیا ہے تاریخ وفات کی طرف بہت کم توجہ دی ہے۔

صحابہؓ کرام کے علاوہ دیگر راویوں پر بہ حیثیت جرح و تعدیل کلام بھی کیا ہے جس کیلئے علماء جرح و تعدیل کے اقوال سے استشہاد بھی کیا ہے، نیز اپنی رائے کا بھی اظہار فرمایا ہے، اس طرح سے یہ کتاب کافی مفید ہے، اختلاف کنی یا اختلاف نام کی وجہ سے بعض تراجم مکرر مذکور ہو گئے ہیں عموماً تراجم متوسط ہیں بعض طویل اور بعض مختصر بھی ہیں۔ (۱)

---

(۱) تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو الکنیٰ ابن مندہ مقدمہ محقق ص ٤٢، ٤٨

۱۲-الاستغناء فی معرفۃ الکنی

تالیف:ابن عبدالبر قرطبی(متوفی ۴۶۳ھ)

یہ کتاب حافظ مغرب علامہ ابو عمر یوسف بن عبداللہ بن محمد بن عبدالبر قرطبی اندلسی (متوفی ۴۶۳ھ) کی تالیف ہے جو الکنی لابن عبدالبر کے نام سے مشہور ہے، اس کو"الاستغناء فی معرفة المشهورين من حملة العلم بالكنى "اور "الاستغناء فيمن اشتهر من حملة العلم بالكنى " بھی کہا جاتا ہے۔

اقسام کتاب :- حافظ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے"الاسماءوالکنی" کے موضوع پرایک جامع اور منظّم کتاب تحریر کی ہے جس کو تین قسموں پر تقسیم کیا ہے۔

مؤلف کتاب نے معرفت صحابہؓ پرایک کتاب"الا ستيعاب فی معرفة الأصحاب" کے نام سے تالیف کی ہے جسکے آخر میں کنیت سے مشہور صحابہؓ کا تذکرہ کیا ہے۔

الاستغنا کی پہلی قسم اسی کتاب الاستیعاب کے قسم الکنی کی مختصر ہے،اس قسم میں صرف صحابہ کرامؓ کی کنیت کوذکر کیا ہے۔

دوسری قسم میں صحابہ کے علاوہ دیگر رجال حدیث میں سے ان لوگوں کی کنیت اس میں مذکور ہے جو صاحب نام بھی ہیں۔

تیسری قسم میں ان روایان کی کنیت ہے جنکا نام یاتومعلوم نہیں یاسرے سے نام ہے ہی نہیں،انہیں تین قسموں کے مجموعہ کوالاستغناء فی معرفةالکنی کہاجاتا ہے۔

مؤلف نے ان قسموں کو الگ الگ خطبہ سے شروع کیا ہے اور موضوع کی جانب بھی اشارہ کردیا ہے،اس لئے اس کو تین کتاب تصور کیا گیا ہے جیسا کہ بعض حضرات نے کہا ہے۔

مؤلف نے پہلی قسم کی جانب"من عرف من الصحابة بكنيته" کہہ کر اشارہ فرمایا ہے۔

دوسری قسم کیلئے اس طرح عنوان قائم کیا:"أسماء المعروفين بالكنى من حملة العلم ممن اشهر بكنيته ولم يذ كرفى أكثر أسانيد الحديث

باسمه من التابعين ومن بعدهم في الخالفين "[۱]

تیسری قسم کا عنوان یہ ہے: "فیمن لم یوقف له علی اسم ولا عرف بغیر کنیة من التابعین ومن بعدهم في الخالفین "[۲]

بعض حضرات نے "الاستغناء" کو ان کتابوں سے الگ ایک چوتھی کتاب بتائی ہے، جس کو محقق کتاب نے دلائل سے غلط ثابت کیا ہے۔

ان تینوں قسموں میں سے ہر قسم کو مؤلف نے حروف معجم پر مرتب کیا ہے لیکن حروف کی ترتیب مشرقی ترتیب نہیں بلکہ مغربی ترتیب ہے لہٰذا اس کا خیال رکھنا ضروری ہے، مغربی حروف کی ترتیب اس طرح ہے۔

ا،ب، ت، ث، ج، ح، خ، د، ذ، ر، ز، ط، ظ، ک، ل، م، ن، ص، ض، ع، غ، ف، ق، س، ش، ھ، و، لا، ی۔ اس ترتیب میں صرف حرف اول کا خیال کیا گیا ہے، ہر حرف میں مشترک اصحاب کنی کو باب کے تحت ذکر کیا گیا ہے جیسے "باب ابی ادریس"، "باب ابی ابراہیم" وغیرہ پھر ہر حرف کے آخر میں "اسماء مفردہ" یا "کنی شتی" کے عنوان کے تحت اس حرف کے باقی ماندہ منفرد کنی کا ذکر کیا ہے۔

نوعیت تراجم:- پہلی قسم میں صحابیؓ کی کنیت نام و نسب کا ذکر ہے، اگر ان سے کوئی حدیث مروی ہے تو بطور نمونہ ایک دو حدیث کو بذریعہ سند ذکر کیا ہے نیز صحابیؓ کے اسلام لانے، غزوات میں شرکت، زندگی کے خاص واقعات، وفات وغیرہ کو بھی ذکر کیا ہے۔

دوسری قسم میں صاحب کنیت کا نام اگر موجود ہے تو نام و نسب کے ساتھ بعض شیوخ و تلامذہ، زندگی کا کوئی خاص واقعہ رہا ہو تو اس ذکر کیا ہے۔ان افراد پر بحیثیت جرح و تعدیل خصوصی توجہ دی ہے اور ائمہ جرح و تعدیل کے کلام سے استشہاد کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کیا ہے، نیز مختلف اقوال کا خلاصہ پیش کردیا ہے۔اس وجہ سے عموماً تراجم مطول ہیں، بہت سے تراجم ایسے ہیں جو سطر دو سطر پر مشتمل ہیں، کبھی کبھی صاحب کنیت کے واسطہ سے مروی حدیث یا اثر کی جانب اشارہ کیا ہے۔

تیسری قسم میں بھی قریب قریب یہی طریقہ اپنایا گیا ہے البتہ اس میں تراجم

---

(۱) الاستغناء ۱/ ۴۷ مقدمہ محقق (۲) الاستغناء ۱/ ۵۱

دوسری قسم کے مقابلہ میں مختصر ہیں خصوصاً اساتذہ و تلامذہ میں کافی اختصار ہے، غالباً اسکی وجہ یہ ہے کہ عموماً یہ افراد مجہول ہیں جنکے بارے میں وافر معلومات نہیں مل سکی۔
اس کتاب کی تالیف میں سابقہ مؤلفین کی کتابوں سے مدد لی گئی ہے مثلاً امام بخاریؒ، مسلم، ابن معین، ابن حنبل، ابن ابی حاتم، ابواحمد حاکم وغیرہ رحمہم اللہ۔ (۱)

۱۴- المقتنی فی سرد الکنی

تالیف: امام ذہبی (متوفی ۷۴۸ھ)

تعارف :- امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے امام حاکم کبیر کی کتاب کو کچھ اضافہ کے ساتھ مہذب، مختصر، مرتب کیا ہے جس کا نام "المقتنی فی سرد الکنی" رکھا ہے۔

اختصار:- امام ذہبی نے اس کتاب میں مذکورہ کتاب کی جملہ اسانید و احادیث کو حذف کر دیا ہے، ترجمہ میں صرف ایک استاد، شاگرد کا ذکر ہے کہیں کہیں صرف استاد کے ذکر پر اکتفاء کیا ہے، البتہ صحابیؓ کے ساتھ ساتھ تابعی کی بھی وضاحت کر دی ہے جو مذکورہ کتاب میں نہیں تھی، کہیں کہیں ثقہ اور ضعیف کی بھی نشاندہی کر دی ہے۔

ترتیب:- سب سے اہم کام یہ کیا ہے کہ اس کو حروف معجم پر نہایت ہی اچھی ترتیب سے حرف اول سے آخر تک کا خیال کر کے مرتب کیا ہے، اس لئے استفادہ بہت آسان ہو گیا ہے، مقدمہ کے طور پر سب سے پہلے ابو القاسم، پھر ابو احمد، ابو اسحاق، ابو اسرائیل اور ابو اسماعیل کو مقدم کر کے بقیہ حرف الف اور پھر دیگر حروف کو مرتب کیا ہے، حرف م میں ابو محمد کو مقدم کر دیا ہے۔ سب سے پہلے کنیت کا ذکر ہے اس کے بعد ان لوگوں کا نام اس کے تحت بغیر کسی ترتیب کے جمع کر دیا ہے جو مذکورہ کنیت سے مشہور ہیں۔ جو کنی مجردہ ہیں ان کیلئے الگ عنوان "وممن لم یسم" قائم کر کے ان کو الگ ذکر کیا ہے۔

اضافی عمل :- خواتین کی کنیت کا ذکر امام حاکم نے نہیں کیا تھا امام ذہبیؒ نے آخری کتاب میں اس کا بھی اضافہ کیا ہے۔ اس طرح سے یہ کتاب اس فن کی موجودہ کتابوں میں سب سے عظیم کتاب ہے جس میں مطبوعہ نسخہ کے رقم مسلسل کے مطابق

---

(۱) تفصیل کیلئے دیکھئے الاستغنا ۱/۵۶-۶۱ مقدمہ محقق

(۱۹۹۵) تراجم ہیں، اس کتاب کی تحقیق شیخ محمد صالح عبدالعزیز مراد نے کی ہے، جس کو جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی مجلس علمی نے ایک ضخیم جلد میں (جس میں دو اجزاء ہیں) ۱۴۰۸ھ میں طبع کیا ہے، مطبوعہ نسخہ میں ایک خامی یہ ہے کہ جب بھی جوئی جدید کنیت شروع ہوئی ہے تو اس کو سابقہ کنیت کے ساتھ تسلسل سے ذکر کر دیا ہے۔ تمیز کی کوئی علامت نہیں رکھی ہے جس سے مراجعہ کرنے والے کو دقت ہوتی ہے۔

تنبیہ :- امام سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ) کی تالیف کردہ ہے ایک کتاب "المنی فی الکنی" ہے جو مطبوع بھی ہے اور اس کے مختلف طبعات بھی ہیں، آخری طبعہ محمد عزیز شمس کی تحقیق سے الدار السلفیہ بمبئی سے ایک مجموعہ میں چھپی ہے جس کا نام "روائع التراث" ہے۔

بہت سے اہل علم نے اس کتاب کو کتب الاسماء والکنی میں شمار کیا ہے، حالانکہ یہ فن رجال سے متعلق کتاب نہیں حتی کہ انسانوں سے بھی متعلق نہیں ہے بلکہ اس میں حیوانات اور اسماء اجناس کی کنیت کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو علامہ ابن اثیر کی کتاب "المرصع" سے ماخوذ ہے، جیسا کہ کتاب کی ابتدا میں مذکور ہے۔[1] غالباً یہ دھوکہ کتاب کے نام سے ہو گیا ہے۔

امام سیوطی کی جانب کتاب الکنی کے نام سے ایک کتاب اور بھی منسوب کی جاتی ہے جس کا نسخہ مکتبہ اسکوریال میں (نمبر ۱۷۹۸/۱۰) پر موجود ہے جو تقریباً بیس ورق میں ہے جبکہ "المنی فی الکنی" صرف چھ ورق میں ہے[2]

ممکن ہے اس کی وجہ سے بھی دونوں کتابوں کے سمجھنے اور تفریق کرنے میں غلطی ہو گئی ہو۔

☆☆☆

---

(۱) روائع التراث، المنی فی الکنی ص [illegible] مقدمہ محقق

(۲) مصدر سابق ص ۱۳۵ مقدمہ محقق

کتب خاصہ کی چھٹی قسم

کتب القاب

روایان حدیث کی معرفت، ان کی شخصیت کی تعیین، نیز معرفت احوال کے لئے علماءِ محدثین و مورخین نے مختلف قسم کی جو کتابیں تالیف کی ہیں ان میں "کتب القاب" ایک نمایاں قسم ہے، ان کتابوں میں لقب سے مشہور راویان حدیث نیز دیگر علماء و محدثین کے ناموں کی وضاحت، شخصیت کی تعین اور حسب معلومات اسباب لقب کا ذکر ہوتا ہے، کتابوں میں بعض دیگر حالات زندگی بحیثیت جرح و تعدیل نقاد کے اقوال وغیرہ کا تذکرہ بھی کیا جاتا ہے، جس سے ان روایان کی معرفت بآسانی ہو جاتی ہے، ان کے تراجم و حالات زندگی کتب رجال و کتب جرح و تعدیل میں تفصیل سے مذکور ہوتی ہیں، پھر بھی صرف ان پر اکتفانہ کرتے ہوئے بحیثیت فن ان کو جدا کتابوں میں جمع کر دیا گیا ہے، اس فن اور اس میں تالیف شدہ کتابوں کا مختصر تعارف پیش خدمت ہے۔

القاب: لقب کی جمع ہے، لقب اس نام کو کہتے ہیں جو اصل نام کے علاوہ ہو۔[۲]

لقب کا یہ مفہوم نحویوں اور لغویوں کے یہاں ہے۔

محدثین کے یہاں لقب اس صفت کو کہتے ہیں جو مسمی کی معرفت پر بحیثیت مدح و ذم یا بلندی و پستی دلالت کرے، خواہ بطور نام استعمال ہو یا بطور کنیت و نسبت[۳]

اس لئے محدثین کے یہاں لقب کا مفہوم نحویوں و لغویوں کے مقابلے میں قدرے وسیع ہے، اصل نام کے علاوہ دوسرے نام سے عام طور پر بچوں کو پکارنے کی عادت ہو جاتی ہے یہ عادت عرب و عجم ہر جگہ رائج ہے، یہی نام عموماً لقب کی شکل اختیار کرتے ہیں جو کبھی کبھی اتنے بدتر ہوتے تھے جن کا ادا کرنا طبیعت پر بڑا گراں گذرتا تھا، اسی وجہ سے اہل عرب اپنے بچوں کو برے القاب سے بچانے کیلئے بچپن ہی سے کنیت سے پکارنے لگتے تھے۔

اقسام:- باعتبار استعمال (باعتبار مقصد) لقب کی تین قسمیں ہوتی ہیں، لقب تشریف جیسے افضل، لقب توہین جیسے بُطیط، لقب تعریف جیسے اعمش[۳]

---

(۱) لسان العرب ۷۴۳/۴ (۲) فتح المغیث ۴۰۷/۴

(۳) فتح الوهاب فيمن اشتهر من المحدثين بالالقاب ص ۷

البتہ شکلیات کے اعتبار سے اس کی مختلف قسمیں (شکلیں) ہوتی ہیں، کہیں لقب نام کی شکل میں ہوتا ہے، جیسے اشہب، کہیں کنیت کی شکل میں ہوتا ہے، جیسے ابوالبطین کہیں نسبت کی شکل میں ہوتا ہے خواہ یہ نسبت صنعت وحرفت کی جانب ہو جیسے بقال، یا ملقب بہ کے کسی صفت کے اعتبار سے ہو جیسے، اعمش یا قبائل و بلدان کی طرف ہو جیسے ذہلی، مکی (۱)

شرعی حکم:- ہر وہ لقب جسکو ملقب بہ ناپسند کرے، یا جو ملقب بہ کی توہین وتحریت پر دلالت کرے اسکا استعمال جائز نہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ﴾ [حجرت:۱۱] یعنی آپس میں ایک دوسرے کو برے لقب سے نہ پکارو۔ یہاں تنا بز بالالقاب سے ایسے القاب مراد ہیں جو توہین کیلئے استعمال کئے جاتے ہیں جن کو صاحب لقب پسند نہیں کرتا، لیکن جو القاب عزت وشرافت قدر و منزلت کیلئے ہوں جن کو صاحب لقب ناپسند نہ کرتا ہو تو اس کا استعمال درست ہے، خود رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو بکرؓ کو "صدیق" حضرت عمرؓ کو "فاروق" کے لقب سے نوازا ہے۔ (۲)

البتہ جو لقب بظاہر برا ہو یا ملقب بہ ناپسند کرتا ہو لیکن تعریف و پہچان کیلئے اس کو استعمال کیا جائے جس کے بغیر چارہ نہ ہو تو علماء نے اس کو جائز قرار دیا ہے۔ (۳)

علامہ ابن صلاح فرماتے ہیں کہ: جس کو ملقب بہ پسند کرتا ہے اس کا استعمال درست ہے، اور جس کو ناپسند کرتا ہے اس کا استعمال درست نہیں۔ (۴)

کچھ مشہور القاب:- القاب عموماً بغیر کسی سبب کے متداول و معروف ہو جاتے ہیں (یا سبب معلوم نہیں ہو پاتے) اور بعض کسی سبب کی بنا پر متداول ہو جاتے ہیں کچھ مشہور سببی القاب یہ ہیں۔

بُندار:- محمد بن بشار شیخ بخاری کا لقب ہے جو کثرت حفظ کی بنا پر پڑ گیا تھا۔

خت:- یہ امام بخاری کے استاذ یحییٰ بن موسیٰ کا لقب تھا اس لئے کہ یہ کلمہ ان کا تکیہ کلام ہو گیا تھا، اسی کو لوگوں نے ان کی معرفت کیلئے بطور لقب استعمال کر لیا۔

---

(۱) فتح المغیث ۲۲۲/٤، فتح الوهاب ص۷ (۲) تفسیر قرطبی ۳۲۹/۱٦
(۳) تفسیر قرطبی ۳۲۹/۱٦، فتح المغیث ۲۲٤/٤، ارشاد طلاب الحقائق للنووی ۲۸٦/۲
(٤) مقدمة ابن الصلاح ص ۳۰۵

ضال:- (گم گشتہ راہ) یہ معاویہ بن عبدالکریم کا لقب ہے اس لئے کہ "ضل فی طریق مکۃ" یہ مکہ جاتے وقت راستہ بھٹک گئے تھے اسی گم شدگی میں وفات ہو گئی وہیں سے ضال ان کا لقب پڑ گیا۔

ضعیف:- (کمزور) یہ عبداللہ بن محمد بن یحیٰی طرسوسی کا لقب ہے جو جسمانی اعتبار سے کمزور تھے۔

انہیں دونوں کے بارے میں حافظ عبدالغنی بن سعید نے فرمایا تھا کہ "رجلان جليلان لزمهما لقبان قبيحان ، معاوية بن عبدالكريم الضال، و إنما ضل في طريق مكة، و عبدالله بن محمد الضعيف كان ضعيفا في جسمه لافي حديثه" (۱)

غُندر:- (شور مچانے والا) یہ محمد بن جعفر کا لقب ہے، جب ابن جریج بصرہ آئے تو ان کے درس میں انہوں نے کسی معاملہ پر زیادہ شور مچانا شروع کر دیا، تو ابن جریج نے کہا اسکت یا غندر، حجاز کی زبان میں غندر شور مچانے والے کو کہتے ہیں یہیں سے ان کا لقب غندر پڑ گیا۔

مُطیّن:- (مٹی پوتا ہوا) یہ ابو جعفر حضرمی کا لقب ہے، یہ ایک مرتبہ بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے بچے ان کے جسم پر مٹی و کیچڑ پوت رہے تھے ادھر سے ابو نعیم کا گذر ہوا تو انہوں نے کہا "یا مطين لمالا تحضر مجلس العلم" او مٹی پوتے ہوئے علم کی مجلس میں کیوں شریک نہیں ہوتے یہیں سے ان کا یہ لقب پڑ گیا۔

نبیل :- (ہوشیار) یہ ابو عاصم الضحاک کا لقب ہے ایک مرتبہ امام شعبہ نے حدیث نہ بیان کرنے کی قسم کھالی، تو انہوں نے ان سے کہا کہ آپ بیان کیجئے میر اغلام (بطور کفارہ) آزاد ہے تو امام شعبہ نے یہ سن کر فرمایا کہ "أنت نبيل" تم بڑے ہوشیار ہو یہیں سے ان کا لقب نبیل پڑ گیا۔ (۲)

فائدہ :- معرفت القاب کے چند اہم فائدے ہیں۔

پہلا:- یہ کہ اس کی معرفت سے افراد میں جو تشابہ ہونے کا امکان ہے اس سے محفوظ

---

(۱) مصدر سابق

(۲) مقدمة ابن الصلاح ص ۳۰۶-۳۰۹، فتح المغيث ۲۲۳/۴، ۲۲۵

رہا جاتا ہے، اس لئے کہ ایک شخص کبھی لقب سے اور کبھی نام سے مذکور ہوتا ہے اس کی معرفت سے دو اشخاص ہونے کا شبہ ختم ہو جاتا ہے۔[1]

دوسرا:- یہ کہ راوی کے اصل نام و لقب میں فرق معلوم ہو جاتا ہے جو اس کو نہیں جانتا وہ نام کو لقب اور لقب کو نام سمجھ سکتا ہے۔[2]

تیسرا:- اگر اتفاق سے راوی کسی سند میں اپنے نام و لقب دونوں سے مذکور ہو تو پڑھنے والا یہ سمجھ بیٹھے گا کہ درمیان سے عن ساقط ہو گیا ہے۔

چوتھا:- ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ القاب کی معرفت سے کبھی کبھی سببِ لقب بھی معلوم ہو جاتا ہے جس کے معلوم ہونے سے ملقب بہ کا غیر ظاہر مفہوم بھی واضح ہو جاتا ہے، مثلاً سابقہ القاب میں ضال و ضعیف کی وضاحت اس بنیاد پر ہو گئی کہ اس کا سبب معلوم ہو گیا اور یہ حل ہو گیا کہ اس کا ظاہری معنی مراد نہیں۔[3]

تالیفات:- القاب کے سلسلے میں محدثین نے بہت مفید کتابیں تالیف کی ہیں کچھ کتابیں خالص القاب میں اور کچھ کنیت کے ساتھ اور کچھ اسماء کے ساتھ مشترک ہیں، ان کتابوں میں جو القاب سے متعلق ہیں اکثر و بیشتر کتابیں غیر مطبوع ہیں، بعض کے تو وجود کا بھی پتہ نہیں صرف ان کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے، میرے علم میں فی الحال صرف ایک مطبوعہ کتاب ہے جو استاذ گرامی محدث مدینہ حماد بن محمد انصاری رحمۃ اللہ علیہ کی تالیف ہے، ویسے اس فن میں جو کتابیں تالیف کی گئی ہیں ان میں علامہ شیرازی اور حافظ ابن حجر کی کتاب کافی مشہور ہے۔

دوسری کتابوں کو اگرچہ وہ شہرت حاصل نہیں لیکن ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، بہر کیف اس فن میں تالیف شدہ اہم کتابوں میں سے کچھ مندرجہ ذیل ہیں:

۱-الألقاب و الکنی:- یہ علامہ ابو بکر شیرازی احمد بن عبد الرحمن (متوفی ۴۱۱ھ) کی تالیف ہے، جو اس فن کی مشہور ترین کتاب ہے علماء کا خیال ہے کہ یہ انتہائی مفید اور جامع تالیف ہے، حافظ ابن حجرؒ کی تالیف سے پہلے یہ کتاب اس فن کی سب

---

(۱) تدریب الراوی ۲/۲۸۹ (۲) مقدمۃ ابن الصلاح ص ۳۰۵

(۳) تیسیر مصطلح الحدیث: ۲۲۰

سے عظیم کتاب سمجھی جاتی تھی[۱]

۲-مختصر الألقاب للشیرای :- سابقہ کتاب کا اختصار " **مختصر** القاب للشیرازی " کے نام سے حافظ ابوالفضل بن طاہر نے کیا ہے جو انتہائی مختصر ہے، اس مختصر کا ایک نسخہ دمشق کی لائبریری ظاہریہ میں موجود ہے۔[۲]

۳-ذات النقاب فی الألقاب :- یہ امام ذہبی احمد بن عثمان (متوفی ۷۴۸ھ) کی تالیف ہے، مذکورہ دونوں کتابوں کا نسخہ ہالینڈ کی لائبریری لیڈن میں موجود ہے۔[۳]

٤-نزهة الألباب فی الألقاب

یہ حافظ ابن حجر عسقلانی (متوفی ۸۵۲ھ) کی تالیف ہے جو اس فن کی قدر سے اختصار کے ساتھ سب سے جامع کتاب تصور کی جاتی ہے مؤلف نے اس کتاب میں سابقہ کتابوں کا خلاصہ و نچوڑ پیش کیا ہے، علامہ سخاوی فرماتے ہیں کہ اس میں حافظ ابن الجوزی کی کتاب کا خلاصہ گراں قدر اضافہ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے جو اپنے فن کی انوکھی کتاب ہے۔[۴]

اس کتاب میں حافظ ابن حجر نے راوی کا لقب اور نام ذکر کیا ہے، دیگر حالات زندگی سے قطعاً تعارض نہیں کیا ہے، کہیں کہیں تاریخ وفات بتادی ہے، اور اس کتاب سے لقب اور راوی کا نام معلوم ہو جاتا ہے البتہ دیگر معلومات کیلئے دوسری کتابوں کی جانب رجوع کرنا پڑے گا، اس کتاب کے ایک حصہ کا مصور نسخہ مکتبہ حرم مکی میں موجود ہے۔[۵]

اس کتاب پر امام سخاوی نے کچھ اضافہ کر کے مستقل کتاب کی شکل دی ہے۔[۶]

٥-فتح الوهاب فیمن اشهر من المحدثین بالألقاب

یہ اس فن کی سب سے متاخر کتاب ہے جس کو محدث مدینہ شیخ حماد بن محمد انصاری رحمہ اللہ نے ترتیب دیا ہے، جو دیر آید درست آید کے مصداق ہے، اپنی جامعیت و معنویت کے اعتبار سے کافی بہتر ہے، اس کو شیخ نے حروف معجم پر بڑی

(۱) فتح المغیث ٤/۲۲۲، الرساله المستطرفة ص ۹۰

(۲) فتح الوهاب فیمن اشتهر من المحدثین بالألقاب ٦ حاشیه

(۳) فتح الوهاب ص ٦ حاشیه (٤) فتح المغیث ٤/۲۲۲

(٥) فتح الوهاب ص٦ (٦) فتح المغیث ٤/۲۲۲، الرسالة المستطرفة ص ۹۰

دقیق ترتیب سے مرتب کیا ہے، جس میں ملقب بہ کا مکمل نام ونسب اور کچھ حالات زندگی بھی مذکور ہے خصوصیت کے ساتھ جرح وتعدیل سے متعلق معلومات پر زور دیا گیا ہے جس سے اس کی افادیت واہمیت دوچند ہو جاتی ہے اس میں ہر قسم کا لقب ذکر ہے خواہ وہ نام کی شکل میں ہو یا کنیت یا نسبت کی شکل میں ہو، اگر ایک ہی لقب کے مختلف افراد ہیں تو ہر ایک کی وضاحت کر دیا ہے، اس کی تالیف میں کتب رجال سے استفادہ کیا گیا ہے خصوصاً حافظ ابن حجر کی کتاب تقریب التہذیب پر زیادہ اعتماد کیا گیا ہے اس فن کی یہی ایک مطبوعہ کتاب ہے جو میری نظر سے گذری ہے۔ اس فن کی کچھ اور کتابوں کا ذکر ملتا ہے وہ یہ ہیں:

۱-مجمع الآداب فی معجم الأسماء و الألقاب:-یہ ابو الولید ابن الفرضی (عبد اللہ بن محمد اندلسی) کی تالیف ہے، اسکا ذکر امام سخاوی وعلامہ کتانی وغیرہ نے کیا ہے[۱]۔

۲- فتح الباب فی الکنی والألقاب:- یہ ابو عبد اللہ بن مندہ کی تالیف ہے جس کا ذکر کتب کنی میں گذر چکا ہے۔

۳-الکنی و الألقاب :- یہ امام ابو عبد اللہ حاکم (متوفی ۴۰۵ھ) کی تالیف ہے[۲] نام ہی سے واضح ہے کہ یہ کنیت کے ساتھ مشترک ہے امید یہی ہے کہ اس میں بھی القاب کا ذکر کم ہی ہو گا۔

٤-منتهى الكمال فی معرفة ألقاب الرجال:- یہ ابو الفضل ابن الفلکی علی بن الحسین (متوفی ۴۲۸ھ) کی تالیف ہے۔[۳]

٥-كشف النقاب عن الأسماء و الألقاب:-یہ حافظ ابن الجوزی (متوفی ۵۹۵ھ) کی تالیف ہے علامہ سخاوی کا کہنا یہ ہے کہ یہ اس فن میں کافی مفصل اور وسیع کتاب ہے۔[۴]

٦-كشف النقاب عن الألقاب:-یہ امام سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ) کی تالیف ہے۔[۵]

---

(۱) فتح المغیث ٤/۲۲۲ ، الرسالة المستطرفة ص ۹۰
(۲) الرسالة المستطرفة ص ۹۰
(۳) فتح المغیث ٤/۲۲۲ ، الرسالة المستطرفة
(٤) فتح المغیث ٤/۲۲۲ (٥) کشف الظنون ٤/۱٤۹٦

کتب خاصہ کی ساتویں قسم

کتب انساب

حسب ونسب کی معرفت اوراس کے ذریعہ فخر ومباہات اوراس پر شدید قبائلی عصبیت قوم عرب کا طرۂ امتیاز تھا، وہ اپنے حسب ونسب کے علاوہ مخالفین کے حسب و نسب سے بھی آگاہ رہتے تھے تاکہ ان کے عیوب ونقائص کا بیان اور اپنی فضیلت اور برتری کا اظہار کر سکیں، یہ چیزیں ان کے خطباء وشعراء کے کلام میں نمایاں طور سے پائی جاتی تھیں، حتیٰ کی زمانۂ اسلام میں بھی اس کا اثر برقرار رہا جس کی مثال یہ ہے۔

فغض الطرف إنك من نمير　　فلا كعبا بلغت و لا كلابا

و لو أن بر غوثا على ظهر نملة　　يكر على صفي تميم لولت

زمانۂ جاہلیت اور دور صحابہؓ میں بھی بڑے بڑے ماہرین نسب پائے جاتے تھے خود رسول پاک ﷺ کو بھی اس سلسلہ میں کافی معلومات تھیں، حضرت ابو بکر صدیقؓ اپنے دور کے نسابین میں شمار کئے جاتے تھے جس کی شہادت خود رسول پاک ﷺ نے دی ہے۔[1]

فن انساب:- ایسے فن کو کہتے ہیں جس میں قبیلوں کے بنیادی اور فرعی افراد نیز ان سے متفرع ہونے والے ذیلی قبائل کا بیان ہو، اسی طرح سے لفظی نسبتوں کی جمع و ترتیب، ضبط اور معنی کی وضاحت کو بھی فن انساب کہا جاتا ہے۔[2]

اس فن میں کتابوں کی تصنیف سے پہلے ایسے افراد پائے جاتے تھے جن سے ان کی معرفت کیلئے رجوع کیا جاتا تھا مثلاً دور صحابہؓ میں حضرت ابو بکر صدیقؓ، ابو جہم بن حذیفہ بن غانم عدویؓ، جبیر بن مطعم بن عدیؓ۔[3] اور دور تابعین میں سعید بن المسیبؒ اور انکے بیٹے محمد بن سعیدؒ اور ان کے شاگرد امام زہریؒ، قتادہ بن دعامۃ سدوسیؒ اور قاسم بن ربیعہؒ کافی معروف تھے پھر ان کے بعد امام شافعیؒ، ابو عبیدہ قاسم بن سلامؒ، ہشام کلبیؒ وغیرہ اس فن کے ماہرین میں سے تھے۔ پھر تالیف کا دور شروع ہوا۔[4]

---

(۱) صحيح مسلم فضائل الصحابة، باب فضائل حسان بن ثابت ، معرفة علوم الحديث ص ١٦٩

(۲) الأنساب للسمعانى مقدمه محقق ٣/١　　(۳) جمهرة أنساب العرب لابن حزم ص ٥

(٤) بحوث فى تاريخ السنة ص ١٧٥

فن انساب کی معرفت کا حکم:- قرآن کریم میں حسب ونسب کے معرفت کی ترغیب دی گئی ہے ﴿وَجَعَلْنَا کُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا﴾[حجرات: ۱۳] اور اس کی معرفت کا مقصد بھی بتایا گیا ہے نیز آپ ﷺ نے فرمایا: "تعلموا أنسابكم تصلوا أرحامكم"[۱] اپنے حسب کو معلوم رکھو تاکہ ان سے صلہ رحمی کرو۔

لہٰذا شرعی نقطہ نظر سے بھی انساب کی معرفت ایک اہم ضرورت ہے اسلئے کہ اسکی معرفت سے ہر شخص اپنے قرابت داروں سے متعارف ہو گا اور پھر صلہ رحمی کے اصولوں کی پابندی کرے گا، اسی طرح سے اسکی معرفت سے ان رشتوں کا پتہ چلتا ہے جن سے نکاح کے جواز اور عدم جواز کا تعلق ہے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں: "تعلموا من الأنساب تصلون به أرحامكم و تعرفون به مما حرم عليكم من النساء"[۲]

نیز اس کی معرفت سے حق وراثت و حق ولایت اور حق انفاق کی ذمہ داری مرتب ہوتی ہے۔[۳] اس کی معرفت سے ﴿وَأَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْأَقْرَبِيْنَ﴾ [شعراء: ۲۱۴] پر عمل ممکن ہوتا ہے۔

علامہ ابن حزمؒ فرماتے ہیں کہ اس علم کا جاننا اسلئے بھی ضروری ہے تاکہ ہر کوئی مدعیٔ خلافت نہ ہو سکے، کیوں کہ خلیفہ صرف فہر بن مالک کی اولاد سے ہو سکتے ہیں۔[۴] اسی طرح سے ذوی القربیٰ کا جاننا ضروری ہوتا ہے جن کا حق مال خمس میں ہوتا ہے اور جن کیلئے صدقہ لینا حرام ہوتا ہے۔ ان سب کی معرفت کا دار و مدار حسب ونسب کی معرفت پر ہے۔

فوائد:- محدثین کرام حسب ونسب کی معرفت کا بہت اہتمام کرتے تھے اس سے راویوں کی تعیین میں آسانی ہوتی تھی، تصحیف و تحریف کی غلطیوں سے حفاظت نیز لطائف اسناد کا استنباط کرتے تھے۔ مثلاً کسی سند کے بارے میں کہتے تھے کہ اس کے راوی سب ہاشمی ہیں، یا سب قریشی ہیں یا یہ روایت بصری ہے یا مدنی ہے وغیرہ[۵]

اہل عرب اپنے آپ کو قبیلوں کی جانب منسوب کرتے تھے اور اس کی معرفت

---

(۱) مسند احمد ۲/ ۳۷۴، معرفة علوم الحديث ص ۱۶۹، جمهرة انساب العرب ص ۳
(۲) الأنساب للسمعانی ۱/ ۱۱ (۳) جمهرة أنساب العرب ص ۲
(٤) جمهرة أنساب العرب ص ٥ (٥) معرفة علوم الحديث ۱۷۵-۱۷٦

رکھتے تھے، انکے بر خلاف عجم میں حسب و نسب کی معرفت کا وہ رواج نہ تھا، لہٰذا یہ لوگ اپنے آپ کو قبیلہ کی بجائے ملک، وطن، محلّہ، پیشہ، صنعت و حرفت وغیرہ کی جانب منسوب کرتے تھے اور اس طرح انساب کی بڑی کثرت ہو گئی بلکہ اسی کا غلبہ ہو گیا۔[۱]

علامہ ابن اثیرؒ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ بہت سے حضرات قبیلہ، جد اعلیٰ، جد ادنیٰ، وطن، صنعت، مذہب وغیرہ کی جانب نسبت کرتے تھے جو خاص و عام ہر ایک کیلئے غیر معروف ہوتے تھے جس کی بناء پر اس میں تصحیف و تحریف اور بے حد غلطیاں ہوتی تھیں لہٰذا ایک تالیف کا خیال پیدا ہوا۔[۲]

چنانچہ محدثین نے تصحیف و تحریف سے بچنے کیلئے اس کو ایک مستقل فن کی حیثیت دے دی، اور اس کی معرفت میں بڑی توجہ اور دلچسپی دکھائی، بڑے بڑے ماہرین نسب اور مؤلفین انساب پیدا ہوئے۔

ابتدائی تألیف:- باور کیا جاتا ہے کہ سب سے پہلے امام زہریؒ (متوفی ۱۲۴ھ) نے اس فن میں تالیف کی ہے، اسکے بعد ماہر نسابہ ابو یقظان سحیم یا عامر بن حفص (متوفی ۱۹۰ھ) اور ان کے ہم عصر مورخ ابن عمرو سدوسی (متوفی ۱۹۵ھ) نے غیر مکمل تالیف کی، پھر ہشام بن سائب کلبیؒ (متوفی ۲۰۴ھ) نے اس فن کو جلا بخشی۔[۳]

حاجی خلیفہ فرماتے ہیں کہ ہشام کلبی نے سب سے پہلے اس فن میں تالیف کا باب کھولا اور پانچ کتابیں تحریر کیں، المنزل، الجمهرة، الوجيز، الفريد، الملوكی، پھر دوسروں نے ان کی اقتداء کی۔[۴]

چنانچہ ابو عبداللہ بن مصعب بن عبداللہ زبیری (متوفی ۲۳۶ھ) نے "الجمهرة فی نسب قريش" تحریر کیا۔[۵]

نیز ابو الفرج علی بن حسین اصبہانی (متوفی ۳۵۶ھ) و ابو محمد بن حزم اندلسی (متوفی ۴۵۶ھ) نے "جمهرة الأنساب" کے نام سے کتابیں تحریر کیں۔[۶]

---

(۱) كشف الظنون ۱/۱۷۸ (۲) اللباب فی تهذيب الأنساب ۱/۷
(۳) بحوث فی تاريخ السنة ص ۱۷۵ (٤) كشف الظنون ۱/۶۰۵
(۵) تاريخ التراث العربی ۱/٤۳۸ اس کے نسخے مختلف مکتبات میں پائے جاتے ہیں۔
(٦) كشف الظنون ۱/۶۰۵

پھر ابوالحسن احمد بن یحییٰ بلاذری (متوفی   ) نے اس فن میں عظیم کتاب ''انساب الأشراف'' کے نام سے بیس جلدوں میں تحریر کیا پھر بھی نامکمل رہی۔[1] انہوں نے ہشام کلبی کی کتاب ''جمهرة الأنساب'' کی بیشتر معلومات کو اس کتاب میں جمع کر دیا۔[2]

لیکن یہ ساری کتابیں فن انساب کی اس قسم سے متعلق ہیں جن میں صرف قبائل اور ان کے افراد کا ذکر کیا جاتا ہے، عام نسبتوں کا ذکر نہیں ہوتا۔

تراجم رجال پر کتابیں تحریر کرنے والوں میں سے بہت سارے مؤلفین نے اپنی کتابوں کو اسطرح کے انساب پر مرتب کیا ہے یا اس کی وضاحت پر زیادہ زور دیا ہے۔

البتہ اس فن کی دوسری قسم جو یہاں موضوع بحث ہے جس میں عام نسبتوں کا ذکر ہوتا ہے خواہ وہ نسبت کسی خاندان کی جانب ہو یا ملک و وطن کی جانب ہو، یا محلّہ و بازار کی جانب، یا کسی صنعت و حرفت کی جانب، یا مذہب و طریقہ کی جانب، اس کا فن جرح و تعدیل سے گہرا تعلق ہے، اسی لئے ان کتابوں میں راویان حدیث کے مکمل تراجم بھی پائے جاتے ہیں جن پر بحیثیت جرح و تعدیل حکم بھی رہتا ہے، نیز بعض راویان حدیث ایسے بھی ہیں جو نسبت سے زیادہ مشہور ہیں، حتی کہ کبھی کبھی وہی نسبت نام کی جگہ لے لیتی ہے۔ لہٰذا ان کا جاننا ضروری ہوتا ہے مثلاً اوزاعیؒ، زہریؒ، شافعیؒ وغیرہ۔

اس فن کی جانب محدثین نے اصول حدیث کی کتابوں میں مخصوص ابواب میں رہنمائی کی ہے، اور اسماء و کنی، القاب و انساب کی معرفت ایک محدث کے لئے ضروری قرار دیا ہے اور اس کی انواع و اقسام کو ذکر کیا ہے۔ مثلاً امام حاکمؒ علوم حدیث کی انتالیسویں قسم میں فرماتے ہیں کہ: ''**هذا النوع فی هذه العلوم معرفة أنساب المحدثين والصحابة إلى عصرنا هذا فقد أمرنا سيدنا المصطفى صلى الله عليه وسلم**''

امام سخاوی وغیرہ نے اس کی مزید وضاحت کی ہے اور ان حضرات کا بطور ذکر کیا ہے جو اپنے باپ کے علاوہ کسی اور کی جانب منسوب ہیں (مثلاً دادا، دادی، نانی، ماں

(۱) کشف الظنون ۱/۱۷۹ (۲) تاریخ التراث العربی ۱/۴۳۸

وغیرہ) جیسے ابن علیہ، ابن عفرا، ابن جریج، مقداد بن الاسود وغیرہ۔

اسی طرح سے کچھ لوگ خلاف ظاہر منسوب ہوتے ہیں جیسے ابو مسعود بدری، اسماعیل بن محمد مکی، ابو خالد دالانی، خالد حذاء، مقسم مولی ابن عباس۔ پہلے کی نسبت مقام بدر میں قیام کی وجہ سے ہے دوسرے کی بکثرت حج کرنے کی وجہ سے، تیسرے کی بنی دالان میں رہنے کی وجہ سے، چوتھے کی حذائین (موچیوں) کے پاس بیٹھنے کی وجہ سے، پانچویں کی بکثرت ابن عباسؓ کے ساتھ رہنے کی وجہ سے[1]

اس فن میں جو کتابیں تحریر کی گئی ہیں ان کا ذکر خیر یہاں پر کیا جارہا ہے۔

کتب انساب لفظیہ

مخصوص کتابیں:- علامہ معلمیؒ فرماتے ہیں کہ مجموعی اعتبار سے اس فن کی پہلی کتاب:

مختلف أسماء القبائل و مؤتلفها:- تالیف ابو جعفر محمد بن حبیب بغدادی (متوفی ۲۴۵ھ) کو شمار کیا جاسکتا ہے جو بالواسطہ اس فن کے ایک گوشے سے متعلق ہے، یہ کتاب مطبوع ہے، اس کا قلمی نسخہ دار الکتب المصریۃ میں موجود ہے۔[2] اس کی ایک تہذیب و مختصر وزیر مغربی (متوفی ۴۱۸ھ) نے کی ہے۔ جس میں خصوصیت کے ساتھ ضبط الفاظ پر توجہ دی ہے، اس کی ایک اور تہذیب، ابو الولید کنانی وقشی (متوفی ۴۸۹ھ) نے بھی کی ہے۔[3]

مشتبہ النسبۃ:- یہ حافظ عبد الغنی بن سعید ازدی مصری (متوفی ۴۰۹ھ) کی کتاب ہے جو ایک خاص جانب پر مشتمل ہے[4] کیوں کہ اس میں صرف ان نسبتوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کے پڑھنے میں اشتباہ اور غلطی کا امکان ہے مثلاً اسطرح کا "لصری" رسم الخط ہو تو اس کو "نصری" صاد ساکن، "نصَری" صاد مفتوح، "بصری"، "نَضری" چاروں پڑھا جاسکتا ہے۔ مؤلف نے اس میں یہ وضاحت کر دی ہے کہ اس میں نصری

---

(۱) فتح المغیث ۴/ ۲۹۹، تدریب الراوی ۲/ ۳۳۶-۳۴۲

(۲) الاکمال ۱/ ۴ مقدمہ محقق (۳) مصدر سابق ۱/ ۴-۵

(۴) الأنساب ۱/ ۴ مقدمہ محقق

کون ہے بصری کون ہے اور نصری کون ہے، اس میں جرح و تعدیل کے کلمات کا استعمال تو نہیں کیا گیا ہے البتہ استاد و شاگرد کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ یہ ایک مختصر سی کتاب ہے جو ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے اور کتاب " المؤ تلف و المختلف " یعنی، مشتبہ الاسماء کے ساتھ ۱۳۲۷ھ میں الہ باد سے مطبوع ہے۔

مشتبه النسبة :- یہ ابوالولید عبد اللہ بن محمد بن الفرضی اندلسی (متوفی سن ۴۰۳ھ) کی کتاب ہے۔ جس میں حافظ عبد الغنی ازدی کے نقش قدم پر کام کیا ہے۔ (۱)

مشتبه النسبة :- یہ حافظ ابو سعد احمد بن محمد المالینی الهروی (متوفی ۴۱۲ھ) کی تصنیف ہے جس میں مؤتلف و مختلف انساب کا ذکر ہے۔ (۲)

الأنساب المتفقة فى الخط المماثلة فى النقط :- پھر حافظ ابو الفضل محمد بن طاہر مقدسی ابن قیسرانی (متوفی ۵۰۷ھ) نے ان انساب کا ذکر کیا جو خط و نقطہ میں متفق و مماثل ہیں، اور عموماً مشترک ہیں، یعنی یہ بھی المؤتلف والمختلف فی الانساب پر ہے جو انساب کا ایک خاص گوشہ ہے۔ (۳)

مشتبه النسبة :- اسی طرح علامہ زمخشری محمود بن عمر (متوفی ۵۳۸ھ) نے بھی اس موضوع پر کتاب تصنیف کی ہے،

ما ائتلف و اختلف فى أنساب العرب :- یہ علامہ ابیوردی ابو المظفر محمد بن أحمد بن محمد الاموی متوفی (متوفی ۵۵۷ھ) کی تالیف ہے جو خاص قسم کے انساب کے متعلق ہے۔ جیسا کہ 'وفیات الأعیان' میں ان کے ترجمہ میں علامہ ابن خلکان نے اشارہ کیا ہے۔ (۴)

الفيصل فى مشتبة النسبة :- اسی طرح سے امام حازمی حافظ محمد بن موسیٰ (متوفی ۵۸۳ھ) نے ایک کتاب "الفیصل فی مشتبۃ النسبۃ" کے نام سے تالیف کی ہے جیسا کہ ابن خلکان نے ان کے ترجمے میں ذکر کیا ہے۔ (۵)

ایسے ہی ابن باطیس ابو المجد اسماعیل بن ہبۃ اللہ موصلی (متوفی ۶۴۰ھ) نے

---

(۱) مصدر سابق ۸/۱ مقدمه محقق، تذكرة الحفاظ ۱۰۷۷/۳

(۲) فتح المغيث ۲۳۱/٤

(۳) الأنساب ٤/۱ مقدمه محقق

(٤) الاكمال ۸/۱ مقدمه محقق

(٥) مصدر سابق

مشتبہ النسبۃ پر ایک کتاب تالیف کی ہے جیسا کہ تکملۃ اکمال الاکمال کے مقدمے میں مذکور ہے۔[۱]

مشتبہ النسبۃ :- پھر ابو العلاء محمود بن ابو بکر الفرضی (متوفی ۷۰۰ھ) نے حافظ ذہبیؒ کے کہنے کے مطابق مشتبہ النسبۃ پر ایک بڑی عظیم کتاب تصنیف کی ہے۔[۲]

المؤتلف والمختلف من أنساب العرب :- اسی طرح علامہ ابن ترکمانی علی بن عثمان بن ابراہیم مصری (متوفی ۷۴۹ھ) نے مذکورہ نام سے کتاب تصنیف کی ہے۔[۳]

نیز مؤتلف و مختلف پر جو بھی کتابیں تصنیف کی گئیں ہیں ان میں اس طرح انساب کا بھی ذکر پایا جاتا ہے، علامہ ابن ماکولا کی معروف زمانہ کتاب "الاکمال" نیز یاقوت حموی کی کتاب "معجم البلدان" میں بھی انساب کا ذکر بکثرت پایا جاتا ہے جس میں ان نسبتوں کی وضاحت بھی ہے اگرچہ یہ کتابیں صرف نسبتوں کی وضاحت کیلئے نہیں تالیف کی گئی تھیں پھر بھی بہت مفید کتابیں ہیں۔

عام کتابیں:- البتہ مطلق نسبت میں جو سب سے پہلی تصنیف ہے وہ شیخ معلّمی کی تحقیق کے مطابق:

اقتباس الأنوار والتماس الأزهار فی أنساب الصحابة و رواة الآثار ہے، جو علامہ ابو محمد عبداللہ بن علی بن عبداللہ رشاطی (متوفی ۵۴۲ھ) کی تالیف ہے۔[۴] علامہ کتانی فرماتے ہیں مؤلف نے اس میں بہت اچھا کام کیا ہے، معلومات اکٹھا کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے۔[۵]

اس کا اختصار ابو محمد عبداللہ بن عبدالرحمٰن اشبیلی نے کیا ہے، جس کا ناقص نسخہ مکتبہ ازہریہ میں موجود ہے، اس کا ایک اختصار مجد الدین اسماعیل بن ابراہیم بلبیسی

---

(۱) تکملة إكمال الاکمال للصابونی ص ۹

(۲) الدر المضیئة ۲/۱۶۳، نیز ملاحظہ ہو مقدمہ الاکمال ۱/۱۰

(۳) الاکمال ۱/۱۱ مقدمہ محقق، نیز ملاحظہ ہو کشف الظنون

(٤) الانساب ۱/٤ مقدمہ محقق، الرسالة المستطرفة ص ۹٤

(۵) الرسالة المستطرفة ص ۹٤

(متوفی ۸۰۲ھ) نے بھی 'القبس' کے نام سے کیا ہے۔[1]

پھر امام ابو سعد عبد الکریم بن محمد سمعانی (متوفی ۵۶۲ھ) نے ایک نہایت عمدہ اور جامع کتاب تصنیف کی جو "الانساب" کے نام سے مشہور ہے، جسکا مختصر تعارف یہ ہے:

الأنساب للسمعاني

(متوفی ۵۶۲ھ)

علماء کی نگاہ میں:- یہ فن انساب لفظیہ کی سب سے پہلی جامع کتاب ہے علامہ ابن اثیر فرماتے ہیں کہ اگر کوئی یہ کہے کہ: "إن هذا تصنيف لم يسبق إليه لكان صادقا ، و لوزعم أنه قد استقصى الأنساب لكان بالحق ناطقا" یہ ایسی کتاب ہے کہ اس سے قبل اسطرح کی کوئی تالیف نہیں کی گئی ہے۔ تو اس کا کہنا درست ہوگا اور اگر دعویٰ کرے کہ انہوں نے سارے انساب کو جمع کر دیا ہے تو حق بجانب ہوگا۔

نیز فرمایا کہ مؤلف کتاب نے اس میں ایسی چیزیں پیش کی ہیں جس سے پہلے کے لوگ عاجز رہے، اور بعد کے لوگ اب ایسا کر نہیں سکتے۔[2]

علامہ کتانی فرماتے ہیں کہ: اس فن میں اسطرح کی کوئی دوسری کتاب تالیف نہیں کی گئی۔[3]

علامہ ابن اثیر فرماتے ہیں کہ: امام سمعانی نے اس میں مختلف قسم کے انساب کا ذکر کیا ہے، خواہ وہ نسبت قبائل اور اس کے فروع کی جانب ہو یا آباواجداد کی جانب ہو، یا مذاہب اور تحریکات کی جانب ہو، یا مقامات ووطن کی جانب ہو، یا صنعت و حرفت کی جانب ہو یا صفات و عیوب کی جانب ہو، اسطرح سے یہ کتاب فن انساب میں ایک حسین گلدستہ ہے۔[4]

علامہ سمعانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کتاب کی سبب تالیف اور طریقہ تالیف کا ذکر مقدمہ کتاب میں کیا ہے، اور یہ بتایا ہے کہ میں فن کی تلاش و جستجو میں سرگرداں و حیران رہتا تھا، سفر میں ہمیشہ یہ کوشش رہتی تھی کہ ان نسبتوں اور ان کی حقیقت کے

---

(۱) الرسالة المستطرفة ص ۹٤، الانساب ۱/ ٥ مقدمه محقق

(۲) اللباب فی تهذيب الأنساب ۱/ ۸

(۳) الرسالة المستطرفة ص ۹۳

(٤) اللباب فی تهذيب الأنساب ۱/ ۸

بارے میں ماہرین انساب سے معلومات حاصل کروں اور جو معلومات ملتی تھیں اسکو جمع کرتا جاتا تھا، ایک مرتبہ اپنے پیشوا اور استاذ محترم ابو شجاع بسطامی سے ملاقات ہوئی تو آپ نے انساب پر ایک منظّم مجموعہ تیار کرنے کی ترغیب دلائی تو میں نے ۵۵۰ھ سے مقام سمرقند میں یہ کام کرنا شروع کر دیا۔(۱)

محتویات:- کتاب کو ایک مقدمہ سے شروع کیا ہے جس میں انساب کی معرفت اور اسکے حصول کیلئے کتاب و سنت کی روشنی میں رغبت دلائی گئی ہے، پھر رسول پاک ﷺ کے حسب ونسب کا ذکر کیا ہے، اس کے بعد ایک فصل بنی ہاشم کے حسب ونسب کیلئے اور ایک فصل قریش کیلئے مختص کیا ہے، پھر اہل عرب کے حسب ونسب اور کچھ مشہور قبائل جیسے قحطان، کھلان، قضاعۃ وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے بعد ازاں اصل کتاب (۱/ ۶۳) سے شروع ہوتی ہے۔(۲)

ترتیب:- کتاب کی ترتیب و تنظیم بڑی ہی مہارت اور دقت کے ساتھ حروف معجم پر کی گئی ہے جس کی ترتیب میں حرف اول سے لیکر حرف آخر تک رعایت کی گئی، لہٰذا یہ کتاب بڑی منظّم اور استفادہ کیلئے انتہائی سہل ہے۔

سب سے پہلے حرف الف سے شروع ہونے والے انساب کو ترتیب وار ذکر کیا ہے، حرف الف میں الف ممدودہ (مد) کو مقدم کیا ہے اسلئے کہ وہ دو الف کے قائم مقام ہوتا ہے، اسلئے الف کے بعد الف میں یہ ترتیب مقدم ہو جاتی ہے جیسے "الآبری"

نوعیت تراجم:- ترجمہ میں نسبت کی وضاحت کے بعد مذکورہ شخص حالات و سیرت کا ذکر کیا ہے جس میں صاحب ترجمہ کے اساتذہ و تلامذہ، مولد و وفات کیساتھ ساتھ علماء کے اقوال کا بھی ذکر کیا ہے۔ ابتدائی تالیف میں حکایات و واقعات نیز جرح و تعدیل کے معلومات کیلئے سند تحریر کرنا شروع کیا تھا لیکن پھر طوالت کی خوف سے اسناد کو حذف کر دیا۔

طریقہ استفادہ:- لہٰذا کسی بھی نسبت کو تلاش کرنے کیلئے سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ کس حرف سے شروع ہوتی ہے، پھر ترتیب حروف میں کسی جگہ

(۱) الأنساب للسمعانی ۱/ ۴ (۲) تفصیل کیلئے دیکھئے: مقدمہ کتاب ۱/ ۶۳

آسکتی ہے اس ممکنہ جگہ پر تلاش کرنے سے مطلوبہ نسبت فوراً مل سکتی ہے۔

تحقیق:- یہ کتاب علامہ شیخ عبدالرحمٰن معلمی یمانی رحمۃ اللہ علیہ (۱۳۸٦ھ) کی تحقیق سے حیدر آباد ہند سے طبع ہوئی ہے جو کئی جلدوں پر مشتمل ہے۔

اس تحقیق و تعلیق میں تحقیق کے علاوہ قابل ذکر اور قابل قدر عمل یہ ہے کہ محقق نے بہت سارے انساب کا استدراک حاشیہ میں کر دیا ہے جس سے یہ کتاب مزید مفید ہو گئی ہے، صرف حرف الف میں ایک سو چھہتر (۱۷٦) نسبتوں کا استدراک کیا ہے جو ایک نہایت اہم کام ہے۔

اختصار:- کتاب کی اہمیت کے پیش نظر علماء نے اس کا اختصار و تہذیب کیا ہے، انھیں میں سے علامہ ابن اثیر جزری (متوفی ٦۳۰ھ) ہیں جنہوں "اللباب فی تهذيب الانساب" میں اس کا اختصار کیا ہے۔ جسکا ذکر آگے آرہا ہے، انہیں میں سے علامہ قطب الدین محمد بن محمد خضیری شافعی (متوفی ۸۹۴ھ) ہیں جن کی کتاب "الاکتساب" ہے جس میں علامہ ابن اثیر کی "اللباب" اور علامہ رشاطی وغیرہ کی کتاب سے کچھ زوائد کا اضافہ کیا ہے۔[1]

اللباب فی تهذيب الأنساب

تالیف: ابن اثیر جزری (متوفی ٦۳۰ھ)

تعارف:- یہ کتاب حافظ عزالدین ابوالحسن علی بن محمد ابن اثیر جزری (متوفی ٦۳۰ھ) کی تالیف کردہ ہے، جو فن انساب کی ایک جامع اور مفید ترین کتاب ہے، اس میں حافظ ابن اثیرؒ نے علامہ سمعانی کی کتاب "الانساب" کو کچھ اضافہ کے ساتھ مختصر و مہذب کیا ہے، نیز ان سے کہیں کہیں جو لغزشیں ہو گئی تھیں ان کی اصلاح کر دی ہے۔

علماء کی نگاہ میں:- علامہ کتانی فرماتے ہیں: "واختصره ابن الأثير وزاد عليه أشياء أهملها و استدرك على مافاته و نبه على أغلاطه وهو كتاب مفيد جدا"[2] یعنی 'الانساب' کو ابن اثیر نے کچھ اضافہ کے ساتھ مختصر کر دیا

---

(۱) كشف الظنون ۱/۱۷۹، الرسالة المستطرفة ص ۹۳

(۲) الرسالة المستطرفة ص ۹۳

ہے اور ان سے فوت شدہ اشیاء کو جمع کر دیا ہے اور ان کی غلطیوں کی اصلاح کر دی ہے، یہ انتہائی مفید کتاب ہے۔

ابن خلکان فرماتے ہیں: "وهو أحسن من الأصل"[1] یہ اپنی اصل (الانساب) سے بھی بہتر ہے۔ یہ بہتری اس ناحیہ سے بھی ہے کہ اس میں انساب کی معرفت سمعانی کی کتاب کے مقابلے میں مختصر ڈھنگ سے کی گئی ہے ورنہ "الانساب" کا مقام اپنی جگہ مسلم ہے۔

سبب تالیف اور طریقه اختصار:- کتاب کے سبب تالیف اور طریقہ اختصار کا ذکر مؤلف نے کتاب کے مقدمہ میں تفصیل سے کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: "فن انساب کی اہمیت کے باوجود بہت سارے خاص و عام اس کی معرفت میں کورے نظر آتے ہیں، مختلف شخصیات، مختلف اُشیاء کی جانب منسوب ہیں جن کا پتہ کسی کو نہیں، بنا بریں ان نسبتوں میں تصحیف و تحریف اور بے حد غلطیاں ہوتی رہتی ہیں، اسلئے دل میں یہ خیال آیا کہ اس فن میں ایک کتاب ترتیب دوں لیکن بے بضاعتی اور کم علمی کی وجہ سے شش و پنج میں مبتلا رہا، اتفاق سے تاج الاسلام ابو سعد سمعانی کی کتاب مل گئی جو اپنے فن میں درِ بے بہا تھی۔

میں نے ان اس کا مطالعہ کیا اور نقل کرنا چاہا تو یوں محسوس ہوا کہ اس میں مؤلف نے کافی تتبع اور طوالت سے کام لیا ہے، حتیٰ کہ فن انساب سے زیادہ یہ فن تاریخ سے مشابہ ہو گئی، پھر اس میں کچھ غلطیاں بھی نظر آئیں لہٰذا نقل کی بجائے اختصار کا کام شروع کیا اور جو خامیاں نظر آئیں ان کی اصلاح بھی کر دی، اس اختصاری اور اضافی عمل میں مؤلف کے کلام میں کوئی تبدیلی نہیں کی، مؤلف نے جتنے تراجم اور نسبتوں کا ذکر کیا تھا اس میں سے کسی کو حذف نہیں کیا، البتہ ان تراجم میں جن مختلف اشخاص کو ذکر کیا تھا ان میں سے اکثر و بیشتر کو حذف کر کے ایک دو کو باقی رکھا، جن تراجم میں ایک یا دو ہی فرد کا ذکر تھا تو ان کو باقی رکھا ہے، البتہ ان کے دیگر حالات کو جن کا تعلق نسب سے نہیں تھا حذف کر دیا، ایسے تراجم پر حرف "م" کا رمز لگا دیا ہے جسکا

(۱) کشف الظنون ۱/۱۷۹

مطلب یہ ہے کہ یہ ترجمہ مکمل ہے، اس میں سے کوئی نام حذف نہیں ہے۔[1]

اصلاح و تکمیل:- ترجمہ میں کہیں کہیں افراد کی ترتیب بہتر نہیں تھی اس کو بہتر بنادیا، اسی طرح ایک نسبت کے تحت کبھی کبھی ایک فرد کو قدرے فرق کے ساتھ کئی بار ذکر کر دیا تھا، مثلاً ''ابو ثعلبہ خشنی'' کو تین بار ذکر کیا ہے اس کی اصلاح کر دی ہے۔ کبھی کبھی فرعی قبیلہ کی نسبت کسی بڑے قبیلہ کی جانب کرتے ہوئے چھوڑ دیا تھا مکمل نسبت بیان نہیں کی تھی، اس کو مکمل کر دیا ہے۔

اصحاب کلام و اصول کی جانب نسبت کرتے وقت ان کے مذہب کے بارے میں کچھ معلومات ذکر کی ہے اس کو اسی طرح برقرار رکھا ہے۔

کہیں کوئی غلطی مل گئی ہے تو اس کی اصلاح اظہارِ حق کیلئے کیا ہے نہ کہ غلطی کے اظہار کیلئے، کہیں ضبط میں خلل تھا یا ضبط کی ضرورت تھی تو اس خلل کو دور کر دیا گیا ہے اور اہمال ضبط درست کر دیا ہے، اسی طرح سے کسی قبیلے یا شہر وغیرہ کی جانب نسبت کرنے میں کوئی خلل رہ گیا تھا اس کو بھی ٹھیک کر دیا ہے۔

مصادر:- اکثر و بیشتر معلومات ہشام کلبی سے لیا ہے اس لئے کہ وہ علماء نسب میں سب سے زیادہ مشہور اور حافظ ہیں ان سے غلطیاں بہت کم ہوتی ہیں۔

اضافہ:- کچھ نسبتوں کا اضافہ کیا ہے جو مؤلف کے زمانہ میں یا اس سے پہلے پائی جاتی تھیں، جن نسبتوں کا وجود بعد میں ہوا ہے ان کا ذکر نہیں کیا ہے اس لئے کہ یہ استدراک نہیں بلکہ ذیل کی حیثیت رکھتی ہے۔[2]

ترتیب:- کتاب کی مکمل ترتیب وتنظیم (اصل کتاب) الانساب کی طرح حروف معجم پر بڑی دقت سے کی گئی، اسلئے استفادہ بہت آسان ہے۔ ان ساری خوبیوں کی وجہ سے یہ کتاب اپنی اصل پر فوقیت رکھتی ہے اور فنی اعتبار سے بڑی ممتاز کتاب ہے۔

اس کتاب ''اللباب'' کو امام سیوطیؒ نے کچھ اضافہ کے ساتھ مزید مختصر کیا ہے جس کا نام ''لب اللباب فی تحریر الأنساب'' رکھا ہے۔[3]

---

(۱) مقدمة اللباب فی تهذیب الأنساب ۱/۸۰۷

(۲) اللباب ۱/۱۲۰۹ (۲) الرسالة المستطرفة ص ۹۳

کچھ دیگر کتابیں یہ ہیں:

أنساب المحدثین :- یہ محبّ الدین محمد بن محمود بن نجار بغدادی (متوفی ۶۴۳ھ) کی تالیف ہے۔[1]

القبس:- پھر مجد الدین اسماعیل بن ابراہیم بلبیسی (متوفی ۸۰۲ھ) نے "القبس" کو "اللباب" کے ان اضافوں کے ساتھ ضم کر دیا جو "انساب سمعانی" پر انہوں نے کیا تھا اور ایک جدید تالیف تیار کی غالباً اس کا بھی نام "القبس" ہی رکھا۔[2] اسکا مصور نسخہ مخطوطات مصورہ میں پایا جاتا ہے۔ شیخ یمانیؒ کے پاس بھی اس کا ایک مصور نسخہ تھا جو مؤلف کے تحریر کردہ نسخہ سے تصویر شدہ ہے، البتہ اس کے نام کی تحقیق نہ ہو سکی۔[3]

الاکتساب فی تلخیص کتب الأنساب :- یہ قطب الدین محمد بن محمد بن عبداللہ دمشقی (متوفی ۸۹۴ھ) کی تالیف ہے، جس میں سمعانی کی "الانساب"، ابن اثیر کی "اللباب" اور بلبیسی کی "القبس" کو ملخص کر کے مرتب کر دیا، اس کی تیسری جلد موجود ہے جیسا کہ فہرس مخطوطات مصورہ سے پتہ چلتا ہے۔[4]

لب اللباب من تحریر الأنساب:- ان کے بعد امام سیوطیؒ (متوفی ۹۱۱ھ) نے ابن اثیر کی کتاب کو تلخیص کر کے کچھ اضافہ کیا ہے جس کا نام رکھا۔

ان کے علاوہ اور حضرات نے بھی کتابیں تصنیف کی ہیں۔[5]

☆☆☆

---

(۱) الرسالة المستطرفة ص ۹٤

(۲) کشف الظنون ۱/۱۳٤، الرسالة المستطرفة ص ۹٤

(۳) الأنساب ۱/۵ مقدمه محقق، الاکمال ۱/۱٦، مقدمه محقق، الرسالة المستطرفة ۹٤

(٤) الأنساب ۱/۵ مقدمه محقق، الرسالة المستطرفة ۹٤

(۵) الرسالة المستطرفة ۹٤، کشف الظنون ۱/۸۰

کتب خاصہ کی آٹھویں قسم

کتب موتَلِف و مُختَلِف

خدام سنت نبوی نے راویوں کے نام کنیت اور القاب کی وضاحت اور ان کو صحیح طور سے ادا کرنے کیلئے کچھ مخصوص کتابیں تیار کی ہیں، جنکے تحریر کرنے کا اصل مقصد تصحیف و تحریف کے وقوع سے طالبان علوم نبوت کو بچانا تھا، پس منظر میں جو کتابیں تحریر کی گئیں عمومی طور سے ان کو ”کتب موتلف و مختلف“ کہا جاتا ہے، اور دونوں میں اسی قربت کی وجہ سے ”کتب تصحیفات“ اور ”کتب موتلف“ کو ایک شمار کیا جاتا ہے۔

تصحیف و تحریف : تصحیف و تحریف کے معنی و مفہوم کا جو بنیادی محور ہے، وہ کسی کلمہ میں تبدیلی کا ہونا ہے، البتہ اس کی تعبیر و تعریف میں قدرے اختلاف پایا جاتا ہے، کچھ اہل علم کا خیال ہے کہ:

تصحیف:- حروف کے نقطوں یا حرکات میں تبدیلی خط کی شکل باقی رکھتے ہوئے کی جائے تو اس کو تصحیف کہتے ہیں۔

تحریف:- کسی چیز کو اس کی حقیقت سے بدل دیا جائے خواہ یہ تبدیلی کمی وزیادتی کی وجہ سے ہو، یا غیر مراد پر محمول کر کے ہو، تو اس کو تحریف کہتے ہیں۔(۱) لہٰذا تحریف عام ہے اور تصحیف خاص ہے۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ: کسی لفظ میں مخالفت یا چند حروف میں نقطہ کی تبدیلی سے کی جائے خط کی شکل وصورت باقی رہے تو اس کو تصحیف کہتے ہیں۔(۲)

اور اگر حرکت کی تبدیلی سے کی جائے خط کی شکل باقی رکھتے ہوئے تو اس کو تحریف کہتے ہیں۔

لہٰذا ان کے کہنے کے مطابق تصحیف حروف کے نقطوں کی تبدیلی کا نام ہے۔

مثلاً یزید کو بُرید کہنا، یا بُرید کو یزید کہنا، اور تحریف حروف کے حرکات سے تبدیلی کا نام ہے جیسے اُسید کو اَسید کہنا یا اَسید کو اُسید کہنا۔

---

(۱) تصحیفات المحدثین ۱/ ۳۹ (۲) نزهة النظر ص ۸۲

حافظ ابن حجرؒ کی تعریف میں دقت ضرور پائی جاتی ہے، لیکن یہ جامع تعریف نہیں ہے، کیونکہ اگر لفظ کی تبدیلی کر دی جائے یا شکل کی تبدیلی کر دی جائے تو ایسی صورت میں اس کو کیا کہیں گے، وہ اس تعریف میں شامل نہیں ہوتا، اور پہلی تعریف مانع نہیں ہے، اس لئے کہ بعض صورتوں میں تصحیف و تحریف کا اجتماع ممکن ہے، لہٰذا بہتر یہ ہے کہ دونوں تعریفوں کا یکجا کر کے اس طرح کہا جائے:

اگر حروف میں تبدیلی پائی جائے نقطوں یا حرکت کی وجہ سے اس کو تصحیف، اور اگر شکل یا معنی میں تبدیلی پائی جائے تو اس کو تحریف کہیں گے۔

راویان حدیث کا تعلق چونکہ مختلف علاقوں، مختلف ماحول اور مقامات سے رہا ہے، اس لئے ان ناموں کے تسمیہ پر علاقوں اور ماحول کا اثر رہا ہے، اور چونکہ راویوں کی ایک غیر معمولی تعداد ہے لہٰذا ان کے ناموں کے ادا کرنے میں غلطی، تصحیف و تحریف کا ہونا کوئی عجیب بات نہیں ہے، اس لئے کہ ان کا سارا دارومدار مجرد سماع پر ہوتا ہے، ان کے ضبط کیلئے کوئی قاعدہ نہیں ہوتا، اور نہ ہی ماقبل اور مابعد سے اسکا کوئی تعلق ہوتا ہے، جس طرح سے اول مرحلہ میں یہ وضع کیا گیا ہے، یا ادا کیا گیا ہے اسی ضبط سے وہ موسوم ہوتا ہے، لہٰذا جب تک ان کو مشائخ سے نہ سنا جائے، یا نہ پڑھا جائے تب تک ان کی غلطی اور تصحیف کا امکان رہتا ہے، بڑے بڑے اہل علم سے بھی کبھی کبھی غلطیاں ہو جاتی ہیں، اور بقول امام احمد بن حنبلؒ **"من يعرى عن الخطاء والتصحيف"**[1] غلطیوں اور تصحیفات سے کون بچ سکتا ہے؟

لیکن جب غلطیاں بکثرت سرزد ہونے لگیں تو وہ عیب کے ضمن میں آجاتی ہیں، یہ غلطیاں صرف راویان حدیث کے ناموں کیساتھ خاص نہیں ہوتیں بلکہ ادب و لغت اشعار وغیرہ میں بھی سرزد ہوتی ہیں، البتہ محدثین ایسے شخص کی روایت سے پرہیز کرتے تھے اور اپنے شاگردوں کو یہ ہدایت دیتے تھے کہ **"لا تأخذو الحديث عن الصحفيين"**[2]

اسباب وانواع تصحیف:- اہل علم وفن سے پڑھے بغیر کتابوں کے مطالعہ پر

(۱) مقدمة ابن الصلاح ص ۲۵۲ (۲) الجرح والتعديل ۲/ ۳۱

اعتماد کرنے سے اسماء وکنی کے پڑھنے میں تصحیفات بکثرت ہوتی ہیں، ایسے تصحیف کو تصحیف بصر کہا جاتا ہے۔

کبھی کبھی حروف کے مخارج قریب ہونے کیوجہ سے کہنے والا کچھ کہتا ہے اور سننے والا کچھ سمجھ لیتا ہے، جو غلطی اور تصحیف کا سبب بن جاتا ہے، اسکو تصحیف سمع کہا جاتا ہے،(۱)

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کہنا کچھ چاہتا ہے سبقت لسانی کے طور پر زبان سے کچھ اور نکل جاتا ہے سننے والا اسی طرح ادا کرتا ہے اسکو تصحیف لسان کہا جاسکتا ہے۔

تصحیفات عموماً لفظی ہوتے ہیں، کبھی کبھی معنوی بھی ہو جاتے ہیں،(۲)

تصحیف کا وقوع سند متن دونوں میں ہوتا ہے، سند حدیث میں تصحیف کی ایک مضحکہ خیز مثال یہ ہے کہ روایت کرنے والے نے سند حدیث ''عن جبرئیل، عن الله عزو جل ''کو ''عن جبرائیل، عن الله، عن رجل '' پڑھ دیا(۳)

اسلیئے اہل علم نے اسماء رجال، ان کی کنیت اور القاب و نسبت وغیرہ کے ضبط میں جس میں تصحیف کا امکان تھا، بڑی توجہ دی ہے، اصول حدیث کی کتابوں میں اس کیلئے خاص باب مختص کیا گیا ہے، اور اس فن میں مختلف النوع کتابیں تصنیف کی گئی ہیں، بعض کتابوں میں ضبط تحریر کے قائدے بتائے گئے ہیں، اور بعض میں مشکل کلمات کو جمع کیا گیا ہے، جبکہ بعض کتابوں میں ان تصحیفات کا ذکر کیا گیا ہے جو راویوں سے سرزد ہوئی ہیں، ان جملہ کتابوں کو ''کتب موتلف و مختلف'' یا ''کتب تصحیفات'' کہا جاتا ہے۔

مولفات:- ان بنیادی کتابوں میں:

تصحیف العلماء : علامہ ابن قتیبہ (متوفی ۲۷۶ھ) کی

التنبیه علی حدوث التصحیف : حمزہ بن حسن اصبہانی (متوفی ۳۶۰ھ)

شرح ما یقع فیه التصحیف والتحریف اور تصحیفات المحدثین: علامہ ابو احمد عسکری، (متوفی ۳۸۲ھ) کی

تصحیفات المحدثین : امام دار قطنی (متوفی ۳۸۵ھ) کی کتابیں ہیں

ان کے علاوہ تقیید المهمل : ابو علی غسانی (متوفی ۴۹۸ھ) کی

(۱) مقدمة ابن الصلاح ص ۲۵٦ (۲) فتح المغیث ٤/ ٦١

(۳) تصحیفات المحدثین ١/ ١٤

مشارق الأنوار : قاضی عیاض یحصبی (متوفی ۵۴۴ھ) کی

مطالع الأنوار : ابن قرقول (متوفی ۵۶۹ھ) وغیرہ کی اہم کتابیں ہیں۔[1]

موتلف و مختلف :- یہ دونوں کلمے اسم فاعل ہیں جو معنی میں ایک دوسرے کے ضد ہیں۔

موتلف:- کلمہ "ائتلاف" سے ماخوذ ہے، جس کا معنی ہے ملنا اور مجتمع ہونا، موتلف ان کلموں کو کہا جاتا ہے جن کے حروف کی شکل یکساں ہو۔

مختلف :- کلمہ "اختلاف" سے ماخوذ ہے، جسکا معنی ہے متفرق اور جدا ہونا، مختلف ان کلموں کو کہتے جن کے تلفظ جدا جدا ہوں، اصطلاحی تعریف کے اعتبار سے۔

موتلف و مختلف :- ان کلمات کا کہا جاتا ہے جو تحریر میں یکساں ہوں لیکن تلفظ جدا جدا ہوں[2]

اس کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں مثلاً:

۱- حروف کی شکل یکساں ہو لیکن حرکات جدا جدا ہوں جیسے سلام، سلّام۔

۲- حروف کی شکل یکساں ہو لیکن نقطے جدا جدا ہوں جیسے بزار، بزاز۔

۳- حروف کی شکل تحریر میں یکساں ہو لیکن حقیقت میں جدا جدا ہو، جیسے زنیر، زنین

جس زمانہ میں کتابوں کی طباعت نہیں ہوتی تھی بلکہ قلمی تحریر پر ہی اکتفاء کیا جاتا تھا جس میں نقطوں کا اہتمام بھی نہیں کیا جاتا تھا اس وقت ان دونوں کلموں کی تحریر میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا تھا البتہ جدید طباعت کے دور میں دونوں کے خط میں فرق واضح ہے۔

اسباب:- بہت سارے حروف کی شکلوں میں مشابہت کا پایا جانا، (مثلاً ب ت ث) اور بہت سارے حروف جو نقطے والے ہیں ان پر نقطوں کا نہ لگانا، (مثلاً ز ژ ش ج،) وغیرہ نیز بہت سارے ہم شکل کلمات جو مختلف حرکات کے ہوتے ہیں، ان پر حرکتوں کا نہ لگانا، (مثلاً اُصیر، نُصیر) اس فن کے بنیادی اسباب ہیں۔[3]

ضرورت:- یہ ایک ایسا علم ہے جس کے محتاج شعراء، مورخین، مفسرین، سب

---

(۱) تصحیفات المحدثین مقدمہ محقق ۱/ ۲۸

(۲) مقدمة ابن الصلاح ص ۳۱۰ (۳) مقدمة تکملة اکمال الاکمال ص ۷ م

ہی ہوتے ہیں لیکن محدثین اسکے زیادہ محتاج ہوتے ہیں، اسی وجہ سے انہوں نے ضبط پر سب سے زیادہ توجہ دی ہے، اور یہ فرمایا ہے کہ: "أولى الأشياء بالضبط أسماء الناس لأنه شئ لا يدخله القياس ولا قبله شئ ولا بعده شئ يدل عليه"(۱)

یعنی اولین چیزیں جن کے ضبط کی ضرورت پڑتی ہے، وہ لوگوں کے نام ہیں اس لئے کہ یہ ایسی چیزیں ہیں جن میں قیاس کا کوئی دخل نہیں ہوتا، اور نہ ہی اس کے ما قبل ومابعد کوئی چیز ہوتی ہے جو اس پر دلالت کرے۔

وجود:- ضبط و تحریر کے یہ مسائل جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے فن اصول حدیث کا ایک اہم باب ہیں، اس کے علاوہ فن رجال و تاریخ میں تحریر کی جانے والی کتابوں میں کا فی حد تک مشکل اسماء والقاب اور کنی کا ضبط ہوتا ہے، علامہ ابن کثیر کی ''الکامل فی التاریخ'' اور حافظ ابن حجرؒ کی ''تقریب التہذیب'' اس کا بین ثبوت ہیں پھر بھی صرف اسی پر اکتفاء نہ کرتے ہوئے محدثین نے اس فن میں مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں، علامہ کتانی نے ''الرسالۃ المستطرفۃ'' میں اس فن کی کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ڈاکٹر موفق بن عبد القادر نے امام دار قطنی کی کتاب " المؤتلف والمختلف " کے مقدمہ میں اس فن میں تقریباً ساٹھ کتابوں کا ذکر کیا ہے، جس میں زیادہ تر نایاب و مفقود کتابیں ہیں، ان میں سے جو موجود یا مطبوع ہیں انکا ذکر حاشیہ میں کر دیا گیا ہے۔(۲)

اسی طرح سے علامہ معلّمی یمانی نے ''مقدمۃ الاکمال'' میں، مصطفیٰ جواد نے مقدمۃ" تكملة اكمال الاكمال "میں، نیز ڈاکٹر اکرم ضیاء عمری نے" بحوث في تاريخ السنة " میں ان کی تفصیل ذکر کی ہے۔

پہلی تالیف:- فن موتلف ومختلف میں جو سب سے پہلی تالیف:

الموتلف والمختلف في أسماء القبائل:- ہے، جو ابو جعفر محمد بن حبیب بغدادی (متوفی ۲۴۵ھ) کی تالیف ہے، البتہ علامہ سخاوی کے کہنے کے مطابق اس فن میں سب سے پہلی تصنیف عبد الغنی بن سعید ازدی (متوفی ۴۰۹ھ) کی ہے جس کا نام" الموتلف والمختلف في أسماء نقلة الحديث "ہے اس کے بعد ان

---

(۱) الموتلف والمختلف للازدی ص ۲ (۲) دیکھئے ۱/ ۶۹-۸۰

کے استاذ امام دار قطنی (متوفی ۳۸۵ھ) کی تالیف "المؤتلف والمختلف" ہے۔

شاید امام سخاوی کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اسماء محدثین سے متعلق امام ازدی کی کتاب سب سے پہلی تصنیف ہے، ورنہ ابن حبیب کی کتاب پہلی تصنیف ہے لیکن وہ اسماء محدثین پر نہیں بلکہ قبائل پر ہے۔ اس فن کی جو مطبوعہ کتابیں ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱- الموتلف والمختلف فی أسماء نقلة الحدیث

تالیف: حافظ عبد الغنی ازدی (متوفی ۴۰۹ھ)

یہ کتاب حافظ عبد الغنی بن سعید ازدی (متوفی ۴۰۹ھ) کی تالیف ہے، جسکو "مشتبہ الاسماء" بھی کہا جاتا ہے، اس میں ان ناموں کا تذکرہ ہے جس میں تشابہ و تصحیف کا امکان ہوتا ہے، ان ناموں کو آپ نے حروف معجم پر مرتب کر دیا ہے، اور یہ وضاحت کر دی ہے کہ مذکورہ نام کے افراد کون کون سے ہیں، عموماً ان کا مختصر تعارف بھی کر دیا ہے، اسلئے یہ کتاب مختصر ہونے کے باوجود انتہائی مفید ہے، اس کتاب کی تالیف کے بعد حافظ عبد الغنی نے اس فن سے متعلق ایک کتاب اور تحریر کی ہے، جس کا نام " مشتبة النسبة " ہے، اس کتاب میں آپ نے ان نسبتوں کا ذکر کیا ہے جو مشکل اور متشابہ ہیں، اس کتاب کی تالیف سابقہ کتاب کے بعد کیا ہے جس کا اظہار آپ نے یوں فرمایا ہے:

موتلف و مختلف اسماء محدثین کے سلسلہ میں تالیف کرنے کے بعد جب اس طرف توجہ گئی کہ بہت سارے لوگ قبیلہ و وطن، صنعت و حرفت کی جانب منسوب ہوتے ہیں، اس میں بعض نسبتیں ایسی ہیں جن میں تصحیف کا امکان ہے، لہٰذا مناسب معلوم ہوا کہ ایسی کتاب تالیف کی جائے جس میں مشتبہ نسبتوں کا ذکر کر دیا جائے تاکہ جس کو اس کا علم نہیں ہے اس کو بھی علم ہو جائے "مشتبہ النسبة" بھی حروف معجم پر حرف اول کے اعتبار سے مرتب ہے، دونوں کتابوں کا منہج تحریر بالکل یکساں ہے، مشتبہ ناموں و نسبتوں کی وضاحت کے ساتھ ساتھ اس سے روایت کرنے والے اور جن سے اس نے روایت کیا ہے اس کا بھی تذکرہ عموماً کر دیا ہے، کلمات جرح و تعدیل کا استعمال بھی کہیں کہیں کیا ہے، مثلاً ضعیف، ثقہ، قلیل الحدیث وغیرہ، عموماً راوی و

مروی عنہ ہی پر اکتفاء کیا ہے، البتہ صحابی کی صحبت کی صراحت کر دی ہے، کسی خاص واقعہ نیز منصب کا بھی ذکر کہیں کہیں کر دیا ہے۔

اس کتاب کی تالیف میں اپنے استاذ امام دار قطنی سے بھرپور استفادہ کیا ہے، کتاب کی تالیف مکمل ہو جانے کے بعد جب امام دار قطنی نے اس کو بطور تشجیع و ہمت افزائی اپنے شاگرد سے سننا چاہا تو انہوں نے جواب دیا کہ زیادہ تر تو آپ ہی کی بتائی ہوئی باتیں ہیں، آپ اس کو کیا سنیں گے؟ امام دار قطنی نے جواب دیا کہ آپ نے مجھ سے متفرق معلومات حاصل کیا ہے، اس میں بہت ساری چیزیں ایسی ہیں جو آپ نے اپنے دیگر مشائخ سے جمع کیا ہے لہٰذا میں سننا چاہتا ہوں، چنانچہ انہوں نے اپنے استاذ کو پڑھ کر سنا دیا، اس طرح سے ایک امام وقت کی تائید اس کو حاصل ہے۔[۱]

حافظ ازدی کی یہ دونوں کتابیں ایک ہی جلد میں مطبوع ہیں۔ مطبع انوار احمدی الہ آباد ہند نے اسکو طبع کیا ہے، پہلی کتاب (۱۳۵) صفحات اور دوسری کتاب (۸۰) صفحات پر مشتمل ہے۔

۲- تصحیفات المحدثین

تالیف: ابو احمد حسن بن عبد اللہ بن سعید عسکری (متوفی ۳۸۲ھ)

علامہ عسکری کے ترجمے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس فن میں تین کتابیں تالیف کی ہیں۔

۱- شرح ما يقع فيه التصحيف والتحريف

۲- تصحيفات المحدثين ۳- المؤتلف والمختلف.

امام سخاوی کے کہنے کے مطابق آپ نے سب سے بڑی کتاب "سائر ما يقع فيه التصحيف من الأسماء والألفاظ" تالیف کی ہے، پھر اسی سے ایک اور کتاب "مايقع فيه التصحيف من ألفاظ اللغة والشعرو أسماء الشعراء والفرسان وأخبار العرب وأيامها ووقائعها وأماكنها وأنسابها" تیار کیا ہے پھر ایک اور کتاب تیار کی جو محدثین کے ساتھ خاص ہے، یہی تیسری کتاب تصحیفات المحدثین ہے۔[۲]

---

(۱) تذكرة الحفاظ ۳/ ۱۰۴۹ مقدمة المؤتلف والمختلف ۷۲ .

(۲) مقدمة تصحيفات المحدثين ۱/ ۳۰

اقسام: -اس کتاب کو مولف نے تین قسموں پر تقسیم کیا ہے:

پہلی قسم میں تصحیف اور اہل تصحیف کی مذمت، اتقان اور متقنین کی مدحت، مصحفین سے پڑھنے میں قباحت، مضحکہ خیز تصحیفات کے نمونے اور بعض اہل علم کے اوہام کا ذکر کیا ہے۔یہ قسم مطبوعہ نسخہ میں ۱/۳ سے ۱/۴۴ پر مشتمل ہے۔

دوسری قسم میں قرآن وسنتِ رسول میں جو تصحیفات ہوئے ہیں ان کا ذکر ہے، تصحیفات قرآن برائے نام صرف ۳ صفحہ میں ہے البتہ تصحیفات حدیث پر کافی گفتگو کیا ہے، یہ قسم ۱/۴۴ سے شروع ہے اور ۱/۳۵۹ پر ختم ہے، جہاں مطبوعہ نسخہ کی پہلی جلد مکمل ہوتی ہے۔

تیسری قسم جو اصل کتاب ہے اور جو یہاں پر مطلوب ہے اس میں ان اسماء کا ذکر کیا ہے جو تصحیف کے قابل ہیں البتہ اس میں کسی خاص ترتیب کا خیال نہیں کیا ہے۔اس لئے پہلا کلمہ جو مطبوعہ نسخے کے دوسری جلد سے شروع ہے، خُباب، حُبَاب، خَبّاب، اور جناب ہے۔جو نام زیادہ مشہور اور کثیر الاستعمال ہے اور روایتوں میں جس کا نام زیادہ آتا ہے، صرف اسی کو ذکر کیا ہے۔

محقق کتاب کا کہنا ہے کہ مؤلف نے تو ایسے ہی کہا ہے لیکن اس کے باوجود اس میں بہت سارے غریب نام بھی ہیں، خاص طور سے باب الا فراد میں۔ بعض تراجم مطول، بعض متوسط اور بعض بہت مختصر ہیں، عموماً تراجم کسی حدیث یا واقعہ کے ذکر کرنے اور اس پر اضافی معلومات دینے کی وجہ سے طویل ہوتے ہیں ورنہ عموماً راوی کے حالات سے متعلق اس کے استاذ وشاگرد کا ہی ذکر رہتا ہے۔

یہ کتاب اس فن کی اہم اور بنیادی کتابوں میں سے ہے، مؤلف نے اپنی فنی مہارت کو بروئے کار لاتے ہوئے گرانقدر معلومات فراہم کیا ہے۔

کتاب کی تحقیق استاذ گرامی جناب ڈاکٹر محمود احمد میرہ حفظہ اللہ نے کیا ہے، جو تین جلدوں میں قاہرہ سے مطبوع ہے، کتاب کے آخر میں فہرست لگا دیا ہے، جس کی وجہ سے استفادہ آسان ہو گیا ہے۔

۲- المؤتلف والمختلف

تالیف: امام دار قطنی (متوفی ۳۸۵ھ)

تعارف: - امام دار قطنی کی یہ کتاب اس فن کی انتہائی اہم اور وسیع کتاب ہے، جس میں محدثین کرام اور راویان حدیث کے مشتبہ اسماء و کنیٰ اور القاب کا ذکر کیا گیا ہے، ان کے علاوہ دیگر اشخاص فقہاء، ادباء، شعراء وغیرہ نیز اسماء قبائل و مقامات کا بھی ذکر کیا ہے، حتیٰ کہ بعض لغوی کلمات جو مشتبہ ہوتے ہیں ان کو بھی کتاب میں شامل کر لیا ہے۔(۱)

آپ کے بعد آپ کے شاگرد رشید عبد الغنی بن سعید ازدی (متوفی ۴۰۹ھ) نے اس فن میں کتاب تحریر کی جس میں آپ کے علم کا خلاصہ ہے، لہٰذا آپ کی یہ تالیف فنی اعتبار سے پہلی تالیف ہے، حالانکہ امام سخاوی کا کہنا ہے کہ آپ کے شاگرد کی کتاب مقدم اور استاذ کی کتاب مؤخر ہے۔(۲)

کتاب کا ابتدائی حصہ اب تک مل نہ سکا اس لئے مطبوعہ نسخہ ناقص ہے، جو حرف باء کے "باب بُجیر" سے شروع ہوتا ہے، لہٰذا کتاب کا مقدمہ بھی دستیاب نہیں جس سے پتہ چلتا کہ امام دار قطنی نے اپنا طریقہ اور منہج تالیف، مصادر اور سبب تالیف وغیرہ کا ذکر کس طرح سے کیا ہے، البتہ کتاب کے مطالعہ سے جو خاکہ ذہن میں بنتا ہے وہ یہ ہے کہ:

ترتیب: - کتاب کی ترتیب بنیادی طور سے حروف معجم پر ہے، ان حروف کو ابواب پر مرتب کیا ہے، جب کہ بعض کلمات کے لئے بھی باب کا استعمال کیا ہے، اس ترتیب میں صرف پہلے کلمہ کا اعتبار کیا ہے، دوسرا کلمہ جو اس کے مشابہ ہے اس کا خیال نہیں کیا ہے، اور نہ ہی اس فن میں یہ ممکن ہے، مثلاً کلمہ بُدیل کے ساتھ بُذیل، تذیل، یذیل سب کا ذکر کرنا پڑتا ہے، ایسے ہی کلمہ بُرید کے ساتھ بَرَید، برند، یزید، تزید، کا ذکر کیا جاتا ہے۔

کہیں کہیں باب کے تحت کوئی ایسا نام ذکر کر دیا ہے جو مشتبہ ہے، پھر اس نام کے جتنے افراد پائے جاتے ہیں یا حسب و نسب میں جہاں وہ مستعمل ہیں ان کا ذکر کر دیا ہے، مثلاً مطبوعہ نسخہ کا پہلا باب جو باب بجیر سے شروع ہوا ہے اس کے تحت اس نام

(۱) المؤتلف والمختلف ۱/۸۵ مقدمہ مؤلف (۲) فتح المغیث ۴/۲۳۰-۲۳۱

کے جتنے افراد ہیں یاان کے نام ونسب میں یہ کلمہ موجود ہے ان سب کاذکر کردیاہے۔
باب کے تحت ذکر کیے جانے والے اسماء، کنی، القاب وغیرہ کے ذکر میں کوئی خاص ترتیب نظر نہیں آتی، کہیں نام مقدم ہے کہیں لقب، تو کہیں کنیت، بلکہ بعض جگہوں پر خواتین کانام مقدم کردیاہے۔(۱)
ہر حرف کے تحت جو داخلی ابواب ہیں ان میں کوئی بھی خاص ترتیب نہیں۔
مصادر:- اس کتاب کیلئے مختلف فنون کی کتابوں خاص طور سے جرح وتعدیل کی مختلف انواع کی کتابوں سے مدد لی ہے۔ ساتھ ساتھ ذاتی معلومات جو بذریعہ مشائخ و تجارب حاصل ہوئی تھی شامل کیاہے۔
نوعیت تراجم:-صاحب ترجمہ کے استاذ و شاگرد اور کہیں کہیں بطور مثال حدیث بھی ذکر کی گئی ہے، جس میں اسناد کا اہتمام کیا گیاہے، اس اسناد میں صاحب ترجمہ کانام مذکور ہے۔
اس کتاب میں امام دار قطنی نے کہیں کہیں جرح وتعدیل کا بھی ذکر کیاہے، محقق کتاب کے اعداد وشمار کے مطابق اس طرح کے جملہ ۱۳۲ راوی ہیں۔(۲)
ایک خاص بات یہ ہے کہ اس کتاب میں امام دار قطنی نے ائمہ حدیث کے اوہام واغلاط کوذکر کرکے اس کی تصحیح فرمادی ہے۔(۳)
چونکہ یہ فن انتہائی غامض ہوتاہے، جو کسی قانون قاعدہ کے تحت نہیں آتا بلکہ مجرد سماع پر اس کادار و مدار ہوتاہے، لہٰذا اس میں وہم اور غلطی کاامکان زیادہ ہوتا ہے، بنابریں امام دار قطنی سے بھی غلطیاں ہوئی ہیں، جس کی تصحیح خطیب بغدادی اور ابن ماکولانے کی ہے، نیز ان کی غلطیوں کی اصلاح ان کے بعد کے حضرات نے کی ہے۔
علماء کی نگاہ میں:- چونکہ یہ کتاب انتہائی اہم تھی جس پر امام دار قطنی کی مہارت اور فنی ترتیب کا اثر تھا، لہٰذا اہل علم نے اس پر بھرپور اعتماد کیاہے، اور جن لوگوں نے اس کے بعد رجال حدیث یا اس فن پر کتابیں تحریر کی ہیں انہوں نے اس

---

(۱) مصدر سابق ۸۷/۱ (۲) مصدر سابق ۸۸/۱
(۳) مقدمہ محقق ۹۳/۱-۹۴

کتاب کو رہبر بنایا ہے، بلکہ علامہ ابن ماکولا نے اپنی کتاب ''الاکمال'' میں اور امام سمعانی نے ''الأنساب'' میں اس کتاب کی زیادہ تر معلومات کو تحریر کرلیا ہے۔

امام دار قطنی کی اس کتاب کے بارے میں امام سخاوی فرماتے ہیں کہ ''وھو کتاب حافل'' وہ بڑی عظیم کتاب ہے، خطیب بغدادی نے امام دار قطنی اور ابو سعید ازدی کی کتاب پر ذیل تحریر کیا ہے، پھر حافظ ابن ماکولا نے سب کو جمع کر کے کچھ اضافہ کے ساتھ ایک جامع کتاب تیار کی ہے، جو ''الاکمال'' کے نام سے مشہور ہے۔[۱]

٤- الاکمال

تالیف: حافظ ابن ماکولا (متوفی ۴۸۷ھ)

مصادر:- یہ کتاب فن موتلف و مختلف کی انتہائی مشہور اور جامع کتاب ہے، جس کا مکمل نام: ''الاکمال فی رفع الإرتیاب عن المؤتلف والمختلف فی الأسماء والکنی والأنساب'' ہے، اس میں امام دار قطنی، حافظ عبدالغنی ازدی، خطیب بغدادی جیسے نامور شخصیات کے علم کے ساتھ ساتھ ابن ماکولا کا کمال بھی شامل ہے۔

سبب تالیف:- سبب تالیف کے بارے میں مولف فرماتے ہیں کہ: امام دار قطنی، خطیب بغدادی وغیرہ کی کتاب دیکھنے کے بعد یہ خیال پیدا ہوا کہ اس فن میں ایک ایسی کتاب تحریر کر دی جائے جو ان کتابوں کو شامل ہو اور ان میں جو نہیں آسکا ہے اسمیں داخل ہو جائے۔[۲]

چنانچہ اس کتاب کو جامع اور مفید تر بنانے کی نیت سے تالیف کیا جس میں پوری طرح کامیاب رہے۔

ترتیب:- کتاب کو حروف معجم کی ترتیب پر مرتب کر دیا گیا ہے تاکہ استفادہ میں آسانی ہو۔

طریقۂ تحریر:- طریقۂ تحریر یہ ہے کہ باب کے تحت مشتبہ نام ذکر کر کے مختلف صورتوں میں جو فرق ہے اس کو واضح کر دیا ہے، اور یہ بتا دیا ہے کہ اس میں سے ہر ایک نام سے کون کون حضرات مراد ہیں۔ مثلاً أجمد، أحمد، أحمر میں یہ واضح کر دیا ہے

(۱) فتح المغیث ٢٣١/٤
(۲) تکملة اکمال الاکمال لابن الصابونی مقدمہ محقق ص ١٥

کہ اُجمد جو حرف جیم سے ہے وہ اُجمد بن عجیان ہیں، احمد مشہور ہے اس نام کے بے شمار لوگ ہیں اور اُحمر، آخر میں راء سے مراد اُحمر بن جزء سدوسی صحابی ہیں۔

اس طرح سے یہ کتاب ضبط اسماء کے ساتھ معجم رجال حدیث بھی ہے۔(۱)

علماء کی نگاہ میں:- ابن خلکان فرماتے ہیں کہ: یہ کتاب التباس کے ختم کرنے، ضبط اور تحریر و تدقیق میں کیا ہی خوب تر ہے، اسی پر محدثین اور علماء فن کا اعتماد رہا ہے، اس لئے کہ اس طرح کی خوبیوں والی کتاب اس فن میں تحریر نہیں کی گئی۔(۲)

علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ: خطیب بغدادی نے امام دار قطنی اور عبدالغنی ازدی کی کتابوں کو جمع کر کے "المؤتنف فی تکملة المؤتلف والمختلف" تحریر کی تھی، ابن ماکولا نے اس پر اضافہ کر کے "الاکمال" کے نام سے ایک کتاب تحریر کی جو انتہائی مفید ہے، اس طرح کی کتاب اس فن میں نہ تو اس سے پہلے تحریر کی گئی اور نہ بعد میں، سوائے ابن نقطہ کے استدراک کے جو انہوں نے اس پر کیا ہے۔(۳)

امام سخاوی فرماتے ہیں کہ: اس کتاب کی تالیف کے بعد جو بھی محدث آیا اسی پر اعتماد رہا۔(۴)

سابقہ کتابوں پر اضافہ کیساتھ ساتھ ان کے اغلاط کی اصلاح بھی کر دی ہے جس سے یہ کتاب اور بہتر ہو گئی ہے۔

مذکورہ کتاب علامہ معلمی یمانیؒ کی تحقیق سے حیدر آباد ہند سے چھپی ہوئی ہے، اس کی مصور طباعت بازاروں میں دستیاب ہے، یمانی صاحب کا مقدمہ انتہائی مفید اور قابل مطالعہ ہے۔

۵-الموتلف والمختلف:- تالیف: ابوالفضل محمد بن طاہر مقدسی (متوفی ۵۰۷ھ)

بعض حضرات نے کتاب کا نام صرف "الموتلف والمختلف" بتلایا ہے، جبکہ "بحوث فی تاریخ السنة" میں من الاسماء کا اضافہ ہے۔ جو اضافہ موضوع سے مطابقت نہیں رکھتا اس کیلئے کہ اس کتاب میں ایسے انساب کا ذکر ہے، جو تحریر میں

---

(۱) تکملة اکمال الاکمال مقدمه محقق، ص ۱۵ (۲) شذرات الذهب ۳/۳۸۱-۳۸۲

(۳) البداية والنهاية ۱۲/۱۳۳ (۴) فتح المغيث ۴/۲۳۱

یکساں، نیز شکل و حرکت میں مماثل ہوں، یہی کتاب ایک تیسرے نام "الأنساب المتفقة فی النقط و الضبط" کے نام سے مطبوع ہے۔

٦- **إکمال الاکمال**:- تالیف ابو بکر محمد بن نقطہ (متوفی ٦٢٩ھ) یہ کتاب علامہ ابن ماکولا کی کتاب "الاکمال" پر بحثیت ذیل تحریر کی گئی ہے جو ذیل کے ساتھ ساتھ استدراک بھی ہے، جامعہ ام القری مکہ مکرمہ میں اس کتاب کی تحقیق شیخ عبدالقیوم بن عبدالرب النبی نے کی ہے۔

٧- **تکملة اکمال الاکمال فی الأنساب والأسماء والألقاب**: تالیف ابو حامد محمد بن علی صابونی (متوفی ٦٨٠ھ)

یہ کتاب ابن نقطہ کی سابقہ تالیف پر ذیل و مستدرک ہے، جو تراجم ابن نقطہ سے فوت ہوگئے تھے یا انکی وفات کے بعد ظاہر ہوئے تھے ان کا اضافہ کیا ہے، کتاب میں راویان حدیث کے علاوہ دیگر مختلف اصناف کے افراد مثلاً شعراء، ادباء، مورخین، اطباء، وزراء و امراء وغیرہ کا بھی تذکرہ کیا ہے، البتہ محدثین کے تراجم کا زیادہ اہتمام کیا ہے۔[1]

کتاب کی ترتیب حروف معجم پر ہے لیکن صرف پہلے حرف کا خیال کیا گیا ہے اس لئے کہ اس فن میں مکمل ترتیب کا التزام ناممکن ہے، یہ کتاب مصطفیٰ جواد کی تحقیق سے مطبوع ہے۔

٨- **المشتبه فی أسماء الرجال وأنسابهم**: تالیف: ابو عبداللہ محمد بن احمد ذہبی (متوفی ٧٤٨ھ)

یہ کتاب بنیادی اعتبار سے حافظ عبدالغنی ازدی، ابن ماکولا، ابن نقطہ اور امام ذہبی کے استاذ ابن فرضی کی کتابوں کا خلاصہ ہے، کچھ معلومات کا اضافہ مؤلف نے اپنی طرف سے بھی کیا ہے، کتاب حروف معجم پر مرتب ہے، اس کتاب میں مشتبہ اسماء و انساب کو حروف کے بجائے حرکت سے ضبط کیا ہے، کسی بھی قسم میں ناموں کا ذکر مکمل نہیں کیا، بلکہ وغیرہم کہہ کر کام چلانے کی کوشش کی ہے، لہٰذا اس کتاب سے

---

(١) تکملة اکمال الاکمال ٤٥-٤٧ مقدمہ محقق

استفادہ کرنے والا شخص اس وقت حیران ہو کر رہ جاتا ہے، جو کسی مشتبہ نام کی معرفت چاہتا ہے، اور وہ اس میں موجود نہیں ہے کہ آخر اس مطلوبہ نام کو وہ کس قسم میں شمار کرے، جب کہ دونوں قسموں میں وغیرہم موجود ہے۔[۱]

یہ کتاب علی محمد بجاوی کی تحقیق سے مطبوع ہے۔

۹- ذیل مشتبه النسبة:- تالیف: محمد بن رافع سلامی (متوفی ۷۷۴ھ)

یہ کتاب امام ذہبی کی سابقہ کتاب پر بطور ذیل تحریر کی گئی ہے، جس کی تحقیق ڈاکٹر صلاح الدین منجد نے کی ہے، جو دار الکتاب الجدید بیروت سے مطبوع ہے۔

۱۰-الاعلام بما وقع فی مشتبہ النسبة للذهبی من الأوهام:-

تالیف: ابن ناصر الدین (متوفی ۸۴۲ھ)۔

کتاب کے نام سے موضوع واضح ہے اس کی تحقیق شیخ عبد رب النبی نے کی ہے۔[۲]

۱۱- تبصير المنتبه بتحرير المشتبه

تالیف: حافظ ابن حجر عسقلانی (۸۵۲ھ)

یہ کتاب بھی جیسا کہ نام سے واضح ہے امام ذہبی کی کتاب "المشتبه" سے متعلق ہے، جب حافظ ابن حجر نے اس کتاب کو دیکھا تو اس میں ان کو تین بنیادی خامیاں نظر آئیں۔

۱- مشکل اسماء کو حروف کے بجائے حرکات سے ضبط کیا تھا لہٰذا ضبط میں وقت بر قرار نہیں رہ گئی، کیونکہ حرکات کے بدلنے کا بہت زیادہ امکان ہوتا ہے۔

۲- دوسری خامی یہ تھی کہ کتاب کو انتہائی مختصر کر دیا، مشکل ناموں کے ذکر کرنے کے بعد ہر قسم میں چند مثال دے کر وغیرہم کہہ کر کام چلایا ہے، جس سے التباس بر قرار رہ گیا۔

۳- بہت سارے تراجم جو ان کی معتمد علیہ چاروں کتابوں میں سے کسی نہ کسی میں موجود تھے ان سے فوت ہو گئے۔[۳]

---

(۱) فتح المغيث ٤/٢٣١

(۲) المؤتلف والمختلف فی الدار قطني، مقدمه محقق، الإكمال مقدمه مصحح ص ١١

(۳) تبصير المنتبه ١/١-٢

حافظ ابن حجر نے اس کتاب میں انہیں دو خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کی، مشکل کلمات کو حروف کے ذریعہ ضبط کیا، وہ اشخاص جو مشتبہات کے ضمن میں آتے تھے ان کی بڑی اچھی تفصیل کر دی، بنیادی کتابوں کے وہ تراجم جو ان سے فوت ہو گئے تھے، ان کا مراجعہ کر کے اضافہ کیا نیز اپنی معلومات سے بہت سارے تراجم کا اضافہ کیا خاص طور سے زمانہ جاہلیت کے شعراء، فرسان وغیرہ جن کا ذکر سیرت و تاریخ کی کتابوں میں پایا جاتا ہے، یہ سارا کام بڑے سنہرے ڈھنگ سے کیا ہے، حافظ ابن حجرؒ نے اپنے طریقۂ تالیف کی جانب یوں اشارہ کیا ہے۔

ابتدا ان ناموں سے کیا ہے جو بہت مشہور ہوتے ہیں جن کے ضبط کی ضرورت نہیں ہوتی، انہیں کلمات کو ضبط کیا ہے جن کے ضبط کی ضرورت پڑتی ہے، جن کلمہ کے بارے میں کچھ نہیں کہا ہے وہ اپنے ماقبل کے ہم مثل ہے، حرف ''ب'' کو موحدۃ، ''ت'' کو مثناۃ، اور ''ث'' کو مثلثہ سے تعبیر کیا ہے، اپنی طرف سے جن معلومات کا اضافہ کیا ہے، اس کی ابتدا ''قُلتُ'' سے کی ہے اور آخر میں انتہی تحریر کر دیا ہے، یعنی قُلتُ اور انتھٰی کے درمیان جو معلومات ہیں وہ حافظ ابن حجرؒ کے اضافات ہیں، البتہ ضبط کلمات خلط ملط ہیں ہر حرف میں پہلے اسماء پھر انساب کا ذکر ہے، کتاب کی ابتدا أحمد اور أحمر سے کیا ہے۔[1]

اس ضبط تحریر، کامل تحقیق، دقت ترتیب، بابصیرت نقد اور جستجوے کثیر کی وجہ سے یہ کتاب اس فن کی انتہائی جامع اور مفید کتاب بن گئی ہے جس کے مطالعہ سے قلبی راحت ملتی ہے، مشتبہات کی تاریکی روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے، اس کتاب کی موجودگی میں بظاہر کسی دوسرے کتاب کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی یہ کتاب چار جلدوں میں علی محمد بجاوی کی تحقیق سے مطبوع ہے۔

۱۲-المغنی فی ضبط أسماء الرجال

تالیف: محمد بن طاہر ہندی (متوفی ۹۸۶ھ)

یہ کتاب محمد ابن طاہر بن علی ہندی کی تالیف ہے جس کا مکمل نام ''المغنی

(۱) تبصیر المنتبہ ۱/ ۲

فی ضبط أسماء الرجال و معرفة کنی الرواۃ وألقابھم و أنسابھم" ہے اس سلسلہ کی ایک مختصر کتاب ہے، جس میں زیادہ تر صحیحین یا مشہور کتب حدیث میں وارد شدہ اسماء وانساب وکنیت کا ذکر ہے، مجرد ضبط کے سلسلہ میں کتاب مفید ضرور ہے، لیکن دیگر معلومات نہ ہونے کے برابر، مولف نے اپنے جن مصادر کا ذکر مقدمہ کتاب میں کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فن کی بنیادی کتابیں ان کو میسر نہ ہو سکی تھیں۔

کتاب کے موتلف ومختلف والے حصہ میں اسماء والقاب کا ذکر ترتیب وار ہے، ہر حرف میں سب سے پہلے اسماء کا پھر انساب کا ذکر کیا ہے، آخری کتاب میں کنیت سے مشہور راویوں کا نام سرد کر دیا ہے، چاہے اس کا تعلق اس فن سے ہو یا نہ ہو۔ اسی طرح سے القاب وانساب کی معرفت کے سلسلہ میں ہر حرف کے آخر میں فصل قائم کیا ہے۔

کتاب کے دو طبعات نظر سے گزرے ہیں اس کا پاکستانی طبعہ اگرچہ قدیم طرز پر ہے لیکن طبعات کی غلطیوں سے تقریباً صاف ہے، البتہ اس کا جدید بیروتی نسخہ غلطیوں سے بھرا ہوا ہے۔

☆☆☆

کتب خاصہ کی نویں قسم

کتب بلدان (کتب جغرافیہ)

کتب بلدان:- ان کتابوں کو کہتے ہیں جن میں ایک شہر یا مختلف شہروں، مقامات وہاں کی آب و ہوا، حدود و اربعہ، مشہور صنعت، امراء و سلاطین، نہروں، پہاڑوں، راستوں وغیرہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔

اس فن میں جو کتابیں تحریر کی گئی ہیں ان میں زیادہ تر وہ ہیں جن میں صرف بلدان و مقامات سے متعلق عام معلومات درج ہوتی ہیں، لیکن کچھ ایسی بھی ہیں جن میں ان معلومات کے علاوہ، وہاں کے مشہور ائمہ و محدثین، اہل علم اور راویان حدیث کے متعلق بھی معلومات درج ہیں، اس طرح کی کتابیں "کتب تواریخ محلیہ" سے ایک حیثیت سے قریب تر ہوتی ہیں، فرق یہ ہوتا ہے کہ کتب تواریخ محلیہ میں عموماً کسی ایک مقام اور وہاں کے اہل علم کا تذکرہ ہوتا ہے، جبکہ کتب بلدان میں عموماً بے شمار مقامات اور شہروں کا تذکرہ ہوتا ہے۔

علامہ سخاوی کتب تواریخ محلیہ کے ذکر کے بعد فرماتے ہیں کہ:

ان کتابوں کے علاوہ بلدان سے متعلق کتابیں تحریر کی گئی ہیں، جن میں شہروں کا تعارف، ان کی خصوصیت، فضائل، فتوحات کا ذکر ہوتا ہے، لیکن عموماً ان میں وہاں کے رہنے والوں کے تراجم نہیں ہوتے، اس طرح کی کتابیں بے شمار ہیں، جن میں سب سے اہم کتاب "معجم البلدان" یاقوت حموی کی ہے:

دیگر کتابوں میں ابو عبید اللہ بکری کی کتاب "المسالك و الممالك" اور "معجم ما استعجم" ہے، نیز اس فن میں عبید اللہ بن خرداذبہ کی کتاب ہے، جو تاریخ کے علاوہ ہے، ایسے ہی شہاب بن فضل کی کتاب "مسالك الأبصار في الأقطار والأمصار" ہے جو بیس جلدوں سے زیادہ ہے۔ اس طرح سے احمد بن یحیٰ بلاذری کی کتاب "أخبار البلدان و فتوحها......" ہے، جسکے بارے میں مسعودی کا خیال ہے کہ "لانعلم في البلدان أحسن منه" کہ بلدان میں اس سے بہتر کوئی کتاب

نہیں۔ امام سخاوی فرماتے ہیں کہ یہ بات یاقوت حموی کی کتاب سے پہلے کی ہے۔[1]

گوئی، لی، استرانج (Guy-le-strange) نے "بلدان الخلافة الشرقية" کے مقدمہ میں ۲۴ مولفین کا ذکر کیا ہے جس میں ابو عبید بکری، بلاذری جیسے اہم مولفین کا ذکر نہیں ہے۔[2] امام سخاوی کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ کتب بلدان میں عموماً راویان و محدثین سے متعلق معلومات نہیں ہوتی البتہ کچھ کتابیں ایسی ہیں جس میں اس طرح کی معلومات بھی ہوتی ہیں۔

اسی طرح کی کتابوں میں یاقوت حموی کی کتاب "معجم البلدان" بھی ہے، جس میں راویان و مشہور اہل علم کے بارے میں بڑی اچھی معلومات موجود ہے۔

لہٰذا جس طرح سے کتب تواریخ محلیہ (مقامی تواریخ) سے راویان کے بارے میں استفادہ کیا جاتا ہے اسطرح سے اس کتاب سے بھی استفادہ ممکن ہے، اگر اس کو فن رجال کی کتابوں کے ضمن میں نہ بھی شمار کیا جائے تو بھی ایک محدث اور حدیث کے طالبعلم کیلئے اس فن کی کتابوں کی شدید ضرورت پڑتی ہے، خاص طور سے یہ کتاب جو راویوں کے مقامات اور ان کے صحیح تلفظ (ضبط) کے بارے میں کافی مفید اور جامع کتاب ہے، جس سے راویوں کی نسبت میں تصحیف کا امکان ختم ہو جاتا ہے اور وہاں کے مزاج، ماحول اور اسباب مروت کی واقفیت حاصل ہوتی ہے، جس سے وہاں کا باشندہ راوی متاثر رہتا ہے، لہٰذا راوی پر حکم لگانے اور اس کو سمجھنے میں اس کتاب سے بڑی مدد مل سکتی ہے، بنابریں اگر اس کا تعارف ہو جائے تو کوئی حرج نہیں۔

معجم البلدان

تالیف: یاقوت حموی (متوفی ۶۲۶ھ)

یہ کتاب اس فن کی سب سے عظیم جامع اور بہتر سمجھی جاتی ہے، علامہ سخاوی کے بیان سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔

سبب تالیف:- کتاب کے سبب تالیف کے بارے میں مؤلف عرض کرتے ہیں کہ: ایک مرتبہ اپنے استاذ ابوالمظفر سمعانی کے پاس بیٹھا تھا، کچھ لوگوں سے لفظ "حُبَاشَة" کے بارے میں جس کا ذکر احادیث میں ملتا ہے، اور جو زمانہ جاہلیت کے بازاروں میں

(۱) الاعلان بالتوبیخ ص ۱۳۵ (۲) بلدان الخلافة الشرقیة ص ۱۲

ایک بازار کا نام تھا۔ بحث ومباحثہ اوراختلاف ہوگیا، یہ کلمہ تلاش بسیار کے باوجود وقت پر نہ مل سکا، لہٰذا دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ایک ایسی تصنیف کی ضرورت ہے جس میں اسماء اماکن کا ذکر ضبط وشکل کے ساتھ آجائے تاکہ اس طرح کی پریشانی نہ اٹھانی پڑے۔(۱)

اس فن میں جو سابقہ کتابیں تھیں وہ یا تو بہت مختصر، یا غیر مرتب، یا کسی خاص علاقہ سے متعلق تھیں، نیز غیر مضبوط تھیں جس سے ضبط میں دھوکہ ہوتا تھا، لہٰذا یہ کتابیں کافی نہیں تھیں اس لئے استخارہ کرنے کے بعد اس کی تالیف شروع کردی، جس کی تبییض محرم ۶۲۵ھ میں شروع کیا۔(۲)

مصادر کتاب:- اس فن کی سابقہ کتابوں میں سے جو دستیاب ہوسکیں، نیز محدثین اور عرب کی تواریخ، عوام کی معلومات اور ذاتی مشاہدہ جو اپنے اسفار میں کیا ان سب معلومات کو اس کتاب کیلئے مرجع ومصدر بنایا گیا ہے۔

ترتیب:- کتاب کی ترتیب حروف معجم پر بڑی دقت کیساتھ کی گئی ہے، جس طرح سے لغت کی کتابیں مرتب ہوا کرتی ہیں، چونکہ حروف تہجی کے کل ۲۸ حروف ہیں، اسلئے اس میں ۲۸ کتاب بنائے گئے ہیں پھر ہر حرف کو ۲۸ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے اسلئے کہ ہر حرف، دوسرے حروف کیساتھ مرتب ہے۔ (مثلاً حرف الف کیساتھ الف پھر الف کے ساتھ ب ت ث وغیرہ ایسے ہی حرف ب کیساتھ الف پھر ب کیساتھ ب، ت ث ......الخ) اسطرح سے ہر حرف میں ترتیب کا خیال ابتداء سے انتہا تک رکھا گیا ہے۔

یہ مقامات جس طرح سے بولے جاتے ہیں اسی حساب سے حروف کا اعتبار کیا گیا ہے، اشتقاق اصل کلمہ اور زوائد کا اعتبار نہیں کیا ہے، اسلئے کہ اس میں بے شمار مقامات وکلمات غیر عربی ہیں۔(۳)

دیگر معلومات و مشتملات:- اس کتاب میں جتنے مقامات کا ذکر آیا ہے ان کو ضبط کردیا گیا ہے تاکہ کوئی شبہ باقی نہ رہے، پھر اگر یہ عربی کلمہ ہے تو اس کا اشتقاق، اور عجمی کلمہ ہے تو اس کا معنی اگر علم ہوسکا تو بتادیا ہے۔ نیز یہ بھی وضاحت کردی گئی ہے کہ کس اقلیم میں پڑتا ہے، اس کو کس نے تعمیر کرایا یا آباد کیا۔ کون مشہور

---

(۱) . مقدمة المعجم البلدان. (۲) مقدمة المعجم البلدان ۱/ ۱۰

(۳) مصدر سابق ۱/ ۱۲،۱۵

مقامات اس کے قرب و جوار میں ہیں، ان میں کیا فاصلہ ہے، اس کی کیا خصوصیت و عجوبے ہیں، اس میں کون صحابی یا تابعی یا مشہور اہل علم مدفون ہے مسلمانوں کے قبضہ میں کب اور کیسے آیا؟ امیر و حاکم کون تھا؟ مولف کے زمانہ میں اس کا ذمہ دار کون تھا؟[1]

اس میں بعض ایسی معلومات بھی مذکور ہیں جن کو عقل قبول نہیں کرتی، اس لئے کہ یہ عام عادات کے برخلاف ہیں، خود مؤلف کو اس کی صحت کا یقین نہیں لیکن اس کا ذکر اس وجہ سے کر دیا ہے کہ کم از کم اس سلسلہ میں جو باتیں کہی گئی ہیں اس کا علم ہو جائے، خواہ وہ صحیح ہو یا غلط۔

امام سیوطی کی تنقید:- امام سیوطی فرماتے ہیں کہ اس طرح کی کتابوں (کتب بلدان) کا ایک خاص مقصد ہوتا ہے، لہٰذا ان میں دوسری چیزوں کا شامل کرنا جس کا تعلق دوسرے علوم سے ہے مناسب نہیں یہی حال "معجم البلدان" کا بھی ہے جس میں موضوع کے علاوہ بہت ساری چیزوں کا اضافہ کیا ہے جو غیر ضروری ہیں مثلاً ناموں کا اشتقاق جس کا محل کتب لغت ہے، اور بہت ساری چیزیں جو طول بلاد وغیرہ سے متعلق ہیں جو درست نہیں، ایسے ہی ان افراد کا ذکر جو ان مقامات کی جانب منسوب ہیں جس کا محل کتب رجال ہے، اس لئے کہ اس طرح کی چیزوں کا شمار اور استیعاب بے حد مشکل ہے۔[2]

تردید:- یہ تبصرہ و تنقید امام سیوطی نے کیا ہے، حالانکہ بظاہر اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی اس لئے کہ مؤلف کتاب کو خود اس کا احساس تھا جسکی وجہ انہوں نے مقدمہ کتاب میں تحریر کر دیا ہے، جہاں تک راویان یا اہلیان بلاد کا معاملہ ہے تو یہ ان کا اپنا منہج ہے "ولا مشاحة فی الاصطلاح" نیز کسی بھی شہر یا مقام کا تعارف حقیقت میں اس وقت تک ناقص رہتا ہے جب تک کہ وہاں کی اہم شخصیت کا تذکرہ نہ کیا جائے۔

مختصرات:- معجم البلدان کو صفی الدین عبد المؤمن نے مختصر کیا ہے، جبکہ مولف کتاب یاقوت حموی کو کتاب کا مختصر کرنا پسند نہیں، ان کے کہنے کے مطابق کسی کتاب کے اختصار کی مثال اس کامل شخص کی طرح ہے جسکے ہاتھ پیر کاٹ دیئے گئے ہوں۔

بہر حال کتاب کی اختصار اس کی اہمیت افادیت اور ضرورت پر غماز ہے۔

---

(۱) مصدر سابق ۱/۱۲   (۲) کشف الظنون ۲/۱۷۳۳

کتب خاصہ کی دسویں قسم

کتب وفیات

معرفت وفیات کی اہمیت:- راویان حدیث کی تاریخ پیدائش اور وفات کا جاننا ناقد حدیث کیلئے انتہائی ضروری ہے، اس ضرورت کے پیش نظر محدثین نے اسکو اصول حدیث کے علوم میں سے ایک علم شمار کیا ہے، اور اس کی معرفت کی جانب توجہ دلائی ہے۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ تاریخ پیدائش اور وفات کی معرفت انتہائی اہم فن ہے، اس کی معرفت سے حدیث کی انقطاع و اتصال کا پتہ چلتا ہے، بعض افراد نے کچھ ایسے لوگوں سے روایت کرنے کا دعویٰ کیا جب ان کی تاریخ [پیدائش و وفات] دیکھی گئی تو پتہ چلا کہ یہ دعویٰ غلط ہے۔ (۱)

یعنی اس کی معرفت سے دروغ گوئی کا پتہ بھی چل جاتا ہے۔

امام سیوطی فرماتے ہیں کہ اسماعیل بن عیاش نے ایک شخص سے دریافت کیا کہ آپ نے خالد بن معدان سے کس سن میں روایت کیا ہے۔ اس نے کہا ۱۱۳ھ میں، ابن عیاش نے فرمایا: یعنی ان کی وفات کے سات سال بعد تم نے ان سے روایت کیا!! اسلئے کہ ان کی وفات ۱۰۶ھ میں ہو گئی ہے۔ ایسے میں محمد بن حاتم الکسی نے عبد بن حمید سے روایت کا دعویٰ کیا تو امام حاکم نے ان سے سوال کیا کہ آپ کی پیدائش کس سن میں ہے اس نے کہا کہ ۲۶۰ھ میں۔ امام حاکم نے فرمایا کہ: اسکا مطلب یہ ہوا کہ آپ نے انکی وفات کے ۱۳ سال بعد ان سے روایت کیا اسلئے کہ ان کا انتقال ۲۴۹ھ میں ہی ہو گیا تھا۔

امام سفیان ثوری فرماتے ہیں کہ: جب راویوں نے دروغ گوئی کی تو ہم نے ان کیلئے تاریخ کا استعمال کیا۔ (۲)

حسان بن یزید فرماتے ہیں کہ: کذابین کی معرفت اور ان کی گرفت کیلئے تاریخ کی طرح کسی اور سے مدد نہیں ملتی۔ (۳)

اس لئے کتب رجال کی کتابوں میں تاریخ پیدائش اور خاص طور سے وفات کا

---

(۱) التقریب للنووی مع التدریب ۳۴۹/۲ (۲) الکفایة فی علم الروایة ص ۱۱۹

(۳) تدریب الراوی ۳۴۹/۲-۳۵۰

بہت اہتمام کیا جاتا ہے، اسی اہتمام کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے راویوں کی تاریخ کی معرفت کیلئے مخصوص کتابیں تالیف کی ہیں جن کو "کتب وفیات" کہا جاتا ہے، جو کتب رجال حدیث کی ایک قسم ہے۔

کتب وفیات:- ان کتابوں کو کہتے ہیں جن میں راویوں کو تاریخ وفات پر مرتب کر کے دیگر معلومات تحریر کردی جائے۔

ابتدا میں یہ کتابیں صرف راویان حدیث کیلئے تحریر کی گئی تھیں لیکن بعد میں ان میں وسعت دے دی گئی اور اس میں دیگر افراد مثلاً علماء، ادباء، شعراء، امراء وغیرہ کو بھی شامل کیا گیا بعد میں تحریر کی گئی کتابیں زیادہ تر اسی طرح کی ہیں۔

راویوں کے عام حالات کی طرح ان کی تاریخ میلاد و وفات علماء جرح و تعدیل کو معلوم تھی جس کا استعمال انہوں نے کیا ہے، لیکن اس فن میں منظم طریقے سے تدوین چوتھی صدی ہجری میں شروع ہوئی۔

امام ذہبی فرماتے ہیں کہ پرانے لوگوں نے (امام شافعی کے زمانہ تک) حفظ پر زیادہ اعتماد کیا اس لئے وفیات کو تحریر نہیں کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے صحابہ و تابعین کی تاریخ وفات معلوم نہ رہ سکی، لیکن جب متاخرین نے ان کی تحریر شروع کی تو بہت سارے مجہولین کی تاریخ وفات بھی معلوم ہوگئی۔ (۱)

اس فن میں جن لوگوں نے کتابیں تحریر کی ہیں ان میں سے ابتدائی دور کی تالیف کردہ کتابیں ہی راویان حدیث سے متعلق ہیں۔ جبکہ ان کے بعد کی تالیفات میں راویوں کے علاوہ دیگر حضرات کی تاریخ ہے۔ اسلئے یہ کتابیں راویوں کیلئے مفید نہیں، لیکن افسوس یہ ہے کہ جو ابتدائی کتابیں ہیں وہ یا تو موجود نہیں یا پھر مطبوع نہیں۔

بطور علم کچھ کتابوں کا تذکرہ یہاں کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

الوفیات:- یہ ابوالحسین عبدالباقی بن قانع بن مرزوق (متوفی ۳۵۱ھ) کی تالیف ہے، جو اس فن کی پہلی تالیف ہے اس میں ہجرت رسول سے لے کر ۳۴۶ھ تک کے وفیات کا ذکر ہے۔ (۲)

---

(۱) الاعلان بالتوبیخ ص ۱۶۰ (۲) الاعلان بالتوبیخ ص۱۶۰، الرسالۃ المستطرفۃ ص۱۵۸

تاریخ موالید الرواۃ و وفیاتهم:- یہ حافظ ابو سلیمان محمد بن عبداللہ (متوفی ۳۷۹ھ) کی تالیف ہے جو ابن زبر سے معروف ہیں، اس میں ہجرت رسول سے ۳۳۸ھ تک کے وفیات کاذکر ہے۔[۱]

امام ذہبی فرماتے ہیں کہ وفیات پر ان کی کتاب کافی مشہور ہے۔[۲]

اس کا قلمی نسخہ موجود ہے جس کی ایک تصویر ڈاکٹر بشار عواد معروف کے کتب خانہ میں موجود ہے۔[۳]

آپ نے سن وفات کو ترتیب کیلئے بنیاد ضرور بنایا لیکن مہینہ اور دن کے اعتبار سے ترتیب کا اہتمام نہیں کیا، بظاہر وجہ یہ ہے کہ اس دور میں یہی ترتیب کافی ترقی یافتہ تصور کی جاتی تھی۔

الوفیات:- یہ ابو یعقوب اسحٰق بن ابراہیم سرخسی ہروی (متوفی ۴۲۹ھ) کی ہے۔ امام ذہبی فرماتے ہیں کہ آپ کی ایک تاریخ ہے جو سن وفات پر مرتب ہے جس کو اہل کے وفات کے سلسلہ میں تصنیف کیا ہے، یہ رسول ﷺ کے زمانہ سے لے کر ۴۲۹ھ تک کے وفیات پر مشتمل ہے۔[۴]

الوفیات:- یہ ابوالقاسم عبدالرحمٰن بن مندہ (متوفی ۴۷۰ھ) کی تالیف ہے، امام ذہبی فرماتے ہیں کہ "لم أرَ أكثر استيعابا منه" اس سے زیادہ جامع میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔(۵)

در السحابة فی وفیات الصحابة:- یہ کتاب صرف صحابہ رسول کی وفات کیساتھ خاص ہے، جو امام صاغانی (متوفی ۶۵۰ھ) کی تالیف ہے۔[۶]

اس فن میں جو دیگر متاخرین کی کتابیں ہیں عموماً وہ ایک دوسرے پر ذیل ہیں، جسکی بنیاد ابن زبر کی کتاب "تاریخ موالید الرواۃ و وفیاتهم" پر ہے۔ وہ یہ ہیں:

ذیل تاریخ موالید الرواۃ:- یہ کتاب علامہ ابن زبر کے شاگرد ابو محمد

---

(۱) الاعلان بالتوبیخ ص ۱۶۰، کشف الظنون ۲/۲۰۱۹، الرسالة المستطرفة ص ۱۵۸

(۲) الرسالة المستطرفة ۱۵۸ (۳) الوفیات لابن رافع السلامی (۵۸/۱) مقدمه محقق

(٤) الوفیات لابن رافع السلامی ۱/ ۶۰ مقدمه محقق.

(٥) الرسالة المستطرفة ص ۱۵۸ (٦) . الرسالة المستطرفة ص ۱۵۷

عبدالعزیز کتانی دمشقی (متوفی ۴۶۶ھ) کی تالیف ہے، جو ۳۳۸ھ سے ۴۶۶ھ کے وفیات پر مشتمل ہے۔[۱]

جامع الوفیات:- یہ سابقہ کتاب پر آپ ہی کے شاگرد ابو محمد ہبۃ اللہ بن احمد اکفانی (متوفی ۵۲۴ھ) کی تالیف ہے۔ یہ ۴۶۶ھ سے ۴۸۵ھ پر مشتمل ہے۔[۲]

اس کا ایک مصور نسخہ ڈاکٹر بشار کے کتب خانہ میں موجود ہے۔[۳]

وفیات النقلۃ:- یہ ابوالحسن علی بن مفضل مقدسی (متوفی ۶۱۱ھ) کی تالیف ہے۔ جو اکفانی کی کتاب پر ذیل ہے جو ۴۸۵ھ سے ۵۸۱ھ کے وفیات پر مشتمل ہے۔[۴]

التکملۃ لوفیات النقلۃ:- یہ حافظ زکی الدین عبدالعظیم بن عبدالقوی منذری (متوفی ۶۵۶ھ) کی تالیف ہے۔ جو سابقہ کتاب پر ذیل ہے جو ۵۸۱ھ سے شروع ہوتا ہے۔[۵]

امام سخاوی فرماتے ہیں کہ یہ بڑی عظیم، دقیق اور سودمند کتاب ہے[۶]

یہ کتاب چار جلدوں میں ڈاکٹر بشار عواد کی تحقیق سے مطبوع ہے۔

صلۃ التکملۃ لوفیات النقلۃ:- یہ عزالدین احمد بن محمد بن عبدالرحمٰن حسینی (۶۹۵ھ) کی تالیف ہے جو اپنے استاذ علامہ منذری کی کتاب پر بطور ذیل تحریر کیا ہے۔[۷]

اسکا ایک مصور نسخہ ڈاکٹر بشار کے کتب خانہ میں موجود ہے جو مولف کے قلم سے ہے۔[۸]

پھر حسینی کی کتاب پر احمد بن ایبک دمیاطی نے (متوفی ۷۴۹ھ) نے اپنی سن وفات تک ایک ذیل تحریر کی ہے۔ انکے بعد امام ابوزرعہ عراقی (متوفی ۸۲۶ھ) نے اس پر ایک ذیل تحریر کی۔[۹]

اس طرح سے عام طور سے یہ کتابیں سلسلہ وار تالیف کی گئی ہیں۔

---

(۱) الاعلان بالتوبیخ ص ۱۶۰، الرسالة المستطرفة ص ۱۵۸، كشف الظنون ۲۰۱۹/۲

(۲) الاعلان بالتوبیخ ص ۱۵۹، الرسالة المستطرفة ص ۱۵۸، كشف الظنون ۲۰۱۹/۲

(۳) الوفیات لابن رافع ۱۵۹/۱ مقدمه محقق

(٤) الرسالة المستطرفة ص ۱۵۹

(٥) الاعلان بالتوبیخ ص ۱۶۰، كشف الظنون ۲۰۲۰/۲

(٦) الاعلان بالتوبیخ ۱۶۰ (۷) الاعلان بالتوبیخ ص ۱۶۰

(۸) الوفیات لابن رافع السلامی (۵۹/۱) مقدمه محقق (۹) الاعلان بالتوبیخ ص ۱۶۰

علامہ علم الدین برزالی (متوفی ۷۳۹ھ) نے فن تاریخ میں ایک کتاب ترتیب دی تھی جس میں بکثرت تراجم پائے جاتے ہیں، چونکہ یہ سن وفات پر مرتب تھی اس لئے یہ بھی "الوفیات" کے نام سے مشہور ہو گئی۔ جو (۶۶۵ھ - ۷۳۸ھ) تک کے وفیات پرمشتمل ہے، اس پر حافظ تقی الدین محمد بن رافع سلامی (متوفی ۷۷۴ھ) نے "ذیل الوفیات" کے نام سے ایک ذیل تحریر کی جو انتہائی مفید ہے، یہ ۷۳۷ھ سے شروع ہوکر ۷۷۳ھ پرختم ہو جاتی ہے۔ یہ کتاب صالح مہدی عباس کی تحقیق سے مطبوع ہے۔ اس پر شہاب بن حجی نے ذیل تحریر کی ہے، اور بقول امام سخاوی حافظ ابن حجر کی کتاب "انباء الغمر" اس کی ذیل کی صلاحیت رکھتی ہے، پھر ساتویں اور آٹھوی صدی کے وفیات کو خود امام سخاوی نے مرتب کیا ہے جس کا نام "الشفاء من الألم" رکھا ہے۔ [۲]

وفيات الأعيان لابن خلكان:- یہ کتاب بظاہر نام سے وفیات سے متعلق معلوم ہوتی ہے جبکہ ایسا نہیں ہے، بلکہ یہ فن تاریخ کی ایک کتاب ہے جس میں تراجم کا ذکر بکثرت پایا جاتا ہے، یہ حروف معجم پر مرتب ہے۔ البتہ اسمیں صحابہ اور تابعین کے تراجم نہیں ہیں۔

فوات الوفيات:- یہ بھی ابن خلکان کی کتاب کی طرح ہے، بلکہ ان سے فوت شدہ تراجم کو تحریر کردیا ہے لہٰذا یہ اس پر مستدرک کی حیثیت رکھتی ہے۔

الوافي بالوفيات:- یہ خلیل بن ایبک صفدی (متوفی ۷۶۴ھ) کی تالیف کردہ ہے یہ بھی حروف معجم پر مرتب ہے جس میں ہر قسم کے تراجم موجود ہیں۔

یہ تینوں کتابیں مطبوع ہیں لیکن اپنے موضوع سے متعلق نہیں اگرچہ نام سے یہی واضح ہوتا ہے۔

راویان حدیث کی تاریخ وفات معلوم کرنے کے سلسلہ میں ان سے زیادہ مفید وہ کتابیں ہیں جو فن تاریخ میں لکھی گئی ہیں جن میں زیادہ تر اہل علم کا تذکرہ پایا جاتا ہے، ان میں کچھ کا تعارف کتب تاریخ کے ذکر میں گذر چکا ہے۔

ایسے ہی وہ کتابیں بھی مفید ہیں جو طبقات پر مرتب ہیں جسکی ترتیب میں سن وفات کا اہتمام کیا گیا ہے، مثلاً سیر اعلام النبلاء، طبقات الحفاظ، شذرات الذہب وغیرہ۔

☆☆☆

---

(۱) الاعلان بالتوبيخ ص ۱۶۰-۱۶۱

خاتمہ

اب تک کے مطالعہ سے جو اہم باتیں سامنے آئیں وہ یہ ہیں کہ: صحابہ کرام، تابعین عظام، محدثین وائمہ دین نے حدیث رسول کی حفاظت کیلئے ایسی بے مثال قربانیاں پیش کی ہیں، جنکی نظیر نہیں ملتی، اسکی حفاظت کیلئے جو انتظام کیا وہ بے مثال ہے۔

سلسلہ اسناد کے واسطہ سے حدیث رسول کی معرفت حاصل کرنا اور اس کو محفوظ رکھنا اس امت کا امتیازی شان ہے۔

سلسلہ اسناد میں پائے جانے والے افراد کے بارے میں ہرقسم کی ضروری معلومات حاصل کرنے اور اس کی حفاظت کیلئے اللہ تعالیٰ نے بڑے بڑے ناقدین وقت اور ائمہ جرح و تعدیل کو پیدا کیا جنہوں نے اپنی زندگی اس کے لئے وقف کر دی۔ رجال کے متعلق معلومات کو معیاری بنانے کیلئے جرح و تعدیل کے دقیق سے دقیق تر اصول وضوابط وضع کئے۔ ان افراد کے حالات کو تاقیامت باقی رکھنے کیلئے اس فن کی کتابوں میں قلم بند کر دیا۔ یہ کتابیں مختلف انواع واقسام کی ہیں جو امت کے تابناک ماضی پر غماز اور مستقبل کیلئے عظیم سرمایہ ہیں۔ انہیں کتابوں کے سہارے آج ان راویان حدیث کے حالات معلوم کئے جاسکتے ہیں جو آج سے پندرہ سو سال قبل دنیا سے رخصت ہو چکے۔

علماء جرح و تعدیل نے ان کے بارے میں جو اظہار خیال کیا ہے بڑے اہتمام کے ساتھ صحیح سندوں کے ذریعے ان کو کتابوں میں تحریر کر دیا گیا، کسی بھی حدیث کی سند پر حکم لگانے اور اس کا مرتبہ معلوم کرنے کیلئے انہی کتابوں پر اب سارا دارومدار ہے، لہٰذا ان کی معرفت، ان کے استعمال کرنے کا طریقہ، ان کی خصوصیت جاننا بے حد ضروری ہے۔

اسناد پر حکم لگانے کا اصل مقصد احادیث رسول پر حکم لگانا، اس کی صحت و ضعف کو معلوم کرنا اور خارجی چیزوں کو جو حدیث رسول کے نام سے اس میں شامل کر

دی گئی ہیں اس سے ان کو الگ کرنا ہے، تاکہ حدیث رسول کسی غیر کی باتوں سے خلط ملط نہ ہو جائے اور اس طرح سے عمل بر حدیث صحیح کے ساتھ ساتھ حفاظت حدیث کا کام بھی ہو تا رہے۔

کسی بھی حدیث پر حکم لگانے کیلئے رجال اسناد کے افراد کی تعیین کرنا، بحیثیت جرح و تعدیل ان کا حکم معلوم کرنا، حدیث کا شذوذ و علت سے خالی ہونے کی معرفت رکھنا ضروری ہو تا ہے۔

اس عملی مرحلہ میں داخل ہونے سے پہلے یہ بات ذہن میں خصوصی طور سے رکھنا چاہئے کہ صحابہ کرام کی عدالت ایک مسلمہ حقیقت ہے جو کتاب و سنت و اجماع امت اور قیاس صحیح سے ثابت ہے، لہذا ان کے سلسلے میں اگر شخصیت کا تعارف نہ بھی ہو تو حدیث پر حکم لگانے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ صرف اتنا معلوم ہونا ضروری ہے کہ فلاں شخص صحابی ہے۔ صحبت کے ثبوت کے بعد جرح کے جملہ قوانین وضوابط سے وہ بالاتر ہو جاتا ہے، لہذا بحیثیت جرح و تعدیل ان کے سلسلے میں معلومات کی اب کوئی ضرورت نہیں، ان کے علاوہ اسناد میں جو باقی افراد پائے جاتے ہیں ان کی معرفت، بحیثیت جرح و تعدیل ان کا حکم معلوم کرنا ضروری ہو تا ہے۔

بہت ساری حدیثیں ایسی ہیں جن کا حکم معلوم ہو چکا ہے اور امت کا ان کی صحت پر اجماع ہو چکا ہے، ایسی حدیثوں پر حکم لگانے کیلئے محنت صرف کرنا بظاہر تحصیل حاصل اور وقت ضائع کرنا ہے۔ انہیں حدیثوں میں سے احادیث صحیحین ہیں جن کی صحت پر اہل علم کا اجماع ہو چکا ہے۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ: صحیحین اور دیگر کتابوں میں یہی فرق ہے کہ ان میں موجود احادیث صحیح ہیں ان میں بحث و نظر کی ضرورت اب باقی نہیں۔ [شرح صحیح مسلم ۱/۲۰]

علامہ ابن صلاح فرماتے ہیں کہ: چونکہ امت نے ان دونوں کتابوں کو از روئے صحت قبول کر لیا لہذا ان کی وہ روایتیں بھی جن کے اخراج میں یہ دونوں منفرد ہیں وہ بھی قطعی طور پر صحیح اور قابل قبول ہیں۔ [علوم حدیث]

علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ: جس حدیث کو امت نے (از روئے صحت) قبول

کرلیا ہے، اس پر عمل کرنا جملہ علماء حدیث کا مذہب ہے۔[الباعث الحثیث ص ۱۷]
صحیحین کے علاوہ اور بھی بہت ساری حدیثیں ہیں جن کی صحت اور قابل قبول ہونے پر حکم لگایا جا چکا ہے اس حکم کو اس طرح کی کتابوں سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ جنکے مؤلفین نے صحت کا التزام کیا ہے، نیز ان کتابوں سے بھی معلوم کیا جا سکتا ہے، جن میں ہر طرح کی حدیثیں ہوتی ہیں لیکن ہر ایک کا حکم و مرتبہ بتا دیا گیا ہے۔

لیکن اگر خدانخواستہ کسی حدیث پر حکم نہ لگا ہوا ہو، یا معلوم نہ ہو اور اس کے معلومات کی ضرورت ہے تو یہاں سے بڑی محنت و جانفشانی، ہمت اور ذمہ داری کی ضرورت پڑتی ہے، مطلوبہ حدیث کی سند میں موجود راویوں کے بارے میں فرداً فرداً معلومات حاصل کرنی پڑتی ہے، ائمہ جرح و تعدیل نے ان کے بارے میں کیا حکم لگایا ہے وہ حکم متفق علیہ ہے یا کسی نے اختلاف کیا ہے؟ اختلاف کی صورت میں راجح کیا ہے؟ بحیثیت عدالت وضبط، ارسال و تدلیس وہ کس درجہ میں ہے وغیرہ وغیرہ۔

جس حدیث پر حکم لگانا مقصد ہے وہ دو امر سے خالی نہیں یا تو اس کتاب کے راویوں پر اہل علم نے خصوصی کتابیں تحریر کردی ہیں یا نہیں۔

پہلی صورت میں عمل قدرے آسان ہے جبکہ دوسری صورت میں اس کے مقابلے میں کچھ مشکل ہے۔

۱- راوی کی شخصیت کی تعیین:- اس سلسلے میں جو پہلا کام ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ سند میں موجود راویوں کی فرداً فرداً تعیین کردی جائے اس لئے کہ ایک نام کے مختلف راوی ہوتے ہیں اور بسا اوقات ایک ہی طبقہ کے ہوتے ہیں جس سے اشتباہ لازمی ہوتا ہے۔

اس عملی اقدام کیلئے پہلا کام یہ کریں کہ سند کا بغور مطالعہ کریں اور یہ معلوم کریں کہ اس میں وارد شدہ نام مبین ہے جس سے شخصیت کی تعیین جاتی ہے یا مہمل جس سے تعیین نہیں ہوپاتی۔ اگر شخصیت مبین ہے تو بہت خوب، عمل آسان ہوگیا اور اگر شخصیت مبہم ہے تو یہ معلوم کریں کہ یہ حدیث کسی اور کتاب میں پائی جاتی ہے کہ نہیں؟ اگر ہے تو اس کی سند میں مبین ہے یا مبہم اگر مبین ہے تو بہتر ہے۔ ورنہ اس

کتاب کو اٹھائیں جس میں اس راوی کی سیرت وسوانح تحریر شدہ ہے، اس نام کا اگر دوسرا راوی اس کتاب میں نہیں تو یوں سمجھئے کہ اس کی تعیین ہو گئی اور سامنے موجود راوی ہی مطلوبہ شخصیت ہے اور اگر اس نام کے دو یا اس سے زیادہ راوی ہوں تو سند حدیث پر ایک نظر پھر سے ڈالیں اور یہ دیکھیں کہ اس راوی کا استاد اور شاگرد کون ہے؟ استاد اور شاگرد کا نام معلوم ہو جانے پر پھر اس کتاب کو دیکھیں جس میں اس کا ترجمہ موجود ہے اور یہ دیکھیں کہ وہاں پر اس کے استاد اور شاگرد کس راوی کے ترجمہ میں ہیں۔ جس ترجمہ میں بحیثیت استاد و شاگرد وہ نام تحریر ہو تو اب اس کی تعیین ہو گئی۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دو ہم نام راوی استاد و شاگرد میں مشترک ہوتے ہیں اس صورت میں اگر دونوں ثقہ ہیں تو مسئلہ آسان ہے۔ اور اگر ان میں کوئی ضعیف ہے تو مسئلہ بڑا مشکل اور پیچیدہ ہو جاتا ہے، اس کی تعیین کیلئے بڑی دقت اٹھانی پڑتی ہے، اس کیلئے کتب معاجم و کتب مشیخات سے جس میں اس کی روایتیں ہوتی ہیں مدد مل سکتی ہے، نیز کتب ضعفاء وغیرہ سے مدد لی جاسکتی ہے جس میں ضعیف راویوں کی روایتوں کو ان کے ترجمہ میں ذکر کیا جاتا ہے۔ جس کتاب کی حدیث آپ تلاش کر رہے ہیں اگر اس کی کوئی شرح ہے تو ممکن ہے کہ اس میں راوی کی تعیین شارح نے کسی ذریعہ سے معلوم کر کے کر دی ہو وہاں سے بھی مدد مل سکتی ہے۔

۲- راوی کا حکم معلوم کرنا:- جب راوی کی شخصیت کی تعیین ہو جائے تو اس کا ترجمہ جس کتاب میں خصوصی طور سے ذکر کیا گیا ہے اس میں دیکھ کر اس کا حکم بحیثیت عدالت و ضبط اور بحیثیت تدلیس و ارسال معلوم کر لیں، اگر اس کا وافی ترجمہ وہاں پر موجود نہ ہو تو کتب ثقات یا کتب ضعفاء نیز دیگر کتاب سے مدد لے سکتے ہیں۔ راوی کے ثقہ یا عدم ثقہ دونوں صورتوں میں اس کی حیثیت کے حساب سے حدیث پر حکم لگایا جاتا ہے۔

بذریعہ استاد و شاگرد کتب ستہ کے راویوں کی تعیین کیلئے سب سے بہتر کتاب "تہذیب الکمال" ہے۔ اور بحیثیت جرح و تعدیل اقوال کی تفصیل معلوم کرنے کیلئے سب سے مفید کتاب "تہذیب التہذیب" ہے اور صرف مجموعی حکم (خلاصہ) معلوم

کرنے کیلئے سب سے بہتر کتاب تقریب التہذیب ہے۔

توضیحی مثال:- مثلاً اگر کسی کو سنن ابو داؤد کی پہلی روایت کا حکم معلوم کرنا ہو جس کی سند اس طرح سے ہے: حدثنا عبدالله ابن مسلمة بن قعنب القعنبی، ثنا عبدالعزیز -یعنی ابن محمد- عن محمد-یعنی ابن عمرو- عن أبی سلمة، عن المغیرة بن شعبة أن النبیِ صلی الله علیه وسلم : "کان إذا ذهب المذهب أبعد".

اس سند میں کل پانچ راوی ہیں:

عبداللہ بن مسلمہ بن قعنب قعنبی	عبدالعزیز بن محمد
محمد بن عمرو	ابو سلمہ
مغیرہ بن شعبہ	

سب سے پہلے ان راویوں میں سے ہر ایک کی تعیین کرنی پڑے گی ان میں سب سے پہلے راوی:

(۱) عبداللہ بن مسلمہ بن قعنب قعنبی ہیں جو بالکل مبین اور واضح ہیں صرف ان کا حکم اور درجہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے، جس کیلئے "تقریب التہذیب" کا مراجعہ کرنے سے یہ معلوم جائے گا کہ وہ "ثقہ عابد" ہیں جن سے جملہ اصحاب کتب ستہ نے روایت کیا ہے۔

(۲) دوسرے راوی عبدالعزیز بن محمد ہیں۔ جب کتب ستہ سے متعلق تراجم کی کتاب "تہذیب التہذیب" وغیرہ میں سے کوئی کتاب دیکھیں گے تو اس میں آپ کو عبدالعزیز بن محمد نام کے صرف ایک راوی ملیں گے جو کتب ستہ کے رجال میں ہیں۔ اور وہ دراوردی ہیں، لہٰذا ان کی تعیین ہو گئی۔ اب ان کا حکم معلوم کرنے کیلئے جب انہی کتابوں کا مطالعہ کریں گے تو یہ معلوم ہو گا کہ ان کے بارے میں ائمہ نقد کے مختلف اقوال ہیں: کچھ لوگوں نے ثقہ کہا ہے اور کچھ لوگوں نے سئ الحفظ کہا ہے، کچھ لوگوں نے یہ کہا ہے کہ: جب یہ اپنی کتاب سے روایت کرتے ہیں تو ثقہ ہوتے ہیں ورنہ سئ الحفظ۔ معلوم ہوا کہ کلام کسی خاص جہت پر ہے اور ثقاہت کسی دوسری جہت پر۔ اس کا

خلاصہ حافظ ابن حجر نے یوں ذکر کیا ہے: صدوق کان یحدث من کتب غیرہ فیخطئ جس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک خاص جہت میں غیر مقبول ہیں۔

(۳) تیسرے راوی محمد بن عمرو ہیں، ان کے ترجمہ میں دیکھنے سے یہ معلوم ہو جائے گا کہ وہ محمد بن عمرو جنہوں نے ابو سلمہ سے روایت کی ہے وہ محمد بن عمرو بن علقمہ ہیں، جب شخصیت کی تعیین ہو گئی تو حکم کا خلاصہ دیکھنے کیلئے "تقریب التہذیب" سے یہ پتہ چلا کہ یہ "صدوق له أوهام" ہیں۔

(۴) ابو سلمہ کی تعیین کیلئے ان کے شاگرد محمد بن عمرو بن علقمہ کا ترجمہ دیکھنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن سے روایت کیا ہے، جیسا کہ ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن کے ترجمہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان سے محمد بن عمرو بن علقمہ نے روایت کیا ہے، لہٰذا یہ تعیین ہو گئی کہ مذکورہ راوی ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن ہی ہیں اور رجال کتب ستہ میں ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن بن عوف زہری کے علاوہ کوئی دوسرا راوی اس نام کا نہیں، لہٰذا ان کا حکم معلوم کر لیں بطور خلاصہ "تقریب التہذیب" سے یہ پتہ چلتا ہے کہ: یہ "ثقة مكثر" ہیں۔

(۵) مغیرہ بن شعبہ صحابی رسول ہیں ان کا حکم معلوم کرنے کی ضرورت نہیں اور اگر یہ نہ معلوم ہو کہ یہ کون ہیں تو کتب ستہ سے متعلق کسی بھی کتاب میں دیکھنے سے واضح ہو جائے گا کہ یہ صحابی ہیں، اب اس سند میں جو راوی ہیں وہ :

عبد اللہ بن مسلمہ قعنبی ہیں جو ثقہ عابد ہے، جو تعدیل کا دوسرا مرتبہ ہے۔

عبد العزیز الدراوردی "صدوق يخطئ إذا حدث من كتب غيره" ہیں جو تعدیل کا پانچواں مرتبہ ہے۔

محمد بن عمرو بن علقمہ "صدوق له أوهام" ہیں جو تعدیل کا پانچواں مرتبہ ہے۔

ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن: "ثقه مكثر" ہیں جو تعدیل کا دوسرا مرتبہ ہے۔

ان راویوں میں کوئی مدلس اور مرسل راوی نہیں ہے۔ لہٰذا اس حدیث کی سند میں مرتبہ خامسہ کا راوی ہونے کے ناطے ضعف خفیف پایا ہے جو دوسروں کی موافقت سے حسن ہو جائے گی، بلکہ اس طرح کی حدیثیں امام ترمذی کے یہاں حسن

ہوتی ہیں اور امام ابوداؤد اس پر سکوت اختیار کرتے ہیں۔

مذکورہ حدیث کے بعد حضرت جابر کی جو دوسری روایت ہے "كان ينطلق حتى لا يراه أحد" پہلی حدیث کے معنی کی تائید کرتی ہے لہٰذا اس کی موافقت کی وجہ سے پہلی حدیث والی سند حسن ہو جائے گی۔

اور اگر مسند احمد کی پہلی روایت کا حکم معلوم کرنا ہو جو اس طرح سے ہے:

حدثنا عبدالله بن نمير، أخبرنا إسماعيل بن أبى خالد، عن قيس، قال: قام أبوبكر فحمدالله و أثنى عليه. ثم قال : يا أيها الناس انكم تقرؤن هذه الآية ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُم﴾ [المائدة : ١٠٥] وأنا سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: "إن الناس إذا رأوا المنكر فلم يغيروا أوشك أن يعمهم الله العذاب"

مذکورہ سند میں چار راوی ہیں:

عبداللہ بن نمیر　　　اسماعیل بن ابی خالد

قیس　　　ابوبکر

سب سے پہلے عبداللہ بن نمیر کی تعیین کرلیں، مسند احمد کے راویوں سے متعلق کتاب "تعجيل المنفعة" کو دیکھنے سے یہ پتہ چلا کہ اس میں ان کا نام موجود نہیں، معلوم ہوا کہ یہ کتب ستہ کے راویوں میں سے بھی ہیں ان کا ترجمہ "تہذیب التہذیب" و "تقریب التہذیب" وغیرہ کتابوں میں موجود ہے۔

ان کتابوں کے دیکھنے سے یہ معلوم ہو جائے گا کہ وہ عبداللہ بن نمیر جنہوں نے اسماعیل بن ابی خالد سے روایت کیا ہے وہ ہمدانی ہیں اور ان کا حکم "تقریب التہذیب" میں "ثقة صاحب حديث" ملے گا۔

پھر اسماعیل بن ابی خالد کا ترجمہ جب "تعجيل المنفعة" میں دیکھیں گے تو پتہ چلے گا کہ ان کا بھی ترجمہ اس میں موجود نہیں لہٰذا وہ بھی کتب ستہ کے راوی ہیں اور ان کتابوں میں دیکھنے سے یہ معلوم ہوگا کہ وہ احمسی ہیں جنہوں نے قیس سے روایت کیا ہے۔ اب ان کا حکم معلوم کریں، "تقریب التہذیب" سے یہ معلوم ہوگا کہ وہ "ثقة

ثبت'' ہیں۔

قیس کی شخصیت کی تعیین کیلئے جب ان کے استاد و شاگرد کو دیکھا گیا تو پتہ چلا کہ یہ قیس بن ابی حازم ہیں جو ''تعجیل المنفعة'' میں موجود نہیں لہٰذا یہ بھی کتب ستہ کے راویوں میں سے ہیں، [یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ مسند احمد کی اس سند کے جملہ راوی کتب ستہ کے راویوں میں سے ہیں] خیر ان کا حکم معلوم کرنے سے پتہ چلا کہ یہ ''ثقة مخضرم'' ہیں۔ حضرت ابو بکر صحابی رسول معروف اور مشہور ہیں ان کا حکم واضح ہے۔

معلوم ہو گیا کہ مذکورہ سند کے راویان ثقہ ہیں اور ان میں کسی کے بارے میں مدلس اور مرسل کا عیب بھی نہیں ملا لہٰذا یہ فیصلہ کرنا آسان ہو گیا کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے۔

لیکن اگر کسی ایسی کتاب کی سند پر حکم لگانا ہو جنکے رجال کے تعلق سے کوئی مخصوص کتاب نہیں لکھی گئی ہے تو ایسی صورت میں ان کے نام کی تعیین اور حکم معلوم کرنے کیلئے کسی بھی طرح کی کتاب میں تلاش کیا جا سکتا ہے، مثلاً ان کو ان کتابوں میں تلاش کیا جا سکتا ہے جن کو کتب عامہ کہا جاتا ہے، اسی طرح سے کتب خاصہ میں سے ہر طرح کی کتاب میں تلاش کیا جا سکتا ہے خواہ وہ کتب ثقات ہوں یا کتب ضعفاء ہوں یا رجال کتب ستہ سے متعلق کتابیں ہوں، اگر یہ رجال کتب ستہ کے راوی نہیں ہیں تو عموماً مذکورہ کتابوں میں سے کسی نہ کسی کتاب میں مل جائیں گے جس کی مدد سے ان کی تعیین اور حکم معلوم کیا جا سکتا ہے۔

لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ مذکورہ عمل سے آپ صرف اسی سند پر حکم لگا سکتے ہیں اور یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی سند صحیح ہے یا حسن ہے یا ضعیف ہے، البتہ حدیث پر حکم لگانے کیلئے ابھی تیسرے عمل کی ضرورت ہے۔

۳- شذوذ و علت کی معرفت:- تیسرا عمل یہ ہے کہ آپ اس کے جملہ طرق، متابعات و شواہد کو علل و شذوذ کی معرفت کیلئے تلاش کریں۔

حدیث میں علت یا شذوذ معلوم کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ آپ اس فن

سے متعلق مخصوص کتابوں کو دیکھیں جس میں سب سے عظیم کتاب "العلل الواردة في الأحاديث النبوية" ہے جو امام دار قطنی کی تالیف ہے اور مسانید صحابہ کی ترتیب پر مرتب ہے، اس کی فی الحال کچھ ہی جلدیں مطبوع ہیں بقیہ مخطوط ہیں۔ اس سلسلہ کی دوسری جامع کتاب "علل الحدیث" ابن ابی حاتم رازی کی ہے جو مطبوع و متداول ہے اور ابواب فقہ پر مرتب ہے، اس میں وہ حدیثیں مل سکتی ہیں جو معلل یا شاذ ہیں۔

ان جملہ صبر آزما عمل، محنت و مشقت کے بعد پھر آپ کسی حدیث پر حکم لگا سکتے ہیں اب ذرا اپنی شخصیت پر نظر ڈالئیے کہ کیا آپ ان سارے اعمال کو بحسن وخوبی انجام دینے کی صلاحیت اپنے اندر پاتے ہیں؟ اگر نہیں تو خدارا حدیث رسول پر فیصلہ کرنے کی جرأت مت کیجئے۔ وباللہ التوفیق۔

یہ کتاب جس کا نام "جرح و تعدیل" ہے اس خاتمہ کے تحریر کے ساتھ حسن اختتام کو پہنچا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ خادم سنت رسول کی اس حقیر کوشش کو قبول فرمائے، اس کو صدقہ جاریہ اور ذخیرۂ آخرت بنائے۔ سنت نبوی کی خدمت کرنے والے اور عام مسلمانوں کیلئے مفید بنائے۔ آمین۔

والحمد لله رب العالمين و صلى الله على نبينا محمد و آله و صحبه أجمعين ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين.

راقم

ڈاکٹر اقبال احمد بسکوہری

شوال ۱۴۲۳ھ

کتب عامہ کی
کتب تواریخ ق
التاریخ الکبیر، امام بخاری
التاریخ، یحیی بن معین
کتب طبقات
الطبقات، امام مسلم
الطبقات، خلیفہ بن خیاط
الطبقات الکبری، ابن سعد
کتب سوالات
سوالات البرقانی للدارقطنی
سوالات السہمی للدارقطنی
سوالات ابن ابی شیبہ لعلی بن المدینی
کتب خاص
کتب
الاسامی و الکنی، ابو احمد حاکم
الکنی و الاسماء، دولابی
الکنی، امام نسائی
الکنی و الأسماء، امام مسلم
الکنی، امام بخاری
الاسامی و الکنی، امام احمد
کتب مقامی تواریخ
تاریخ نیسابور، حاکم
تاریخ دمشق، ابن عساکر
تاریخ بغداد، خطیب
کتب بر رجال کتب ستہ
تفصیلی خاکہ ص ۲۹۰ پر دیکھیں
کتب ثقات
الثقات عمن لم یقع فی ...... ، ابن قطلوبغا
تاریخ الاسماء و الثقات، ابن شاہین
الثقات، ابن حبان
معرفۃ الثقات، عجلی
ضعفاء رجال
لسان المیزان، ابن حجر
میزان الاعتدال، ذہبی
الکامل فی ضعفاء الرجال، ابن عدی
المجروحین، ابن حبان
تاریخ الضعفاء، عقیلی

مشہور کتابیں
کتب تواریخ ق ۲
کتب تواریخ ق ۳
المنتظم، ابن الجوزی
البدایۃ والنہایۃ، ابن کثیر
تاریخ اسلام، ذہبی
تاریخ الملوک والامم، طبری
الکامل فی التاریخ، ابن اثیر
مشہور کتابیں
کتب القاب
کتب انساب
کتب موتلف و مختلف
کتب بلدان
کتب وفیات
الکنی، ابن مندہ
الاستغنا، ابن عبدالبر
المقتنی فی سرد الکنی، ذہبی
الالقاب، شیرازی
نزھۃ الالباب، ابن حجر
فتح الوہاب، حماد انصاری
الانساب، سمعانی
اللباب، ابن اثیر
الموتلف، عبدالغنی ازدی
تصحیفات المحدثین، عسکری
الموتلف، دار قطنی
الاکمال، ابن ماکولا
تبصیر المنتبہ، ابن حجر
معجم استعجم، بکری
معجم البلدان، یاقوت حموی
الوفیات، ابن قانع
تاریخ موالید الرواۃ، ابن زبر
الوفیات، ھروی